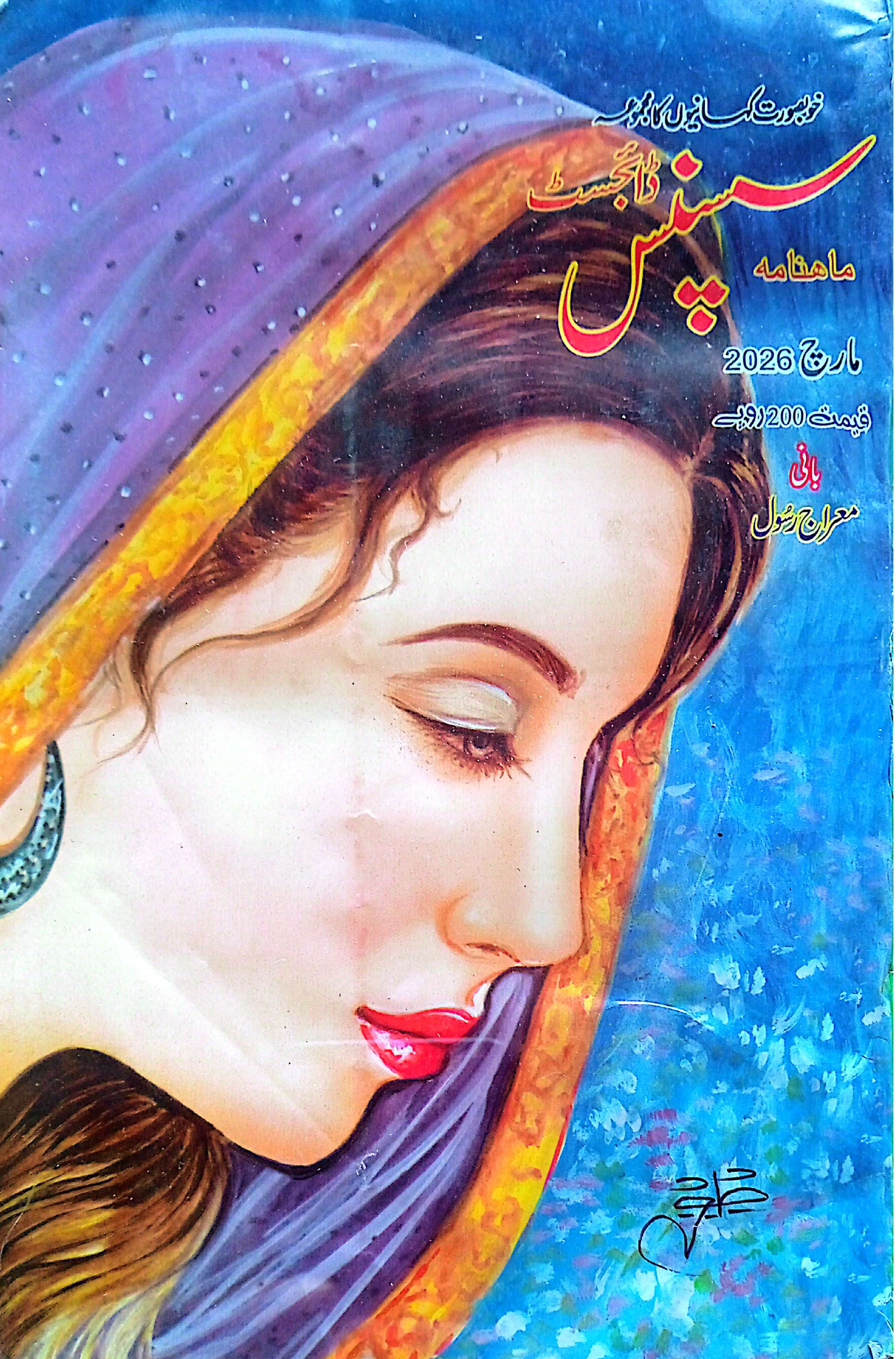
خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ
سسپنس ڈائجسٹ
ماھنامہ
مارچ 2026
قیمت 200روپے
بانی
معراج رسول

سسپنس ڈائجسٹ

CPNE

MEMBER APNS

مدیرِ اعلیٰ

عذرا رسول

مدیر

اطہر حسین

نائب مدیرہ

شازیہ حمیر

مارکیٹنگ و

سرکولیشن منیجر

ثمر عباس

07 انشائیہ / جون ایلیا

حکومتی بساط کی باریکیوں کا جائزہ

08 آپ کے خط / مدیرِ اعلیٰ

سسپنس کی مجلسِ مشاورت و دستار نشین کی نشست

شیریں باتیں، گلے شکوے اور پُرخلوص مشورے

12 ظالم مظلوم / زویا صفوان

ماضی کا آئینہ۔ بااختیار اور بے اختیار انسانوں کے سبق آموز اور عبرت آمیز واقعات

37 موذی ریچھ / صائمہ دانش

خود کو دوسروں سے برتر سمجھنے والے گھمنڈی شخص کا ماجرا

44 رمز شناس / نازیہ کامران کاشف

خوف میں لپٹی پوشیدہ رازوں کی کڑیاں ملانے والے ایک رمز شناس کی سنسنی خیز داستان

67 اندھیرے تلے / طیب سنگھانوی

سورج گرہن کے باعث ہونے والے اثرات کی پُراسرار منظر کشی

72 خوگرفتہ / ملک صفدر حیات

ہوس کے مارے ایک مجرم کے قبیح فعل کی کہانی

95 مکر / لبنیٰ خان

پڑوسن کی سنائی کہانی پر نوجوان عورت کا اقدام

جلد 55 • شمارہ 03 مارچ 2026 • زرِ سالانہ 3000 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 200 روپے •

خط کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 215 کراچی 74200 • فون: 35895313 (021) E-mail:jdpgroup@hotmail.com

104 — محفلِ شعر و سخن — قارئین
آپ کے ہاتھوں سجی ایک انجمن رنگ رنگ
آپ کی پسند آپ کے ذوق سے ہم آہنگ

107 — خالہ کی کڑواہٹ — عیوق بخاری
کڑوی کسیلی باتیں کرنے
والی خالہ کی عقلمندی

118 — جنگ باز — ڈاکٹر عبدالرب بھٹی
معاشرتی ناسوروں اور درندوں کی خوں ریز سازشوں اور
زخم زخم ہونے والے ایک جنگ باز کی دلدوز داستان

141 — تماشا — عائشہ نصیر
مشہور ہونے کے لیے غلط طریقہ
اپنانے والے جوڑے کی داستان

149 — میرزا یحییٰ صبح ازل — ضیا تسنیم بلگرامی
خود ساختہ مدعیانِ نبوت میں سے ایک
جس کا اردو میں بہت کم ذکر کیا گیا

159 — قید تنہائی — جاوید بسام
آزادی کی چاہ میں ویران
سیارے پر بسنے والے مجرم کا احوال

166 — دیس پردیس — ناہید سلطانہ اختر
دلوں میں امنگ آنکھوں میں سہانے خواب سجائے
پردیس میں قسمت آزمانے والوں کی داستان

** — کترنیں — ادارہ
دنیا بھر کے ادھر ادھر سے لطیفے، چٹکلے، اقتباسات
مسکراہٹیں اور قہقہے سب کچھ آپ کے لیے

پبلشر و پروپرائٹر: ذیشان رسول • مقامِ اشاعت: گراؤنڈ فلور C-63 فیز II ایکس ٹینشن، ڈیفنس، مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابنِ حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

انشائیہ

جون ایلیا

ناگزیر

آج ہم حکومتوں کے سب سے زیادہ محبوب رجحان کے بارے میں گفتگو کریں گے۔ یہ مطلقیت یا مطلق العنانی کا رجحان ہے۔ اکثر حکمراں بلکہ تمام حکمراں اس کو مملکت کے تمام عقدوں کا حل سمجھتے رہے ہیں۔ بہت سے دانشمندوں نے بھی حکومت اور ریاست کے باب میں بحث کرتے ہوئے اس کی تائید کی ہے۔ پر حقیقت یہی ہے کہ وہ رجحان تھا جس نے تاریخ کو ایک قصاب خانہ بنا دیا۔

صحیح بات شاید یہی ہے کہ انسانی فطرت اپنی آزادوضع میں حکومت کے تسلط کو تسلیم کرنے سے ہمیشہ انکار کرتی رہی ہے اور اس نے حکومت کو ہمیشہ ایک ظالمانہ اور غاصبانہ بندوبست گردانا ہے۔ ہے بھی یہی کہ حکومت اپنے جوہر میں ایک جبر ہے اور انسانی تاریخ اس جبر سے چھٹکارا پانے کی پے در پے کوششوں کا رزم نامہ ہے۔ تاریخ کی جھنجلائی ہوئی دست و پابریدہ جرأتیں، سولی پر چڑھ جانے والی سینہ خیز صداقتیں اور بپھری ہوئی لہولہان بغاوتیں ہم پر یہی رمز منکشف کرتی ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ ان واقعہ طلب عزیمتوں کے ہیجان کا اصل رمز سینوں ہی میں رہا ہو اور زبانوں پر یہی نعرے سنائی دیے ہوں کہ فلاں ظالم اور فلاں غاصب کا تختہ الٹ دو مگر حقیقت یہی ہے کہ یہ سارا ہیجان ظالموں اور غاصبوں کے اس سلسلے کے خلاف برپا ہوتا رہا ہے جس کا جامع اسم حکومت ہے۔

حکومت کا وہ خاص علیہ کیا ہے جس کے باعث ہمیشہ ذہنوں میں بغاوتیں بھڑکتی رہی ہیں۔ وہ ایک مسلم تسلط کی سرپرستی میں ایک برگزیدہ اقلیت کی طرف سے اکثریت کے حقوق کو غصب کرنے کا دستور ہے۔ جس کے ساتھ قانون اور اخلاق کا پورا انتظام ہوتا ہے۔ پھر اپنے اس کردار کے ساتھ حکومت اپنی روح اور عمل میں ایک جبر و قہر ہوئے ہجوموں سے خطاب کرتے ہوئے یا قید خانوں کی سلاخوں کے پیچھے تلخ ہنسی ہنستے ہوئے ہمیں کتنے عجیب، عظیم اور قابلِ تعظیم محسوس ہوتے ہیں لیکن جب یہی لوگ اقتدار کی مسند پر دکھائی دیتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ہم خوابوں کی فضا سے ناگہاں زمین پر گھسیٹ لیے گئے ہوں۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ اس لیے کہ انسانی فطرت حکومت سے کبھی انس پیدا نہیں کرسکی اور واقعی حکومتوں کا وجود اس بات کا ثبوت ہے کہ انسانیت زمین پر آج تک پابہ زنجیر ہے۔ دنیا کی حسّاس اور آزادی پسند ذہانتوں نے ہمیشہ ایک ایسے دور کے خواب دیکھے ہیں جب حکومت موجود نہ ہوگی اور ایک لاحکومت اور لاریاست معاشرہ وجود میں آئے گا۔ حکومتوں کے سرفروش حریفوں اور جگردار مقتولوں کو تاریخ نے عام طور پر شہیدوں کے نام سے یاد کیا ہے۔

حکومت زیادہ سے زیادہ اقتدار اور زیادہ سے زیادہ تسلط کو اپنی طاقت خیال کرتی ہے۔ یہ محض خوش فہمی ہے، سب سے زیادہ بااقتدار حکومت سب سے زیادہ کمزور ہوتی ہے۔ اس کے خلاف بغاوت کرنا خود اسی کے محکوم معاشرے میں سب سے بڑی فضیلت کا درجہ رکھتا ہے۔ چاہے اس کے خلاف کوئی ایک شخص بھی بغاوت نہ کرے لیکن درحقیقت ہر شخص اس کا باغی ہوتا ہے۔

اگر کسی حکومت کو حکومت ہونے کے باوجود اچھا کہا جانا ممکن ہے تو اچھی حکومت وہ ہے جسے معاشرہ اپنے احساس آزادی کا ضامن اور وکیل سمجھتا ہو اور جس کے افراد کسی فریب خوردگی کے بغیر فرائض میں حقوق کی لذت پاتے ہوں۔ ورنہ ہے یہی کہ عوام حکومتوں کو ہمیشہ اپنی امنگوں کا حریف محسوس کرتے ہیں۔ اس احساس کو دلوں سے یکسر مٹا دینا شاید ہی کسی حکومت کے بس میں ہو۔ ہاں، اس احساس کو کم کر دینا ممکن ہے اور یہ معجزہ ایک مثالی حکومت ہی سے ظہور میں آسکتا ہے۔ ویسے اپنے جوہر میں حکومت ایک شر ہے، بری حکومت ہی نہیں بہت اچھی حکومت بھی۔ اس حیثیت سے کہ وہ حکومت ہے...... ایک شر ہے...... اب یہ ایک مجبوری ہے کہ تاریخ کے موجودہ مرحلے میں یہ شر ناگزیر ہے۔

ایک خط

قارئین کرام
السلام علیکم!
مارچ 2026ء کا شمارہ آپ کی خدمت میں حاضر ہے۔ نیا سال شروع ہو چکا ہے مگر آغاز میں ہی دلسوز اور خوفناک سانحات نے پوری قوم کو سوگوار کر دیا ہے۔ کراچی میں گل پلازا میں ہونے والے سانحے کے بعد مختلف علاقوں میں آگ لگنے کے واقعات منظرِ عام پر آئے...... لیکن افسوس کہ مقتدر حلقوں نے کچھ خاص پیش رفت نہ کی اور سوائے زبانی کلامی خانہ پری کے عملی اقدامات کا فقدان رہا۔ بلکہ سیاسی رسّا کشی شروع ہو گئی۔ ایک دوسرے پر الزام تراشی کی گئی...... ابھی یہی زخم تازہ تھے کہ اسلام آباد میں ہونے والے بم بلاسٹ میں بے گناہ شہریوں کی شہادت نے فضا کو اور رنجیدہ کر دیا۔ نہ جانے ہمارے ملک کو کس کی نظر لگ گئی۔ ہماری اعلیٰ حلقوں سے اپیل ہے کہ موجودہ نازک صورتِ حال میں پرانی رنجشوں کو بھلا کر مشکلات کا مقابلہ کریں اور پوری قوم ایک پیج پر متحد ہو تاکہ بیرونی سازشوں کو ناکام بنایا جائے۔ یہ مہینا اس حوالے سے اہم ہے کہ 23 مارچ 1940ء کو قراردادِ پاکستان منظور ہوئی۔ یہ دن تاریخ میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ مذکورہ قرارداد برصغیر کے مسلمانوں کے لیے ایک علیحدہ وطن کے قیام کی بنیاد بنی۔ یہ دن ہمیں اپنے بزرگوں کی قربانیوں اور قائداعظم محمد علی جناح کی قیادت میں تحریکِ آزادی کے ولولہ انگیز سفر کی یاد دلاتا ہے۔ ہمیں اپنے ملک کی ترقی اور استحکام کے لیے اسی جذبے کو اپنانا ہوگا اور عہد کرنا ہوگا کہ ہم ملک کو خوش حال اور ترقی یافتہ بنانے کے لیے اپنی صلاحیتیں بروئے کار لائیں گے۔ اسی ماہ میں عیدالفطر بھی منائی جائے گی۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہمیں اپنے وطن کی حفاظت اور خدمت کی توفیق عطا فرمائے اور دشمنانِ پاکستان سے محفوظ رکھے، آمین۔

✲ سیدہ روبینہ شاہین روبی، تھل ساؤتھ پنجاب سے خط لکھ رہی ہیں۔ ”اپنے بس میں کم ہی ہوتا ہے...... کہیں کچھ ہو جاتا ہے اور ہم کمزور انسان بے بس ہوتے ہیں اسے روکنے میں۔ کاش یہ نہ ہوتا...... کاش اس طرح کرتے تو ایسا نہ ہوتا، کاش...... کاش...... آہ! روشنیوں کا شہر غم کی تاریکی میں ڈوب گیا اور اس غم کے بھیانک سائے تھل کے ٹیلوں تک واضح دکھائی دے رہے ہیں۔ گل پلازا کی گھٹن، دھواں، تپش دیگر پاکستانیوں کی طرح تھل والوں نے بھی محسوس کی ہے اور اپنوں کی جدائی پر تڑپ اٹھے ہیں۔ کتنے حسین چہرے تھے جو راکھ ہو گئے...... کتنے چراغ تھے جو گل ہو گئے...... کتنی مسکراہٹیں تھیں جو آگ میں مجسم ہو گئیں اور...... کتنا درد ہے جو ہمارے دلوں میں بھر چکا ہے۔ ٹی وی اسکرین پر دیکھنا اور محسوس کرنا اتنا دردناک ہے تو جن پر گزری، ان کا کیا حال ہوگا، یہ سوچ کر آنکھوں سے آنسو رواں ہو رہے ہیں۔ سانحہ گل پلازا پر پورا پاکستان سوگ میں ہے۔ خدا متاثرین اور پیاروں کی میتیں اٹھانے والوں کو صبر دے اور ہمیں سانحات و حادثات سے محفوظ رکھے، آمین۔ پاکستانیوں سے اپیل ہے کہ عیدالفطر کو یومِ دعا کے طور پر منائیں اور خدا سے رحمت مانگیں۔ حقیقت ہے کہ عید کے رنگ کراچی سانحہ کی وجہ سے مدھم پڑ گئے ہیں۔ خدا ہم پر رحم کرے، ہماری کوتاہیوں کو درگزر کر کے ہماری دعائیں قبول فرمائے، آمین۔ سید محی الدین اشفاق کرسیِ صدارت پر براجمان تھے، ماشاءاللہ، واقعی زبردست تبصرہ لکھا تھا۔ معذرت کہ سانحہ گل پلازا کی وجہ سے اس بار مبارک باد نہیں دے سکتے لیکن آپ کے لیے ڈھیروں دعائیں بھجوا رہے ہیں۔ ڈیرہ غازی خان سے سیتا شاہ کا عمدہ تبصرہ پڑھنے کو ملا۔ عون احمد کا معلوماتی و تجزیاتی تبصرہ بہت بھایا۔ سینٹرل جیل سے مبشر امیر خط بھجوا رہے ہیں، یہ ایک مثبت و نیک شگون ہے۔ مبشر امیر کی دعاؤں پر آمین۔ اپنی ہم نام کا تبصرہ دیکھ کر ہمیشہ کی طرح اچھا لگا۔ ملک وحید کی حاضری بھی خوب رہی۔ سب سے پہلے عائشہ نصیر کی ”بلائے ناگہانی“ پڑھی۔ مزیدار تحریر تھی۔ مس ٹیری نے بروقت کال کر کے ایک بے گناہ کی جان بچائی اور چاکلیٹ کی حقدار بن گئی۔ ”وہم“ میں عتیق بخاری نے ایک اہم بات کی جانب توجہ مبذول کروائی ہے۔ بے شک یہ علاج کرتی ایک تحریر ہے۔ زویا صفوان کی ”ظالم مظلوم“ پورے انداز سے جاری ہے۔ محمد فاروق انجم ”زنجیر“ کے انجام نے حیران کر دیا۔ سراج کا شک غلط ثابت ہوا اور توفیق احمد نے صورتِ حال کو دیکھ کر اپنی فطرت بدل کر یہ ثابت کر دیا کہ انسان اگر چاہے تو برائی کو اچھائی میں بدل سکتا ہے۔ آصف ضیا احمد کی ”ایک لوہار کی“ عمدہ کہانی تھی۔ کترنیں بھی دلچسپ اور اشعار سارے ہی واہ واہ کرنے والے تھے۔ سانحہ گل پلازا میں جاں بحق ہونے والے شہداء کے لیے دعائے مغفرت اور لواحقین کے لیے دعائے صبرِ جمیل۔ خدا ہماری لغزشوں کو معاف فرمائے اور ماہِ صیام کی برکتوں اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم و آلِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل ہم پر رحمتوں کی بارش کرے، آمین۔“

✲ قیدی مبشر امیر کا تبصرہ، پشاور سینٹرل جیل سے۔ ”فروری کا شمارہ جنوری کی 21 تاریخ کو مل گیا تھا، شمارہ لکھنے والوں سے لے کر شمارہ پہنچانے والوں تک کا دل کی گہرائیوں سے شکریہ۔ ٹائٹل فوٹو میں بھوری آنکھوں والی حسینہ اداس چہرے کے ساتھ خوبصورت تھی لیکن سمجھ نہ آئی کہ بیچاری کو ہماری طرح کون سے دکھ ہیں...... منطق اور فلسفہ جون ایلیا صاحب کی تحریر پڑھی، جون ایلیا صاحب نے بڑے ہی عقل مندانہ طریقے سے پڑھے لکھے اور ان پڑھ میں فرق واضح کر دیا۔ خطوط میں کرسیِ صدارت سید محی الدین اشفاق کو نصیب ہوئی، مبارک ہو۔ انتہائی خوشگوار تبصرہ کیا ہے بلکہ اگر کہا جائے کہ تمام کہانیاں بلکہ تمام شمارے پر مکمل تبصرہ کیا ہے تو بیجا نہ ہوگا۔ ڈیرہ غازی خان سے سیتا شاہ کا تبصرہ بھی کمال تھا، پھر عون

احمد، سیدہ روبینہ شاہین صاحبہ، روبینہ اشعر صاحبہ اور ملک وحید کا تبصرہ بھی پڑھا، وہ بھی کمال تھا، پھر اپنا نام پڑھ کر تو خوشی ڈبل ہی ہوگئی۔ کہانیوں میں زویا صفوان کی ''ظالم مظلوم'' پڑھی، بیچاری پھولن اب اصل پھول سنگھ بن کر سامنے آئی ہے۔ یہ معاشرے کی بری صورت بھی ہے کہ عورت کو ہمیشہ ہی کمزور سمجھا جاتا ہے۔ لگتا ہے کہ مان سنگھ کی تجویز شاید پھولن دیوی کے لیے کارآمد ثابت ہو۔ عاطر شاہین نے ''بدقسمتی'' میں لکھا کہ ٹکٹ چیکر نے سابقہ بیوی کو قتل تو کر دیا لیکن اس کی بدقسمتی کہ اسی ٹرین میں بلا، اسی کی سابقہ بیوی کے سامنے ہی ایک حاضر سروس پولیس والا بھی بیٹھا تھا اور بیچارہ پکڑا گیا، اچھی کہانی تھی۔ پھر ''رمز شناس'' کی باری آئی۔ اب حقیقت میں تین الگ الگ واقعات میں درست طریقے سے ولن کی انٹری ہو چکی ہے کیونکہ لالچ ہی انسان کو شیطان کا پیروکار بناتا ہے۔ حلیمہ بھی اپنی حرص میں شیطان کی پیروکار بن چکی ہے اور وہ عیاد کی محبت حاصل کرنے کے لیے ضرور کتاب چرانے کی کوشش کرے گی۔ باقی کہانی شاندار ہے اور آگے بھی اسی طرح جاری رہے گی۔ اس کے بعد پھر برازیل کے ایمازون جنگلوں کی کہانی ''سونے کا راستہ'' بھی اچھی تھی۔ مرزا امجد بیگ ہمیشہ کی طرح ایک دفعہ پھر کامیاب مقدمہ لے کر آئے۔ ''پیش کار'' اچھی کہانی تھی۔ یہاں بھی ڈاکٹر انیتا اپنی حرص میں قتل کر بیٹھی لیکن جانتی نہ تھی کہ قانون ہمیشہ ایک قدم آگے ہوتا ہے۔ عائشہ نصیر کی کہانی ''بلائے ناگہانی'' کی ذرا بھی سمجھ نہ آئی، معذرت چاہتا ہوں۔ ''پختہ عزم'' میں فائز کے غلط قدم کے جواب میں قتل کرنا مجھے تو درست نہ لگا کیونکہ جتنا قصور فائز کا تھا، اتنا ہی زنیرہ کا بھی۔ خیر کسی کو اتنا موقع ہی نہ دیں کہ وہ آپ کی عزت کے ساتھ کھیلے۔ ''جنگ باز'' ابھی تک تو اچھی جا رہی ہے اور ایک دفعہ پھر انٹرنیشنل ایجنٹس کی انٹری نے ماحول کو گرما دیا۔ ''دیس پردیس'' بھی اچھی ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ اگر آپ اپنے والدین کو تنہا چھوڑیں گے تو ایک دن آپ کی اولاد بھی آپ کے ساتھ ویسا ہی کرے گی یا شاید اس سے بھی بڑھ کے برتاؤ کرے۔ باقی کہانی اچھی ہے۔ مغربی معاشرے کی برائیوں کو درست طریقے سے بیان کیا گیا ہے لیکن ہم پھر بھی سبق نہیں سیکھتے بلکہ مغرب کی طرف زیادہ ہی دوڑتے ہیں۔ باقی تمام قارئین کو رمضان کی بہت بہت ایڈوانس مبارک۔ آپ سب سے دعا ہے کہ ہم قیدیوں کے لیے بھی دعائیں کیجیے گا۔ باقی اللہ ہم سب کے لیے آسانیاں پیدا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔''

✠ سیتا شاہ، ڈیرہ غازی خان سے۔ ''خوبصورت ٹائٹل سے سجا ماہِ فروری کا شمارہ جلدی مل گیا۔ حسبِ عادت سب سے پہلے جون ایلیا کا انشائیہ پڑھا پھر خطوط۔ سید محی الدین اشفاق بہترین تبصرے کے ساتھ کرسیٔ صدارت پر موجود تھے، بہت مبارک باد۔ ہر خط میں اپنے ذکر کی خوشی مناتے عون احمد بھی اچھے تبصرے کے ساتھ شریک محفل تھے۔ سیدہ روبینہ شاہین روبی اور روبینہ اشعر کی حاضریاں دلچسپ تھیں۔ ملک وحید کا تبصرہ مختصر مگر دلچسپ تھا۔ اب ذکر کہانیوں کا۔ سب سے پہلے ''دیس پردیس'' پڑھی۔ رجب علی کی زندگی میں کامیابی آنا اور رشتوں کا جانا افسوسناک لگا۔ رجب علی سے تو لگتا ہے رائٹر صاحبہ کا بھی اختلاف چل رہا ہے، اسی لیے اس کے ساتھ برا ہی کر رہی ہیں۔ شاید اگلے حصے میں اختتام ہو جائے۔ ''رمز شناس'' میں سنگھیا کے ہاتھوں روپا اور امرتا کی موت ہوگئی۔ یہ سب اس نے رتناوتی کو بچانے کے لیے کیا مگر اب لگتا ہے وہ رتناوتی کا ہی سب سے بڑا دشمن بن جائے گا۔ اگلی قسط کا انتظار رہے گا۔ مرزا امجد بیگ کا کیس ''پیش کار'' دلچسپ تحریر تھی۔ عیوق بخاری کی ''وہم'' میں بار بار اپنی دوست سیلی کو چند لمحوں میں سالوں کے وہم سے آزاد کر دیا۔ اچھی تحریر تھی۔ آصفہ ضیا کی تحریر ''ایک لوہار کی'' میں بیگم خلیق الزمانی کی بے قدری نے منصب کو مجرم بنا دیا، ایک ایسی مجرم جو اپنے جیسوں کو ان کا حق دلوانے والی تھی۔ فاروق انجم کی ''زنجیر'' میں سراج کے شک نے کئی افراد کو مشکل میں ڈال دیا۔ شکر ہے اختتام تک تھانیدار طفیل کی موٹر سائیکل نے دغا نہیں دیا۔ شاندار تحریر تھی۔ عمران قریشی کی ''غلط فہمی'' میں تبسم نے غلط فہمی میں نعمان اور اس کی بیوی کو مار دیا۔ دماغی کیفیت کے پیشِ نظر وہ قانونی سزا سے تو بچ گئی مگر ضمیر کی سزا ساری زندگی اس کے ساتھ چلنے والی تھی۔ اے آر راجپوت کی ''پختہ عزم'' میں زنیرہ نے فائز کو زندگی کا ساتھی چننے کا غلط فیصلہ کیا مگر بیٹے کے ساتھ واپس اپنے دیس آکر بس جانا اچھا فیصلہ رہا۔ زویا صفوان کی ''ظالم مظلوم'' دلچسپی کا عنصر قائم رکھے جاری ہے۔ ''سونے کا راستہ'' میں ڈوم گیلوئل کا سفر اور ''دور دیس کا مہمان'' میں روح کا انتقام دلچسپ لگا۔ عائشہ نصیر کی ''بلائے ناگہانی'' میں مس ٹیری کا کردار پسند آیا۔ اسٹیو ہلٹن کو گرفتار کروانے میں اسی کی تیز نظر کام آئی تھی۔ دلچسپ کہانی تھی۔ عاطر شاہین کی تحریر ''بدقسمتی'' میں سارجنٹ رابرٹ ہیلر کا اصل قاتل مائیکل تک پہنچنا اور اس سے پہلے کے تمام واقعات دلچسپ لگے۔ اچھی کہانی تھی۔ کترنیں خوب رہیں، محفلِ شعر و سخن میں سبھی انتخاب اچھے تھے۔ شمارہ دلچسپ تھا۔ سسپنس اور اس کی پوری ٹیم کے لیے دعاگو۔''

✠ سید محی الدین اشفاق کا دکھ فتح پور لیہ سے۔ ''اپنوں کی محفل میں حاضر ہوئے ہیں ایک دکھ شیئر کرنے۔ وہ دکھ جو پورے پاکستان کا مشترکہ درد بن چکا ہے۔ سانحہ گل پلازا نے خون کے آنسو رلا دیا ہے۔ روشنیوں کے شہر میں زندگی کے کئی چراغ گل ہوگئے، آگ کراچی میں لگی لیکن خدا کی قسم جلن، تپش اور اذیت ہر پاکستانی کے دل تک پہنچی ہے۔ بچھڑ جانے والوں کی تصویریں دیکھ کر روح پر زخم لگ رہے ہیں۔ آگ، دھوئیں، گھٹن نے کیسے ہمارے پیاروں کو ہم سے جدا کر دیا، یہ سوچ سوچ کر دماغ سلگ رہا ہے۔ سندھ کے غم میں پنجاب، بلوچستان، خیبر پختونخواہ و آزاد کشمیر نوحہ کناں ہیں۔ بری طرح توڑ کے رکھ دیا ہے شہرِ قائد کے اس حادثے نے۔ کس کا قصور تھا، کس کی غفلت، اس سے مجھے کوئی لینا دینا نہیں۔ یہ باتیں تو ''دکانداری'' چمکانے والے کریں۔ میں تو ایک حساس انسان ہوں جسے یہ احساس رلائے دے رہا ہے کہ وہ معصوم قلقاریاں جو وطن کے آنگن میں سنائی دیتی تھیں، وہ دھوئیں میں گھٹ گئیں۔ وہ جو کئی خوشیاں خریدنے گئے تھے، کیسے ہمیں غم دے گئے، وہ مسکراہٹیں بے چین کر رہی ہیں جو آگ نے جلا ڈالی ہیں۔ بہت بڑا دکھ ہے پیارے پاکستان کے لیے،

پاکستانیوں کے لیے اور ان لواحقین کے لیے جنہوں نے پیاروں کی میتیں اٹھائی ہیں۔ ان غم سے نڈھال لوگوں سے کہنا ہے کہ ہم آپ کے غم میں برابر کے شریک ہیں۔ اتنی بڑی آزمائش کے بعد یقیناً خدا کے ہاں تمہیں عظیم اجر ملے گا، آمین۔ خدا ہمیں اور ہمارے وطن کو ناگہانی آفات سے بچائے، اتنے بڑے دکھ اور غم کے بعد عید پھیکی پڑ گئی ہے۔ اہلِ وطن سے اپیل ہے کہ عید پر ان ہم وطنوں کو دلاسا دیں جن کی آنکھوں میں آنسو نہ جانے کب تک بھرے رہیں گے اور عید پر خدا کے حضور گڑگڑا کر سلامتی، امن و تحفظ کی دعا مانگیں۔ ماہ فروری کا ڈائجسٹ پڑھ لیا ہے۔ عہدۂ صدارت پر اپنا نام دیکھ کر اچھا لگا لیکن سانحہ گل پلازا کی وجہ سے خوشی نہیں منائی۔ ''دیس پردیس'' کی قسط پڑھی۔ رجب علی کی زندگی مسلسل طوفانوں کی زد میں ہے۔ دیکھتے ہیں ساری اولاد اور دو بیویوں کے دھوکے کے بعد ناہید سلطانہ اختر کون سا نیا موڑ دکھاتی ہیں۔ عائشہ نصیر کی ''بلائے ناگہانی'' دلچسپ تحریر تھی۔ مس ٹیری کی تیز نظر نے ایک معصوم کو قتل ہونے سے بچا لیا اور پھر اس نے اپنا ''معاوضہ'' بھی وصول کر لیا۔ چاکلیٹ بطور معاوضہ حاصل کرنا بڑا معصومانہ اور پیارا سا لگا۔ عیوق بخاری نے ''وہم'' لکھ کر بڑا اچھا کام کیا ہے۔ کئی لوگ ہیں جو توہمات میں پھنس کر پریشان ہیں۔ بار برا نے سمجھدار دوست ہونے کا ثبوت دے کر اپنی دوست کی جان ایک مصیبت سے چھڑائی۔ محمد فاروق انجم کی ''زنجیر'' نے واقعی زنجیر کی طرح کڑیاں آگے بڑھائیں اور انجام پر ہم چونک گئے۔ بہت ہی عمدہ تحریر تھی۔ حنا خان نے مری سے دلچسپ کترن بھیجی۔ حنظلہ خان نے گوادر سے بڑا شاندار شعر بھجوایا ہے۔ ویسے باقی اشعار بھی کچھ کم نہیں ہیں۔ عیدالفطر کے حوالے سے امتِ مسلمہ و ہم وطنوں کے لیے نیک خواہشات و ڈھیروں دعائیں۔''

✠ روبینہ اشعر، کراچی سے تبصرہ کر رہی ہیں۔ ''ماہ جنوری میں کراچی میں ہونے والا گل پلازا کا المیہ ایسا واقعہ ہے جس نے پورے پاکستان کو غمگین کر دیا ہے۔ گل پلازا تین دن جلتا رہا اور آگ پر بہ مشکل قابو پایا گیا جس سے انتظامیہ کی بے پروائی اور اداروں کی ناتجربہ کاری سامنے آئی۔ درجنوں قیمتی انسانی جانیں گئیں اور ساتھ ہی اربوں روپے کا مالی نقصان ہوا۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ ہمارے ملک میں اس طرح کے المیے پر اربابِ اختیار ایک دوسرے پر الزام تراشی کر کے بری الذمہ ہو جاتے ہیں اور اس شور میں تحقیقات اور انصاف کہیں دب کر مر جاتے ہیں۔ ہمارے ہاں اب المیے سوگ منانے کے لیے نہیں بلکہ سیاست چمکانے کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ ہر سانحے کے بعد شور مچتا ہے، چند دن میڈیا میں بحث ہوتی ہے، سیاسی پوائنٹ اسکورنگ ہوتی ہے پھر سب کچھ بھلا دیا جاتا ہے یہاں تک کہ اگلا سانحہ رونما ہو جائے۔ گل پلازا میں لگی آگ کو اگر محض ایک حادثہ قرار دیا جائے تو یہ حقیقت سے آنکھیں چرانے کے مترادف ہوگا۔ اللہ پاک سے دعا ہے کہ اس سانحے میں جاں بحق افراد کی مغفرت فرمائے اور جن کا مالی نقصان ہوا ہے انہیں اس سے بہتر عطا فرمائے، آمین۔ ماہ فروری 2026ء کا شمارہ حسبِ معمول جلد موصول ہوا اور جب تک اس پر تبصرہ شائع ہوگا تو ماہ رمضان کا مبارک مہینا آدھا گزر چکا ہوگا۔ اللہ پاک ہمیں اس ماہِ مبارک کی تمام برکتیں سمیٹنے اور عبادات کی بھرپور توفیق عطا فرمائے، آمین۔ ٹائٹل کے رنگ کچھ پھیکے سے محسوس ہوئے حالانکہ سردی کے موسم میں شوخ رنگ اچھے لگتے ہیں۔ ٹائٹل نے کچھ خاص متاثر نہ کیا۔ فہرست پر سرسری نظر ڈالتے ہوئے جون ایلیا کے انشائیہ ''منطق اور فلسفہ'' سے مستفید ہوئے جہاں وہ تعصب پر سیر حاصل گفتگو فرما رہے تھے۔ انہوں نے درست فرمایا کہ تعصب پھیلانے والے لوگ مفسدانہ کلیے بناتے ہیں اور مختلف گروہوں کے درمیان مستقل فتنے پھیلاتے ہیں اور ہمیں ان کی باتوں کو سختی سے رد کرنا چاہیے۔ خطوط کی محفل میں مدیر صاحب رمضان المبارک کے بابرکت مہینے میں مہنگائی کے آنے والے طوفان سے خبردار کرتے نظر آئے۔ ان کی ہر دعا پر آمین کہتے ہیں۔ اب آتے ہیں کہانیوں کی جانب۔ تو جناب سب سے پہلے زویا صفوان کی ''ظالم مظلوم'' کا ساتواں حصہ بھی شاندار رہا۔ واقعات کا تسلسل قاری کی توجہ ایک لمحہ بھی اِدھر اُدھر نہیں ہونے دیتا۔ ظلم اور بربریت سہتے سہتے پھولن دیوی مضبوط ہو گئی ہے اور اب قہر بن کر ٹھاکروں پر گرنے لگی ہے۔ عاطر شاہین کی تحریر ''بدقسمتی'' اچھی رہی۔ نازیہ کامران کاشف کے قلم کا جادو ''رمز شناس'' میں سر چڑھ کر بول رہا ہے۔ راج گڑھ، قاہرہ، ایڈنبرا میں مسلسل سنسنی خیز واقعات کا ظہور ہو رہا ہے۔ دوسری جانب قاہرہ میں حلیمہ، المیرا کے خلاف سازشوں میں مصروف ہے اور اب وہ عیاد کے پاس موجود کتاب چرانے پر راضی ہو گئی ہے۔ آگے کے واقعات بھی یقیناً دلچسپ اور سنسنی خیز ہوں گے۔ اگلی قسط کا انتظار ہے۔ جان جوکھوں میں ڈال کر ایک مہم پر جانے والے نوجوان کی ناکامی کا احوال ماہ وش طالب کی تحریر ''سونے کا راستہ'' میں پڑھنے کو ملا۔ کہانی پسند آئی۔ جرم و سزا کے گرد گھومتی مرزا امجد بیگ کی کاوش ''پیش کار'' زبردست رہی۔ ناہید سلطانہ اختر کی ''دیس پردیس'' کا چوتھا حصہ زبردست رہا۔ نشاط کے جانے کے بعد رجب علی کے مصائب میں بے پناہ اضافہ ہو گیا ہے۔ ناہید النساء بھی چند دن گزار کر اسے چھوڑ گئی اور اب رجب علی کی تیسری بیوی ثمینہ نے گھر سنبھال لیا۔ دوسری جانب نشاط کو اپنی غلطی کا احساس ہوا لیکن اب بہت دیر ہو چکی ہے۔ آہستہ آہستہ بچے بھی رجب علی کا ساتھ چھوڑ گئے۔ آگے دیکھتے ہیں حالات کیا رخ اختیار کرتے ہیں۔ عائشہ نصیر کی کہانی ''بلائے ناگہانی'' بھی خوب رہی۔ اے آر راجپوت کی تحریر ''پختہ عزم'' معاشرے کی برائیوں کو اجاگر کرتی متاثر کن تحریر رہی۔ جاوید بسام کی کاوش ''دور دیس کا مہمان'' اچھی رہی۔ ہلکے پھلکے انداز میں تحریر کی گئی محمد فاروق انجم کی ''زنجیر'' پسند آئی۔ آصف ضیا احمد کی کہانی ''ایک لوہار کی'' شاندار تحریر ثابت ہوئی۔ بیگم خلیق الزمانی کے بخیل رویے سے دلبرداشتہ منصب بی بی نے آخر میں نہایت مہارت سے اپنی چال چلی اور ان کی جمع پونجی لے اڑی۔ ڈاکٹر طیب سنگھانوی کی ''آخری وکیل'' جدید دور کی عکاسی کرتی تحریر ثابت ہوئی۔ ضیا تسنیم بلگرامی کی ''ابو علی شفیق بلخی'' کا دوسرا حصہ بھی خوب رہا۔ غلط فہمی کا شکار ایک لڑکی کا اندوہنا انتقام عمران قریشی کی ''غلط فہمی'' میں پڑھنے کو ملا۔ تحریر پسند آئی۔ دلچسپ انداز میں لکھی گئی عیوق بخاری کی تحریر ''وہم'' زبردست رہی۔ باربرا نے بہت سمجھداری سے سیلی کے وہم کا خاتمہ کیا۔ اشعار کی محفل میں تمام اشعار اچھے لگے۔ کترنوں کا انتخاب بھی خوب رہا۔''

✠ محمد ظفر اللہ ضیا کی شکایت، کمالیہ سٹی سے۔ ”دسمبر میں نئے سال کی آمد کے حوالے سے مبارک باد اور سسپنس پر تفصیلی تبصرے [illegible] خط ارسال کیا مگر اس کو جنوری میں جگہ نہ مل سکی۔ محفلِ شعر و سخن کے لیے اشعار روانہ کیے، وہ بھی شائع نہ ہوئے۔ اب فروری کا شمارہ آچکا ہے۔ میرا خیال تھا کہ شاید خط تاخیر سے پہنچا ہو مگر فروری کے شمارے میں بھی نہ خط کا ذکر ہے اور نہ شعر شائع ہوا (جناب ہمیں آپ کا نہ خط ملا نہ ہی دیگر چیزیں)۔ اس سے صاف پتا چلتا ہے کہ کوئی دل جلا سسپنس کی ڈاک اغوا کر کے ظالم سماج کا کردار ادا کر رہا ہے۔ براہِ کرم اس ظالم کا کھوج لگا کر اسے بے نقاب کریں اور قرار واقعی سزا دیں۔ سارے شہر میں سسپنس وقت پر نہیں آتا۔ براہِ کرم اسے جلد بھیجنے کی کوشش کیا کریں تاکہ ہم بروقت خط ارسال کر سکیں۔“

✠ انجم فاروق ساحلی، علامہ اقبال ٹاؤن لاہور سے خط لکھ رہے ہیں۔ ”سسپنس کا ٹائٹل خوبصورت منظر کے ساتھ مارکیٹ میں جلوہ گر ہوا۔ خطوط کی محفل مختصر مگر جاذبِ نظر تھی۔ سید محی الدین اشفاق صاحب، سیتا شاہ صاحبہ، سیدہ روبینہ شاہین صاحبہ، مبشر امیر صاحب، ملک وحید صاحب سبھی احباب کا بے حد مشکور ہوں جنہوں نے تبصرہ قلمبند فرمایا۔ گزشتہ برس میرے چھوٹے چچا پی ٹی وی ڈراما رائٹر محمد طارق ساحلی انتقال کر گئے۔ ابھی یہ صدمہ تازہ تھا کہ دو ماہ سے علیل میرا چھوٹا بھائی سلیم اختر ساحلی اکتیس دسمبر کی رات ہارٹ اٹیک سے وفات پا گیا (بہت افسوس ہوا، اللہ پاک آپ کو اور اہلِ خانہ کو صبرِ جمیل عطا فرمائے)۔ کام میں دقت پیش آ رہی ہے۔ ”ظالم مظلوم“ خوب ہے، ”بدقسمتی“ اچھی رہی، ”پختہ عزم“ کا اختتام جاندار ہے، ”زنجیر“ کا اختتام بھی خوب تھا۔ ”پیش کار“ میں ابتدائی تمہید لمبی ہے، بہرحال کہانی اچھی اور دلچسپ تھی۔ ”آخری وکیل“ نئے انداز کی منفرد کہانی تھی (آپ کی کہانیاں اگر اچھی ہوں گی تو ضرور شائع ہوں گی)۔“

✠ دانیال حسن چغتائی، کہروڑپکا ضلع لودھراں سے۔ ”امید ہے کہ سسپنس کی ادارتی ٹیم اور قارئین خیریت سے ہوں گے۔ کچھ ماہ کی غیر حاضری کے بعد ایک بار پھر سے بزم میں حاضر ہوں۔ پاکستان کے مشہور اور مقبولِ عام رسالے سسپنس ڈائجسٹ کے فروری 2026ء کے شمارے کے سرورق پر روایتی ڈائجسٹ آرٹ کی خوبصورت جھلک نظر آئی جو اپنے مخصوص انداز کی وجہ سے دہائیوں سے قارئین کے دلوں پر راج کر رہا ہے۔ سرورق پر دوشیزہ کی تصویر ہے جس نے روایتی لباس اور دوپٹا اوڑھ رکھا ہے۔ جون ایلیا کے ”انشائیہ“ میں اس بار انسانوں کی مختلف اقسام اور ان کے اختلافات کا ذکر کیا گیا کہ اس دنیا میں کروڑوں انسان رہتے ہیں، ہر ایک کا اپنا نظریہ ہوتا ہے لیکن دوسرے کے نظریے کا احترام کیا جانا چاہیے تاکہ ہم آسانی کے ساتھ اور احترام کے ساتھ اس دنیا میں رہ سکیں۔ آپ کے خطوط کی دنیا میں پہلے والے ہی احباب نظر آئے زویا صفوان سسپنس ڈائجسٹ کی مستقل قلمکار اور تاریخ کے آئینے میں سے با اختیار اور بے اختیار انسانوں کے واقعات طویل عرصے سے پیش کر رہی ہیں۔ ملتان سے تعلق رکھنے والے عاطر شاہین ”بدقسمتی“ کے عنوان سے ترجمہ تحریر کے ساتھ ڈائجسٹ میں شامل نظر آئے۔ چلتی ٹرین میں اینا کی موت کے بعد شک کسی اور پر جا رہا تھا لیکن تہ در تہ واقعات کے بعد ٹکٹ چیکر آخرکار مشکوک نکلا اور مرد ایسا کیوں کرتے ہیں کہ اگر اولاد نہیں ہوئی تھی تو اس کی جان اس طرح لینے کا حق اسے نہیں تھا بہرحال قاتل اپنا کوئی نہ کوئی سراغ چھوڑ جاتا ہے اور پھر پکڑا جاتا ہے۔ یہی مائیکل کے ساتھ ہوا۔ تازیہ کامران کاشف کا سلسلہ ”رمز شناس“ اپنا ایک سال مکمل کر چکا ہے اور قارئین کو اپنے سحر کا شکار کیے ہوئے ہے۔ دیکھتے ہیں کہ سہ طرفہ ممالک میں چلتی ہوئی یہ کہانی آخر میں کس کروٹ بیٹھتی ہے۔ ”سونے کا راستہ“ مہوش طالب کی تحریر جو ایک برازیلی نوجوان سے متعلق ہے اور وہ اپنی بیوی کے علاج کے لیے تمام تر مشکلات کو گلے لگاتے ہوئے سیکڑوں میل کا سفر کرنے کے باوجود ناکام رہا اور اپنی بیوی کے لیے علاج حاصل نہیں کر سکا اور پھر شاید خود بھی جنگل کی بلاؤں کا شکار ہو گیا۔ سسپنس کا مقبولِ عام سلسلہ جو قانونی کہانیوں سے متعلق ہے اس بار بھی ”پیش کار“ کے عنوان سے شامل تھا۔ ”بلائے ناگہانی“ کے عنوان سے عائشہ نصیر کی مختصر کہانی اور اس میں ایک ایسا شخص قتل کے مقدمے میں ملوث کر دیا گیا جس کا اس کیس کے ساتھ دور دور تک تعلق نہیں تھا لیکن اس کی خوش قسمتی یہ رہی کہ اس کی ایک دوست جو اس پر نظر رکھتی تھی اور اس نے اس کو ایک خاص راستے سے جاتے دیکھ لیا تھا پھر پولیس نے بھی اس کی تصدیق کر لی تو جان بچ گئی۔ ”پختہ عزم“ اے آر راجپوت کی تحریر۔ مشرق اور مغرب دونوں کے سنگم میں لکھی گئی تحریر اور انسان بعض اوقات کسی پر ایسا اندھا اعتماد کرتا ہے کہ جس کے بعد صرف پچھتاوا ہی بچتا ہے۔ محفلِ شعر و سخن میں تمام قارئین کا انتخاب بہت عمدہ رہا۔ جاوید بسام کراچی سے، بہت عمدہ ترجمہ نگار ہیں اور اس بار بھی وہ ”دور دیس کا مہمان“ کے ساتھ نظر آئے۔ ”جنگ باز“ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کا بہترین سلسلہ جس کی 48 ویں قسط یعنی اس کو شائع ہوتے ہوئے چار سال ہو چکے ہیں اور ابھی تک یہ واقعات چلتے جا رہے ہیں۔ معاشرتی ناسوروں کے خلاف لڑنے والے جنگ باز کی یہ داستان نہایت دلچسپی سے بھرپور جا رہی ہے۔ ”زنجیر“ محمد فاروق انجم کے قلم سے لکھی گئی تحریر تھی۔ ”ایک لوہار کی“ آصفہ ضیا احمد کی نہایت دلسوز تحریر تھی۔ ضیا تسنیم بلگرامی اسلامی تاریخ کے مختلف صوفیاء کے تذکرے کے ساتھ میگزین میں شامل ہوتے ہیں اور اس بار ابو علی شفیق بلخی کی زندگی کے احوال کا آخری حصہ شامل رہا۔ ”غلط فہمی“ عمران قریشی کی چشم کشا تحریر رہی۔ ”وہم“ مغربی طرز کی عیوق بخاری کی تحریر جس میں سیلی اپنے معمولاتِ زندگی کو بے جان چیزوں سے نتھی کرنے والی لڑکی ہے لیکن وہ اپنے دوستوں کی وجہ سے بچ گئی۔ ”دیس پردیس“ ناہید اختر سلطانہ کی تحریر کا چوتھا حصہ اس شمارے کی آخری تحریر رہی۔ زندگی رہی تو مارچ کے شمارے پر تبصرے کے ساتھ اسی بزم میں پھر ملاقات ہوگی۔“

اب ان قارئین کے نام جن کے نامے محفل میں شامل نہ ہو سکے۔

فرحان علی، ٹوبہ ٹیک سنگھ۔ ناہید یوسف، اسلام آباد۔ امتیاز احمد، پھالیہ۔ صلاح الدین، میر پور خاص۔ احسان اللہ، بھکر۔

ماضی کا آئینہ۔ بااختیار اور بے اختیار انسانوں کے عبرت اثر واقعات

ظالم مظلوم

زویا صفوان

آخری حصہ

تاریخ نے ثابت کیا ہے کہ جب ظلم حد سے بڑھ جاتا ہے تو مظلوم بھی ظالم بن جاتا ہے لیکن... اس کی شخصیت کے کئی روپ بھی سامنے آتے ہیں... جسے دنیا دیکھ کر حیران رہ جاتی ہے... وہ معصوم بچی جسے اپنے بھگوان سے چھوٹا سا شکوہ تھا کہ اسے حُسن کی ذرا سی خیرات سے بھی ترسادیا... معمولی شکل و صورت کی حامل یہ بچی آگے چل کر کیا قیامت برپا کرسکتی ہے کسی کو خبر نہ تھی... تاریخ میں اس ہستی کا نام پھولن دیوی کے نام سے رقم ہے جسے زمانے کے ظلم و ستم نے اس راہ کا مسافر بنادیا جہاں بچے اپنے بچپن کو بہت پہلے خیرباد کہہ دیتے ہیں... اس نے بھی بہت چھوٹی عمر سے گرم سرد موسموں کا مقابلہ کیا اور ساتھ ہی آنکھوں میں بسنے والے خوابوں کی بھی حفاظت کرتی رہی... اور جب ظلم حد سے سوا ہوا تو اس بچی نے پھولن دیوی کا روپ دھار لیا۔

مان سنگھ کی تجویز نے پھولن کو اُلجھن میں مبتلا کردیا۔

''ایسا کیسے ہوسکتا ہے؟ مجھے تمہاری بات سمجھ نہیں آرہی، کوئی بھی ناری میری جگہ مرنے کے لیے کیسے تیار ہوگی؟''

''بات سمجھنے کی کوشش کرو پھول سنگھ! ایسا کرنا بہت ضروری ہے۔'' مان سنگھ نے بے بسی سے کہا۔

پھولن نے گہری نگاہوں سے اس کی جانب دیکھا اور ایک توقف کے بعد کہنے لگی۔

''تم مجھ سے کیا چھپا رہے ہو مان سنگھ؟ ایسا کیا ہوا ہے جس کی مجھے ابھی تک جانکاری نہیں؟''

''بابا مستقیم پولیس کے ہاتھوں مارا گیا ہے۔'' اس نے بالآخر انکشاف کردیا۔

پھولن چند لمحوں کے لیے سناٹے میں رہ گئی۔

''نہیں...... ایسا نہیں ہوسکتا۔'' وہ بے یقینی سے سر دائیں بائیں جھٹکنے لگی۔

''میں نے خود ریڈیو پر سنا ہے۔'' مان سنگھ نے بوجھل سانس لی۔

''پولیس جھوٹ پھیلانے میں ماہر ہے۔ تمہیں یاد نہیں کہ وکرم کو گولیاں لگنے کے بعد پولیس نے اس کی کسی فرضی لاش کا کریا کرم بھی کروادیا تھا۔'' پھولن مُصر رہی۔

''سچ بھی تو ہوسکتا ہے۔ میرا من کہہ رہا ہے کہ یہ سچ ہی ہے۔'' اس کی آنکھوں میں نمی چھلکی۔

''کسی نے غداری کی ہے۔'' وہ پُریقین تھی۔

''شاید میں جانتا ہوں کہ وہ کون ہے۔'' مان سنگھ نے اپنی بھویں سکیڑیں۔

''یہ سرولی گاؤں کا وہی پنڈت ہے جس کے پاس بابا مستقیم اپنے پیسے رکھواتا تھا۔'' پھولن زہرخند ہوئی۔

مان سنگھ نے اثبات میں سر ہلادیا۔ ستان نامی اس پنڈت نے مستقیم کے ایما پر اسی رقم سے اپنے نام پر چند لاریاں خرید رکھی تھیں۔ بابا مستقیم کے محلے میں پنڈت ہی واحد ہندو تھا، تاہم پھولن کو وہ شخص کبھی بھی ایک آنکھ نہ بھایا تھا۔ اس کی نگاہوں میں کوئی ایسی بات ضرور تھی جو اسے ٹھٹکنے پر مجبور کردیتی۔

''بابا مستقیم کے گاؤں چلنے کا سمے آگیا ہے۔'' پھولن نے ایک توقف کے بعد کہا۔

''اتنی جلدی کوئی فیصلہ نہ کرو، ہمیں وہاں خطرہ ہوسکتا ہے۔'' مان سنگھ نے متنبہ کیا۔

۔ پھولن اپنے فیصلے سے ایک انچ بھی پیچھے ہٹنے کے لیے تیار نہ تھی۔ پنڈت کے دومنزلہ پختہ مکان تک پہنچنے کے دوران ریڈیو پر آئے روز کم وبیش ایک ہی اعلان ہونے لگا۔

''فلاں ڈکیت نے خود کو پولیس کے حوالے کردیا ہے...... فلاں ڈکیت کو مخبری ہونے پر گولی مار کر ہلاک کردیا گیا ہے۔'' ان خبروں کے مطابق اب جنگل میں پھولن دیوی کے گروہ کے سوا کوئی بھی باقی نہیں رہ گیا تھا۔

پنڈت نے ان سب کا خوشدلی سے استقبال کیا اور تازہ دم ہونے کے بعد کھانا لے آیا۔ اس کے بشرے سے افسردگی عیاں تھی۔

''بابا مستقیم کے ساتھ کیا ہوا تھا؟'' پھولن نے بے دلی سے لقمہ توڑا۔

''وہ اپنی بہن سے ملنے دستام پور جارہا تھا۔ اس کے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا، اسی لیے پولیس کے قابو میں آگیا۔ مستقیم کے ساتھ تین آدمی اور بھی تھے، ان کا ڈکیتی سے کوئی سمبندھ نہیں تھا۔ پولیس کہتی پھرتی ہے کہ مقابلہ ہوا تھا، سب مکر کرتے ہیں۔'' اس کی آواز رندھ گئی۔

حاضرین کو گویا سانپ سونگھ گیا۔ ان سبھی کو ایسا محسوس ہورہا تھا گویا ''باپُو'' کے سائے سے محروم ہوگئے ہیں۔ مستقیم ان سے ہمیشہ والد کی طرح شفقت واپنایت سے برتاؤ کرتا تھا۔

''میں تو اناتھ ہی ہوگیا۔'' پنڈت نے ہچکی لی۔ ''تم لوگ مجھے اپنی شرن میں نہیں لے سکتے کیا؟''

پھولن نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ وہ پُرپیچ خیالات میں غلطاں تھی۔ گزشتہ چند ماہ سے حالات بے حد منتشر ہوچکے تھے، انہیں پیسوں کی اشد ضرورت تھی۔ موجودہ حالات کے پیشِ نظر کسی بھی بڑے ڈاکے کا تصور ہی حماقت تھی۔ چھوٹی موٹی لوٹ مار کے نتیجے میں دو وقت کا کھانا اور اسلحے کے اخراجات ہی بمشکل پورے ہوتے۔ سری رام کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں تھی کہ اسے زمین کھاگئی یا آسمان نگل گیا۔ ان حالات وواقعات نے پھولن کی ذہنی پراگندگی میں مزید اضافہ کررکھا تھا۔

''تم لوگوں نے کہاں جانا ہے اب؟'' پنڈت نے کھانے کے بعد استفسار کیا۔

''بابا مستقیم کے پریوار سے ملنا ہے۔'' پھولن نے دانتوں میں پھنسے خوراک کے ذرے اپنے میلے لمبے ناخنوں سے نکالتے ہوئے کہا۔ ''مان سنگھ اور بلادین میرے ساتھ جائیں گے۔ للتو، سبران اور رام شنکر یہیں تمہارے پاس رہیں گے۔''

پھولن کے اس منصوبے پر پنڈت پرسکون ہوگیا۔

تین آدمیوں کی موجودگی کا مطلب یہی تھا کہ وہ اس پر اپنا اعتماد قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ پھولن نے اگلے چند گھنٹے مستقیم کے اہلِ خانہ کے ہمراہ بسر کیے۔ کچھ ہی دیر بعد فضا دودھاکوں کی آواز سے گونج اٹھی۔

''کیا یہاں کسی کا بیاہ ہو رہا ہے؟'' پھولن مضطرب ہوئی۔

مستقیم کا چچازاد منا متوحش انداز میں چھت کی جانب لپکا اور فق رنگت لیے نیچے اتر آیا۔

''پولیس نے گاؤں پر دھاوا بول دیا ہے۔''

پھولن کے وجود میں برق کوند گئی۔ اس نے ایک بڑی سی چادر اوڑھی اور اپنے ہمراہ لائی دوربین سے قرب و جوار کا جائزہ لینے لگی۔ سروتی اور گیلولی گاؤں میں تا حدِ نگاہ پولیس اہلکار دکھائی دے رہے تھے۔ وہ تیزی سے گلیوں، گھروں، صحنوں اور چھتوں پر اپنے مورچے بنا رہے تھے۔

صورتِ حال ہر لمحہ ہلاکت خیزی کی جانب بڑھتی دکھائی دینے لگی۔

☆☆☆

پولیس اہلکاروں کا اعتماد و انداز اس بات کی واضح دلیل تھا کہ وہ کسی کی مخبری کے باعث ہی وہاں پہنچے ہیں۔ یہ کارنامہ پنڈت کے سوا اور کسی کا نہیں ہو سکتا تھا۔ پھولن کا دماغ نہایت تیزی سے کام کر رہا تھا۔ اسی اثنا میں پولیس کے بھونپو سے ایک اعلان ہونے لگا۔

''بھائیو! پھولن دیوی اور اس کے ساتھی تمہارے گاؤں میں چھپے ہیں۔ آپ سب سے بنتی ہے کہ اپنے گھر خالی کر کے گاؤں سے باہر آ جائیں۔ ہر پُرش اور ناری کو گاؤں سے باہر نکلتے ہوئے اپنی شناخت کروانا ہوگی۔''

پھولن دانت پیس کر رہ گئی۔ وہ سب ایک چوہے دان میں پھنسنے والے تھے۔ کچھ ہی لمحوں بعد فضا میں ہیلی کاپٹر کی گڑگڑاہٹ بلند ہونے لگی۔ گاؤں کے مکین ہیجانی کیفیت میں اپنے گھر خالی کرنے لگے۔ مان سنگھ اور بلادین گاؤں سے نکلنے کی راہ تلاشنے میں ناکام ہو چکے تھے۔ گاؤں کی گلیاں باوردی سپاہیوں سے بھری ہوئی تھیں۔

''پھولن دیوی! تم جہاں بھی ہو، ہماری آواز سن رہی ہوگی۔'' بھونپو سے ایک بار پھر اعلان ہوا۔ ''تمہارے تین ساتھی مار دیے گئے ہیں۔ تمہاری بھلائی اسی میں ہے کہ خود کو ہمارے حوالے کر دو۔''

پھولن کی آنکھیں اذیت سے جلنے لگیں۔ پنڈت کی غداری میں اب کوئی شائبہ نہ رہا تھا۔

''بھگوان کرے جگیشور اور کالو سر کھشت ہوں۔''

بلادین نے زیرِ لب دعا کی۔

پھولن کی نگاہیں اپنے ہتھیاروں پر اٹھی تھیں۔ ان کے پاس تین خودکار رائفلیں تھیں۔ بارود کا ذخیرہ بھی تسلی بخش تھا۔ [illegible] تمام گاؤں خالی ہو گیا۔

''پھولن دیوی! تمہارے بچنے کی کوئی جگہ نہیں ہے۔ خود کو پولیس کے حوالے کر دو ورنہ انجام اچھا نہیں ہوگا۔''

اس اعلان کے بعد ایک بار پھر سناٹا چھا گیا۔ پھولن کے پاس اب وہاں سے نکلنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ وہ تینوں ایک گھر سے نکل کر دوسرے گھر میں منتقل ہوتے رہے۔ چھتوں، دیواروں کو پھلانگتے، فائرنگ کا جواب فائرنگ سے دیتے وہ ہر ایک قدم پھونک پھونک کر رکھ رہے تھے۔

پولیس اہلکاروں کی وحشت دوچند ہو گئی تھی۔ وہ ہیلی کاپٹروں سے گرینیڈ گرانے لگے۔ ان تینوں کی مکان در مکان منتقلی سے لمحہ بھر قبل یا بعد میں وہ عمارت گرینیڈ کے حملے سے مسمار ہو جاتی۔ کچھ ہی دیر میں گاؤں میدانِ جنگ کا منظر پیش کرنے لگا۔ پولیس اہلکار ہر اس جگہ گرینیڈ پھینک رہے تھے جہاں سے ایک بھی گولی چلنے کی آواز سنائی دیتی۔ اس بدحواسی میں ان کے اپنے اہلکار بھی زخمی ہونے لگے۔

پھولن، مان سنگھ اور بلادین کبھی صحنوں میں جا چھپتے، کبھی دروازوں کی اوٹ لیتے تو کبھی تنگ گلیوں میں سے راستہ پا کر دیواروں کی آڑ میں کوئی نئی پناہ گاہ ڈھونڈ لیتے۔ پولیس کا براہِ راست سامنا ممکن ہی نہیں تھا۔ وہ اسٹین گن سے لیس درجنوں کی ٹولی میں گھوم رہے تھے۔

اس آنکھ مچولی میں فضا پر شب کی تاریکی چھا گئی۔ وہ ایک ویران اور غیر آباد گھر میں روپوش ہو گئے۔ کچھ ہی دیر بعد بھونپو سے ایک اور اعلان اعصابی شکستگی کا باعث بن گیا۔

''پھولن دیوی! تمہارے پانچ آدمی مار دیے گئے ہیں۔ تم میں سے کوئی بھی نہیں بچ سکے گا۔''

اسی اثنا میں سارا گاؤں روشنی سے منور ہو گیا۔ سرچ لائٹس کی مدد سے تلاشی کا ایک بار پھر آغاز ہو گیا تھا۔ وہ واکی ٹاکی کے ذریعے باہمی رابطے میں تھے۔ ایک دوسرے کی شناخت کے لیے مخصوص کوڈ ورڈز طے شدہ تھے۔ پھولن نے ان کی گفتگو سنتے ہوئے کوڈ ورڈ جاننے کی بھرپور کوشش کی لیکن زبان و لہجے سے ناواقفیت آڑے آ گئی۔ اس کوشش میں کامیابی کی صورت میں وہ اہلکاروں میں مدغم ہو کر بہ آسانی فرار ہو سکتے تھے۔ فی الوقت اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ ایک گھر سے نکل کر دوسرے گھر میں چھپ جائیں۔ پولیس کے کسی بھی مکان سے نکلتے ہی وہ ان کے پیچھے اسی جگہ

جا چھپتے۔ کسی بھی گھر کے محاصرے کی صورت میں وہ ملحقہ دیوار پھلانگ کر دوسرے مکان میں روپوش ہوجاتے۔

اسی کوشش کے دوران وہ ایک ایسے صحن میں پہنچ گئے جہاں درجن بھر اہلکار بیرونی دروازے کے پاس پہلے سے ہی موجود تھے۔ وہ پھولن دیوی کو جی بھر کے کوسنے دے رہے تھے جس کی وجہ سے ان کے بھائی بند بھی غلط فہمی میں مارے جارہے تھے۔ مان سنگھ نے کندھے سے رائفل اتار کر ان کا نشانہ لینا چاہا لیکن پھولن نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا۔ وہ اہلکار گھر سے باہر جانے لگے تو پھولن، بلادین اور مان سنگھ اعتماد سے ان کی ٹولی کا حصہ بن گئے۔ اہلکاروں کے اگلے گھر میں جاتے ہی وہ واپس اسی گھر کے صحن میں چلے آئے۔

روپوشی کا یہ سلسلہ شب بھر جاری رہا۔ پولیس اہلکار کسی بھی سائے کو دیکھتے ہی بلادریغ گولیاں چلادیتے۔ یہ سماعت شکن دھماکے اعصاب میں شدید جھنجھناہٹ پیدا کرنے لگے۔ اگلی صبح پولیس نے بھونپو پر ایک اور اعلان کردیا۔

''پھولن دیوی نے پولیس کی وردی پہن رکھی ہے۔ اس کے سر پر ایک پگڑی بندھی ہے، دوسرے ساتھی بھی وردی کی آڑ میں چھپے ہیں۔ یہ لوگ جہاں بھی نظر آئیں، ہمیں اطلاع دیں۔''

مان سنگھ نے معنی خیزی سے پھولن کی جانب دیکھا۔ خاکی وردی سے خلاصی کا وقت آگیا تھا۔ انہوں نے جان ہتھیلی پر رکھتے ہوئے ایک چبوترے سے مردانہ اور زنانہ کپڑے اتارے اور قریبی کمروں میں جاچھپے۔ پھولن نہایت احتیاط سے ساڑی تلے پیٹی اور اسٹین گن چھپانے لگی۔ اختتامی مراحل میں بیرونی سمت آہٹیں سنائی دیں اور دروازہ دھماکے سے کھول دیا گیا۔

''تم یہاں کیا کررہی ہو؟'' ایک اہلکار نے اسے گھورا۔ ''تم نے سنا نہیں تھا کہ گاؤں والوں کو یہاں سے نکلنے کا آدیش دیا گیا ہے۔''

پھولن مسمسی صورت لیے اس کی جانب دیکھنے لگی۔

''میں...... ڈرگئی تھی...... سمجھ نہیں آیا...... کہاں جاؤں۔''

اسی لمحے ان کے ہاتھ میں پیٹرول کا ایک ڈبا دکھائی دیا۔ وہ یقیناً گھر گھر تلاشی کے دوران مال واسباب لوٹ کر گھر نذرِ آتش کردیتے۔ الزام کا سہرا لامحالہ طور پر پھولن اور اس کے ساتھیوں کے سر سجا دیا جاتا۔ ان اہلکاروں کے روانہ ہوتے ہی فضا میں بارود اور جلنے کی بدبو میں اضافہ ہوگیا۔ گولیوں کی تڑتڑاہٹ، بھونپو سے برآمد ہوتی تنبیہ، جلنے کی بدبو، گرینیڈ پھینکے جانے کے بعد دھماکوں کی مخصوص آوازیں اور روپوشی کی وہ کوششیں ان کے حواس پر جمود طاری کرنے لگیں۔ وحشت اب جنون میں ڈھل رہی تھی۔ فائرنگ سے اٹھتا دھواں حلق میں انگارے بھرنے لگا۔

اس چوہے بلی کے کھیل میں وہ دن بھی بیت گیا۔ مان سنگھ کے اعصاب چٹخنے لگے۔

''ہم خود کو پولیس کے حوالے کردیتے ہیں۔ وہ کئی بار یہ اعلان کرچکے ہیں کہ ہتھیار پھینک دینے پر ہمیں کچھ نہیں کہا جائے گا۔''

''بابا مستقیم کے سامنے بھی یہی چارا ڈالا گیا ہوگا۔'' اس نے سرد مہری سے جواب دیا۔

''پولیس ہر ایک گھر کی دوبارہ تلاشی لے رہی ہے۔ ان کی اور گاڑیاں بھی آئی ہیں۔'' بلادین نے شکستگی سے کہا۔

''اگر کسی نے پولیس کی طرف جانے کی کوشش کرنی چاہی تو میں اسے خود گولی ماردوں گی۔'' پھولن غرائی۔

مان سنگھ اور بلادین بے بسی سے اس کی جانب دیکھ کر رہ گئے۔

''میں نے ایک ٹھکانا ڈھونڈ لیا ہے۔ ہمیں وہاں کوئی نہیں ڈھونڈ سکے گا۔'' وہ پُراعتماد تھی۔

اگلے چند لمحوں میں پھولن مسمار شدہ ملبے پر رینگتے ہوئے انہیں مسجد سے ملحقہ ایک کوٹھری میں لے آئی جہاں بھوسے کے ڈھیر جمع تھے۔ یہ مقام روپوشی کے لیے بہترین ثابت ہوسکتا تھا۔ پولیس اہلکار مسجد کی سمت آنے سے حتی الامکان گریزاں تھے۔ بلادین اور مان سنگھ نے کوٹھری کی دیواروں میں موجود سوراخ کسی نہ کسی طور بند کردیے۔ یہ جگہ اب کسی قبر سے مشابہ محسوس ہونے لگی تھی۔ پولیس اہلکاروں کے ہاتھوں موت کے گھاٹ اترنے سے یہ وقتی اذیت بدرجہا بہتر تھی۔

پھولن کا یہ اندازہ بالکل درست ثابت ہوا۔ پولیس اس کی تلاش میں ہر جگہ ٹامک ٹوئیاں مارتی رہی۔ ناکامی ان کے جنون اور وحشت میں اضافہ کرنے لگی۔ اگلی صبح پھولن کو ان کی سرگرمیوں میں نمایاں کمی محسوس ہوئی۔ اسے علم ہی نہیں تھا کہ دوسری جانب اس کے ایک گرفتار شدہ ساتھی کالو نے شدید زخمی حالت میں پولیس کو گمراہ کُن بیان دیا تھا کہ اس نے پھولن کو جنگل میں فرار کروادیا ہے۔ اس بیان میں چند فرضی سپاہیوں کا حلیہ بھی شامل کردیا۔

اس اعترافِ جرم کے بعد کالو کو عدم کا پروانہ تھما دیا گیا تھا۔ پھولن کے فرار کی خبر نے انہیں شکستگی میں مبتلا

کر دیا۔ گاؤں کے رہائشیوں کا احتجاج بھی بڑھنے لگا۔ انہوں نے پھولن کی تلاش ترک کر دی۔ درجنوں اہلکار بردار گاڑیاں واپس ہولیں۔ ہیلی کاپٹر کی خوفناک گڑگڑاہٹ بھی کہیں سنائی نہ دے رہی تھی۔ کچھ ہی لمحوں بعد بھونپو سے ایک جھنجلائی ہوئی آواز برآمد ہونے لگی۔

’’سب گاؤں والے اپنے گھروں میں لوٹ سکتے ہیں۔ پھولن دیوی فرار ہو چکی ہے۔‘‘

پھولن، مان سنگھ اور بلادین کے ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ رینگ گئی۔ وہ اپنی کمین گاہ سے نکلنے کے لیے مناسب وقت کے منتظر تھے۔ چند لمحوں بعد انہیں قرب وجوار سے متفرق آوازیں سنائی دینے لگیں۔ آہ وفغاں، کوسنے، تڑپ اور اذیت ہر ایک لفظ میں عیاں تھے۔ وہ محنت کش غریب دیہاتی اپنے گھر مسمار ہونے پر بلک رہے تھے۔ پھولن کا دل دکھ سے بھر گیا۔ پنڈت کی مخبری نے سیکڑوں گھر اور مال واسباب نیست ونابود کر دیے تھے۔ پھولن اسے نشانِ عبرت بنا دینا چاہتی تھی لیکن فی الوقت بے بسی وتلملاہٹ برداشت کرنے کے سوا کچھ بھی ممکن نہیں تھا۔

☆☆☆

پولیس کی سرگرمیاں ماند پڑتے ہی وہ تینوں گاؤں سے باہر نکلے اور آخری سرے پر جا پہنچے۔ پولیس کی لاریاں ہنوز مختلف مقامات پر موجود تھیں۔ پھولن، مان سنگھ اور بلادین سر جھوڑائے کھیتوں سے ہوتے ہوئے دریائے جمنا کی طرف بڑھنے لگے۔

دریا پر پہنچ کر انہوں نے بالآخر اپنے سر اٹھائے۔ پولیس کے دستے سڑک پر جا رہے تھے تاہم ان میں سے کسی نے ان کی طرف دھیان نہ دیا۔ وہ اپنے عام سے گندے پھٹے پرانے کپڑوں کے باعث بادی النظر میں غریب کسان محسوس ہو رہے تھے۔ پولیس اہلکاروں کے درمیان سے گزرتے ہوئے دھڑکنیں وحشت سے بے حال تھیں۔ بدن میں ایک عجیب سنسنی اور ٹھنڈک سرایت کر رہی تھی۔ اس لمحے اعتماد اور بے نیازی ہی کارگر ہتھیار ثابت ہو سکتے تھے۔

وہ لمحات اعصاب شکن ہونے کے ساتھ انکشاف سے بھی بھرپور تھے۔ پولیس اہلکاروں کی گفتگو سے علم ہوا کہ وزیراعظم اندرا گاندھی نے بہمائی قتلِ عام کے ڈکیتوں کو کیفرِ کردار تک پہنچانے کی سخت ہدایات دی ہیں۔ مان سنگھ اور بلادین تاسف بھری نظروں سے پھولن کو دیکھنے لگے۔ وہ ان نگاہوں کا مطلب بخوبی سمجھتی تھی۔ پھولن کی ٹھاکروں سے نفرت اور انتقامی روش ہی اس قتلِ عام کا محرک تھی۔

دریا کے کنارے رکتے ہی انہوں نے جی بھر کے پانی پیا اور خود کو تازہ دم کرنے لگے۔ بدن پر پانی کے لمس نے جادوئی اثر کیا۔ انہیں اپنے وجود میں توانائی امڈتی محسوس ہونے لگی۔

’’اب آگے کیا کرنا ہے؟‘‘ مان سنگھ نے دریافت کیا۔

’’پنڈت کی ناک کاٹ کر اسے شگون دینا ہے۔‘‘ وہ بے نیازی سے کہنے لگی۔

مان سنگھ اور بلادین بے بسی سے ایک دوسرے کی جانب دیکھ کر رہ گئے۔

’’ہوش سے کام لو پھولن! یہ سب ایسی بال ہٹ کا نہیں ہے۔‘‘ مان سنگھ جھنجلایا۔ ’’پولیس بھی جانتی ہے کہ تم پنڈت کو سزا دینے ضرور آؤ گی۔ وہ تمہارے سواگت کے لیے پہلے سے ہی تیار بیٹھے ہوں گے۔‘‘

پھولن اپنے ہونٹ بھینچ کر رہ گئی۔ اسے سری رام کے بعد پنڈت کو اپنے ہاتھوں سے جہنم واصل کرنے کی تمنا بے کل کیے ہوئے تھی۔

’’کچھ سے خاموشی سے کہیں چھپے رہنے میں ہمارا کوئی اپمان نہیں ہوگا۔ جان بچانا زیادہ ضروری ہے۔ انتقام بعد میں لے ہی لیں گے۔‘‘ بلادین نے بھی لب کشائی کی۔

’’چھپنے کی کوئی جگہ بھی تو ہو۔‘‘ وہ تڑخ گئی۔

بلادین اور مان سنگھ خاموش ہو گئے۔

☆☆☆

پھولن کی زندگی ایک نئے آزار سے دوچار ہو گئی تھی۔ اسے وکرم کے علاوہ اپنے گروہ کے تمام تر مرحومین کی یاد ستانے لگتی۔ دل ودماغ انہی لمحات میں کھوئے رہنا چاہتے تھے جب وہ بھی جنگل میں خوش باش زندگی گزارتے ہوئے ہر واردات نہایت کامیابی سے سرانجام دیا کرتے تھے۔ اس کے بعد ذہنی رو پولیس کی جانب مبذول ہو جاتی۔ وہ پولیس کو بہرصورت زندہ یا مردہ مطلوب تھی۔ اس پر طے شدہ انعام بھی خطیر تھا۔ حقیقت بہرحال یہ تھی کہ اسے پولیس سے بالکل خوف محسوس نہیں ہوتا تھا۔ وہ اپنے ساتھیوں کی نگاہیں بدلنے اور غداری کی جانب گامزن ہو جانے پر تشویش زدہ رہتی۔

کچھ ہی روز بعد بلادین کچھ سامان لینے کی غرض سے قریبی گاؤں روانہ ہوا اور لوٹ کے ہی نہ آیا۔ مان سنگھ کی خاموشی دبیز افسردگی میں ڈھلنے لگی۔ پھولن بھی خالی الذہنی کے عالم میں خلا میں تکتی رہتی۔ ان دنوں اشیائے خورونوش کا حصول بہت بڑا مسئلہ بننے لگا تھا۔ اپنی عددی تعداد کی وجہ سے وہ کسی بھی گاؤں جانے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے

تھے۔ دھیرے دھیرے نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ وہ کسی بھی ایسے راہگیر کو دبوچ لیتے جس کے پاس کھانے پینے کا معمولی سامان بھی موجود ہوتا تھا۔

مان سنگھ کے مزاج میں تلخی اور بیزاری غالب آنے لگی۔ وہ ان حالات وواقعات کے بعد اعصابی شکستگی کی نہج پر پہنچ چکا تھا۔

''پھولن! یہ سب آخر کب تک چلے گا؟'' اس نے بالآخر خاموشی کا قفل توڑا۔

''حالات جلد بہتر ہوجائیں گے۔'' پھولن نے دلاسا دیا۔

''سپنے دیکھنے چھوڑ دو پھولن! اب تو عقل سے کام لو۔'' وہ کراہا۔

پھولن نظریں چرا کر رہ گئی۔ مان سنگھ زچ ہو کر کہنے لگا۔ ''جنگلوں اور پہاڑی نالوں کی اس بھاگ دوڑ نے تھکا دیا ہے۔ ہم سڑک پر چل نہیں سکتے، سپاہیوں کی نظروں میں آئے بغیر نہا نہیں سکتے۔ مجھے اس جیون میں اب تھوڑی شانتی چاہیے۔''

''کہاں جا کر رہنا چاہتے ہو؟'' اس نے استفسار کیا۔

''ہم دونوں ''براہائی'' چلتے ہیں، وہاں میرا بھائی رہتا ہے۔ وہ ہمیں کچھ سمے کے لیے شرن دے گا۔'' مان سنگھ نے تجویز دی۔

پھولن نے تائیدی انداز میں سر ہلا دیا۔ ضلع الماپی پور کے گاؤں براہائی میں پہنچتے ہی ایک نئی افتاد آ پڑی۔ مان سنگھ کا بھائی اور اہلِ خانہ شب بھر ایک ہی التجا کرتے رہے۔

''خود کو پولیس کے حوالے کر دو۔ ہمیں اب یہاں کسی ڈکیت کی ضرورت نہیں ہے۔''

مان سنگھ اس صورتِ حال پر سخت دباؤ کا شکار تھا۔ اسے گاؤں میں ہی مقیم رہنے پر آمادہ دیکھتے ہوئے پھولن نے اپنی راہیں جدا کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ تنہا ہی جنگل لوٹ آئی۔ اسے شکست کے بارے میں سوچنا ہی وکرم سے بے وفائی محسوس ہوتی تھی۔

☆☆☆

پھولن کی زندگی اب ایک نئے مدار میں داخل ہو چکی تھی۔ وہ بالکل تنہا ہو چکی تھی۔ اس کے معمولات زندگی بھی اب یکسر تبدیل ہو گئے تھے۔ وہ کھیتوں میں کسی بھی کسان سے اپنے لیے اشیائے خورونوش خریدتی اور کسی محفوظ مقام پر پہنچ کر کھانے کے لیے رات بھر سفر کرتی۔ اس کے ساتھیوں میں انسانوں کے بجائے بندر، ریچھ اور جنگلی بلیاں تھیں۔

دھیرے دھیرے وہ اپنی محافظ خود ہی بن گئی۔ اس نے اپنی عقل وفہم کے مطابق بقا کی راہ تلاش کر لی تھی۔

جنگل میں قیام کے دوران وہ جنگلی پھلوں، بیریوں اور نمکین پھلیوں پر گزر بسر کرتی۔ دریا کے شفاف پانی میں نہاتی اور درختوں کے درمیان کسی کھلی جگہ پر نیند سے ہم آغوش ہو جاتی۔ اسی دوران مون سون اختتام پذیر ہو گیا۔ کھیتوں میں جوار اور باجرے کی فصلیں انسانی قد کے برابر ہوتے ہی پانی نایاب ہونے لگا۔ پھولن کے پاس اب اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ چرواہوں سے قریبی کنوئیں کے بارے میں دریافت کر لیتی۔

''کنوؤں سے پانی پینا اب خطرہ بن چکا ہے۔'' کسی چرواہے نے بتایا۔

''کیا ہوا ہے بھیا؟'' اس نے معصومیت سے کہا۔

''ہم نے سنا ہے پولیس نے کنوؤں میں زہر ڈلوا دیا ہے۔ وہ پھولن دیوی اور اس کے ساتھیوں کو زہر دے کر مارنا چاہتی ہے۔''

پھولن اس انکشاف اور پولیس کی سفاکی پر دنگ رہ گئی۔ اسے اس قدر انتہائی قدم کی توقع نہیں تھی۔ اس روز کے بعد وہ مزید محتاط ہو گئی۔ کسی بھی چشمے سے پانی پینے سے قبل مچھلیوں کی حرکات وسکنات کا مشاہدہ لازم تھا۔ اگر یہ مچھلیاں پانی کی مخالف سمت تیر رہی ہوتیں تو اس کی ہلاکت اور پانی کی ضرر رسانی پر مہر تصدیق ثبت ہو جاتی۔ اس کے علاوہ تھوڑی ہی دیر مسافت طے کرنے کے بعد کسی اونچے درخت پر چڑھ کر قرب وجوار کا جائزہ لے لیتی کہ کہیں پولیس کا محاصرہ نہ ہو۔

یہ طویل مسافت آبلہ پائی اور اعصابی پژمردگی میں ڈھلنے لگی تھی۔ وہ وکرم کے بارے میں سوچتی ان کیفیات سے نجات پانے کی کوشش میں ہلکان ہونے لگتی۔ اس سفر در سفر میں وہ اپنے گاؤں کے قریب آ پہنچی۔ ان مانوس راہوں اور بچپن کی سہانی گم گشتہ خوشبو نے اس کی آنکھوں سے آنسو رواں کر دیے۔ وہ اس لمحے خود کو وہی نو سالہ پھولن محسوس کر رہی تھی جو اپنی شادی کے روز بھی کھیل کود کی چاہ میں یہاں چلی آئی تھی۔ وہ کتنی ہی دیر وہاں کھڑی اپنی زندگی کے نشیب وفراز کے متعلق سوچوں میں اُلجھی رہی۔ والدین اور بھائی بہنوں سے ملاقات کی خواہش ضبط کا پیمانہ لبریز کرنے لگی۔

کچھ لمحوں بعد اسے ایک ملاح اپنی جانب آتا دکھائی دیا۔ پھولن نے اسے شناخت کر لیا تھا۔ وہ بیتابی سے اس کی سمت لپکی اور بے ربط تنفس سے گویا ہوئی۔

''مجھے پہچانا تم نے؟''

ملاح نے الجھ کر اس کی جانب دیکھا اور نفی میں سر ہلا دیا۔
”کون ہو تم؟ آج سے پہلے تو کبھی یہاں نہیں دیکھا۔“

پھولن کے اعصاب شل ہونے لگے۔ ملاح کی آنکھوں میں ناشناسائی اور اپنے حلیے کے لیے حقارت دیکھ کر مزید آگے بڑھنے کی تاب نہیں رہی تھی۔

☆☆☆

گاؤں سے روانگی کے بعد مسافت کا سلسلہ ایک بار پھر جاری ہو گیا۔ کئی ماہ سے جنگلی پھلوں پر گزر بسر ہو رہی تھی۔ دال، روٹی، چاول اور گھی تو گویا خواب ہو گئے تھے۔

انہی شب و روز میں اسے ایک شناسا سا آواز نے چونکا دیا۔
”پھول سنگھ! یہ تم ہی ہو نا؟ کہاں کہاں نہیں ڈھونڈا تمہیں۔“

پھولن حیرت و خوشگواریت سے شل ہو گئی۔ اس کے سامنے دو دیرینہ ساتھی منی رام اور چاچا کھڑاگ موجود تھے۔ وہ کتنی ہی دیر اپنے حالات و واقعات کے بارے میں محو گفتگو رہے۔

”مان سنگھ نے خود کو ابھی تک پولیس کے حوالے نہیں کیا ہے۔“ منی رام نے بتایا۔

”میرا وچار ہے کہ ہمیں اسے واپس بلانا چاہیے۔“ کھڑاگ نے تجویز دی۔

پھولن نے تائیدی انداز میں سر ہلا دیا۔ منی رام نے اس کے خاندان کے ایک آدمی کو کھوج نکالا جو ایک نیم کھنڈر مکان میں رہائش پذیر تھا۔ مان سنگھ کے اس چچا سے علم ہوا کہ اپنے بھائی کی پولیس مقابلے میں ہلاکت کے بعد وہ ہتھیار ڈالنے سے گریزاں تھا۔ دیگر اہل خانہ بھی خوفزدہ ہو کر ”اوراِئے“ فرار ہو چکے تھے۔ مان سنگھ کو خدشہ تھا کہ پولیس کے اعلیٰ افسران تک خبر پہنچنے سے قبل ہی مقامی اہلکار اسے کسی فرضی مقابلے میں ہلاک کر دیں گے۔ اس بوڑھے شخص نے انہیں مان سنگھ کی موجودہ کمین گاہ سے آگاہ کیا اور وہ فی الفور اس سے ملاقات کے لیے روانہ ہو گئے۔

مان سنگھ کی آمد پر پھولن نے کسی گلے شکوے سے گریز ہی کیا۔ ایک طویل عرصے تک تنہا رہنے کے بعد وہ انسانوں کے وجود سے اعتبار کھو چکی تھی۔

”تم بہت بہادر ہو پھول سنگھ!“ اس نے پژمردگی سے پھولن کو مخاطب کیا۔ ”تم اکیلے ہی جنگل، ویرانوں میں پھرتی رہیں۔“

”ہاں۔ وکرم سے بے وفائی کے سامنے یہ سفر تو کچھ بھی نہیں تھا۔ وکرم ہر سمے میرے ساتھ ہی تو ہوتا تھا۔“ وہ سپاٹ لہجے میں کہنے لگی۔

”پولیس تمہارے پریوار کو تنگ تو نہیں کرے گی؟“ منی رام نے دریافت کیا۔

”اس نے ہر کسی کو اپنی پڑی ہے۔“ وہ زہرخند ہوا۔ ”میرے ان بہنوں نے ہمیں یہ انجام دیا تھا، وہ مجھے بعد میں یہ سمجھا رہا تھا کہ پھولن اور اس کے ساتھیوں کو مار دوں۔ اس کے بعد پولیس سے رعایت مل جائے گی۔“

”تو شبھ کام میں دیر کیسی؟ مار دو ہمیں۔“ پھولن نے اسے پیشکش کی۔

”مجھے اتنا نیچ سمجھ رکھا ہے کیا؟“ وہ تڑپ گیا۔ ”میں نے تمہیں دل سے اپنی بہن سمجھا تھا۔“

پھولن کے ہونٹوں پر پھیکی مسکراہٹ رینگ گئی۔ وہ مان سنگھ یا کسی کو بھی نہیں بتا سکتی تھی کہ شک کرنا اس کی فطرتِ ثانیہ بن چکی ہے۔

”مجھے کچھ روز پہلے مسلم ملا تھا۔“ اس نے ایک توقف کے بعد بتایا۔

پھولن بے اختیار چونک گئی۔ مسلم، بابا مستقیم کا دیرینہ ساتھی تھا۔

”اسے ترنت یہاں لے آؤ۔“ وہ مصر ہوئی۔

مسلم کی آمد کے بعد ایک اور انکشاف نے انہیں مضطرب کر دیا۔

”پولیس تمہاری تلاش میں پھر سے باؤلی ہو رہی ہے پھولن!“

”اب کیا اپرادھ ہو گیا ہے ہم سے؟“ اس نے تنفر سے کہا۔

”دستام میں بھی بہمائی کی طرح قتل عام ہوا ہے۔ بابا مستقیم کی مخبری کرنے والوں کو انعام دینے کے بہانے ایک جگہ پر اکٹھا کر کے گولیوں سے اڑا دیا گیا۔ پولیس نے اس کا آروپ بھی تم ہی پر لگایا ہے۔“

”کس کا کارنامہ ہے یہ؟“ وہ چونکی۔

”بابا مستقیم کے خاندان سے ہی کچھ لوگوں نے انتقام لیا ہے۔ وہ اپنی برادری اور گاؤں کے لیے مسیحا تھے۔“ مسلم نے افسردگی سے بتایا۔

پھولن گہری سوچ میں غرق ہو گئی۔ بہمائی اور دستار پور کے اس قتلِ عام کے بعد اتر پردیش میں مزید قیام ممکن نہیں رہا تھا۔ مقامی پولیس ان کے خون کی پیاسی ہو چکی تھی۔ پھولن نے فی الفور مدھیہ پردیش منتقلی کا فیصلہ کر لیا۔ وہاں چھوٹے موٹے ڈاکے مارتے ہوئے بنیادی ضروریات پوری کی جا سکتی تھیں۔ اس کے بعد دھیرے دھیرے مکمل

طور پر قدم جمالیے جاتے۔

☆☆☆

مدھیہ پردیش میں قیام کے دوران انہوں نے اپنی وارداتوں کا آغاز ''اغوا'' سے کیا۔ اس کے بعد بسیں روک کر ان میں سوار امیر تاجروں کا مال واسباب لوٹنے لگے۔ کچھ ہی عرصے بعد اس ریاست میں بھی ان کی گرفتاری کے مطالبات بڑھنے لگے۔ ریڈیو سے نشر ہونے والی خبریں مزید تکلیف دہ تھیں۔

ان خبروں کے مطابق دیوی دین اور مولہ کو گرفتار کرلیا گیا تھا۔ وہ ان دونوں کے توسط سے پھولن پر دباؤ بڑھانا چاہتے تھے تاکہ اس کی گرفتاری جلد از جلد ممکن ہوسکے۔ پھولن ذہنی شکستگی محسوس کرنے لگی۔ سری رام کا غیاب بھی اعصاب کے لیے ایک دیرینہ آزار بنا ہوا تھا۔ اپنی رسوائی اور بے آبروئی کے وہ کربناک لمحات یاد آتے ہی رگ وپے میں اذیت کے انگارے چٹخنے لگتے۔ نفرت اور توہین کا الاؤ اس قدر بھڑک جاتا کہ وہ بلاوجہ طیش میں آجاتی۔

گروہ کے اراکین اس کی ذہنی کیفیت سمجھتے ہوئے حتی الامکان تعاون کرتے تھے۔ اس کی دگرگوں ذہنی کیفیت میں پینے کے لیے پانی دیتے تو کبھی چبانے کے لیے پان لے آتے۔ پھولن بے چینی سے ٹہلتی رہتی۔ پان چبانے سے بھی غصہ کم ہوکے نہ دیتا۔ وجود کی گہرائی میں موجزن نفرت اور غصے کو بہرطور اخراج درکار تھا۔ اس صورتِ حال میں ساتھیوں کی گھٹنوں کے بل جھک کر لطیفہ بازی سے ہنسانے کی کوشش بھی کارگر نہ ہوتی۔ سری رام کا تصور اسے شب بھر سونے ہی نہ دیتا۔

کچھ عرصے بعد تقدیر اس پر مہربان ہوگئی۔ اسے ایک روز لالہ رام کی جانب سے خط موصول ہوا۔

''تمہارا دشمن مرگیا ہے۔''

سری رام کی ہلاکت کا یہ مژدہ سن کر وہ سناٹے میں رہ گئی۔ سوختہ وجود میں ٹھنڈک کی پُرسکون لہریں سرایت ہونے لگیں۔

''کہیں یہ اس کی کوئی چال تو نہیں؟'' مان سنگھ بے یقین تھا۔ ''وہ تمہارا دھیان بٹانے کے لیے بھی تو ایسا کہہ سکتا ہے۔''

پھولن نے اس خبر کی تصدیق کروانے کی ٹھان لی۔ ان دونوں بھائیوں میں ایک عورت کے مسئلے پر جھگڑا ہوا تھا جو اس نہج پر پہنچ گیا کہ لالہ رام نے طیش میں آکر اس پر بندوق تان لی۔ سری رام کی وحشیانہ مزاحمت کے بعد وہ اس بندوق سے نکلی گولی کی زد میں آگیا۔

''میں اسے اپنے ہاتھوں سے نرک بھیجنا چاہتی تھی۔'' اس نے آسمان کی جانب دیکھتے ہوئے گہری سانس لی۔

☆☆☆

سری رام کی موت کے بعد پھولن کی جذباتی کیفیت میں ایک نیا تلاطم پیدا ہوگیا۔ اسے بہرصورت کسی بھی دشمن کی ہلاکت درکار تھی۔ اس جذباتی انتشار کا اور کوئی بھی درماں نہیں تھا۔ اسی کیفیت میں اس کی ذہنی رو میادین کی جانب مبذول ہوگئی۔ پھولن نے فی الفور اپنے گاؤں روانگی کا فیصلہ کرلیا۔

میادین کی خوش قسمتی تھی کہ وہ اس روز گاؤں میں موجود ہی نہیں تھا۔ پولیس کو بھی اس کی وہاں آمد کی اطلاع ہوگئی تھی۔ نتیجتاً ایک بھاری نفری نے گاؤں کو اپنے گھیرے میں لے لیا۔ پھولن کے پاس فرار کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

اس ناکامی کا اشتعال اب دوسری سمت مرکوز ہوگیا۔ وہ امیروں سے ان کی دولت چھین کر غریبوں میں تقسیم کردیتی تھی۔ جہیز کی رقم دے کر غریب لڑکیوں کی شادی کا بار اٹھالیتی۔ عصمت کے لٹیروں، زمین پر غاصبانہ قبضہ کرنے والوں اور پولیس کے مخبروں کو نشانِ عبرت بنادیتی۔

اخبارات اور ریڈیو نے خبروں کا بازار گرم کردیا۔ اخباروں میں کئی جھوٹی وارداتیں بھی پھولن سے منسوب ہونے لگیں۔ بعض دوسرے گروہ بھی پھولن دیوی کے نام پر وارداتیں کرتے تھے۔ مان سنگھ، منی رام اور کھڑاگ اس صورتِ حال پر مضطرب تھے۔ ان کے اعصاب ایک بار پھر اسی جذباتی شکستگی کے دہانے پر پہنچ رہے تھے۔ اس کٹھن اور غیر یقینی صورتِ حال میں رگھوناتھ کی آمد خوشگوار حیرت کا سبب بن گئی۔ وکرم کے اس قریبی ساتھی سے پھولن کی خاصی ذہنی ہم آہنگی تھی۔

''تم یہاں کیسے چلے آئے؟'' وہ اسے اپنایت سے کہنے لگی۔

''میں یہاں ایک گاؤں میں کام کے لیے آتا رہتا ہوں۔ تمہارے بارے میں خبریں سنی تھیں کہ یہاں موجود ہو۔ وکرم کی اور بھی یاد آنے لگی۔ یہی سوچتا تھا کہ میری لگن سچی ہوئی تو تم ضرور ملوگی۔'' اس کی آنکھوں سے نمی جھلکنے لگی۔

پھولن کا دل کسی نے مٹھی میں بھینچ لیا۔ اسے ایسا محسوس ہورہا تھا کہ وکرم آج ہی اس سے جدا ہوا ہے۔ رگھوناتھ، بھرت، وارے لال اور دوسرے ساتھیوں کی یاد یکدم ہی حملہ آور ہوگئی تھی۔ جنگل میں گزرے وہ یادگار لمحات دل میں ہوک پیدا کرنے لگے۔

''کیا کام کرتے ہو؟'' اس نے اپنی کیفیت پر قابو پاتے ہوئے دریافت کیا۔

''جو بھی مل جائے۔'' رگھو نے سادگی سے اعتراف کیا۔ ''مزدوری کرلیتا ہوں، لکڑی کا کام بھی سیکھا ہے، کھانا بھی بنالیتا ہوں۔''

پھولن مرعوبیت سے اس کی جانب دیکھنے لگی۔

''تم تو بڑے چھپے رستم نکلے۔''

''میں تمہیں اپنے ہاتھ سے بنی دال کھلاؤں گا، تم انگلیاں چاٹتی رہ جاؤ گی۔ ایک کھاٹ بھی بنا کر رکھی ہے، وہ بھی دکھاؤں گا۔ تمہیں پسند آئے گی۔'' وہ پُرجوش ہوا۔

پھولن نے بلا تامل تائیدی انداز میں سر ہلا دیا۔

☆☆☆

اگلے روز رگھو ناتھ حسبِ وعدہ دال اور کھاٹ لیے چلا آیا۔ اس نے نہایت محبت سے کھاٹ بچھائی اور دال کی کٹوریاں بھی وہیں رکھ دیں۔

''تمہیں یاد ہے پھولن! یہ تڑکے والی دال وکرم کو بھی کتنی پسند تھی؟''

وکرم کی یاد اور اس کی پسندیدہ شے دیکھتے ہی پھولن کو اپنے معدے میں اینٹھن محسوس ہونے لگی۔ اس نے لپک کر پانی کا ایک برتن اٹھایا اور حوائج ضروریہ کے لیے کھیتوں کی سمت چل دی۔ اس کام کی تکمیل سے پہلے ہی وہاں چند قدموں کی آہٹ نے اسے چونکا دیا۔

''دھیان سے چل مورکھ!'' اسے ایک جھنجلائی ہوئی آواز سنائی دی۔

''تم تو ایسے چڑ رہے ہو جیسے پھولن دیوی کے کان ہاتھی جتنے بڑے ہیں۔ وہ اتنی دور سے بھی ہماری آواز سن لے گی۔'' دوسری آواز نے اسے بدکنے پر مجبور کردیا۔

''تمہیں اس چڑیل کا اندازہ ہی نہیں ہے۔ وہ کسی راکھشس سے کم نہیں ہے۔''

''آج اس راکھشس کا آخری دن ہے۔''

پھولن نے صورتِ حال بھانپ لی۔ اسے علم ہوگیا تھا کہ یہ آوازیں پولیس اہلکاروں کی تھیں۔ ان کے ہمراہ یقیناً سیکڑوں بھائی بند بھی موجود ہوتے۔ اس نے فی الفور اوپری سمت سے چکر کاٹتے ہوئے ساتھیوں کو مطلع کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ معدے کی اینٹھن، درد کے بگولے اب کہیں پسِ پشت چلے گئے تھے۔ وہ حتی الامکان برق رفتاری سے ساتھیوں کے پاس پہنچی لیکن بے سود۔ پولیس اہلکار وہاں پہلے ہی موجود تھے۔ اس کے دیکھتے ہی دیکھتے انہوں نے کھاٹ کا نشانہ لے کر گولیاں چلا دیں۔ چند ایک نے مان سنگھ اور دوسرے ساتھیوں کی جانب بندوقیں تان لی تھیں۔

پھولن کو اپنی رائفل کی کمی شدت سے محسوس ہونے لگی۔ اسی لمحے اس کے ذہن میں ایک جھماکا ہوا۔

''پولیس نے وہاں آتے ہی کھاٹ کو نشانہ کیوں بنایا تھا؟''

اس نے بیتابی سے چہار اطراف کا جائزہ لیا۔ مسلم، منی رام، کھڑاگ، مان سنگھ اور دیگر افراد بے جگری سے جوابی فائرنگ کررہے تھے لیکن ان سب میں رگھو ناتھ کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ پھولن کے جبڑے بھنچ گئے۔

''رگھو.....! کتے کے پلے..... تو نے وکرم کا نام لے کر میرے ساتھ وشواس گھات کیا ہے۔ یہ سارے چوہے تیرے ہی دکھائے ہوئے راستے پر یہاں آئے ہیں۔''

وہ لمحات بہت کٹھن تھے۔ پھولن ہمیشہ کسی بھی ساتھی کے دھوکے اور اپنے خلاف کھڑے ہوجانے کی توقع رکھنے کے باوجود اس عملی مظاہرے پر اعصابی شکستگی محسوس کرنے لگی۔ اس دوران اس کے ساتھی بہترین آڑ لینے میں کامیاب ہوچکے تھے۔ انہوں نے پھولن کو بھی دیکھ لیا تھا اور اب وہ اس کے لیے ڈھال بنے آڑ فراہم کرنے لگے۔

''ہم زیادہ دیر تک مقابلہ نہیں کرسکیں گے۔'' مان سنگھ نے متنبہ کیا۔

''ہاں، پولیس اتنی مورکھ بھی نہیں کہ کیول اتنے سے سپاہی بھیج دیے ہوں، ان کے اور بھی چٹی بھائی آتے ہوں گے۔'' پھولن نے تائید کی۔

''یہاں سے نکل چلتے ہیں۔'' مان سنگھ نے حتمی انداز میں کہا۔

''مسلم اور اس کے سب لڑکے آگے ہیں، انہیں بھی ساودھان کرنا ہوگا۔'' وہ مضطرب ہوئی۔ ''ہم کیول اپنی جان بچا کر تو نہیں نکل سکتے۔''

مان سنگھ نے محبت واحترام سے اس کی جانب دیکھا اور ایک پرندے کی مخصوص آواز نکالتے ہوئے مسلم کو فرار کا اشارہ کردیا۔

☆☆☆

جنگل سے فرار کے بعد چند میل کی مسافت ہی طے ہوپائی تھی کہ پولیس کی تازہ کمک آتی دکھائی دی۔ ان کی مخصوص لاریوں میں سیکڑوں باوردی اہلکار تھے۔

''سے پر ہی نکل آئے ہیں۔'' منی رام نے کہا۔

''ہاں، اگر گاؤں میں ہی رہتے تو مقابلہ مشکل ہوجاتا۔'' مان سنگھ نے بوجھل سانس لی۔

پھولن کی ذہنی رو مسلم کی جانب ہی مرکوز تھی۔ وہ جانے وہاں سے فرار ہو پایا تھا یا نہیں؟ اس کے بعد برہنہ پاؤں میں چبھنے والے کانٹے نے مزید تلملا دیا۔ وہ اپنی رائفل، رقم اور جوتے کھاٹ کے پاس ہی چھوڑ آئی تھی۔

اس مسافت کا اختتام دریائے چمبل کے کنارے ایک جنگل میں ہوا۔ گروہ کے ساتھیوں کی ہمت اب شکستہ ہو چکی تھی۔

''پھولن! ہم ایسے کب تک بھاگتے رہیں گے؟'' مان سنگھ نے اپنا دیرینہ سوال دہرایا۔

''جب تک شریر میں آخری سانس سلامت ہے۔'' اس نے صاف گوئی سے کہا۔

''ٹھنڈے دماغ سے کام لو۔ اب تو کسی دشمن سے انتقام کی بھی کوئی مجبوری نہیں ہے۔'' منی رام نے اسے مخاطب کیا۔

''سری رام مر چکا ہے۔ اب تو ہم ہتھیار ڈال سکتے ہیں نا؟'' مان سنگھ نے اسے مزید گھیرا۔

''ایک سری رام کے مر جانے سے کیا ہوتا ہے؟ میں اس سنسار سے ہر ٹھاکر کا سروناش کردوں گی۔'' وہ ہٹ دھرمی سے کہنے لگی۔

''بچوں جیسی باتیں نہ کرو۔'' کھڑاگ نے اپنی عمر کے بھرم میں اسے گھرکا۔ ''یہ مت بھولو کہ پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں۔ کسی بھی نردوش کو مارنا ہمارے اصولوں میں شامل ہی نہیں۔''

''ایک ڈکیت کا یہی جیون ہوتا ہے۔'' مان سنگھ نے گہری سانس لی۔ ''اس کے پاس دو ہی راستے ہوتے ہیں۔ پولیس کے سامنے ہتھیار ڈال دے یا کسی مقابلے میں گولیوں سے چھلنی ہو جائے۔''

پھولن نے اس بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ اس کی فطری ہٹ دھرمی، ضدی مزاج اور قوت ارادی پولیس کے سامنے ہتھیار ڈالنے سے گریزاں تھی۔ کچھ روز بعد مسلم بھی شکستگی اور مایوسی کے عالم میں وہاں چلا آیا۔

''تم اب تک کہاں تھے؟'' پھولن نے مشکوک نظروں سے اسے دیکھا۔

''اپنا بیاہ رچانے گیا تھا۔'' وہ تلخ ہوا۔

''تمہیں کیسے پتا تھا کہ ہم سب یہیں چھپے ہیں؟'' پھولن نے بے یقینی سے دریافت کیا۔

''تم نے ہی تو اس گاؤں میں ایک بار کہا تھا کہ یہاں سے نکل کر چمبل چلے جائیں گے۔'' مسلم اس کے سوالات پر زچ ہونے لگا۔

''یہ بات اور کسے بتا کر آئے ہو؟'' اس نے اپنے ہتھیار پر گرفت مضبوط کی۔

''خدا کا خوف کرو پھولن دیوی!'' مسلم نے اپنے بال نوچے۔ ''میں غدار نہیں ہوں۔''

مان سنگھ نے تاسف سے پھولن کی جانب دیکھا اور قطعیت سے کہنے لگا۔

''بابا مستقیم کا کوئی بھی لڑکا ہمارے ساتھ غداری نہیں کرسکتا۔''

''پھولن! ہمیں ہتھیار ڈال دینے چاہئیں۔ ہم اس چوہے بلی کے کھیل میں کسی نہ کسی دن مارے جائیں گے۔'' مسلم نے بالآخر اپنا مدعا بیان کیا۔

''میں بھی تو اسے یہی سمجھانے کی کوشش کررہا ہوں۔'' مان سنگھ نے کہا۔

''تم لوگوں کو ہتھیار ڈالنے کا اتنا ہی شوق چڑھا ہے تو چلے جاؤ۔ میں اکیلے ہی رہ لوں گی۔ مجھے کسی کی ضرورت نہیں ہے۔'' وہ بھڑک گئی۔

''میں یہ کوشش کر کے ہی یہاں آیا ہوں۔'' مسلم نے اعتراف کیا۔ ''سرکار کہتی ہے، پہلے پھولن دیوی ہتھیار ڈالے گی تو ہماری گرفتاری منظور ہوگی۔''

''مجھے اسی بات کا شک تھا۔'' مان سنگھ مضطرب ہوا۔

''انہیں ہر حال میں پھولن ہی چاہیے۔''

''ہاں، زندہ یا مردہ۔'' اس نے ہیجانی انداز میں کہا۔

''ایک بات اپنے ذہن سے نکال دو۔ وہ پھولن دیوی کو ڈاکوؤں کی ملکہ کبھی بھی نہیں رہنے دیں گے۔ ہتھیار ڈالنے کے بعد کم از کم زندگی تو سلامت رہے گی۔''

پھولن نے بے اعتنائی سے منہ پھیر لیا۔

☆☆☆

کچھ ماہ بعد پھولن کی ملاقات ایک اور گم گشتہ کردار سے ہوگئی۔ بابا گھنشیام کو برسوں بعد اپنے سامنے دیکھ کر اس کے دل و دماغ میں وہی لمحات اجاگر ہوگئے جب وکرم نے بابو گجر سنگھ کا قتل کرنے کے بعد وقتی طور پر بابا گھنشیام سے الحاق کرلیا تھا۔ سیاہ رُو، لمبے بالوں اور بھاری بھرکم جسامت کا حامل گھنشیام اب قدرے بوڑھا دکھائی دینے لگا تھا۔ وہ اپنے بھائی گپرام کے ساتھ وہاں آیا تھا۔

''کیسی ہو میری ننھی کبوتری؟'' اس نے شفقت سے دریافت کیا۔ ''کیا اب بھی دوسروں سے بات کرتے ہوئے ڈرتی ہو؟''

''نہیں۔ اب میں کمزور نہیں رہی۔'' پھولن نے اعتماد

سے جواب دیا۔ ''اب میں دوسروں کو ڈراتی ہوں۔''

بابا گھنشیام کے ہونٹوں پر مسکراہٹ رینگ گئی۔ اس نے ایک توقف کے بعد کہا۔

''آگے کیا کرنا چاہتی ہو؟''

''تمہارے اس سوال کا مجھے یہی مطلب سمجھ آرہا ہے کہ تم بھی ہتھیار ڈالنے کا بھونپو بجانے آئے ہو۔'' وہ رکھائی سے کہنے لگی۔

''کبھی کبھی کسی بڑے نقصان سے بچنے کے لیے چھوٹا نقصان اٹھالینا عقلمند ہونے کی نشانی ہوتا ہے۔'' اس نے رسان سے جواب دیا۔

''میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ ہر کوئی ہتھیار ڈالنے کی ہی بات کیوں کرتا ہے؟ کیا تم سب اتنے بزدل ہوگئے ہو؟'' وہ چیخ گئی۔

''بزدل کوئی بھی نہیں ہے پھولن دیوی!'' اس کی آنکھوں میں طیش کی سرخی جھلکی۔ ''بات اتنی سی ہے کہ بھائی کا قتل عام سرکار کے لیے مصیبت بنا ہوا ہے۔ تم اس پردھان منتری اندرا گاندھی کو نہیں جانتیں۔ وہ اپنی ضد اور ارادوں کی پکی ہے۔ اس نے پورے راجیہ میں ڈاکوؤں کی گرفتاری کا دباؤ ڈالا ہوا ہے۔ تم اگر یہ سمجھتی ہو کہ اس طرح چھپتے چھپاتے سرکار کو بیوقوف بناتی رہو گی تو یہ تمہاری بیوقوفی ہے۔ سرکار تمہیں زمین کھود کر بھی ڈھونڈ نکالے گی۔''

''میں نے تو یہ بھی سنا ہے کہ پولیس والوں کو ایک خاص قسم کی گیس دی گئی ہے، وہ جنگلوں پر چھڑکاؤ کریں گے۔'' گھرام نے لب کشائی کی۔

''تمہیں اگر ہماری بات کا وشواس نہیں ہے تو پارس رام سے مل لو۔'' بابا گھنشیام نے اسے خاموش دیکھ کر رائے دی۔

پھولن کے چہرے پر نیم رضامندی جھلکنے لگی۔

☆☆☆

پارس رام ''بھڈوریا'' گاؤں کا زمیندار اور سرپنچ تھا۔ وہ بہ لحاظ ذات ٹھاکر تھا۔ اس نے فوج میں بھی خدمات سرانجام دی تھیں۔ گاؤں کے کسی بھی کھیا سے دوستی اور ذہنی ہم آہنگی مفقود تھی۔ اس پر اعتماد کے لیے یہی امر کافی تھا کہ وہ وکرم سے ہمیشہ پدرانہ شفقت و محبت کیا کرتا تھا۔ پھولن اس کی دانشمندی اور مثبت سوچ وفکر کی قائل تھی۔

''سمجھ نہیں آرہی کہ تمہیں وکرم کی موت پر گلے لگا کر روؤں یا سری رام کے مرنے پر بدھائی دوں۔'' اس نے کہا۔

''مجھے ایسا لگتا ہے وہ راکھشس اب بھی زندہ ہے۔ ان دونوں بھائیوں نے مل کر اس کی موت کا ناٹک کیا ہے۔'' پھولن نے بے یقینی سے جواب دیا۔

''نہیں۔ یہ بات سچ ہے، میں لالہ رام سے ملا تھا۔ وہ اپنے بھائی کی عورت بازی سے بہت تنگ تھا۔ اس نے جب دوبارہ کسی عورت کے ساتھ ذاتی دشمنی نکالنا چاہی تو لالہ رام نے اسے بہت سمجھایا۔ وہ پہلے ہی تمہارے انتقام سے ڈرا ہوا تھا۔ دونوں بھائیوں کے جھگڑے میں گولی چل گئی۔''

پھولن اس تفصیل پر سر جھٹک کر رہ گئی۔ پارس رام نے ان سب افراد کے لیے ایک متروک قلعے میں رہائش وقیام کا بندوبست کروایا اور تھوڑی ہی دیر میں اشیائے خورونوش کا بندوبست بھی کر دیا۔ طعام سے فراغت کے بعد پھولن اصل مدعا پر آگئی۔ پارس رام نے اس کی تمام ترباتیں توجہ سے سنی اور سنجیدگی سے کہنے لگا۔

''ہتھیار ڈالنا تمہارے لیے اب ایک مجبوری ہے۔ گھنشیام اور گھرام ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ سرکار نے پولیس کو تمہیں مار دینے کے آدیش دے رکھے ہیں۔''

پھولن کو اس جواب کی توقع نہ تھی۔ وہ خاموشی سے اسے دیکھ کر رہ گئی۔

''میں کل صبح تمہاری ایک شخص سے ملاقات کرواتا ہوں۔ اس کے بعد تم خود ہی اپنا فیصلہ بدل لوگی۔'' پارس رام پراعتماد تھا۔

اگلے روز قلعے میں ایک ادھیڑ عمر شخص کی آمد ہوئی۔ پھولن کے ہتھیار بدست ساتھی پیٹ کے بل چٹانوں میں روپوش تھے۔ ان کی انگلیاں گولیاں چلا دینے کے لیے بالکل تیار تھیں۔ پھولن اطمینان سے نووارد کا جائزہ لینے لگی۔ اس کی آنکھوں میں عیارانہ چمک تھی۔

''میرا نام راجندر چترویدی ہے۔ سمبندھ کشمیر سے ہے۔ فوج میں کام کرتا تھا۔''

''پارس رام! کیا تم نے مجھے چھوٹی بچی سمجھ رکھا ہے؟'' پھولن نے اسے نظر انداز کرتے ہوئے پارس کو مخاطب کیا۔

راجندر کے ہونٹوں پر ایک گہری مسکراہٹ جھلکنے لگی۔

''تمہاری جیبوں اور تھیلے میں تو کچھ نہیں ہے؟'' اس نے اگلا سوال کیا۔

راجندر نے سامان نکال کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ اس سامان میں ٹیپ ریکارڈر اور کیمرا دیکھ کر پھولن الجھ گئی تاہم ریوالور کی ساخت انجان نہیں تھی۔

''کون ہو تم؟'' وہ بدک گئی۔

''پترکار ہوں۔'' اس نے سنبھل کر کہا۔

''نہیں، تم ایک پولیس والے ہو۔'' پھولن نے قطعیت سے کہا۔
راجندر کی مسکراہٹ مزید گہری ہوگئی۔ پارس رام نے ان دونوں کے لیے کھانا لگوا دیا۔
''تمہاری نظر بڑی تیز ہے۔'' راجندر نے کہا۔ ''میرا تعلق پولیس سے ہی ہے۔''
''اب میں تم پر وشواس نہیں کرسکتی۔'' پھولن نے کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا۔
''میں تمہاری بھلائی کے لیے ہی بات کرنے آیا ہوں۔'' وہ سنجیدگی سے کہنے لگا۔ ''سرکار نے تمہارے خلاف بہت سخت احکامات دے رکھے ہیں۔''
''میں نے سرکار کی دم پر کب پاؤں رکھا ہے؟'' پھولن بھڑک گئی۔
''تم نے بہمائی میں جن ٹھاکروں کی ہتھیا کی تھی، ان میں سے کسی کا رشتے دار فوج میں ہے، کسی کا کوئی رشتے دار سرکار سے بہت قریب ہے تو کوئی پولیس میں ہے۔ تم نے دم پر پاؤں نہیں رکھا پھولن دیوی! ایک سوئے ہوئے شیر کو جگا دیا ہے۔'' اس نے معنی خیزی سے کہا۔
پھولن اس بات پر سناٹے میں رہ گئی۔ اس نے ایسے پہلو سے تو سوچا ہی نہیں تھا۔ ٹھاکروں سے اس کی دشمنی کسی سے بھی ڈھکی چھپی نہیں تھی۔ ان مقتولین کے ورثاء میں مقتدر افراد نے ہی اس کا ناطقہ بند کر رکھا تھا۔
''ہتھیار ڈالنے کے بارے میں سوچو اب۔ اس طرح کب تک بھاگتی رہوگی؟'' راجندر نے نرمی سے کہا۔ ''اتر پردیش میں تو تمہیں دیکھتے ہی گولی مارنے کا آدیش دیا ہے۔ مدھیہ پردیش میں تمہارے لیے پھر بھی کوئی نہ کوئی راستہ موجود رہے گا۔''
پھولن کا ذہن جامد ہوگیا۔ اسے اس لمحے شدت سے وکرم کی کمی محسوس ہو رہی تھی۔ وکرم نے اسے ایک ڈکیت کی زندگی اور مسائل کے متعلق ہر ایک بات سمجھائی تھی لیکن ہتھیار ڈالنے کے بارے میں کبھی کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ پھولن کو یاد تھا کہ اس نے آخری ایام میں دریا کے کنارے بیٹھے نہایت آزردگی سے ایک خواہش کا اظہار کیا تھا کہ سری رام سے پیسا واپس لیتے ہی وہ خود کو پھولن کے ساتھ پولیس کے حوالے کردے گا۔
راجندر نے اسے اُلجھن میں مبتلا دیکھ کر اپنے ہاتھوں کو ایک خفیف حرکت دی۔ پھولن کسی نامانوس احساس کے تحت چونک گئی۔
''یہ سامان کس لیے لے کر آئے تھے؟'' اس نے تندی سے کہا۔
''میں تمہارا انٹرویو لے کر ایک تصویر بھی اتارنا چاہتا تھا۔'' راجندر نے سادگی سے بتایا۔
تصویر کا ذکر سنتے ہی پھولن کے وجود میں برق کوند گئی۔ وکرم اور اس کے سبھی ساتھی تصویر کے معاملے میں بہت محتاط رہتے تھے۔ راجندر نے ایک بار پھر موضوعِ گفتگو تبدیل کردیا۔
''تم چاہو تو میں اپنے افسروں سے سارے معاملات طے کرسکتا ہوں۔''
''میرا پریوار اتر پردیش میں ہے۔ ان کی رکھشا کون کرے گا؟'' اس نے تلخی سے کہا۔
''میں سب کچھ سنبھال لوں گا، انہیں کچھ نہیں ہوگا۔'' وہ رسان سے گویا ہوا۔
''جیسے بابا مستقیم کی پتنی کی رکھشا ہوئی تھی۔'' پھولن زہر خند ہوئی۔
مستقیم کی بیوی کے ساتھ پولیس اہلکاروں نے نہایت ناروا سلوک کیا تھا۔ اسے بھی برہنہ حالت میں ایک بیل گاڑی پر بٹھا کر دربدر پھرایا گیا تھا۔ اس عورت کا شوہر کی ڈاکا زنی سے بالکل کوئی تعلق نہیں تھا۔
راجندر، پھولن کے اس طنز پر کھسیا گیا تاہم خود کو سنبھالتے ہوئے کہنے لگا۔
''تمہیں کسی نہ کسی پر تو وشواس کرنا ہی ہوگا۔ اگر تم ہتھیار ڈالوگی تو سرکار تمہاری شرطیں بھی مان لے گی۔ تم اپنے پریوار کے لیے کوئی زمین یا نوکری کی مانگ رکھ سکتی ہو۔ اس طرح بلی چوہے کے کھیل میں ماری گئیں تو تمہارے پریوار کا کیا ہوگا؟''
پھولن اس بات پر مزید الجھ گئی۔ یہ نکتہ کہیں نہ کہیں اس کے دل کو لگا تھا، تاہم اس کی ازلی ہٹ دھرمی اور منتقم مزاجی ہتھیار ڈالنے کو اپنی شکست گردان رہی تھی۔
یہ گفتگو کچھ دیر یونہی جاری رہی۔ پارس رام کو بھی پہلی بار پھولن کے خول میں دراڑ محسوس ہونے لگی۔ اس نے صبر کا دامن تھامے رکھا۔ سہ پہر ڈھلتے ہی موسم کا مزاج خطرناک ہونے لگا۔ راجندر نے ان دونوں سے رخصت طلب کی۔ پھولن نے اپنے روپوش ساتھیوں کو بھی مخصوص اشارہ کردیا۔ وہ اسے اپنی حفاظت میں اس کی گاڑی تک چھوڑ آئے۔
گاڑی پہاڑی ٹیلوں سے بہت دور نشیب میں کھڑی تھی۔
اس شب پھولن بہت مضطرب تھی۔ تنہا اور مضبوط رہنے کی ضرورت اب اسے کہیں نہ کہیں تھکانے لگی تھی۔ اہلِ

خانہ کی زندگیاں سنور جانے کا خیال بھی دل کے بند کواڑوں پر دستک دے رہا تھا۔ ان سوچوں سے اُلجھتی وہ بالآخر نیند سے ہم آغوش ہوگئی۔

☆☆☆

کچھ روز بعد مان سنگھ ایک قریبی گاؤں سے واپس آیا تو اس کا چہرہ ستا ہوا تھا۔ اس نے سرد مہری سے پھولن کی جانب دیکھا اور ایک اخبار اس کے سامنے پٹخ دیا۔

''یہ کیا ہے؟'' پھولن کو اس کی حرکت پرا چنبھا ہوا۔

''تمہاری مرضی کا نتیجہ ہے۔ اپنی آنکھوں سے دیکھ لو۔'' اس نے تلخی سے کہا۔

پھولن نے اُلجھتے ہوئے اخبار تھاما اور اپنی تصویر دیکھ کر حواس باختہ ہوگئی۔ اس کے ساتھ ہی ایک دوسری تصویر میں باقی سب ساتھی بھی دکھائی دے رہے تھے۔ راجندر نے اپنے ہاتھ کی صفائی سے ہی یہ کارنامہ انجام دیا تھا۔

''کیا لکھا ہے یہ؟'' اس نے ملحقہ عبارت کی سمت اشارہ کیا۔

''پھولن دیوی ایک اچھی عورت ہے، میں اسے ہتھیار ڈالنے پر آمادہ کرنے کے لیے پوری کوشش کروں گا......راجندر چترویدی۔'' مان سنگھ نے ہر ایک لفظ چباتے ہوئے کہا۔

''تم لوگ بھی تو یہی چاہتے تھے، اب اتنی تڑتڑ کیوں کر رہے ہو؟'' وہ بھنا گئی۔

''پھولن دیوی! تم کبھی کبھی چڑیا کیوں ہو جاتی ہو؟'' مان سنگھ زچ ہوا۔ ''ان تصویروں کا مطلب سمجھتی ہو؟ اب ہر گاؤں، بس اڈوں، ریلوے اسٹیشن کی ہر ایک دیوار پر یہی نظر آئیں گی۔''

اس تلخ حقیقت نے پھولن کو شل کر دیا۔

''ہم سب کے جیون خطرے میں ہیں۔'' منی رام کہنے لگا۔

پھولن نے لمحہ بھر کے لیے توقف کیا اور قطعیت سے کہنے لگی۔

''سامان تیار کرلو۔ ہم اتر پردیش جائیں گے۔''

اس کے ساتھی بے بسی اور طیش سے اسے دیکھ کر رہ گئے۔

☆☆☆

اتر پردیش کا سفر بے حد دشوار گزار ثابت ہوا۔ چند ہفتوں بعد وہ ''امبا پور'' نامی ایک گاؤں میں پہنچ گئے۔ کچھ روز بعد یہاں بھی ایک پولیس اہلکار نے اسے تلاش کرلیا۔ وہ اپنے ہمراہ مولہ اور شیو نارائن کو بھی لے آیا تھا۔

پھولن نے اپنی ماں کو کم از کم دو برس بعد دیکھا تھا۔ اس کے وجود میں گداز کے بجائے طیش ہلکورے لینے لگا۔

''کیوں آئی ہو تم یہاں؟'' وہ دہاڑی۔

''پھولن! میری بچی، ان کی بات سن لو۔ ایک بار سن لو بس۔'' اس نے اپنے ساتھ کھڑے آدمی کی سمت اشارہ کیا۔

''یہ بھی وہی بھونپو بجانے آیا ہوگا۔'' پھولن نے تنفر سے اسے دیکھا۔

''یہ ضمانت دے رہا ہے کہ تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔'' مولہ مصر رہی۔

اسی لمحے شیو نارائن بے اختیار آگے بڑھ کر بہن سے لپٹ گیا۔ پھولن کا وجود یکدم پگھل گیا۔ شیو نارائن جوانی کی دہلیز پر قدم رکھ رہا تھا۔ اس کی روشن آنکھوں میں ذہانت کی چمک تھی۔ اس نے پھولن سے سرگوشی میں کہا۔

''ان کی باتوں میں نہ آنا، ان سب کے دلوں میں میل ہے۔''

شیو نارائن کے پیچھے ہٹتے ہی پھولن خود کو متوازن اور پُرسکون رکھنے کی کوشش کرنے لگی۔ پولیس اہلکار نے اعتماد سے کہا۔

''ہم نے اتر پردیش کے مکھیا منتری سے بات کرلی ہے۔ انہوں نے تمہارے پریوار کو وچن دیا ہے کہ تمہارے ہتھیار ڈال دینے کی صورت میں ان سب کو سو بیگھے زمین دی جائے گی۔ ان سب کے لیے نوکری کا بندوبست بھی کیا جائے گا۔ مکھیا منتری نے یہ بھی وچن دیا ہے کہ تمہیں آٹھ سال بعد جیل سے رہا کردیں گے۔ اس کے بعد تم ایک عام ناگرک کی طرح زندگی بسر کرسکو گی۔''

شیو نارائن نے اسے آنکھوں سے خفیف اشارہ کیا اور ایک جانب لے جاتے ہوئے کہنے لگا۔

''ان کی کسی بھی بات پر وشواس نہ کرنا دیدی! یہ لوگ شوی رام ڈکیت کی طرح تمہیں بھی مار دیں گے۔ اس نے بھی ہتھیار پھینک کر اپنے ہاتھ اوپر کیے تھے، پولیس نے اسے گولیوں سے بھون دیا۔''

پھولن اپنے بھائی کی اس تشویش اور حقیقت پسندی پر بسیج کر رہ گئی۔ اس نے فی الفور مدھیہ پردیش منتقلی کا فیصلہ کرلیا۔

☆☆☆

پھولن کے ساتھی اس کے پے در پے ذہنی تغیرات اور ہٹ دھرمی سے عاجز آنے لگے تھے۔ ان سبھی نے ذہنی طور پر شکست تسلیم کرتے ہوئے ہتھیار ڈالنے کا فیصلہ کرلیا تھا لیکن ایک مجبوری ہر بار آڑے آجاتی۔ اعلیٰ انتظامیہ کو بہر صورت

پھولن بھی درکار تھی۔ پھولن کی دہشت اور دباؤ اس قدر شدید تھا کہ اس کے تنہا رہنے کی صورت میں بھی کوئی نہ کوئی نیا گروہ تشکیل پا جانے کے تحفظات اور اندیشے برقرار تھے۔

مدھیہ پردیش پہنچتے ہی پھولن نے پارس رام کے توسط سے راجندر چترویدی سے رابطہ کیا اور اس کی آمد کے بعد دو ٹوک کہنے لگی۔

''تم نے اپنے افسروں سے بات کر لی ہے کیا؟''

''ہاں، کر لی ہے۔ مجھے کھیا منتری ارجن سنگھ نے بھی بلایا تھا۔ وہ پردھان منتری کے حکم پر کام کر رہے ہیں۔''

''میں پردھان منتری سے ملنا چاہتی ہوں۔ سنا ہے وہ بھی ایک عورت ہے۔'' پھولن نے مطالبہ کیا۔

''ایسا تو نہیں ہو سکتا۔'' وہ پُرسوچ انداز میں کہنے لگا۔ ''اگر تم چاہو تو میں کھیا منتری سے تمہاری ملاقات کروا دوں گا۔ دونوں نیتاؤں نے تمہاری جان کی ضمانت دے رکھی ہے۔''

''اور میرا پریوار؟'' اس نے اگلا سوال کیا۔

''وہ بھی یہاں آ سکتے ہیں۔'' راجندر نے بلا تامل جواب دیا۔

''میں آٹھ برس سے زیادہ جیل میں نہیں رہوں گی۔'' اس نے متنبہ کیا۔

''ٹھیک ہے، میں یہ بات بھی طے کروا لوں گا۔'' وہ پُراعتماد تھا۔

''میں سوچنے کے لیے تھوڑا اور سمے چاہتی ہوں۔'' پھولن نے تذبذب سے کہا۔

''سمے ہی تو نہیں ہے پھولن دیوی!'' وہ گمبھیر انداز میں کہنے لگا۔ ''تمہیں اتر پردیش کی پولیس کا اندازہ نہیں ہے۔ وہ لوگ تمہیں کچا چبا جانے کے لیے تیار بیٹھے ہیں۔ انہیں اس بات پر بھی غصہ ہے کہ ہم دوسرے راجیہ والے ان کے معاملات میں کیوں دخل دے رہے ہیں۔ وہ سارے ڈکیتوں کو مار دینا چاہتے ہیں۔''

پھولن کا ذہن ایک دفعہ پھر جمود کا شکار ہو گیا۔ کچھ روز بعد راجندر وزیر اعلیٰ کے خصوصی ایلچی کو بھی اپنے ہمراہ لے آیا۔ رام شنکر سنگھ نامی اس شخص نے متانت سے اسے اپنے مطالبات ٹیپ ریکارڈر میں ریکارڈ کروانے کی التجا کی۔ پھولن نے اپنے ساتھیوں کی مشاورت سے چند نکات پہلے ہی طے کر لیے تھے۔ وہ رواں انداز میں اعتماد سے کہنے لگی۔

☆ ہمیں پھانسی نہیں دی جائے گی۔

☆ ہم پر مدھیہ پردیش کے علاوہ کہیں اور مقدمہ نہیں چلایا جائے گا۔

☆ ہمیں آٹھ برس سے زیادہ جیل میں نہیں رکھا جائے گا۔

☆ ہمارے پریواروں کی سُرکھشا کے لیے انہیں ہتھیاروں کا لائسنس دیا جائے گا۔

☆ ہمیں زمین اور روزگار فراہم کیا جائے گا۔

☆ تمام مطالبے سرکاری کاغذ پر لکھے جائیں گے۔

رام شنکر نے ٹیپ ریکارڈر بند کیا اور پیشہ ورانہ انداز میں کہنے لگا۔

''سرکار تک یہ سارا معاملہ پہنچانے اور طے کرنے میں کچھ سمے لگ سکتا ہے۔''

پھولن یکلخت خود کو بے حد تنہا محسوس کرنے لگی۔ وہ اپنی زندگی کا سب سے بڑا جوا کھیلنے کے بعد فطری طور پر ہی تذبذب کا شکار تھی۔ سرکاری کاغذات کی تیاری میں تقریباً دو ماہ کا عرصہ بیت گیا۔ پھولن نے دستخط کی جگہ اپنے انگوٹھے کا نشان ثبت کر دیا۔

☆☆☆

ایک ہفتے بعد ان سب افراد کو گاڑی میں بٹھا کر ایک عمارت تک لایا گیا۔ وہ گاڑی سے نیچے اترے اور مختلف کمروں سے گزرتے ہوئے ایک بڑے خالی ہال میں پہنچ گئے جہاں مزید کئی افراد موجود تھے۔

''کھیا منتری کچھ دیر تک یہاں پہنچ جائیں گے۔ یہاں غسل خانوں میں تم سب کے لیے کپڑے بھی تیار ہیں۔ جب تم لوگوں کو کھیا منتری کے سامنے پیش کیا جائے گا تو انہیں دونوں ہاتھ جوڑ کر پرنام کرنا اور اپنے ہتھیار ان کے حوالے کر دینا۔''

پھولن نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس نے غسل خانے میں اپنا لباس تبدیل کیا۔ مخصوص وردی میں بسی ہوئی جنگل کی مہک خود سے دور جاتی محسوس ہوئی تو دھڑکنیں منتشر ہونے لگیں۔ پسینے اور آزادی کی باس سے مبرّا لباس بے حد اجنبی محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے کپکپاتے ہاتھوں سے بالوں میں کنگھی کی اور پیشانی پر سرخ پٹی باندھنے کے بعد چہرے پر ٹھنڈے پانی کے چھپاکے مارنے لگی۔

بیرونی سمت بے حد شور و غل تھا۔ وزیر اعلیٰ کی گاڑی میں آمد پر کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ راجندر نے اسے رائفل تھمائی اور ایک بار پھر اپنی ہدایات دہرانے لگا۔ کچھ دیر بعد انہیں ایک بلند چبوترے پر لے جایا گیا۔ پھولن نے اپنی زندگی میں اتنا ہجوم پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ دوپہر کا سورج تمازت سے بھرپور تھا۔ چبوترے پر ایک

جانب تین بڑی تصویریں تھیں۔ پہلی تصویر ڈاکوؤں کے لیے ہتھیار ڈالنے کی مہم کا بانی ''ونوبا بھاوے'' تھا۔ دوسری تصویر ''مہاتما گاندھی'' جبکہ تیسری شبیہہ درگا دیوی کی تھی۔

دوسری جانب ایک قطار میں سرکاری افسران بیٹھے تھے۔ پھولن کا تنفس غیر متوازن ہونے لگا۔ اسی لمحے فضا میں ایک آواز گونجی۔

''اب پھولن دیوی ہتھیار ڈالے گی۔ سرکار نے اس کی شرطیں مان لی ہیں۔''

ایک پولیس افسر آگے بڑھا اور اسے وزیر اعلیٰ کے سامنے لے آیا۔ پھولن نے اپنے دونوں ہاتھ جوڑے اور رائفل نیچے رکھ دی۔ کچھ دیر بعد بابا گھنشیام اور مسلم نے بھی اپنے ساتھیوں کے ہمراہ یہی عمل دہرایا۔

پھولن دیوی کو سخت حفاظتی حصار میں گوالیار جیل منتقل کر دیا گیا۔

☆☆☆

جیل کے دیوہیکل آہنی دروازے اور چاروں طرف سرخ اینٹوں کی بڑی بڑی دیواریں وحشت انگیز تھیں۔

''تم یہ چاقو اپنے ساتھ نہیں لے جاسکتیں۔'' ایک محافظ نے اسے روک لیا۔

''کیوں نہیں لے جاسکتی؟ میں جب ذرا چلنے پھرنے کے لیے باہر نکلوں گی تو اپنی سرکشا کروں گی۔''

پھولن کے اس جواب پر محافظ استہزائیہ نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا۔ پھولن نے تقریب میں بھی یہ چاقو وزیر اعلیٰ کے سامنے پیش کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

''ہونہہ! نام بڑے درشن چھوٹے۔'' وہ تمسخر سے مسکرایا۔

پھولن دیوی کی دہشت وسفاکی کے قصے سننے کے بعد اپنے مقابل ایک دھان پان سی کم عمر لڑکی کی دید نہایت حیران کن تھی۔ بحث ومباحثہ اور سمجھانے بجھانے کے بعد چاقو واپس لے لیا گیا۔ اس کے بعد اسے جیل کے ایک اور حصے میں لے جایا گیا۔ یہاں مختلف ہال موجود تھے جہاں مختلف گروہوں کے سردار اپنے ساتھیوں کے ہمراہ موجود تھے۔ وہ سب پھولن کو دیکھتے ہوئے بہ آواز بلند نعرے بلند کرنے لگے۔

''پھولن دیوی کی جے...... پھولن دیوی کی جے!''

یہ نعرے اس کی سماعت میں شہد گھولنے لگے۔ اپنے لیے مختص جگہ پر پہنچ کر وہ مضطرب نگاہوں سے ہر ایک شے کا جائزہ لینے لگی۔ ایک کونے میں لوہے کے اسپرنگوں والا پلنگ تھا جس پر ایک گدا اور چادر پڑی تھی۔ وہ خالی الذہنی کے عالم میں فرش پر ہی اکڑوں بیٹھ گئی۔

اگلی صبح کا آغاز ہوتے ہی سب قیدیوں کو یکے بعد دیگرے بیت الخلا کی جانب لے جایا گیا۔ وہاں تعفن اور غلاظت کی بھرمار تھی۔ پھولن برہنہ پاؤں خود کو پھسلنے سے بچانے میں ہلکان ہونے لگی۔ تعفن سے سانس روکنا مزید دشوار تر تھا۔ کچھ دیر بعد چند قیدیوں کو بیت الخلا کی صفائی پر مامور کر دیا گیا۔ انہوں نے تمام تر غلاظت اٹھا کر ایک بالٹی میں ڈالی اور اسے باہر گڑھے میں پھینک دیا۔ اب وہ کراہت آمیز بدبو صحن میں بھی پھیل گئی تھی۔

اس بدبو کا تعفن ختم نہ ہونے پایا تھا کہ کھانا دیکھ کر طبیعت مزید عود آیا۔ سیاہ روٹیوں کا ذائقہ ایسا تھا جیسے آٹے میں ریت ملا کر پیس دی گئی ہو۔ دال بھی سیاہ اور بدمزہ تھی۔ گھی کا کہیں نام ونشان نہیں تھا۔ بدبودار تیل سے دل ایک بار پھر متلانے لگا۔ اس پر مستزاد چائے کا ذائقہ جمنا کے اس پانی جیسا تھا جس میں بارشوں کی گاد شامل ہوتی ہے۔ پھولن نے اس سے قبل چائے کبھی نہ پی تھی۔ اس نے برتنوں کو ٹھوکر سے پیچھے ہٹا دیا۔

جیل کی پہلی صبح خالی پیٹ ہی بیت گئی۔

☆☆☆

کچھ روز بعد جیل میں صحافیوں کی آمد ہونے لگی۔ وہ اس سے ملاقات اور تصویریں لینے کے لیے بیتاب رہتے۔ انہیں پھولن کی مضحکہ خیز تصویریں درکار ہوتیں۔ اگر وہ کھجاتی تو تصویر کھینچ لی جاتی، غصے میں گالیاں دینے پر بھی تصویریں بنالی جاتیں۔ وہ ان پر جھپٹتے ہوئے کیمرے چھین لیتی۔ کیمرے کی مخصوص کلک سنائی دیتے ہی بپھری ہوئی شیرنی بن جاتی۔

صحافیوں کی آمد ورفت میں کمی ہوئی تو ایک روز اشوک کمار نامی کوئی شخص اس سے ملاقات کے لیے چلا آیا۔ وہ پھولن دیوی کی زندگی پر ایک فلم بنانا چاہتا تھا۔ اسے جیل میں تشدد کے مناظر عکس بند کرنا تھے۔ اس نے فلم کی تصویریں دکھانا شروع کیں۔ پھولن اس پر جھپٹی اور کالر سے پکڑ کر جھٹکے دینے لگی۔

''تمہاری ہمت کیسے ہوئی؟ تم میرے نام پر کاروبار کرنا چاہتے ہو؟''

''تم فلموں کے بارے میں کیا جانتی ہو؟'' اشوک نے مزاحمت کرتے ہوئے اسے پیچھے دھکیلا۔

''سب جانتی ہوں میں۔ تم نے مجھے جانور سمجھ رکھا ہے کیا؟'' وہ مزید بھڑکی۔

''میں نے ایسا کب کہا ہے؟ تمہارے ساتھ ہوئے اتیاچار کے متعلق اس سنسار کو بھی تو جانکاری ہونی چاہیے۔''

اس نے سمجھانا چاہا۔
"تم مجھے تماشا بنانا چاہتے ہو؟ مجھے سارے سنسار میں بدنام کرنا چاہتے ہو؟" وہ بے قابو ہونے لگی۔
پھولن کو کچھ روز پہلے ہی چند قیدیوں کی گفتگو سے علم ہوا تھا کہ فلم جھوٹ کا پلندا ہوتی ہے۔ اس میں دکھائی گئی غلط باتوں کو بھی عوام سچ سمجھ لیتے ہیں۔ اشوک نے بمشکل اپنی جان خلاصی کروائی اور سر پر پاؤں رکھے بھاگ گیا۔

☆☆☆

صحافیوں اور دیگر افراد کی آمد کا سلسلہ کم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ کچھ دن بعد اس کے اہلِ خانہ بھی ملاقات کے لیے چلے آئے۔ مولہ اور دیوی دین روزِ اول کی طرح شکستہ، بدحال اور پژمردہ دکھائی دے رہے تھے۔ پھولن انہیں دیکھتے ہی تاسف سے کہنے لگی۔
"میں تم لوگوں کے کارن یہاں پہنچی ہوں۔ جنگل کی آزاد اور تازہ ہوا، کھلی زندگی چھوڑ کر اس بدبو اور گندگی میں سانس لیتی ہوں۔ جانوروں سے بھی بدتر کھانا کھاتی ہوں، سر جھکا کر رہنا پڑتا ہے۔ تم لوگوں کے کارن میں ایک تماشا بن کر رہ گئی ہوں۔ مجھے جنم ہی کیوں دیا تھا؟ اس سے ہی مار دیا ہوتا۔"
مولہ اور دیوی دین کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ انہوں نے اپنی اس اولاد کے ہاتھوں بہت زک اٹھائی تھی۔ اس پر ٹوٹنے والی قیامت کا کرب لمحہ بہ لمحہ خود بھی جھیلا تھا۔
"میری بچی! ہم تو کیول تجھے جیوت اور سُرکھشت دیکھنا چاہتے ہیں۔" دیوی دین نے بھنچی ہوئی آواز میں کہا۔
پھولن نے بے رخی سے منہ موڑ لیا اور رکمنی، چھوٹی، بھوری اور شیو نارائن سے گفت و شنید کرنے لگی۔
دیوی دین اور مولہ حسرت سے اس کی جانب دیکھنے لگے۔ ملاقات کا وقت ختم ہوتے ہی وہ خمیدہ بدن لیے بدقت رخصت ہو گئے۔ پھولن کا دل کوئی بہت شدت سے مٹھی میں بھینچ رہا تھا۔ وہ اپنی کیفیات سمجھنے سے قاصر تھی۔ چند روز بعد دیوی دین زندگی کی قید سے آزاد ہو گیا۔ پھولن کے دل میں اپنے طیش اور اس بدزبانی کی خلش دائمی طور پر نقش ہو گئی تھی۔

☆☆☆

جیل کی زندگی کے معمولات دھیرے دھیرے عادت بننے لگے۔ پھولن کو دو کمروں پر مشتمل ایک کوٹھری میں منتقل کر دیا گیا۔ ایک چھوٹا کمرا اس کے سونے اور دوسرا بیت الخلا اور غسل خانے کے لیے مختص تھا۔ دونوں کمروں کے گرد ایک اونچی دیوار تھی جس میں آہنی دروازہ نصب تھا۔
دیوار اور دروازے کے درمیان گھاس بھی اُگی ہوئی تھی۔ کمروں کے عقبی حصے اور پچھلی بڑی دیوار کے درمیانی حصے میں ایک باغ تھا۔ پھولن نے وہاں آلو، ٹماٹر، مرچیں اور دیگر سبزیوں کی کاشت کا آغاز کر دیا۔ جیل انتظامیہ نے کرن نامی ایک سابق ڈکیت کو اس کے لیے مددگار و معاون مقرر کر دیا۔
کچھ عرصے بعد جیل ڈائریکٹر اس کے پاس چلا آیا۔ اس کے چہرے پر ایک نرم مسکراہٹ تھی۔ وہ کاشت شدہ قطعہ زمین کو توصیفی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔
"تم نے یہاں واقعی بہت محنت کی ہے۔"
پھولن کا سر فخر سے بلند ہو گیا۔ جیل ڈائریکٹر نے قدرے دوستانہ انداز میں کہا۔
"مجھے یہ دیکھ کر بہت خوشی ہو رہی ہے کہ اب تم جنگل کے جیون سے باہر نکل رہی ہو۔ دیکھو پھولن! وہ جیون اب ختم ہو چکا ہے۔ اب انسانوں جیسے طور طریقے اپناؤ، لوگوں سے نرمی سے بات کیا کرو۔ ان کی عزت کرو گی تو وہ بھی تمہاری عزت کریں گے۔ جیون ایک ہاتھ دینے اور دوسرے ہاتھ سے لینے کا نام ہے۔ تمہارے ساتھ جو ہوا، وہ غلط تھا۔ اب وہ سب ماضی بن چکا ہے، اسے کہیں دفنا دو۔ خود کو پوجا پاٹ میں بھی مصروف کرو۔ تمہارے من کو شانتی ملے گی۔"
پھولن کے وجود میں اضطراب ہلکورے لینے لگا۔ وہ اسے اپنی ذہنی کیفیت اور تشنگی سمجھانے سے قاصر تھی۔ جنگل اب ماضی میں بہت دور رہ گیا تھا۔ اسے ایک ڈکیت ہونے کی آزادی، خوشی، گاؤں در گاؤں جا کر اپنا قانون چلانے کی سرشاری اور ستائش، عقیدت مندانہ نعرے بے حد ستاتے۔ یہ سب عناصر اس کے لیے کسی مہلک نشے کی حیثیت اختیار کر چکے تھے۔ اسے شب و روز اس نشے کی شدید طلب ہوتی تھی لیکن کہیں کوئی درماں نہیں تھا۔
جیل ڈائریکٹر نے اسے خاموش اور الجھن میں مبتلا دیکھ کر متانت سے کہا۔
"کبھی کسی سمسیا کا سامنا ہو تو مجھے ضرور بتانا۔"
پھولن نے خالی الذہنی کے عالم میں سر ہلا دیا۔

☆☆☆

کھانے کی تھالی سامنے آتے ہی پھولن کا دماغ ایک بار پھر اُلٹ گیا۔ اس نے طیش سے اس تھالی کو ٹھوکر ماری اور چلاتے ہوئے کہنے لگی۔
"یہ سب نہیں کھانا مجھے۔ کوئی جانور بھی ایسا کھانا نہیں کھا سکتا۔ مجھے سمجھتے کیا ہو آخر؟"

"[illegible]

[illegible] بیزاری سے کہا۔

"تم لوگ انسان نہیں ہو کیا؟" وہ [illegible] بھڑک گئی۔

"یہ جیل ہے پھولن دیوی اور یہاں یہی کچھ ہوتا ہے۔" اہلکار نے کندھے اچکائے۔

پھولن نے بے بسی سے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ اہلکار نے متامل نگاہوں سے قرب و جوار کا جائزہ لیا اور رازدارانہ انداز میں کہنے لگا۔

"تم اتنی بڑی ڈکیت تھیں۔ تمہارے پاس تو کسی راجے مہاراجے سے بھی زیادہ دولت ہوگی؟"

"میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔" اس نے صاف گوئی سے جواب دیا۔

"تو لوٹ مار کا اتنا پیسا کہاں گیا؟ تمہارے نام کا تو اتنا ڈنکا بجتا تھا۔" وہ بے یقینی سے اسے دیکھنے لگا۔

"میں وہ سب غریبوں میں بانٹ دیتی تھی۔" پھولن نے بتایا۔

اہلکار اسے مزید حیرت و بے یقینی سے دیکھنے لگا۔

"تمہیں پتا ہے، یہاں ہر ڈکیت کے پاس ہزاروں روپے ہیں۔ وہ اپنی اچھا کے مطابق باہر سے کچھ بھی منگوا لیتے ہیں۔ تم ہی یہاں بیٹھی چیختی چلاتی رہتی ہو۔" اس نے حقیقت بیان کی۔

"میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ وکرم اور میں سب غریبوں میں بانٹ دیتے تھے۔" وہ زچ ہوئی۔

"تو پھر ان غریبوں سے ہی کہو کہ تمہیں جیل میں ہر صبح وشام بھوجن بھی بھیج دیا کریں۔ یہاں تو یہی سب ملے گا۔"

پھولن اس لیے فیصلہ ہی نہیں کر پا رہی تھی کہ اس اہلکار کے انداز میں ترحم تھا یا حقارت و طنز۔ وہ فی الوقت کھانے کے ملاوٹ شدہ لوازمات کو دیکھتے ہوئے اپنی قے بمشکل روک پا رہی تھی۔

☆☆☆

جیل میں آنے والے صحافیوں کے سوالات کا رخ اب تبدیل ہوگیا تھا۔ وہ اب اسے مختلف مضحکہ خیز اطوار سے تصویریں بنانے کے لیے زچ نہیں کرتے تھے۔ پھولن بھی جیل ڈائریکٹر کی ہدایات کے مطابق نرمی اور رسان سے جواب دینے کی کوشش کرتی لیکن کسی نہ کسی نکتے پر اس کے ضبط کا پیمانہ لبریز ہوجاتا تھا۔ اس روز بھی یہی ہوا۔

"پھولن دیوی [illegible] تم [illegible]" [illegible] صحافی نے [illegible]۔

"میں نے [illegible]۔"

"تم [illegible] ہوگی؟" [illegible] صحافی نے کہا۔

"[illegible]" پھولن نے [illegible] اٹھی۔

"کیوں؟ کیا تمہارا من نہیں چاہتا کہ تم بیاہ کرو، تمہارے پاس بھی ایک گھر ہو، ایک پتی ہو [illegible]؟"

اس سوال نے پھولن کا دماغ الٹا دیا۔ وہ اپنی کم فہمی کے باعث اس انگریزی لفظ کو اپنے لیے ایک گالی سمجھی تھی۔ اس نے طیش میں آتے ہوئے صحافی کو دبوچنے کا فیصلہ کرلیا۔

"گالی دیتا ہے...... تیری یہ ہمت کہ پھولن دیوی کو گالی دے رہا ہے۔ میں تجھے چیر پھاڑ دوں گی۔"

اس کے اردگرد موجود اہلکاروں نے اسے بمشکل قابو کیا اور بازوؤں سے دبوچ کر بدقت کرسی پر بٹھا دیا۔

"میں تمہیں گالی نہیں دے رہا۔" اس نے وضاحت کی۔ "مسز کا مطلب نہیں سمجھتیں......؟ شریمتی...... مطلب گھر کی ملکہ۔"

"مجھے بیاہ نہیں کرنا۔ مجھے اس سنسار کے ہر ایک مرد سے نفرت ہے۔" وہ غرائی۔

"ایسا کیوں ہے پھولن دیوی؟ پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں۔" صحافی کی مردانہ انا کو سخت ٹھیس لگی۔

"پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں۔" وہ زہر خند ہوئی۔ "لیکن ہر مرد ایک جیسا ہی ہوتا ہے۔ راکھشس...... صرف اور صرف راکھشس۔ میادین، پتی لال، سری رام، لالہ رام جیسا راکھشس۔"

"دیوی دین اور وکرم بھی تو مرد ہی تھے۔" دوسرے صحافی نے اسے طنزیہ نگاہوں سے دیکھا۔

پھولن لمحہ بھر کے لیے لاجواب ہوئی اور گہری سانس بھرتے ہوئے کہنے لگی۔

"وہ دونوں دیوتا تھے۔ دیوتا سے بھی بڑھ کے تھے۔"

صحافی کینہ توز نظروں سے اسے گھور کے رہ گئے۔ وہ پھولن کو اس انداز تخاطب پر یادگار جواب دینا چاہتے تھے۔

☆☆☆

اس روز کے بعد اخبارات میں ایک نئی سرخی سرگرم رہنے لگی۔ ملک بھر میں پھولن کی ذات ہی موضوع گفتگو تھی۔

"پھولن دیوی کا جیون بہت سونا اور نراش ہے۔"

''کیا اسے ایک سادھارن ناری کی طرح رہنے کا کوئی ادھیکار نہیں ہے؟''
''پھولن دیوی بیاہ کر کے گھر بسانا چاہتی ہے۔ اسے کسی نیک، دیالو اور مہان پُرش کا انتظار ہے جو اس کا ہاتھ تھام سکے۔''
ان سرخیوں کے نتیجے میں ملاقاتیوں کی ایک نئی قسم جیل میں داخل ہونے لگی۔ سب سے پہلے دہلی سے تعلق رکھنے والے جین خاندان کا ایک لڑکا اپنی شادی کا پیغام لیے چلا آیا۔ اس کی عمر تقریباً بیس، بائیس برس تھی۔
''میں تمہیں بہت خوش رکھوں گا دیوی جی! ہمارے پاس دولت کی کمی نہیں ہے، تم مجھ سے بیاہ کر لو۔'' اس نے اپنا مدعا بیان کیا۔
پھولن نے استہزائیہ نظروں سے اسے دیکھا اور اطمینان سے کہنے لگی۔
''اپنی جوانی پر ترس کھاؤ بالک! تم مجھے جانتے نہیں ہو۔ پھولن دیوی ایک چڑیل ہے۔ وہ تیرا خون پی لے گی۔''
''تم یہ سب جان بوجھ کے کہہ رہی ہو۔ میں جانتا ہوں، لڑکی نے انکار کرنا ہو تو ایسے ہی بھرم دکھا کر سامنے والے کا حوصلہ آزماتی ہے۔'' اس نے جواب دیا۔
''تجھے پتا ہے میں نے بہمائی میں کتنے ٹھاکر مارے تھے؟'' پھولن نے ایک توقف کے بعد کہا۔
لڑکے نے نفی میں سر ہلا دیا۔
''بائیس۔'' وہ تفاخر سے گویا ہوئی۔ ''اور تجھے پتا ہے میں ٹھاکر لوگوں یا دوسرے پاپیوں کو کیا سزا دیتی تھی؟''
''نہیں، مجھے نہیں پتا۔'' وہ پہلی بار سراسیمہ ہوا۔
پھولن نے مسکراتے ہوئے اسے اپنی اختراع کردہ مخصوص سزا کے بارے میں بتا دیا۔ جین لڑکے کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ وہ اس دھان پان وجود کی حامل عورت کو دیکھنے لگا جس کے متعلق سنی گئی خبریں اس کی شخصیت سے بالکل لگا نہیں کھاتی تھیں۔
''اب جیل میں آنے کے بعد میں نے ایک بھی قتل نہیں کیا۔ کسی کو وہ سزا دے کر تڑپتے نہیں دیکھا۔ میں نے تو سوچ لیا ہے کہ جیل سے نکلتے ہی جو بھی پہلا مرد ملے گا، اس کے ساتھ وہی کچھ کروں گی۔ دُرگا میا کی سوگند! ہاتھوں میں بہت ہی کھجلی ہو رہی ہے۔''
جین لڑکے کی سٹی گم ہو گئی۔ اس نے دہشت سے پھولن کی جانب دیکھا اور اشوک کی طرح سر پر پاؤں رکھے فرار ہو گیا۔ اس کے کچھ ہی روز بعد ایک تخیم شخیم سکھ کی آمد ہوئی۔ اس نے سر پر بڑی سی پگڑی باندھ رکھی تھی۔ وہ ایک ٹانگ سے محروم تھا۔
''کیوں آئے ہو یہاں؟'' پھولن نے تندی سے دریافت کیا۔
''میں بہت امیر ہوں۔ میری بہت بڑی ٹرانسپورٹ کمپنی ہے جس میں بے حساب لاریاں چلتی ہیں۔'' اس نے تفاخر سے بتایا۔
''مجھے بس یہی بتانے آئے ہو؟'' وہ ہنسی۔ ''کہیں منشی رکھنے کا ارادہ تو نہیں ہے؟''
''ارے نہیں۔ میں تمہارے لیے جیل میں ایک لاکھ روپے جمع کروا دوں گا۔ میری پہلی پتنی اور بچوں کو اس بیاہ سے کوئی اعتراض نہیں ہے۔'' سکھ شاہانہ انداز میں کہنے لگا۔
''اس دیالو پن کا کوئی تو کارن ہوگا؟'' پھولن نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔
''میں اس سنسار والوں پر یہ ثابت کرنا چاہتا ہوں کہ ابھی ایسے دل گردے کے مالک مہا پُرش موجود ہیں جو ایک بگڑی ہوئی عورت سے بیاہ کر سکتے ہیں۔''
اس جواب نے پھولن کے نسوانی وقار کو سخت مجروح کیا۔ وہ اپنی بلبلاہٹ پر قابو پاتے ہوئے کہنے لگی۔
''یہاں سے بھاگ جاؤ موٹے بیل! اگر دوبارہ اپنی شکل دکھائی تو میں تم سے دوسری ٹانگ کے علاوہ مرد ہونے کا غرور بھی چھین لوں گی پھر دوسری تو کیا، پہلی پتنی بھی تمہارے منہ پر نہیں تھوکے گی۔''
''تم خود کو سمجھتی کیا ہو؟ میں بھی دیکھتا ہوں کہ کس سے بیاہ کرو گی۔ میں یہ بالکل نہیں ہونے دوں گا۔''
اس دعوے نے پھولن کو بے اختیار قہقہہ بار کر دیا۔
''جا بیٹا! پالنے میں لیٹ کر بوتل میں دودھ پیو۔'' اس نے طنز کیا اور اپنی کوٹھری میں جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔
سکھ کے بعد ایک فرانسیسی بہتی گنگا میں ہاتھ دھونے چلا آیا۔ اس کے ساتھ ایک مترجم بھی تھا۔ پھولن اپنی تمام تر کم فہمی کے باوجود یہ بات بہ آسانی سمجھ گئی تھی کہ وہ محض شہرت کا دلدادہ ہے۔ اس نے بہترین ''خاطر مدارت'' کے بعد اسے بھی رخصت کر دیا۔ وہ جیل انتظامیہ کے اس فیصلے اور حکمت عملی پر چیں بہ جبیں تھی جو ہر کسی کو اس سے ملاقات کے لیے بھیج دیتے تھے۔
ان میں سے کسی کو بھی پھولن کے جذبات کی پروا نہیں تھی۔ انہیں کبھی اندازہ ہی نہیں ہو سکتا تھا کہ کسی مردے کی طرح زندہ ہونا کیسا ہوتا ہے؟ اس کی ہم عمر خواتین رسوئی

میں ٹھیں چولہے پر روٹیاں پکاتے ہوئے اپنے پتی کا انتظار کرتی تھیں جتنا۔ وہ جنگل کے بعد اب جیل میں بھی ایک پتھر کی طرح زندگی بسر کررہی تھی۔ کسی بھی پتھر کو خوشی، غم، پچھتاوں یا ملال سے سروکار نہیں ہوتا۔

پھولن دیوی اب ایک عورت نہیں رہی تھی، وہ مجسم پتھر بن چکی تھی۔ کوئی بھی پتھر کسی بھی مرد سے کیونکر بیاہ کرسکتی ہے۔ مرد نے ہی تو اسے پتھر بنادیا تھا۔

☆☆☆

''تمہیں یہاں کوئی سمسّیا تو نہیں ہے پھولن دیوی؟'' رام شنکر سنگھ نے باوقار انداز میں اس سے دریافت کیا۔

پھولن نے تلخی سے سر جھٹکا اور بگڑے ہوئے لہجے میں کہنے لگی۔

''یہاں ایک نہیں، بہت سی سمسّیا ئیں ہیں۔''

''مکھیا منتری ارجن سنگھ اور پردھان منتری اندرا گاندھی نے تمہارا خیال رکھنے کا حکم دے رکھا ہے۔ جیل میں سب کو ہی یہ بات پتا ہے، اس لیے تمہیں کوئی سمسّیا ہونی تو نہیں چاہیے۔'' وہ چونکا۔

''مجھ پر ابھی تک کوئی مقدمہ نہیں چلایا گیا۔ کیا مجھے سارا جیون یہیں رہنا پڑے گا؟'' اس نے تندی سے کہا۔

''ہر سرکاری کام کا اپنا ایک طریقہ اور سے ہوتا ہے۔ دھیرج سے کام لو۔'' رام شنکر نے دلاسا دیا۔

''یہ بہت گندی جگہ ہے، میں یہاں نہیں رہ سکتی۔'' پھولن نے منہ بنایا۔

رام شنکر اس کے انداز پر مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔

''یہ جیل ہے پھولن دیوی! کوئی ہوٹل نہیں ہے۔ تمہیں یہاں خود ہی سمجھوتا کرنا پڑے گا۔'' اس نے اپنی کلائی پر بندھی گھڑی کی جانب دیکھا اور عجلت میں کہنے لگا۔ ''مجھے ایک ضروری میٹنگ میں جانا ہے۔ تم سے پھر ملاقات ہوگی۔''

پھولن کے مزید اعتراضات کو گویا ہی نہ مل سکی۔ وہ اسے بتانا چاہتی تھی کہ گوالیار جیل ایک بدترین مقام تھا۔ یہ سودے بازی اور لین دین کی ایک تاریک دنیا تھی جہاں روشنی کی واحد کرن صرف پیسا تھی۔ وہاں مقید بڑے ڈکیت ایک ہی خطاب کے لیے برسرِپیکار رہتے تھے کہ ''ڈکیتوں کا بادشاہ'' کون ہے۔ وہ چھوٹے ڈکیتوں کا استحصال کرتے، ان کا معمولی ترین مال واسباب بھی چوری کرنے سے گریز نہ کرتے۔ ان سب نے جیل کے اندر ایک جنگل بنا رکھا تھا۔

اس کے بعد پھولن کی زندگی میں ایک اور آزمائش در آئی۔ گوالیار جیل کے سابقہ ڈائریکٹر کا تبادلہ ہونے پر ایک ایسا شخص تعینات کیا گیا جو وہاں موجود قیدیوں سے بھی زیادہ بدنوان اور بے رحم تھا۔ وہ پاگل قیدی عورتوں کو عام قیدیوں میں شامل کردیتا۔ نتیجتاً وہاں تشدد و غیر انسانی حرکات کا سلسلہ شروع ہوجاتا۔ ہلاک شدگان کا بھی کوئی پرسانِ حال نہیں تھا۔ ان کی لاشیں چوہوں کی ضیافت کا سامان بن جاتیں۔ کئی پھٹی لاشوں کی دید پھولن کو کئی روز بے کل رکھتی۔

جیل کی گندگی، بدعنوانی اور کھانے کے معیار کے خلاف احتجاج کے لیے پھولن نے دوبار تامرگ بھوک ہڑتال کا بھی اعلان کیا لیکن جیل انتظامیہ کے کانوں پر جوں تک نہ رینگتی۔ کچھ عرصے بعد قیدیوں کے برتاؤ میں طنز اور حقارت در آنے لگی۔ اس تبدیلی کا محرک بھی بہت جلد آشکار ہوگیا۔ مدھیہ پردیش کے وزیرِاعلیٰ ارجن سنگھ کو گورنر کی حیثیت سے پنجاب منتقل کردیا گیا تھا۔ اب جیل انتظامیہ کو ہدایات واحکامات جاری کرنے کے لیے کوئی بھی نہ تھا۔ اس پر مستزاد اندرا گاندھی کا قتل تابوت میں ایک اور کیل ثابت ہوا۔ پھولن ان پے در پے سانحات پر اعصابی شکستگی میں مبتلا ہونے لگی۔

''بیچاری لاڈلی! اب ایک سادھارن قیدی کی طرح جیل کے آٹے دال کا بھاؤ پتا چلے گا۔'' قیدی ہرزہ سرائی کرتے۔

''پھولن! تمہارے ساتھ بہت انیائے ہورہا ہے۔'' ایک روز کسی قیدی نے کہا۔ ''تمہاری لڑائی سیاسی ہے۔ تمہیں بلی کا بکرا بنایا گیا ہے۔''

''سیاسی لڑائی......؟'' اسے اچنبھا ہوا۔ ''وہ کیا ہوتی ہے؟''

''تم نہیں سمجھوگی۔'' اس نے ہونٹ بھینچے۔ ''ہم نے بہرحال یہ فیصلہ کیا ہے کہ یہاں سے نکلتے ہی تمہارے لیے آواز اٹھائیں گے۔''

پھولن ناسمجھی سے اس کی جانب دیکھ کررہ گئی۔

☆☆☆

قیدیوں کے اس امتیازی سلوک کے علاوہ پھولن ایک اور محاذ پر بھی برسرِپیکار تھی۔ اس کے پیٹ میں عجیب النوعیت درد رہنے لگا۔ تشدد، جنگل میں تنہا بسر شدہ شب وروز اور تامرگ بھوک ہڑتال کی دو کوششوں نے نقاہت دوچند کر رکھی تھی۔ درد ناقابلِ برداشت ہوا تو اسے مجبوراً معائنے کے لیے جیل کے اسپتال میں منتقل کیا گیا۔ ڈاکٹر کی جانب سے پیٹ میں رسولی تشخیص کی گئی۔ پھولن کو فی الفور جراحت کی ضرورت تھی۔

جراحت سے کچھ دیر قبل ایک کرخت صورت شخص اس کے پاس چلا آیا۔ وہ اپنے انداز واطوار سے پولیس افسر

یا گارڈ محسوس ہوتا تھا۔
''میں تمہارے لیے کھانا لایا ہوں۔'' اس نے اپنایت سے کہا تاہم آنکھیں متضاد رنگ منعکس کر رہی تھیں۔
پھولن کی حسیات چوکنا ہوگئیں۔ وہ اپنی کم فہمی اور ناخواندگی کے باوجود آنکھوں میں پوشیدہ تحریر بہ آسانی پڑھ لیتی تھی۔
''مجھے ڈاکٹر نے کہا تھا کہ آپریشن سے پہلے کچھ نہیں کھانا۔'' اس نے سخت لہجے میں جواب دیا۔
''تمہیں کمزوری بہت زیادہ ہے، اس لیے ڈاکٹر نے اب فیصلہ کیا ہے کہ طاقت کے لیے کچھ کھا پی لو۔'' نووارد نے پچکارا۔
''اچھا، یہ ڈاکٹر راجندر چترویدی نے کہا ہوگا، انہیں میری بہت چنتا رہتی ہے۔'' اس نے مقابل کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے ایک فرضی نام بیان کیا۔
''ہاں بالکل، انہوں نے ہی بھیجا ہے۔'' وہ پُرسکون ہوگیا۔
پھولن نے برق رفتاری سے اپنی دائیں ٹانگ اس کے پیٹ میں رسید کی اور فوری طور پر دروازے کی سمت لپک گئی۔
اس نے جیل انتظامیہ کے سامنے جراحت کے لیے دوٹوک انکار کر دیا تھا۔ اگلے ہی روز اخبار میں سرخی شائع ہوئی۔
''پھولن دیوی کا دماغی توازن خراب ہوگیا ہے۔ اس نے اسپتال میں ایک میلا ڈاکٹر کو مارتے ہوئے فرار ہونے کی کوشش کی۔''
کچھ روز بعد ایک صحافی اس سے ملاقات کے لیے چلا آیا۔
''تم نے وہ کھانا نہ کھا کر بہت عقلمندی کی۔ اس میں زہر ملایا گیا تھا۔'' وہ پست آواز میں کہنے لگا۔
''مجھے پہلے ہی شک تھا۔'' اس نے سر جھٹکا۔
''تم اس جیل سے کسی دوسری جیل میں چلی جاؤ پھولن دیوی!'' صحافی نے خلوص سے مشورہ دیا۔
''ایک قیدی کی بھی کوئی مرضی ہوتی ہے کیا؟'' وہ تلخ ہوئی۔
''یہاں تمہاری جان کو خطرہ ہے۔ کسی نے تمہاری موت کے لیے پانچ لاکھ روپے کی سپاری دے رکھی ہے۔''
صحافی کے اس انکشاف پر پھولن کو بالکل حیرت نہ ہوئی۔ اسی شخص اور چند سابقہ قیدیوں کے آواز اٹھانے پر اسے تہاڑ جیل منتقل کرنے کا فیصلہ کرلیا گیا۔ پھولن کو نصف شب کے بعد عورتوں کے کوارٹروں سے باہر لایا گیا اور تین گھنٹے کا کربناک انتظار کروانے کے بعد بکتر بند گاڑی میں سوار کر دیا۔ ریلوے اسٹیشن پر اسے ڈیڑھ درجن سے زائد پولیس اہلکاروں نے گھیرے میں لے رکھا تھا۔ ان میں چار عورتیں اور بقیہ ماندہ مرد پولیس اہلکار تھے۔
اپنے ارد گرد لوگوں کا جم غفیر دیکھ کر وہ ایک عجیب گھٹن محسوس کرنے لگی۔ اس کی سماعت میں گوالیار جیل کے قیدیوں کی زہریلی سرگوشیاں گونجنے لگیں۔
''تہاڑ جیل تو بہت ہی خوفناک جگہ ہے جی۔''
''ہاں، وہاں جانے والا کبھی باہر نہیں نکل پاتا۔''
''وہاں قیدی عورتیں تو کیا، مردوں کی عزت بھی سلامت نہیں رہتی۔''
''تہاڑ جیل میں اتیاچار کے ایسے طریقے استعمال ہوتے ہیں کہ سن کر ہی آتما کانپ جاتی ہے۔''
''پھولن دیوی کا تو وہاں بہت ہی برا حشر کیا جائے گا۔''
ان سرگوشیوں کی بازگشت سے ہلکان ہوتے ہوئے پھولن کو اپنے اہل خانہ سے دوری کا احساس ستانے لگا۔ وہ اب جانے کتنے مہینوں یا برسوں بعد انہیں دیکھ پاتی۔ پھولن نے کرب واذیت سے آنکھیں میچ لیں۔

☆☆☆

تہاڑ جیل ایک مختلف اور وسیع تر دنیا تھی۔ پھولن کو رسمی کارروائی کے بعد دس نمبر کوٹھری میں منتقل کر دیا گیا۔ یہ جگہ اس کی سابقہ کوٹھری کے برعکس قدرے کشادہ تھی۔ دیوار میں بستر کے لیے کنکریٹ کا طاق بنا ہوا تھا جس کے اوپر ایک گدا رکھا تھا۔ محافظ نوجوان عورتیں مستعد تھیں۔ پھولن نے انہی کی معاونت سے ایک اور طاق میں چھوٹا سا مندر بنایا اور دیوتاؤں کی چھوٹی چھوٹی مورتیاں سجا کر ان پر پھول ڈالے اور لوبان کی بتیاں جلا دیں۔
اگلی صبح پوجا پاٹ کے بعد سفید کرتے اور سرمئی جیکٹ میں ملبوس ایک عورت اس کے پاس چلی آئی۔ اس کے چھوٹے بھورے بال لڑکوں سے مشابہ تھے۔ چہرہ بارعب اور آنکھیں بے حد روشن تھیں۔
''میرا نام کرن بیدی ہے۔ تمہارے بارے میں بہت سن رکھا تھا۔'' وہ مسکرائی۔
پھولن کو اس کا اندازِ گفتگو بہت بھایا۔
''تمہیں پوجا کرتے دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوئی ہے۔ یہاں تمہارا سمے بہت اچھا گزرے گا۔'' کرن کی مسکراہٹ گہری ہوئی۔
''میرا باقی جیون جیل میں ہی گزرنا ہے۔ کیا فرق پڑتا ہے کہ سمے اچھا ہو یا برا۔'' وہ حسبِ عادت تلخ ہوگئی۔
''ایسا نہیں ہوسکتا۔'' اس نے اعتماد سے جواب دیا۔
''میں تمہاری چنتا کا ہر کارن جانتی ہوں، تم بہت جلد رہا

ہو جاؤ گی۔ ہمارے دیش میں یہ بات قانون کے خلاف ہے کہ کسی کو بھی مقدمہ چلائے بغیر اتنے لمبے سمے کے لیے قید رکھا جائے۔ میں نے تمہاری طرف سے اپیل دائر کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔''

''کیا سچ میں ایسا ہوسکتا ہے؟'' اسے اپنی سماعت پر یقین ہی نہ آیا۔

''بالکل ہوسکتا ہے۔ تمہارے کھانے پینے کا خیال رکھا جائے گا۔ تمہیں یہاں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔'' کرن نے ملائمت سے کہا۔

''تہاڑ جیل میں ایسا ہوسکتا ہے کیا؟'' وہ ششدر تھی۔

کرن اس کے خدشات پر متانت سے مسکراتے ہوئے وہاں سے لوٹ گئی۔

اس کی کوششوں سے پھولن کو انڈین انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل سائنسز میں لے جایا گیا۔ اسپتال پر پولیس کا سخت پہرا تھا۔ راہداری میں بھی سپاہی موجود تھے۔ اسپتال کی صفائی ستھرائی، عملے کا پیشہ درانہ برتاؤ اور منظم انتظام دیکھتے ہوئے پھولن از خود ہی پرسکون ہونے لگی۔ اس کے معدے کا السر کامیاب جراحی سے ختم کردیا گیا۔ زخم مندمل ہونے پر اپنی کوٹھری میں واپسی کے بعد وہ اپنے وجود میں حیران کن تبدیلیاں محسوس کرنے لگی۔ اس کا ازلی غصہ اور تناؤ خوابیدگی کی جانب مائل ہونے لگے۔ خوف اور بداعتمادی کا زہر ایک متوازن ڈگر میں تبدیل ہوتے دیکھ کر وہ خود سے ایک ہی سوال کرتی۔

''کیا میں وہی پھولن ہوں؟ مجھے یہ کیا ہورہا ہے؟ میں یہ سب کیوں کررہی ہوں؟''

اس سوال کا فی الوقت کوئی جواب نہ تھا۔

☆☆☆

ہتھیار ڈالنے کے بعد پھولن کو جیل کی چار دیواری میں مقید ہوئے گیارہ سال کا عرصہ بیت چکا تھا۔ اسے اب اپنی رہائی کی بالکل کوئی امید نہ رہی تھی۔ اس کے برتاؤ اور انداز واطوار بھی دھیرے دھیرے بالکل تبدیل ہوچکے تھے۔ جنگل میں گزرے شب وروز کے نتیجے میں مزاج پر غالب آنے والی وحشت بھی کم ہوگئی تھی۔ پھولن اپنی ان تبدیلیوں کا محرک سمجھنے سے قاصر تھی۔ اسے یہ حقیقت تاحال سمجھ میں نہیں آئی تھی کہ اس کی جبلت عورت کے نرم ونازک جذبات واحساسات سے گندھی ہے۔ اوائل زندگی کے بعد پے درپے حادثات وواقعات نے اسے وحشت، مزاحمت اور انتقامی روش کی جانب دھکیل دیا تھا لیکن اب جبلت حاوی ہوچلی تھی۔ روح وقلب پر زخموں کے گھاؤ مندمل تو نہ ہوسکے تھے البتہ وقت گزرنے کے ساتھ ان زخموں پر مرہم ضرور آگئے تھے۔

انہی شب وروز میں ایک دن تقدیر نے غیر متوقع موڑ لیا۔ اس روز دن بھر ریڈیو پر ایک ہی اعلان دہرایا جارہا تھا۔

''اترپردیش سرکار نے پھولن دیوی کے خلاف الزامات واپس لے لیے ہیں۔ پھولن دیوی کو جیل سے رہا کردیا جائے گا۔''

یہ اعلان سنتے ہی پھولن پر گویا شادی مرگ کی کیفیت طاری ہوگئی۔ اس نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا کہ تقدیر اس قدر مہربان بھی ہوسکتی ہے۔ کوٹھری میں بند قیدی لڑکیاں اپنی پلیٹیں زور زور سے سلاخوں پر بجانے لگیں۔ اگلی صبح کرن بیدی نے بھی اس خبر کی تصدیق کردی اور قواعد وضوابط کے تمام تر مراحل طے ہوتے ہی اسے رہا کردیا گیا۔

☆☆☆

تہاڑ جیل سے رہائی کے دو سال بعد پھولن نے تمام تر قانونی کارروائیوں کی تکمیل کے بعد سیاست میں قدم رکھنے کا فیصلہ کرلیا۔ یہ خبر ملک بھر میں حیرت، خوشی اور طیش کا باعث بن گئی تھی۔

نچلی ذات کے ہندو اس تاریخی اقدام کے بعد بے حد خوش تھے تو دوسری جانب پھولن کے ازلی دشمن اور اعلیٰ النسل افراد کے سینوں پر سانپ لوٹنے لگے۔ تقدیر نے بھی اپنی سابقہ معاندانہ روش ترک کردی۔ پھولن دیوی کے لیے راہیں از خود ہی آسان ہونے لگیں۔ ملائم سنگھ یادیو کی زیر قیادت ''سماج وادی پارٹی'' نے اسے اترپردیش کے مرزا پور حلقے میں انتخابات کے لیے نامزد کردیا۔

انتخابی مہم شروع ہوئی تو پھولن کے جلوس میں تل دھرنے کو جگہ نہ ہوتی۔ اس کے اسٹیج پر آنے سے گھنٹوں پہلے ہی ایک ایسا انسانی سمندر دکھائی دینے لگتا جس کے ایک کنارے پر کھڑے ہوکر دیکھنے سے دوسرا کنارہ دکھائی ہی نہیں دیتا تھا۔

مائیک ہاتھ میں آتے ہی پھولن ایک آتش فشاں کا روپ دھار لیتی۔ اس کی تقریر اعلیٰ ذاتوں کی جانب سے بدترین معاشی اور جنسی استحصال کے خلاف ایسے انگارے برساتی کہ مجمع بھی اس حدت کی لپیٹ میں آجاتا۔ اس کی تقریر کسی بھی لگی لپٹی یا سیاسی وعدوں کے بغیر صرف اور صرف سچائی پر مبنی ہوتی تھی۔ لاکھوں افراد کا وہ مجمع اس کے کہے گئے ہر ایک لفظ پر یقین کرتا تھا۔ وہ اعلیٰ ذات کے افراد

کا مکروہ چہرہ بے نقاب کرتی اور کمتر ذات کے لوگوں کی اعلیٰ اقدار کی نمائندگی کرنے لگتی۔

''ہم کمزور ہیں تو کیا ہمیں جینے کا کوئی ادھیکار نہیں ہے؟ دھرم کی کس کتاب میں لکھا ہے کہ ٹھاکر، برہمن اور پردھان ہمارے بھگوان ہیں؟ ارے کوئی ان کو بتاؤ کہ یہ بھی ہماری ہی طرح دو آنکھوں، دو کانوں اور دو ہاتھ پاؤں والے انسان ہیں۔ انہیں ہمارا بھگوان بننے کا ادھیکار کس نے دیا ہے؟ کوئی طاقتور میرے ہوتے ہوئے کسی کمزور پر ظلم نہیں کر پائے گا، میں ایسا ہونے ہی نہیں دوں گی۔''

پھولن کے یہ الفاظ مجمعے میں گویا آگ لگا دیتے۔ وہ بے ساختہ نعرہ زن ہوجاتے۔

''پھولن دیوی کی جے...... پھولن دیوی کی جے!''

''یہ ٹھاکر، یہ چور، یہ لٹیرے...... ہائے ہائے...... ہائے ہائے۔''

''جب تک سورج چاند رہے گا...... پھولن تیرا نام رہے گا۔''

☆☆☆

پھولن دیوی ٹھاکروں، برہمنوں اور دیگر مقدس ذاتوں کے انا پرست، متکبر لوگوں کے لیے ایک خوفناک خواب کی حیثیت اختیار کر چکی تھی۔ اس کے مخالفین انگاروں پر لوٹنے کے باوجود فاقہ زدہ عوام کی رائے کا رخ نہیں موڑ پائے۔ انتخابات میں لاکھوں ووٹ حاصل کرنے اور اپنے ان مخالفین پر واضح برتری حاصل کرنے کے بعد وہ سیاسی ایوان میں قدم جمانے میں کامیاب ہوگئی تھی۔

اترپردیش کے استحصال زدہ عوام نے اس دن تاریخی جشن منایا۔ انہیں یقین تھا کہ ان کی ہمدرد اور غمگسار پھولن دیوی حقیقی مسیحا ثابت ہوگی۔ اس دوران پھولن نے اپنی مرحومہ بہن کے بچوں کی دیکھ بھال کے لیے بہنوئی امید سنگھ سے شادی کرلی۔ عوام میں پھولن کے لیے محبت وعقیدت میں مزید اضافہ ہوگیا۔ وہ اپنے عوام کے مسائل حل کرنے کے لیے دن رات کوشاں رہتی۔ علاقے کے ترقیاتی منصوبوں کی منظوری اور تکمیل کے لیے دوڑ دھوپ کرتی۔

سیاسی ایوان میں مسلمہ حیثیت حاصل کرلینے کے باوجود وہ اپنا ماضی اور اصلیت فراموش نہیں کر پائی تھی۔ اس کی جڑیں اسی مٹی میں پیوست تھیں۔ وہ واحد بھارتی سیاست دان تھی جو کسی بھی اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے اعلیٰ النسل ہندوؤں کے جارحانہ رویّوں پر بے دھڑک دشنام طرازی کرتی۔ اس نے جبر واستحصال کی چکی میں پستی خواتین کی ''رہائی'' کے لیے ''مہیلا سدھار فاؤنڈیشن'' نامی تنظیم بھی قائم کرلی۔ وہ کسی بھی دوسری لڑکی کو پھولن دیوی بننے نہیں دینا چاہتی تھی۔

اس تنظیم نے ہندوستان بھر میں بالعموم اور اترپردیش میں بالخصوص شاندار نتائج حاصل کیے۔ دھیرے دھیرے پھولن سیاست دان کے علاوہ سماجی کارکن کی حیثیت سے بھی منفرد شناخت قائم کرنے میں کامیاب ہوگئی۔ مہیلا سدھار فاؤنڈیشن کی سربراہ کی حیثیت سے اسے تقریباً اسّی ممالک نے مدعو کیا۔ بیس ممالک نے امن کے نوبل انعام کے لیے بھی نامزد کیا لیکن مقتدر ٹھاکروں اور برہمنوں نے یہ واقعہ سرد خانے کی نذر کر دیا۔ کسی اچھوت عورت کے لیے ایسے اعزاز کا حصول ان کے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔

☆☆☆

اس نجی محفل میں شراب وکباب کا دور چل رہا تھا۔ شرکاء کی اکثریت نشے میں دھت ہونے کے باعث اپنے ہوش وحواس سے بیگانہ ہوچکی تھی۔ اس موقع پر ان کے دل ودماغ میں پوشیدہ اصل حقائق اور سچائی نوک زبان پر مچلنے لگی۔ وہ محفل سیاست، پولیس اور دیگر قانونی اداروں کے اعلیٰ النسل اہلکاروں نے مرتب کی تھی۔

''کیا سے آگیا ہے؟ اب راج نیتی میں جانور بھی دکھائی دینے لگے ہیں۔'' ایک ٹھاکر نے شراب کا نیا جام تیار کیا۔

''میں تو پہلے ہی کہتا تھا کہ اس...... کا پتّا صاف کردو۔'' پولیس کے اعلیٰ افسر نے حقارت سے کہا۔

''ہمیں کیا پتا تھا کہ وہ...... اتنی اچھل کود کرنے لگے گی۔'' ایک سیاست دان نے بھی بے دریغ دشنام طرازی کی۔

''اچھل کود تو وہ شروع سے ہی کرتی ہے۔'' پولیس کے ایک اور افسر نے تنفر سے کہا۔

''اسے لگام ڈالنا بہت ضروری ہے۔ سماج سیوک اور مہان نیتا بننے کا خواب توڑ کر اس کی اوقات یاد دلوائی جائے۔'' ٹھاکر نے اپنا جام ختم کرلیا تھا۔

''میں تو کہتا ہوں اس کی زبان ہی کاٹ دو۔'' حزب مخالف کے ایک سیاسی راہنما نے بلبلاتے ہوئے کہا۔

''حرام خور! بات نہیں کرتی بلکہ بھونکتی ہے۔''

اس اصطلاح پر وہاں موجود سبھی افراد قہقہہ بار ہوگئے۔ وہ اپنا چہرہ تھوتھنی کی طرح اوپر کیے اسی جانور کی مخصوص آوازیں ہم آہنگی سے نکالنے لگے۔

''تمہیں پتا ہے اس...... نے اسلحے کا لائسنس بنوانے کی درخواست جمع کروائی ہے۔'' ایک مقتدر شخص نے لب کشائی کی۔

اس انکشاف پر حاضرین کا نشہ ہرن ہونے لگا۔ پھولن دیوی کے ہاتھوں میں اسلحہ کا دوبارہ تصور ہی لرزہ خیز تھا۔

''کیوں...... کارن کیا بتایا ہے؟'' ٹھاکر نے پورا جام ہی حلق میں انڈیل لیا۔

''کہتی ہے، ترقیاتی منصوبوں کے ٹینڈر لینے کے لیے کچھ ٹھیکے دار اسے دھمکا رہے ہیں۔''

''یہ درخواست کسی صورت میں منظور نہیں ہونی چاہیے۔'' وہ ہم زبان تھے۔

''چنتا نہ کرو، پولیس کو سمجھا دیا گیا ہے۔ وہ اسے یہی کہیں گے کہ ماضی کو سامنے رکھتے ہوئے اسے ہتھیار دینے کا اجازت نامہ بالکل نہیں مل سکتا۔''

اس مژدہ کے بعد ان کی رکی ہوئی سانسیں بحال ہونے لگیں۔

''اس کی پتنگ بہت اونچی اڑ رہی ہے۔ جنتا نے اسے واقعی دیوی بنالیا ہے۔ یہی حال رہا تو ہمارے لیے مشکلات اور بھی بڑھ جائیں گی۔'' سیاست دان نے اپنا خدشہ بیان کیا۔

''کلیوگ ہے بھئی۔ اب نیچ جاتی کے لوگ بھی لوک سبھا اور راجیہ سبھا میں بیٹھا کریں گے۔'' ایک ٹھاکر نے ہونٹ بھینچے۔

''مجھے تو ایک اور بھی چنتا ہے کہ اس کو دیکھ کر اسی جاتی کے اور کیڑے مکوڑے بھی راج نیتی میں نہ چلے آئیں۔'' سیاست دان نے کہا۔

''ہم ایسا نہیں ہونے دیں گے، بالکل بھی نہیں ہونے دیں گے۔'' دیگر افراد کی نگاہوں میں شعلے رقصاں تھے۔

''دوستو! اب سمے آگیا ہے کہ اس...... کا کوئی اُپائے کرلیا جائے۔'' اس مقتدر شخص نے پہلی بار لب کشائی کی۔

''اس پر بھرشٹاچار کا کوئی مقدمہ بنادیتے ہیں۔'' پولیس اہلکار نے کہا۔

''پھولن جنتا کی نظروں میں ایک دیوی ہے، وہ اس پر ایسا آروپ کبھی سویکار نہیں کریں گے۔ اسے اور زیادہ سر پر بٹھالیں گے۔''

''پھر یہ کیوں بھول رہے ہو کہ وہ جیل میں رہ کر بھی چناؤ لڑسکتی ہے۔''

وہاں موجود ہر سیاست دان کی بلبلاہٹ سواتر ہوگئی۔

''اگر اس نے چور بازار سے کوئی ہتھیار لے لیا تو؟''

اس خدشے کے بعد سب کو ایک بار پھر شدت سے نشے کی طلب ہونے لگی۔

''مجھے تو یہ سمجھ نہیں آرہا کہ ایک نیچ جاتی کی عورت کو اتنا سر پر کیوں سوار کررہے ہیں؟'' محفل کے معمر ترین شخص نے کہا۔

سبھی افراد چونک کر اس کی جانب دیکھنے لگے۔ وہ ایک گھاگ سیاست دان تھا۔ سیاست میں آنے سے قبل اس نے قانون کی اعلیٰ ترین ڈگری بھی حاصل کررکھی تھی۔ اس کی آنکھوں میں تیز زہریلی چمک عیاں تھی۔ وہ جام سے ایک طویل گھونٹ بھرتے ہوئے مزید گویا ہوا۔

''پھولن دیوی نے جتنی اچھل کود کرنا تھی، کرلی۔ وہ پارلیمنٹ اور اپنے جلسوں میں جتنا بھونک چکی ہے، وہ سب یہاں لکھا ہے...... یہاں۔'' اس نے اپنے سینے پر بائیں جانب اشارہ کیا۔ ''اس کا علاج تو نشچت ہے۔''

''کیا کریں پھر اس کا؟'' دوسرے سیاست دان نے استفسار کیا۔

''جو بھی ہوگا، سب کے سامنے آجائے گا۔'' وہ معنی خیزی سے کہنے لگا۔

حاضرین کے اعصاب میں مزید کشیدگی پیدا ہوگئی۔

☆☆☆

جولائی کا اختتامی عشرہ بھی اپنی نصف مسافت طے کرچکا تھا۔ دارالحکومت میں پارلیمنٹ کے اجلاس میں دوپہر کے کھانے کا وقفہ ہوا تو پھولن اپنی نشست سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ حسبِ معمول کھانا اپنی رہائش گاہ پر ہی تناول کرتی تھی۔ گاڑی میں ایک کلومیٹر سے بھی کم فاصلہ آن ہی آن میں طے ہوگیا۔

یہ مختصر مسافت طے ہوتے ہی وہ گھر کے سامنے سڑک پر گاڑی سے باہر نکل آئی۔ پھولن کے مڑتے ہی گاڑی تیزی سے آگے بڑھ گئی۔ وہ رہائش گاہ کے داخلی دروازے تک پہنچ ہی نہ پائی تھی کہ بائیں سمت سے تین مسلح نقاب پوش برآمد ہوئے اور محافظ کو سنبھلنے کا موقع دیے بغیر دونوں پر ہی اندھا دھند گولیاں داغ دیں۔ پھولن کا محافظ شدید زخمی ہوگیا جبکہ اسے سر اور چہرے پر پانچ گولیاں لگی تھیں۔ اس کے بدن کو ایک جھٹکا لگا اور وہ بے دم ہوکر زمیں بوس ہوگئی۔

حملہ آور برق رفتاری سے اس گاڑی کی جانب بڑھ گئے جو رہائش گاہ کے داخلی دروازے کی بائیں دیوار کے

شروع میں ہی کھڑی کی گئی تھی۔ وہ ٹریفک پولیس کو ماہرانہ انداز میں چکما دیتے ہوئے گاڑی جائے واردات سے دو کلومیٹر دور چھوڑ کر فرار ہو گئے تھے۔

پھولن کو فی الفور قریبی رام منوہر لوہیا اسپتال لے جایا گیا جہاں ڈاکٹروں نے موت کی تصدیق کر دی۔ قتل کی خبر حکومتی ایوانوں میں پہنچتے ہی افسردگی کی فضا چھا گئی۔ تمام تر محترم اور معزز اراکین بھی مقتولہ کے احترام میں خاموشی سے کھڑے ہو گئے۔ ان میں اکثریت انہی افراد کی تھی جو اسے راستے سے ہٹا دینے کے شدید متمنی تھے۔

اس بہیمانہ قتل کی خبر دہلی سمیت ملک بھر میں پھیل گئی۔ عالمی ذرائع ابلاغ میں بھی یہی سرخی نمایاں تھی۔ سماج وادی پارٹی کے ہزارہا کارکنان رام منوہر اسپتال کے باہر جمع ہو گئے۔ فضا پرُحدت نعروں سے گونج رہی تھی۔

''خون کا بدلہ خون ہے۔''

''اٹل بہاری اور ایڈوانی...... اب سرکار چھوڑ دو۔''

''پھولن دیوی کی جے۔''

''ٹھاکر ہائے ہائے...... ٹھاکر ہائے ہائے۔''

''جب تک سورج چاند رہے گا...... پھولن تیرا نام رہے گا۔''

''یہ ٹھاکر...... یہ چور لٹیرے...... ہائے ہائے، ہائے ہائے۔''

پھولن کے حلقۂ انتخاب مرزا پور میں بھی ہزاروں مشتعل افراد سڑکوں پر نکل آئے۔ انہوں نے علاقہ بھر میں ٹریفک کا نظام درہم برہم کر دیا۔ سڑکوں پر دھرنے کے باعث کسی بھی گاڑی کو متحرک دیکھ کر پتھراؤ کا آغاز کر دیا جاتا۔ مقامی پولیس اور مظاہرین میں شدید کشیدگی پیدا ہو چکی تھی۔ مرزا پور کے علاوہ اتر پردیش کے دیگر قصبوں اور شہروں میں بھی ہڑتال کر دی گئی۔ کاروبارِ زندگی کلی طور پر معطل تھا۔ جلاؤ گھیراؤ کے واقعات میں تیزی سے اضافہ ہونے لگا۔ قانون نافذ کرنے والے اداروں کے اہلکار اور مظاہرین کی جھڑپوں میں درجنوں افراد زخمی بھی ہوئے۔

سیاسی فضا میں بھی غیر یقینی کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ مظاہرین وزیرِ اعظم اٹل بہاری واجپائی اور وزیرِ داخلہ ایل کے ایڈوانی سے مستعفی ہونے کا مطالبہ کر رہے تھے۔ سماج وادی پارٹی نے پھولن کے قتل کو ایک سیاسی سازش قرار دے کر تمام تر الزام بی جے پی پر عائد کیا۔ ان کا مؤقف یہ تھا کہ ملائم سنگھ یادیو اور پھولن کی حفاظت پر مامور پولیس دستوں کی تعداد میں ایک ماہ پہلے ہی کمی کر دی گئی تھی۔ ان مظاہروں، الزامات اور بیان بازیوں کا سلسلہ کچھ عرصے بعد از خود دم توڑ گیا۔

☆☆☆

پھولن کی آخری رسومات کے اختتام کے بعد بھی بھارتی اور عالمی ذرائع ابلاغ کے مختلف نمائندے اس کے آبائی گاؤں اور ''بہمائی'' میں منڈلاتے رہتے۔ بہمائی میں پھولن کے انتقام کی وحشیانہ داستان رقم تھی۔ اس روز گاؤں کے چوک میں چارپائی پر ایک معذور نوجوان لڑکی بیٹھی تھی۔ وہ کسی کی مدد یا سہارے کے بغیر اپنی جگہ سے حرکت بھی نہ کر سکتی تھی۔ ٹھاکر برادری کی یہ لڑکی اس حملے کے وقت کمسن تھی اور پھولن اور اس کے ساتھیوں کی یلغار میں زخمی ہو جانے کے باعث دائمی معذوری کا شکار ہو چکی تھی۔

صحافیوں کے ایک گروہ کو جب اس کے ''پس منظر'' سے واقفیت ہوئی تو وہ تیر کے مانند اس کی جانب لپکے۔

''تمہیں یہ زخم کیسے آئے تھے؟'' ایک صحافی نے دریافت کیا۔

لڑکی نے خالی الذہنی کے عالم میں اسے دیکھا اور ہونٹ کچلتے ہوئے کہنے لگی۔

''میں تو بس کھیل رہی تھی، پھر ایک آندھی آئی۔ میں تو بس کھیل رہی تھی۔''

''تمہیں پھولن دیوی کے متعلق کچھ یاد ہے؟ اس روز کیا ہوا تھا؟'' دوسرے صحافی نے استفسار کیا۔

''میں کھیل رہی تھی۔ وہ بہت غصے میں تھی، وہ بہت چیخ رہی تھی۔'' لڑکی نے اذیت سے آنکھیں میچ لیں۔

''کیا تم جانتی ہو، پھولن دیوی کو قتل کر دیا گیا ہے؟''

لڑکی نے اس سوال اور انکشاف پر اپنی نگاہیں آسمان کی جانب اٹھائیں اور عجیب سے انداز میں مسکرانے لگی۔

''اچھا ہوا وہ مر گئی۔ بہت اچھا ہوا وہ مر گئی۔ بہت ظالم تھی وہ۔ میرا یہ حال اسی کے کارن ہوا۔ وہ بہت ظالم تھی۔''

''نہیں...... وہ تو خود ایک مظلوم تھی۔ اس کی موت پر لاکھوں لوگ سوگوار ہیں۔'' صحافی نے اسے سمجھانا چاہا۔

''وہ ظالم تھی...... وہ ظالم تھی۔'' لڑکی اپنے جامد جسمانی اعضا کو نوچنے لگی۔

ذرائع ابلاغ کے وہ نمائندے ایک دوسرے کی جانب دیکھ کر رہ گئے۔

''ہاں...... وہ ظالم مظلوم تھی۔''

(ختم شد)

ماخذات

میں ہوں پھولن دیوی، از: پھولن دیوی

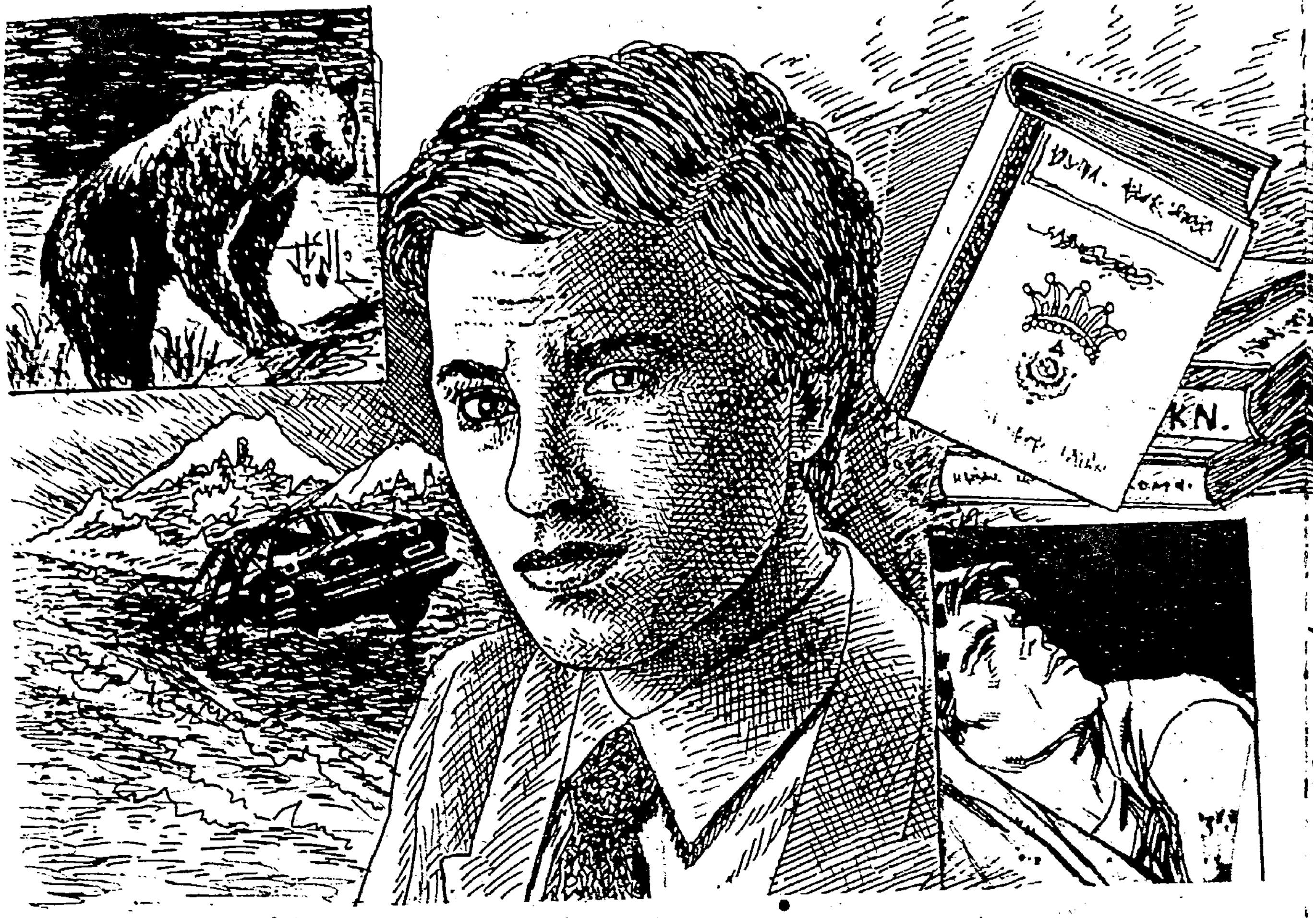

موذی ریچھ

صائمہ دانش

کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ انہیں دیکھ کر یا ان سے مل کر سامنے والا نہ تو خوش ہوتا ہے اور نہ ہی راہ و رسم بڑھانا چاہتا ہے... کیونکہ ان کی طبیعت میں گھمنڈ کا تاثر ہوتا ہے... غرور میں وہ غیر قانونی کام بھی کر گزرنا چاہتے ہیں... اور امید کرتے ہیں کہ دوسرا شخص ان کے اشاروں پر ناچے... مگر کبھی کبھی یہ سب کچھ بہت بھاری پڑ جاتا ہے اور جان پر بن آتی ہے۔

خود کو دوسروں سے برتر سمجھنے والے

گھمنڈی شخص کا ماجرا

بیریٹ انگرام، جو کہ اپنے ڈوفولڈ لانگ جونز اور سورل بوٹس پہنے ہوئے تھا، ریچھ کے گوشت کے ساسیج اور تلے ہوئے انڈے کا ناشتا کر رہا تھا کہ دروازے پر ہونے والی دستک پر اسے اٹھنا پڑا۔

"اوہ، مسٹر اسمتھ......! اندر آجائیں۔"

ریچھ کے گوشت کا ساسیج کھاتے ہوئے بیریٹ ابھی ابھی البرٹ اسمتھ کے بارے میں ہی سوچ رہا تھا۔

اس نے اونی کوٹ پہنے، کالر کھڑے کیے، نفیس نظر

آنے والے آدمی کو اندر آنے دیا اور دروازہ بند کر دیا۔
''تمہیں یہاں دیکھنے کی امید نہیں تھی۔''
''بھرررر۔'' البرٹ اسمتھ نے اپنے نرم چمڑے کے دستانے جیب میں ڈالے اور لکڑی کے چولہے کے اوپر ہاتھ تاپنے لگا۔ ''کب جدید بنو گے؟ میں واپس شہر جانے کی کوشش کر رہا ہوں۔''
''واپس جا رہے ہو؟ ہاں، میں تو جانتا بھی نہیں تھا کہ تم اوپر (پہاڑوں میں) ہو۔ کیبن کیسا ہے؟''
''میں صبح جلدی نکل پڑا تاکہ ٹریفک سے بچ سکوں۔'' البرٹ نے جواب دیا۔
''اس سڑک پر کوئی رش نہیں ہوتا۔'' بیریٹ نے کہا۔
''میرا مطلب ہے ہائی وے پر رش...... بیریٹ!''
''نہیں۔ بیریٹ نہیں...... تمہارے لیے میں مسٹر انگرام ہوں۔'' بیریٹ نے فوراً اس کی بات کاٹی۔ ''تم اور میں دونوں جانتے ہیں کہ تم یہاں صرف اسی صورت میں آسکتے ہو جب تمہیں کسی چیز کی ضرورت ہو۔ میں شاید پڑوسی ہونے کے ناتے تمہاری مدد کر دوں لیکن میں نہیں چاہتا کہ تم یہ سمجھو کہ ہم دوست بن سکتے ہیں۔''
''ٹھیک ہے مسٹر انگرام! ہم بات کو کاروباری رکھیں گے کیونکہ اگر میں تمہارا دوست ہوتا تو پوچھتا کہ تم انڈرویئر میں کیوں گھوم رہے ہو؟''
''میرے دوستوں کو پوچھنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ میں اپنے گھر میں ہوں۔ اندر کے کپڑے گھر کے لیے، باہر کے کپڑے باہر کے لیے۔''
جب البرٹ اسمتھ نے سڑک کے آخری سرے پر کچھ مخلوط ایکڑ زمین کے ساتھ ایک کیبن خریدا اور وہاں رہنا شروع کیا تو دوستی کا امکان ختم نہیں ہوا تھا۔ وہ محتاط سی دوستی جو کسی مقامی اور کسی باہر والے کے درمیان ہوتی ہے، جس میں سمجھوتے اور لین دین شامل ہوتے ہیں اور وقت گزرنے کے ساتھ ایک معقول ہمسایہ بننے کا امکان ہوتا ہے۔
جب اسمتھ نے کیبن کو بہتر بنانے اور سردیوں کے لیے تیار کرنے کا کام بیریٹ کو دیا تو ان کے تعلقات کافی خوشگوار تھے۔ دن میں اسمتھ، بیریٹ کا معاون اور شاگرد بنا رہتا اور شام کو مشروب پیش کرتا۔
مگر اس وقت بھی اسمتھ کا انداز کچھ گھمنڈی سا رہتا تھا۔ وہ بیریٹ کو اپنی نفیس رائے بازی سے چڑاتا رہتا، خاص طور پر وہسکی کے دوران۔ جیسے بیریٹ کو اعلیٰ درجے کی اسکاچ کی پہچان ہی نہ ہو۔

ایسا لگتا تھا جیسے اسے کینیڈین بلینڈڈ کے علاوہ کسی اور چیز کا علم نہیں۔
اسمتھ کی بیوی ایک عام سی عورت لگتی تھی۔ اس کے بارے میں بیریٹ کا خیال تھا کہ وہ جانوروں کے ساتھ اچھی ہوگی۔ انہیں پُرسکون کرنے والی اور بہلا پھسلا کر قابو میں رکھنے والی۔ وہ اکثر اپنے شوہر کے برے رویے کو نرم کرنے کے لیے درمیان میں آجاتی تھی لیکن وہ ہمیشہ موجود نہیں رہتی تھی اور اس کی موجودگی اتنی کافی نہیں تھی کہ اسمتھ کے اندر جلتی ہوئی دشمنی کو بجھا سکے۔ جتنا وقت بیریٹ، اسمتھ کے ساتھ گزارتا، اتنا ہی کم وہ شخص اسے پسند آتا۔
ایک بار کتابوں پر بات شروع ہوئی تو اسمتھ کی بیوی بھی وہاں موجود تھی۔ اس نے اور بیریٹ نے محسوس کیا کہ وہ بہت سی ایک جیسی کتابیں پڑھ چکے ہیں، مختلف موضوعات اور اصناف میں۔ اسمتھ نے تب بھی یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ اس کا پسندیدہ موضوع برتر ہے۔ صرف اس لیے کہ وہ اسے پسند تھا۔
''جاسوسی ناول...... جرائم کی کہانیاں...... سب سے زیادہ تسلی بخش وہ کہانیاں ہوتی ہیں جو کسی حل نہ ہونے والے معمے پر مبنی ہوں۔ وہ کہانیاں جو ایک مکمل جرم کو ظاہر کرتی ہیں۔''
''اور مکمل جرم کیا ہوتا ہے؟'' بیریٹ نے پوچھا۔
''بھئی وہی، جس میں مجرم بچ نکلتا ہے۔''
''لیکن اگر مکمل جرم کہانی میں ظاہر ہو جاتا ہے، تو ایک لحاظ سے وہ حل ہو گیا۔ ایک خاکہ کسی ممکنہ قاتل کے لیے اور ساتھ ہی تفتیش کار کے لیے بھی ایک نمونہ۔''
''شاید۔'' مسز اسمتھ نے کہا۔ ''مکمل جرم وہ ہو سکتا ہے جو بالکل بغیر کسی منصوبہ بندی کے ہو۔ میرے خیال میں منصوبہ بندی خود ہی ایک نشان چھوڑ جاتی ہے۔''
''ہاں۔'' اسمتھ نے اتفاق کیا۔ وہ اب اس گفتگو سے خوش لگ رہا تھا۔ ''لیکن پھر جرم ہوتا ہی کیوں ہے؟ اس کی وجہ کیا ہو سکتی ہے؟''
''کبھی کبھار سب کچھ ویسے ہی ہو جاتا ہے۔'' بیریٹ نے کہا تو سب ہنس پڑے تھے اور بیریٹ کو لگا کہ وہ اس محفل میں اپنی جگہ بنا چکا ہے۔ پھر بیریٹ نے اضافہ کرتے ہوئے کہا کہ اسے ایسے ناول پسند ہیں جن میں تھوڑی سی رومانویت ہو اور خوشگوار انجام۔ ''جیسے، جہاں اچھے لوگ جیتتے ہیں اور ہنسی خوشی زندگی گزارنے لگتے ہیں۔''
یہ بات سن کر اسے وہسکی کا ایک اور بڑا جام ملا، لیکن

اس کے ساتھ ہی اسمتھ کی تمسخرانہ مسکراہٹ اور مسلسل چبھتے جملے بھی ملے۔ اس کی بیوی نے کہا کہ یہ سن کر بہت اچھا لگا کہ ایک مرد کو رومانوی کہانیاں پسند ہیں۔ ''ویسے بھی......'' اس نے کہا۔ ''اگر رومانس نہ ہو تو تمہاری قتل کی کہانیوں کی آدھی وجوہات ختم ہو جائیں۔''

''تمہارا مطلب ہے بگڑا ہوا رومانس؟'' اسمتھ نے اپنا گلاس خالی کرتے ہوئے اس کی بات کی تصحیح کی تھی۔

''تو مسٹر اسمتھ! آپ کو کیا کام ہے، آپ کی گاڑی کہاں ہے؟''

''مجھے اپنی گاڑی اس کھائی سے نکلوانا ہے جہاں میں نے اسے ڈال دیا۔''

''آپ نے یہ کیسے کیا؟ حالانکہ زمین بالکل صاف تھی۔ ہاں، البتہ آج رات کا معاملہ الگ ہوگا۔ آج برفباری کی پیشگوئی کی گئی ہے۔''

البرٹ اسمتھ کی آنکھوں میں بیریٹ انگرام کے لیے غصے بھری چمک در آئی، پھر بولا۔ ''میں گاڑی موڑ رہا تھا اور مجھے لگا کہ زمین پر بس خشک پتیاں پڑی ہیں۔ بعد میں پتا چلا کہ وہ تو جیسے کوئی شیر کے پھندے جیسا گڑھا تھا۔''

کوئی کم ظرف آدمی اسمتھ کی عقل پر سوال اٹھا سکتا تھا، لیکن بیریٹ نے ایسا نہیں کیا۔ بس اتنا کہا۔ ''ہاں یاد ہے، میں نے تہ خانے کے گڑھے سے پانی نکالنے کے لیے نکاسی کا نالا کھودا تھا؟''

''ویسے وہ تہ خانے کا گڑھا ایک گندگی کا ڈھیر ہے اور میرا خیال ہے کہ اب بنیاد کا کام بہار تک رک جائے گا۔'' اسمتھ نے کہا۔

''مسٹر اسمتھ! بنیاد اور باقی تمام کام اس وقت تک رکیں گے جب تک آپ اجازت نامہ نہیں لے لیتے، جیسا کہ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں۔''

''اجازت نامہ......! اس سڑک پر تو کوئی آتا بھی نہیں۔ میں تو سمجھ رہا تھا کہ آپ جیسے سخت جان لوگ اپنی آزادی پر فخر کرتے ہیں۔ شہری نافرمانی اور قانون شکنی جیسے دلفریب الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً کیا یہ قانون نہیں کہ کسی گھر کے اتنے فاصلے کے اندر شکار منع ہے؟''

''آپ واقعی ریچھ کے بارے میں دوبارہ بات کرنا چاہتے ہیں؟'' بیریٹ نے سنجیدگی سے کہا۔

''آپ ہی نے کہا تھا کہ ریچھ سے گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ یہ آپ سے زیادہ آپ سے ڈرتے ہیں۔ یہ آپ ہی نے کہا تھا، پھر آپ نے اسے اپنے ہی صحن میں گولی کیوں مار دی؟''

''جی ہاں، اپنے ہی صحن میں...... وہ ریچھ پہلے بس گزر جاتا تھا، لوگوں اور ان کی چیزوں کا احترام کرتا تھا، جب تک کہ آپ نے مداخلت نہ کی۔ آپ نے میری بات نہیں مانی۔ نہ اپنی بیوی کی بات مانی۔ وہ سمجھ رہی تھی میں کیا کہہ رہا ہوں۔ جنگلی جانوروں کو خوراک دینا منع ہے۔ اس ریچھ کی موت کے آپ ذمے دار ہیں۔ ہاں، آپ...... آپ نے اسے اور موذی بنا دیا اور موذی ریچھ کو برداشت نہیں کیا جاسکتا مسٹر اسمتھ!''

بیریٹ کو ایک بار پھر غصہ آ گیا جب اسے یاد آیا کہ اسے اس ریچھ کو گولی مارنا پڑی تھی جو اس کے مرغیوں کے باڑے اور گھر کے آس پاس زیادہ دلیر ہوتا جا رہا تھا، کیونکہ اسمتھ نے اسے خوراک دینے کی عادت ڈال دی تھی۔ پھر اسے اسمتھ کی تقریر بھی سننا پڑی جب اس نے اس ریچھ کی لاش کو اپنی بیک ہولوڈر کی بالٹی سے لٹکتے دیکھا۔ اسمتھ یقیناً ایسے مناظر کا عادی نہیں تھا۔ خود بیریٹ کو بھی ہمیشہ یہ بات پریشان کرتی تھی کہ جب ایک ریچھ کی کھال اتار دی جائے

متحدہ عرب امارات میں مقیم

اردو قارئین کے لیے خوشخبری

جاسوسی ڈائجسٹ پبلیکیشنز کراچی (پاکستان)
کے چاروں رسائل

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ،
ماہنامہ پاکیزہ اور ماہنامہ سرگزشت

ایک فون کال کے فاصلے پر

آپ کال کریں، مطلوبہ رسالہ آپ کو گھر بیٹھے مل جائے گا۔
اردو بک ورلڈ ایف زیڈ سی۔ بزنس سینٹر، شارجہ پبلشنگ سٹی
فری زون، الزاہیہ، شیخ محمد بن زاید آر ڈی، ای 311 شارجہ

971504805734

URDU BOOKS WORLD FZC.
BUSINESS CENTRE
SHARJAH PUBLISHING CITY
FREE ZONE, AL ZAHIA,
SHEIKH MOHAMMED BIN ZAYED RD,
E311, SHARJAH, UNITED ARAB EMIRATES

اور سیدھا لٹکایا جائے تو وہ تقریباً انسان جیسا لگتا ہے۔

بیریٹ نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''اسمتھ! کچھ قوانین کو نظر انداز کرو تو نتیجہ بھگتنا پڑتا ہے۔ میں تمہارے اس محل پر کوئی کام نہیں کروں گا جب تک کہ تم اجازت نامہ نہ لے آؤ۔ سچ کہوں تو میری دعا ہے کہ زوننگ والے تمہیں مکمل طور پر بین کر دیں۔''

بیریٹ نے اپنی فلالین کی قمیص کے بٹن بند کیے اور اپنی لمبی اندرونی پینٹ کے اوپر پتلون پہنی۔ ''خیر، ابھی کے لیے، چلو تمہیں تمہارے گھر واپس لے چلتا ہوں۔ میں خود کھدائی کرنے والی مشین استعمال کر لیتا ہوں۔ ویسے بھی برفباری سے پہلے نالا صاف کرنا برا نہیں ہوگا۔''

اسمتھ، بیریٹ کے ساتھ بیک ہولوڈر کے شیڈ کی طرف چلتے ہوئے کہنے لگا کہ وہ کوئی محل نہیں، بس ایک عام سا گھر بنوانا چاہتا ہے مگر بیریٹ نے اس کی بات کو نظر انداز کر دیا۔

''دیکھو مسٹر اسمتھ! مجھے مشین کو اسٹارٹ اور گرم کرنا ہے، تھوڑا وقت لگے گا، تم پیدل واپس چلو۔ میں مشین کے ساتھ وہیں آجاؤں گا، پھر تم اور مسز اسمتھ چلے جانا۔''

''مسز اسمتھ اس بار میرے ساتھ نہیں ہیں۔''

''اوہ۔''

بیریٹ نے اسمتھ کو ڈرائیو وے سے سڑک کی طرف جاتے ہوئے دیکھا اور سوچنے لگا کہ آخر یہ آدمی اسے اتنا کیوں چڑاتا ہے۔ جب بیک ہولوڈر کا انجن چلنے لگا تو بیریٹ نے ایک کھینچنے والی زنجیر اور بیلچہ بالٹی میں رکھ دیے۔ حالات دیکھ کر لگ رہا تھا کہ جس شدید برفباری کی پیشگوئی کی گئی ہے، وہ دوپہر تک شروع ہو سکتی ہے۔ وہ یہ کام جلدی نمٹا دینا چاہتا تھا۔

مغرور بندے کو کھائی سے اور پھر قصبے سے جتنی جلدی ممکن ہو، باہر نکال دینا چاہیے۔

یہ بات کہ اسمتھ کے پاس پیسا تھا، بیریٹ کو پریشان نہیں کرتی تھی، لیکن یہ بات ضرور چبھتی تھی کہ وہ سمجھتا تھا جیسے پیسا ہر کسی کے لیے اتنا ہی اہم ہے جتنا اس کے لیے۔ وہ سمجھتا تھا کہ ہر کسی کو خریدا جا سکتا ہے۔ بیریٹ کو پیسا کمانے سے کوئی مسئلہ نہیں تھا، لیکن وہ ہرگز کسی قیمت پر اسمتھ کے منصوبوں میں شامل نہیں ہونا چاہتا تھا۔ کھدائی والی مشین کی سیٹ پر بیٹھا بیریٹ سڑک کے کنارے موجود جنگل کو دیکھ رہا تھا۔ وہ درخت جنہیں اس کے والد اور دادا جانتے تھے۔ کم از کم یہ جنگل، یہ پرانے درخت اور وہ پتھروں کی دیواریں باقی تھیں جو اس کے اور اسمتھ کے کیبنز کے بیچ میں تھیں لیکن کیبن، چاہے اب وہ جدید بنایا جا چکا ہو اور بجلی سے لیس، مگر اسمتھ کے کبھی کبھار کے دوروں کے لیے بھی ناکافی تھا۔

اب وہ ایک بڑی شاندار تین منزلہ عمارت بنانا چاہتا تھا جس میں ہر ممکن جدید سہولت موجود ہو۔ ایسی سہولیات جو اس وقت بالکل بھی سہولت بخش نہیں ہوں گی جب وہ خراب ہو جائیں گی اور ان کی مرمت کی ضرورت پڑے گی۔ اس گھر میں ڈیجیٹل ڈیوائسز اور آلات ہوں گے جن میں نازک الیکٹرانکس شامل ہوں گے اور اس کا مطلب یہ ہوگا کہ مرمت کے لیے جنوبی علاقوں سے ماہرین کو بلایا جائے گا جو اپنے شعبے کے علاوہ ہر چیز سے نابلد ہوں گے اور وہ بھی اس وقت جب کوئی بڑا یا غیر معمولی مسئلہ نہ نکل آئے۔

وہ لوگ نقشہ دیکھے بغیر ہی چلے آئیں گے، یہ جانے بغیر کہ وہ کہاں ہیں اور شکایت کریں گے کہ ان کا GPS گھنے درختوں اور پہاڑوں کے سائے میں کام نہیں کرتا۔ شاید اسی لیے پچھلی بار جب اسمتھ یہاں آیا تھا تو وہ ٹاؤن میں پہاڑی کے پیچھے سیل ٹاور لگوانے کی بات کر رہا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ اس سے پورے علاقے کو فائدہ ہوگا۔

جب بیریٹ سڑک کے آخری سرے پر پہنچا تو اسے پھر سے غصہ آنے لگا۔ اس نے سوچا، جلدی سے گاڑی نکال لے اور وہ خبیث یہاں سے دفع ہو جائے۔ کم از کم موسم سرما کی چھٹی تو ملے گی۔

بیریٹ نے نوٹ کیا کہ گاڑی ایک اسپورٹس کوپ تھی جو اس سڑک کے لیے بالکل بھی موزوں نہیں تھی (یہ وہی سڑک تھی جو اسمتھ کے کیبن خریدنے سے پہلے کلاس فور روڈ مانی جاتی تھی) اتنی بھی بری حالت میں نہیں تھی۔ دونوں پچھلے پہیے دھنسے ہوئے تھے لیکن اگر وہ چین باندھنے کی کوئی جگہ ڈھونڈ لیتا تو گاڑی آسانی سے نکالی جا سکتی تھی۔ نکاسی کے نالے سے اوپر کی طرف جہاں گاڑی پھنسی ہوئی تھی، وہاں تہ خانے کی بنیادیں تھیں۔ بالکل ویسی ہی جیسی بیریٹ نے چھوڑی تھیں۔

وہ خوش تھا کہ اسے اجازت نامے (permitting) کی آڑ میں اس منصوبے کو ملتوی کرنے کا بہانہ مل گیا تھا، یعنی تعمیر کا آغاز۔ وہ جان گیا تھا کہ اسمتھ کو تعمیر کے بارے میں یا کسی بھی چیز کے بارے میں کتنا کم علم ہے۔ اسمتھ کو صرف اس بات سے غرض تھی کہ اسے کیا چاہیے...... اور جتنا زیادہ بیریٹ کو اس کی ضروریات کا علم ہوتا، اتنا ہی وہ ان سے دور ہوتا جاتا۔ حالانکہ اسمتھ کو یہ لگتا تھا

کہ ہیربٹ اس کے مطابق چلے گا اور اس کی ضروریات پوری کرے گا۔

لیکن اب تک ہیربٹ صرف ایک بڑا کمرا ہی دیکھ پایا تھا جہاں اسمتھ نے کہا تھا کہ اسے بڑا کمرا چاہیے۔

اب وہ کیبن کے دروازے کی طرف بڑھا، یہ سوچتے ہوئے کہ وہ ہمیشہ کے لیے ٹال مٹول نہیں کر سکتا۔ بالآخر اسمتھ کسی اور کو تلاش کرلے گا جو وہ کام کر دے جو ہیربٹ نہیں کرنا چاہتا تھا۔

اس نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ ہیربٹ کو حیرت ہوئی کہ اسمتھ پہلے سے باہر نہیں تھا۔ اسے یقیناً کیبن سے نکلنے اور چلنے کے لیے بیتاب ہونا چاہیے تھا۔

ہیربٹ نے دوبارہ زور سے دستک دی۔

پہلی دستک کی نسبت یہ دوسری دستک زیادہ زوردار تھی۔ اسمتھ نے یقیناً اس کی کھدائی والی مشین کی آواز بھی سن لی ہوگی۔ جب وہ تیسری بار دستک دینے ہی والا تھا تو دروازہ کھل گیا اور ایک عورت نے اسے اندر آنے کو کہا کہ جلدی کرو، باہر بہت سردی ہے۔ حالانکہ باہر سردی نہیں تھی، لیکن ہیربٹ اندر چلا آیا۔

اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ وہ حیرت سے عورت اور اسمتھ کو دیکھنے لگا جو اپنی قمیص میں ہاتھ ڈال کر اسے درست کر رہا تھا۔

ہیربٹ کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ ’’تم تو شادی شدہ ہو۔‘‘ اس پر دونوں، اسمتھ اور عورت ہنس پڑے۔

’’کوئی بات نہیں۔‘‘ اس عورت نے کہا۔ ’’میں بھی شادی شدہ ہوں۔‘‘ اس بات پر ان دونوں نے ایک بار پھر قہقہہ لگایا۔

ہیربٹ تو اسی وقت باہر نکل جاتا اگر اسے میز پر کھلے ہوئے نقشے نہ نظر آتے۔ تجسس، شرمندگی پر غالب آ گیا۔ اسمتھ بھی میز کے پاس آ کھڑا ہوا۔ ’’یہ لیونا نے بنائے ہیں۔‘‘ اس نے عورت کو کھینچ کر اپنے قریب کرتے ہوئے کہا۔ ’’اچھے ہیں، ہیں نا؟‘‘

’’نقشے تو خوبصورت لگتے ہیں، لیکن یہ کس قسم کا گھر ہے؟ یہ تو لگتا ہے جیسے ڈزنی ورلڈ میں ہونا چاہیے۔‘‘

’’مسٹر انگرام! تمہارا کیا خیال ہے کہ میں ہمیشہ کے لیے اسی جھونپڑی میں رہوں گا؟‘‘

ہیربٹ نے اردگرد دیکھا۔ یہ جگہ کبھی اس کے خاندان کی ہرنوں کے شکار کیمپ ہوا کرتی تھی۔ اسے اپنے گھر جتنی ہی عزیز تھی۔ اگرچہ اس نے خود یہ کام کرایا تھا لیکن

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ

فروری کی کتنی دلچسپ داستانیں

جاسوسی کے شمارے کی دلچسپ کہانیاں

سرکتے لمحے

جرم کے راستے کتنے ہی طویل ہوں، انجام بہرحال ضرور ہوتا ہے۔ مجرموں کے تعاقب میں قانون اور قانون مجرم کے... سنگین لمحوں سے گزرتی داستان کے پُراسرار واقعات..... **امجد رئیس** کی کوشش و کاوش سے گنڈمی منظر پر ہونا ہے

سربکف

ماضی کی دھندلی پرچھائیوں کے تعاقب میں دوڑتے بھاگتے کردار کی پُراسرار داستان..... **طاہر جاوید مغل** کے قلم سے

دبر

قدم قدم پر بڑھتی مصیبتوں کا مقابلہ کرنے والے ایک دلیر نوجوان کی کوچہ گردی **حُسام بٹ** کے قلم سے سلسلے وار کہانی

سرورق کے رنگ

پہلا رنگ

پہاڑوں اور دریاؤں کے بیچ سفر کرتی ایک پُراسرار کہانی کے نشیب و فراز **عبدالرب بھٹی** کے قلم کے اسرار و رموز

دوسرا رنگ

پہاڑوں سے وابستہ ملکوتی حُسن کا دل فریب قصہ جو برسوں سے دیوانگی کی وجہ تھا **یعقوب بھٹی** کی دل نواز تحریر

ہر بار اسے دیواروں کی چمک اور عمدہ لکڑی کا کام چونکا دیتا تھا۔ پرانا چولہا اب کسی ریستوران والے باورچی خانے کے چولہے سے بدل چکا تھا۔ مسز اسمتھ کو جب وہ یہاں ہوتیں تو کھانا پکانے کا شوق تھا۔ اسے یاد آیا، وہ باغیچے اور خود سے جڑی بوٹیاں اگانے کی بات کیا کرتی تھیں۔

''مجھے یہ بات سمجھ نہیں آتی کہ یہ کافی کیوں نہیں؟ یہ جگہ آرام دہ ہے، پرسکون ہے۔ تمہاری بیوی کو بھی تو یہ ٹھیک لگتی ہے۔'' بیریٹ نے کہا۔

اسمتھ نے ناک چڑھاتے ہوئے کہا۔ ''میری بیوی کو یہ کیبن اچھا لگتا ہے لیکن وہ بھی مان جائے گی اور اگر نہیں مانی تو مجھے پروا نہیں اور تمہیں بھی نہیں ہونی چاہیے۔''

بیریٹ نقشے دیکھتا رہا۔ ''درخت کہاں ہیں؟''

''درخت؟''

''میرے گھر اور یہاں کے درمیان جو جنگل ہے۔''

''میری زمین پر جو درخت ہیں مسٹر انگرام! وہ کاٹے جائیں گے تاکہ مجھے ایک صاف نظارہ ملے۔ میں یہ گھر ضرور بناؤں گا، چاہے تمہیں پسند ہو یا نہ ہو۔ لیونا کے شہر میں جاننے والے لوگ ہیں، وہ یہ کام مکمل کر سکتے ہیں لیکن میں نے اسے فی الحال روک رکھا ہے۔ آؤ، اسے مقامی لوگوں سے بنوا کر دکھاتے ہیں۔ ٹھیک ہے نا مسٹر انگرام؟''

''یہ لیونا نے بنائے ہیں؟''

''ہاں، وہ آرکیٹیکٹ ہے۔''

''یہی واحد کاپیاں ہیں؟'' بیریٹ نے پوچھا۔

اسمتھ نے اثبات میں سر ہلایا۔

''کیا تم نے کسی اور سے یہاں اپنے منصوبے پر بات کی ہے یا زوننگ کے بارے میں کچھ پتا کیا، اس موبائل ٹاور کے بارے میں پوچھا؟''

اسمتھ نے آہ بھری۔ ''نہیں، ابھی نہیں کیا۔ میں حالیہ دنوں میں ذرا مصروف رہا ہوں۔ میں واقعی چاہتا ہوں کہ یہ سب کام تم دیکھ لو مسٹر انگرام! جس میں اجازت نامے بھی شامل ہیں۔ مجھے یقین ہے تم ان سب چیزوں کو بہتر طور پر سنبھال سکتے ہو۔ میں لیونا کے ٹھیکیداروں کے بجائے تمہارے ساتھ کام کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے پتا ہے تمہیں یہ تبدیلیاں پسند نہیں، نہ ہی شاید مجھے لیکن کاروبار، کاروبار ہوتا ہے۔ تو کیا کہتے ہو؟''

بیریٹ اب بھی تصویروں کو دیکھ رہا تھا، پھر اس نے اسمتھ کی طرف دیکھا اور اثبات میں سر ہلایا۔

''زبردست۔ تو چلو اب نکلتے ہیں۔'' اسمتھ اور لیونا نے اپنے اپنے کوٹ پہنے۔

''اوہ...... اور مجھے یقین ہے کہ مجھے آپ سے رازداری کی درخواست کرنے کی ضرورت نہیں۔ صرف آپ ہی جانتے ہیں کہ ہم یہاں تھے۔''

اسمتھ نے اپنا بٹوا نکالا اور پانچ سو ڈالرز کے نوٹ آگے بڑھائے۔ بیریٹ نے ہاتھ نہیں بڑھایا۔

''اور؟'' اسمتھ نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

''نہیں مسٹر اسمتھ! وہ بیس بیس کے نوٹ دے دیجیے جو میں نے دیکھے تھے۔ بس وہی آج کے اخراجات کے لیے کافی ہوں گے۔ ویسے بھی یہ سو سو کے نوٹ یہاں لوگوں کو شک میں ڈال دیں گے۔''

اسمتھ نے اسے تقریباً پسندیدگی سے دیکھا۔ ''ٹھیک ہے مسٹر انگرام! آگے چل کر اپنے وقت اور خرچ کے جو بھی بل ہوں، مجھے بھیج دیجیے گا۔''

بیریٹ نے بیس والے نوٹ تہ کیے اور جیب میں ڈال لیے۔ گاڑی کو گھسیٹنے اور کھائی میں دھکیلنے کی مناسب قیمت۔

''اچھا، اب آپ دونوں جا کر گاڑی میں بیٹھ جائیں۔ سب کچھ لے لیا آپ نے؟ سامان......؟ اب روانہ ہونے میں کوئی مسئلہ نہیں ہونا چاہیے۔'' اس نے نقشے لپیٹ کر اپنی جیکٹ میں رکھ لیے۔

بیریٹ، جس نے بے دلی سے اسمتھ اور اس کی محبوبہ کو دیکھا جو گاڑی میں سیٹ بیلٹ لگا کر بیٹھ گئی تھی۔ وہ زنجیر اور بیلچہ ہٹانے کے بعد بیک ہولوڈر میں چڑھ گیا۔ جب اس نے بالٹی کو اوپر اٹھایا تو اسے یاد آیا جب اس نے ریچھ کی لاش کو کھال اتارنے کے لیے اٹھایا تھا۔ اس کا کبھی اس ریچھ کو مارنے کا ارادہ نہیں تھا، لیکن وہ واقعی ایک مسئلہ بن چکا تھا۔

بیریٹ نے اپنی مشین گاڑی کی طرف بڑھائی اور پھر بالٹی کو گاڑی کی چھت پر نیچے کر دیا۔ اتنا دبایا کہ دروازے جام ہو گئے۔ بیریٹ کو پورا یقین تو نہ تھا لیکن اسے لگا جیسے اسمتھ اسے ایک اور سراہے جانے والی نظر سے دیکھ رہا ہو۔ حیران لیکن متاثر۔ پھر بھی مغرور۔

بیریٹ نے سوچا۔ جیسے وہ مجھے یہ سب کرنے کا طریقہ سکھا رہا ہو۔

بیریٹ اپنا کام کرتا رہا۔ اس نے بالٹی سے گاڑی کو چپٹا کر دیا، پھر اسے پیچھے کھینچ کر کھائی سے نکالا اور اسے اوپر پہاڑی پر لے جا کر گڑھے میں ڈال دیا۔ اس نے گاڑی کو مزید چپٹا کیا پھر بیک ہولوڈر سے مٹی کے ڈھیر واپس گڑھے میں ڈال دیے۔ وہ ہموار کرتا رہا، یہاں تک کہ زمین دوبارہ

ویسی ہی لگنے لگی جیسی گڑھا کھودنے سے پہلے تھی۔

بیریٹ نے سوچا، اس کمینے کے بٹوے میں ہزار ڈالرز تو ہوں گے۔

لیکن اسے پتا تھا کہ یہ سو سو کے نوٹ اسے اس آدمی سے جوڑ دیتے اور اس آدمی کو اس وقت اور جگہ سے۔

ویسے بھی پیسا محرک نہیں تھا۔

بیریٹ نے اپنا وعدہ پورا کیا اور نالی کو ٹھیک کر دیا اور نکالے ہوئے پتوں اور کیچڑ کو گڑھے کی بھرائی پر پھیلا دیا۔ اس نے سوچا کہ بعد میں وہ دو تین ٹرالی گوبر کی ڈالے گا تاکہ مسز اسمتھ کے باغ کے لیے زمین تیار کی جاسکے۔

مسز اسمتھ خوش مزاج اور خوبصورت خاتون تھیں لیکن یہاں وجہ رومانس نہیں تھی۔ بیریٹ اپنی زندگی سے ویسے ہی خوش تھا۔

درختوں سے گھرا ہوا، کسی کو جواب دہ نہیں۔

اور اب کوئی تعلق یا رشتہ......

مسز اسمتھ اور اس کے درمیان جو کچھ تھا، اسے یوں پیش کرنا جیسے پہلے سے کوئی منصوبہ بندی تھی، یہ غلط ہوتا۔ کیونکہ ایسا کچھ نہیں تھا۔ بس ایک مسئلہ تھا، جس کا ایک حل نکل آیا۔

پھر بھی، بیریٹ کے چہرے پر مسکراہٹ آگئی...... یہ سوچ کر کہ شاید مسز اسمتھ کو سچی محبت مل جائے اور وہ خوشی خوشی اپنی زندگی گزارے۔ کوئی اچھا، شریف آدمی جو اس کی قدر کرے۔ وہ دونوں گرمیاں اور ویک اینڈز اس کیبن میں گزارتے، باغبانی کرتے، کبھی کبھار جیت کو رات کے کھانے یا مشروبات پر بلاتے، جہاں وہ سب ایک دوسرے کو پہلے نام سے پکارتے اور اپنی پڑھی ہوئی کتابوں پر بات کرتے۔ مسز اسمتھ اور اس کا نیا محبوب ایسے پڑوسی بن جاتے جن پر بھروسا کیا جاسکتا ہو، جو جنگلات اور جنگلی حیات کے بارے میں عام فہم اپناتے۔

بیریٹ نے بغیر استعمال ہوئے کھینچنے کی زنجیر اور بیلچہ واپس شیڈ میں رکھے، پھر اپنی کھدائی کرنے والی مشین کا دروازہ بند کر دیا۔ گھر کی طرف چلتے ہوئے اس نے اپنی جیکٹ سے رول کیے ہوئے نقشے نکالے۔ اس کے لکڑی کے چولہے کی آگ ان کا کام تمام کر دے گی۔ وہ ایک لمحے کو رکا تاکہ اس برف کی تعریف کر سکے جو اب گہری اور مسلسل گر رہی تھی۔ یہ برفباری خاصی زبردست ہونے والی تھی۔ برف پہلے ہی درختوں پر جم چکی تھی، اس کے قدموں کے نشان پہلے ہی مٹ چکے تھے۔

⌘⌘⌘

ایک سادہ طبع نوجوان کی کہانی...... جو نامساعد حالات کی طنابیں گرفت میں رکھنا جانتا تھا۔

وادی مہران کے ایک دور دراز خطے سے جس کا تعلق تھا......

ایک پراسرار واقعے نے اس کی زندگی کا رخ ہی بدل دیا

جانگلی

جس میں محبت کی دیوانگی بھی ہے اور نفرتوں وعداوتوں کے دہکتے انگارے بھی۔

بہت جلد... سسپنس کے صفحات کی زینت

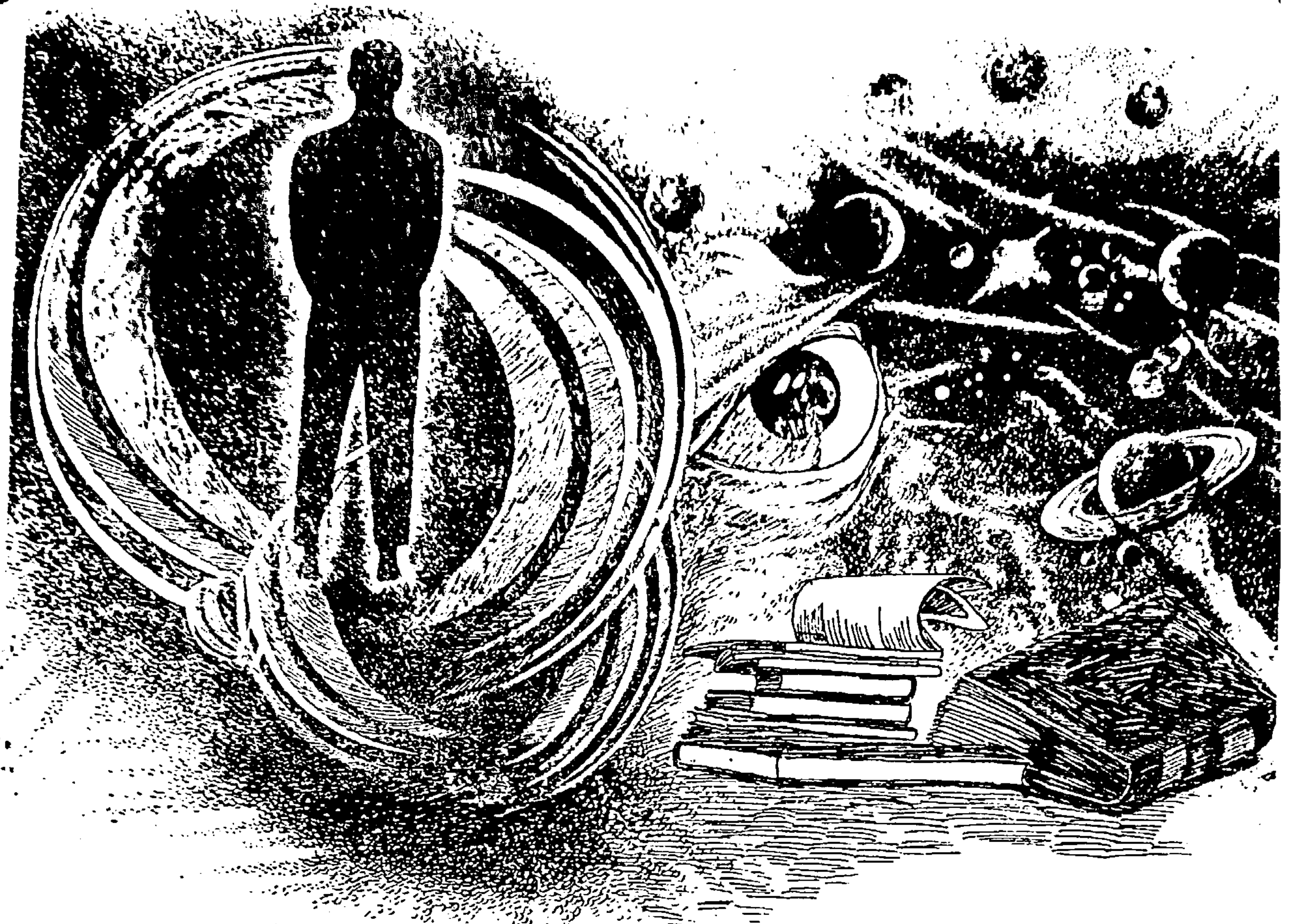

رمز شناس

نازیہ کامران کاشف

قسط نمبر 13

وہ صدیوں پر محیط ایک ایسا گہرا راز تھا جس کی جڑیں ہندوستان کی سرزمین سے لے کر مصر اور انگلستان تک پھیلی ہوئی تھیں اور ان جڑوں میں علم کا ایسا خزانہ دفن تھا جسے صدیوں کوئی تلاش نہ کرسکا... مگر کوئی ایسا بھی تھا جسے اس خزانے کی تلاش تھی۔ یہ بھی کائنات کے پوشیدہ رازوں سے پردہ اٹھانے کی اس رمز شناس کی ایسی کوشش تھی جس نے ان سوئی ہوئی شیطانی قوتوں کو گہری نیند سے جگادیا تھا، جن پر قابو پانا کسی عام انسان کے لیے ناممکن تھا مگر علم کی معراج پر پہنچ کر اس نے ان پُراسرار علوم کو عام کرنے کی ناقابلِ فراموش داستان رقم کردی اور اس نے تاریخ کے اوراق پر انہیں عبرت کا نشان بنادیا... صدیاں گزرتی رہیں اور ایک بار پھر اٹھارویں صدی کے اوائل میں ان قوتوں نے سر اٹھایا... مگر کیا مصر کے عیاد ابیب، انگلستان کے آرتھر اور ہندوستان کے کاویہ سے... مقابلہ کرنا آسان تھا...؟ ہاں عشق اور فرض کے درمیان اسے ہی کامیابی حاصل ہوئی جو سارے بھید جان گیا تھا۔

خوف میں لپٹی پوشیدہ رازوں کی کڑیاں ملانے والے

ایک رمز شناس کی سنسنی خیز داستان

Year 1773

قاہرہ۔ مصر

حلیمہ نے صبح اٹھ کر حسب معمول حاجرہ کے ساتھ گھر کے کاموں میں اس کا ہاتھ بٹانا شروع کر دیا۔

''کیا ہوا، آج تم مکتب نہیں جاؤ گی کیا؟'' حاجرہ اسے اطمینان سے آٹا گوندھتے دیکھ کر بولی۔

''جاؤں گی، آج مجھے دیر سے جانا ہے۔'' حلیمہ نے اسے جواب دیا اور دوبارہ آٹا گوندھنے میں مصروف ہوگئی۔

سچ تو یہ تھا کہ اسے عبداللہ کے جانے کا انتظار تھا۔ وہ اس کام میں دیر نہیں کرنا چاہتی تھی۔ کچھ دیر بعد عبداللہ عیاد کا ناشتا لے کر چلا گیا۔ عیاد ناشتے کے فوراً بعد مکتب روانہ ہو جاتا تھا اور عبداللہ اس کے کمرے سے برتن سمیٹنے کے بعد ہلکی پھلکی صفائی کر کے کمرے کو تالا لگا دیتا تھا۔ شام میں جب عیاد لوٹتا تو عبداللہ اسے چابی دے دیا کرتا تھا۔ حلیمہ کو یہ ساری باتیں حاجرہ سے پتا چلی تھیں۔ وہ عبداللہ کے لوٹنے کا انتظار کرنے لگی۔

کچھ دیر بعد عبداللہ برتن واپس لے آیا اور اپنی جیب سے چابی نکال کر دروازے کے پیچھے لگی کیل میں لٹکائی اور اپنی دکان پر روانہ ہوگیا۔ عیاد کے کمرے میں ایسی کوئی چیز نہیں تھی جسے چرایا جا سکتا اور نہ ہی عبداللہ کے دل میں کبھی ایسا خیال آیا تھا کہ اس کے گھر سے کوئی یہ چابی اٹھا کر عیاد کی چیزیں چوری کر لیتا۔

حلیمہ نے اطمینان سے سارے برتن دھوئے اور مکتب جانے کے لیے تیار ہونے لگی۔ آپا اور حاجرہ اس کے اس معمول سے واقف تھے لہٰذا انہوں نے اس کی تیاری پر غور نہیں کیا۔ جب اس نے اپنا حجاب پہن لیا تو وہ دبے پاؤں عبداللہ کے کمرے میں داخل ہوئی اور دروازے کے پیچھے سے اس چابی کو نکال کر اپنی مٹھی میں چھپا لیا۔ وہ آپا کو بتا کر مکتب جانے کے لیے باہر نکل آئی۔

گلی میں اِکا دُکا لوگ نظر آرہے تھے۔ وہ ان کے جانے کا انتظار کرنے لگی اور جیسے ہی گلی خالی ہوئی، اس نے جلدی سے چابی نکال کر عیاد کے کمرے کا دروازہ کھول لیا۔ وہ فوراً اندر داخل ہوئی اور دروازے کو دوبارہ بند کر دیا۔

عیاد کا کمرا صاف ستھرا پڑا تھا۔ عبداللہ ابھی ابھی صفائی کر کے گیا تھا۔ وہ اطمینان سے کمرے کا جائزہ لینے میں مصروف ہوگئی۔

'کتاب کہاں ہو سکتی ہے؟' وہ سوچنے لگی۔

عیاد کے کمرے میں زیادہ سامان نہیں تھا۔ وہ کچھ سوچ کر الماری کی طرف بڑھی۔ الماری میں عیاد کے کپڑے رکھے تھے۔ وہ کپڑوں کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگی اور پھر ایک دم سے چونکی۔ کپڑوں کے نیچے ایک کتاب چھپا کر رکھی گئی تھی۔ اس نے جلدی سے ہاتھ بڑھا کر اس کتاب کو نکال لیا۔

''یہ تو وہی کتاب ہے۔'' اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ غراض نے اسے اسی کتاب کی شبیہہ دکھائی تھی۔ اس نے کتاب کو بہت آسانی سے حاصل کر لیا تھا۔ اب اسے اور عیاد کو ایک ہونے سے کوئی نہیں روک سکتا تھا۔ وہ یہ سوچ کر مسکرا دی۔ اس نے احتیاط سے اس کتاب کو اپنے عبا کے اندر چھپایا اور عیاد کے کمرے سے باہر نکل کر اسے تالا لگا دیا۔ اب اس کے قدم تیزی سے چوک کی طرف بڑھ رہے تھے۔

چوک پر ہر وقت بگھیاں موجود ہوتی تھیں۔ وہ جلد از جلد اس مقام پر پہنچ کر یہ کتاب غراض کے حوالے کرنا چاہتی تھی۔

اچانک ہی اس کے ذہن میں ایک خیال ابھرا۔ کیوں نہ جانے سے پہلے وہ یونس کے کان میں بھی یہ بات ڈالتی جائے۔ المیرا کو تو ویسے ہی مرجانا تھا۔ لوگ تب بھی اسے عزت اور محبت سے ہی یاد کرتے، وہ بھلا ایسا کیوں ہونے دیتی۔ اس کے قدم خود بخود ہی عیاد کے مکتب کی طرف اٹھ گئے۔

وہ مکتب والی گلی میں داخل ہوئی تو حسب توقع وہاں محل کی بگھی موجود تھی۔ وہ اطمینان سے چلتے ہوئے بگھی تک پہنچی اور بگھی کے اندر جھانکنے لگی۔

''السلام علیکم یونس جناب! کیسے ہیں آپ؟'' اس نے یونس کو کسی کتاب میں مگن پایا لہٰذا خود ہی سلام کر لیا۔ وہ اسے دیکھ کر چونک گیا۔

''وعلیکم السلام! میں خیریت سے ہوں۔'' وہ اس کی بے تکلفی پر حیران ہوا۔

''آج پھر سے آپ انتظار کی سولی پر لٹکے ہوئے ہیں؟'' حلیمہ یہ کہتے ہوئے معنی خیزی سے مسکرائی۔

''آپ کے مضمون کی جماعت شروع ہو چکی ہے۔ آپ کو دیر نہیں ہو رہی؟'' یونس کو اس کی مسکراہٹ سخت زہر لگی۔

''نہیں۔ مجھے المیرا کی طرح تعلیم حاصل کرنے کی آڑ میں خفیہ محبت کو پروان چڑھانے کا شوق نہیں، اس لیے میں نے مکتب چھوڑ دیا ہے۔'' وہ طنزیہ لہجے میں بولی تو اس کی بات سن کر یونس کا خون کھول اٹھا۔

''کیا اول فول بک رہی ہو؟ جانتی بھی ہو کہ کس سے بات کر رہی ہو اور کس کے بارے میں کر رہی ہو؟ اپنی اوقات مت بھولو۔'' یونس دانت پیستے ہوئے بولا۔ اس وقت بگھی بھرے بازار میں کھڑی تھی۔ وہ کوئی تماشا نہیں کرنا چاہتا تھا۔

''مجھے اپنی اوقات اچھی طرح یاد ہے اور مجھ سے اس لہجے میں بات کرنے سے پہلے یہ سمجھ لیں کہ میں اب محل میں ملازمت نہیں کرتی۔ اگر آپ کو میری بات پر یقین نہیں ہے تو جماعت ختم ہوتے ہی اندر جا کر تسلی کر لیجیے گا۔'' وہ یہ کہہ کر یونس کے تاثرات دیکھے بغیر وہاں سے چلی آئی۔ اس کا کام ہو گیا تھا۔ اب یونس جانے اور المیرا۔

اس نے چوک پر پہنچ کر بگھی والے سے الفرافرہ جانے کا کہا تو وہ حیرانی سے اسے تکنے لگا۔

''کیا ہوا، ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟'' حلیمہ سخت لہجے میں بولی۔

''تمہیں پتا بھی ہے وہ یہاں سے کتنی دور ہے؟ پورے دن کا سفر ہے اور تم وہاں کیوں جانا چاہتی ہو؟ وہاں جانے پر تو پابندی ہے۔'' بگھی والا حیرت سے بولا۔

''پورے دن کا سفر ہے؟ مگر میں تو کل رات ہی......'' وہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑ کر خاموش ہو گئی۔ وہ یہ کیسے بھول گئی تھی کہ کل رات اس نے جو سفر کیا تھا، وہ کسی غیبی طاقت کی مدد سے کیا تھا۔

''اچھا تم مجھے یہ بتاؤ کہ تم مجھے وہاں لے جا سکتے ہو یا نہیں؟ بھلے پورا دن لگ جائے۔ میں تمہیں دگنا کرایہ دوں گی۔'' وہ سر جھٹک کر بولی۔

''لے تو جاؤں گا مگر وہ علاقہ آسیب زدہ مشہور ہے اور وہاں جانے پر پابندی ہے۔ تم وہاں کیوں جانا چاہتی ہو؟'' بگھی والا کچھ زیادہ ہی سوال کر رہا تھا۔

''تمہیں کرائے سے مطلب ہونا چاہیے۔ لے کر جا رہے ہو یا میں کسی اور سے بات کروں؟'' حلیمہ تیز لہجے میں بولی تو بگھی والے نے فوراً ہی بگھی کا دروازہ کھول دیا۔ حلیمہ اسے گھورتے ہوئے بگھی میں سوار ہو گئی۔

بگھی والا سچ ہی تو کہہ رہا تھا۔ وہ علاقہ واقعی آسیب زدہ تھا۔ جبھی تو وہ عمراض نامی جن اسے لمحوں میں وہاں تک لے گیا تھا۔

''اوہ...... اگر میں وقت پر واپس نہ لوٹی تو آپا پریشان ہو جائیں گی۔'' اسے اچانک ہی یاد آیا۔

''اُفوہ......کیا سوچ رہی ہو حلیمہ؟ تم انہیں جوابدہ نہیں ہو۔ ایسے بھی اب سے کچھ گھنٹوں بعد تم ایک عظیم خزانے کی مالک بننے والی ہو۔ اپنے شاندار گھر کے لیے۔'' یہ سوچ اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے کتاب کو مضبوطی سے تھام لیا۔

بگھی تیز رفتاری سے الفرافرہ کی طرف جانے والے راستے پر رواں دواں تھی۔ کوچوان کے مطابق وہ لوگ مغرب کے بعد ہی پہنچتے لہٰذا وہ سکون سے بیٹھ گئی۔

☆☆☆

جماعت ختم ہوئی تو المیرا رک کر اس کا انتظار کرنے لگی۔ ابھی عیاد نے المیرا کے قریب پہنچ کر سلام ہی کیا تھا کہ اچانک المیرا کا وہ پہرے دار جماعت کے اندر چلا آیا۔ المیرا اسے دیکھ کر چونکی۔

''چلیں، دیر ہو رہی ہے؟'' وہ عیاد پر ایک نظر ڈال کر المیرا سے مخاطب ہوا۔ جماعت خالی تھی اور کمرے میں صرف المیرا اور عیاد ہی موجود تھے۔

المیرا اس کی بات پر سر ہلا کر تیزی سے جماعت کے کمرے سے باہر نکل گئی۔ وہ پہرے دار تھوڑی دیر وہیں کھڑا عیاد کو عجیب سی نظروں سے گھورتا رہا اور پھر المیرا کے پیچھے جماعت سے باہر نکل گیا۔

عیاد نے مایوسی سے سر ہلایا۔ وہ المیرا کو حلیمہ کے بارے میں بتانا چاہتا تھا مگر آج اسے موقع ہی نہیں ملا تھا۔

اس نے جماعت سے باہر نکل کر یوسف سے اس پہرے دار کے اچانک اندر چلے آنے کا مقصد پوچھا۔ یوسف نے بتایا کہ پہرے دار کے مطابق المیرا کے والد کی طبیعت خراب ہو گئی تھی۔ وہ بہت جلدی میں تھا اور المیرا کو ساتھ لے کر ہی جانا چاہتا تھا۔ اتفاق سے اسی وقت جماعت بھی ختم ہو گئی تھی تو وہ جماعت کے اندر چلا گیا۔ المیرا کے والد کی بیماری کی خبر سن کر یوسف بھی اسے روک نہیں سکا تھا۔

عیاد نے معمول کے مطابق باقی جماعتوں کو نمٹایا اور یوسف کو مکتب بند کرنے کا کہہ کر واپس گھر کی طرف چل دیا۔ آج اس نے دوا خانے پر بیٹھنے کا ارادہ بھی ملتوی کر دیا۔ طبیعت پر عجیب سی بے چینی طاری تھی۔ شاید اس کی یہ کیفیت المیرا سے بات نہ کرنے کی وجہ سے ہوئی تھی۔

عبداللہ کے گھر پہنچ کر اس نے دروازہ بجایا اور اپنے کمرے کی چابی طلب کی۔ عبداللہ اس وقت گھر پر موجود نہیں تھا۔ اس کی بیوی نے کچھ دیر تک چابی ڈھونڈنے کے بعد عیاد کو اطلاع دی کہ چابی گھر میں موجود نہیں ہے۔ شاید عبداللہ اسے اپنے ساتھ دکان پر لے گیا ہے۔

عیاد کو شدید کوفت ہوئی۔ وہ باہر بیٹھ کر انتظار نہیں کرنا چاہتا تھا لہٰذا عبداللہ کی دکان پر چلا آیا مگر عبداللہ کے مطابق وہ چابی گھر پر چھوڑ کر آیا تھا۔ عیاد کی پریشانی دیکھ کر عبداللہ اس کے ساتھ گھر لوٹ آیا اور چابی تلاش کرنے لگا مگر چابی کہیں بھی موجود نہیں تھی۔

''حیرت ہے، چابی کہاں جاسکتی ہے؟ میں نے خود دروازے کے پیچھے لٹکائی تھی۔'' وہ اپنی بیوی سے مخاطب ہوا۔

''آپ فی الحال صحن میں کھلنے والے دروازے سے عیاد بھائی کو ان کے کمرے میں بھیج دیں۔ یہ چابی بھی کہیں نہ کہیں سے مل ہی جائے گی۔'' حاجرہ نے اسے تجویز دی۔

عبداللہ نے یہی کیا۔ وہ عیاد کو زیادہ دیر انتظار نہیں کرواسکتا تھا۔ وہ نہ جانے کب سے گلی میں کھڑا تھا۔

''عیاد بھائی! آپ پریشان نہ ہوں۔ میں وہ چابی بھی ڈھونڈ نکالوں گا، نہ جانے کہاں چلی گئی۔'' عبداللہ سخت شرمندہ تھا۔

''کوئی بات نہیں۔ اگر نہ بھی ملی تو قاہرہ میں کافی قفل ساز موجود ہیں، ان سے چابی بنوالیں گے۔'' عیاد نے اس کی شرمندگی کو دیکھ کر اسے تسلی دی۔ چابی گم ہوجانا کوئی ایسا مسئلہ نہیں تھا جس پر وہ ناراض ہوجاتا۔ عبداللہ اس کا ضرورت سے زیادہ خیال رکھتا تھا۔

عبداللہ کے جانے کے بعد وہ اپنے بستر پر نیم دراز ہوگیا۔ کل رات سے اس کے ساتھ عجیب وغریب واقعات ہی ہورہے تھے۔ پہلے حلیمہ کا آنا پھر اہرام کے پہرے دار کی گھورتی نظریں اور اس کے بعد چابی کا گم ہوجانا۔

''پہرے دار!'' اس کے ذہن میں اچانک جھماکا ہوا۔

''یہ ہے وہ عظیم ذمے داری جس کی وجہ سے تم یہاں تک لائے گئے ہو۔ تم نیکی کے پہرے دار ہو۔ ہمارا پچھلا پہرے دار اب رخصت لینے والا ہے۔ اس کی جگہ تم یہاں پہرا دو گے۔ تمہیں کیا کرنا ہے وہ ہمارا پہرے دار تمہیں خود سمجھائے گا...... صحیح وقت پر۔ تم اس کا انتظار کرنا اور اس کتاب کی حفاظت کرنا۔'' اس کے ذہن میں یہ الفاظ گونجے۔ وہ تو اس کتاب کو رکھ کر بھول ہی گیا تھا۔

وہ کچھ سوچ کر اپنی الماری کی طرف بڑھا مگر الماری کھولتے ہی اسے زوردار جھٹکا لگا۔ اس کے کپڑے بکھرے ہوئے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی نے اس کی الماری کی تلاشی لی ہو۔ اس نے جلدی سے کپڑوں کے نیچے چھپی کتاب کو تلاشنا چاہا مگر وہاں کتاب موجود ہی نہیں تھی۔ اس کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ اس نے لمحوں میں پوری الماری خالی کردی مگر وہاں کتاب کا نام ونشان تک نہیں تھا۔

ایسا کیسے ہوسکتا تھا؟ اس کے کمرے میں تو عبداللہ کے علاوہ کوئی نہیں آتا تھا۔ وہ صحن والے دروازے پر دستک دیتے ہوئے عبداللہ کو پکارنے لگا۔ دروازہ عبداللہ نے ہی کھولا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

''عیاد بھائی! میں آپ کے پاس ہی آنے والا تھا۔'' وہ پریشانی سے بولا۔

''میرے کمرے سے کچھ سامان غائب ہے۔ کیا آپ بتاسکتے ہیں کہ میرے کمرے میں آج کون آیا تھا؟'' عیاد کا لہجہ سخت ہوگیا۔

''سامان غائب ہے...... مطلب؟ آپ کا کمرا تو صبح میں نے ہی صاف کیا تھا۔ اس کے بعد تو آپ کے کمرے میں کوئی نہیں گیا اور نہ ہی جاسکتا ہے کیونکہ کمرے کی چابی تو میرے پاس ہوتی ہے۔'' عبداللہ بولا مگر پھر چونک پڑا۔

''اوہ...... آپ کے کمرے کی چابی تو غائب ہوچکی ہے اور سامان غائب ہونے کا مطلب تو یہی ہے کہ کسی نے چوری کی ہے مگر یہ سب کون کرسکتا ہے؟ آج ہی ساری مصیبتیں نازل ہونا تھیں۔'' وہ اپنا سر پکڑ کر وہیں بیٹھ گیا۔

''کیا ہوا، سب خیریت تو ہے؟ کیا اور بھی کوئی مسئلہ درپیش ہے آپ کو؟'' وہ عبداللہ کے چہرے پر پھیلی پریشانی دیکھ کر پوچھ بیٹھا۔

''جی، وہ حلیمہ بہن آپ کے مکتب پڑھنے گئی تھیں، تب سے واپس نہیں لوٹی ہیں۔ ہمیں لگا کہ شاید وہ محل تک گئی ہوں گی مگر وہاں پتا کرنے پر یہی معلوم ہوا ہے کہ وہ وہاں بھی نہیں گئیں۔ کیا آپ بتاسکتے ہیں کہ وہ مکتب سے کب نکلی تھیں؟ میری بیوی بتارہی تھی کہ وہ آپ کے مکتب میں زیرِ تعلیم ہیں۔'' عبداللہ بولا تو عیاد کے قدم وہیں جم گئے۔

''حلیمہ آپ کی بہن ہے؟'' عیاد حیرانی سے بولا۔

''جی...... وہ میری والدہ کی ایک قریبی عزیزہ کی بیٹی ہیں اور مجھے اپنی بہنوں کی طرح ہی عزیز ہیں۔ میری والدہ ان کی گمشدگی کی وجہ سے کافی پریشان ہیں۔'' عبداللہ بولا۔

''مگر وہ تو آج مکتب آئی ہی نہیں۔'' عیاد کے چہرے پر فکرمندی کے آثار نمودار ہوئے۔ یقیناً یہ کام حلیمہ کا تھا۔ وہ اس کے کمرے سے کتاب چوری کرنے کے بعد غائب ہوچکی تھی مگر اسے اس کتاب سے بھلا کیا حاصل ہوتا؟ عبداللہ سے کچھ دیر سوال جواب کرنے کے بعد وہ اپنے کمرے میں واپس لوٹ آیا اور بے چینی سے ٹہلنے لگا۔

اسے یہ کتاب کسی اہم ذمے داری کی وجہ سے سونپی

گئی تھی۔ وہ کتاب ان بزرگ کی امانت تھی اور اب اس کی الماری سے غائب ہو چکی تھی۔ وہ اس امانت کی حفاظت نہیں کر پایا تھا۔ اس نے نیل کو بلانے کا فیصلہ کیا اور آنکھیں بند کر کے اسے پکارا۔

''السلام علیکم عیاد! کیا ہوا؟ آج تم مکتب سے جلدی واپس چلے آئے۔ میں وہاں تم سے ملنے گیا تو تم جا چکے تھے۔'' اسے نیل کی آواز سنائی دی۔

عیاد نے اپنی آنکھیں کھولیں۔

''وعلیکم السلام...... نیل! مجھے ایک مسئلہ درپیش ہے۔ میں تمہیں ایک اہم بات بتانا چاہتا ہوں، امید ہے تم اسے راز رکھو گے اور میری مدد کرو گے۔'' عیاد سنجیدگی سے بولا۔

''ہاں، کہو۔ بےفکر رہو عیاد...... ! تمہارا راز، راز ہی رہے گا۔'' نیل اس کا لہجہ سن کر چونک پڑا۔

''پچھلے دنوں میرے ساتھ ایک عجیب سا واقعہ ہوا۔ پہلے تو میں اسے خواب سمجھا تھا اور میں نے اسے کوئی اہمیت نہ دی مگر اب مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے مجھ سے بہت بڑی غلطی ہو گئی ہے۔'' عیاد نے نیل کو اس رات اپنے سفر اور ان بزرگ سے ملاقات کے بارے میں بتانا شروع کیا۔ جیسے جیسے وہ بتا رہا تھا، نیل کے چہرے کے تاثرات تبدیل ہوتے جا رہے تھے۔

''عیاد! کیا تم نیکی کے پہرے دار ہو؟'' نیل جوش سے اس کی طرف بڑھا۔ ''تمہیں اندازہ بھی ہے کہ تمہیں کتنا بڑا عہدہ عطا کیا گیا ہے؟'' نیل حیرت اور خوشی کے ملے جلے جذبات کے ساتھ گویا ہوا۔

''کیا مطلب؟ تم جانتے ہو اس عہدے کے بارے میں...... اور وہ بزرگ کون ہیں؟ کیسے بنتے ہیں نیکی کے پہرے دار؟ ان کے مطابق وہ مجھے کچھ ذمے داریاں سونپنے والے تھے مگر انہوں نے مجھے کچھ بتایا ہی نہیں بلکہ مجھے شمس المعارف کا نادر نسخہ دے کر غائب ہو گئے۔ میں تو وہ نسخہ وہیں چھوڑ آیا تھا مگر حیرت انگیز بات تو یہ ہوئی کہ وہ نسخہ میرے کمرے میں خود بخود آ گیا۔ میں تو وہ کتاب دیکھ کر ڈر ہی گیا تھا۔'' عیاد سنجیدگی سے بولا۔

''میں سب جانتا ہوں۔ کیا تم ان بزرگ کا حلیہ بتا سکتے ہو؟'' نیل نے اپنا آخری شک بھی دور کرنا چاہا اور جواباً عیاد نے ہوبہو اراماں کا حلیہ بیان کیا تھا۔

''عیاد! میں بہت...... بہت خوش ہوں۔ مجھے یقین تھا کہ تم عام انسان نہیں ہو سکتے۔ اب مجھے سمجھ آ رہا ہے کہ تمہیں اس سرزمین پر کیوں لایا گیا ہے اور خوشی تو اس بات کی ہے

[illegible]
[illegible]
''تم بہت [illegible]
مجھے ان [illegible]
انجان بنتے ہوئے'' عیاد [illegible]

''جب تم اراماں سے ملو گے [illegible] نہیں بتا سکتا...... اور ویسے بھی تمہیں بہت جلد سب پتا چلنے والا ہے کیونکہ جنگ کی تیاری شروع ہو چکی ہے۔'' نیل بولا۔

''جنگ کی تیاری...... کیا مطلب...... کون سی جنگ؟'' عیاد الجھتا ہی چلا جا رہا تھا۔

''ہمارا قبیلہ ایک اہم جنگ کی تیاری کر رہا ہے۔ بس یوں سمجھو کہ ہم یہاں برسوں سے جمع ہی اس لیے تھے کہ ایک دن ہمیں یہ جنگ لڑنا تھی مگر اب وہ وقت قریب آ چکا ہے۔ عروخ کو خبر مل چکی تھی۔ بس ہمیں ایک شخص کا انتظار تھا جو آج ختم ہوا۔'' نیل نے الجھی ہوئی باتیں کیں۔

''کس شخص کا انتظار تھا اور آج تم یہ کس طرح کی باتیں کر رہے ہو؟ اس سے پہلے تو تم نے مجھے ایسی کوئی بات نہیں بتائی۔ نہ میرے کسی سوال کا صحیح طرح جواب دے رہے ہو؟'' عیاد ناراضگی سے بولا۔

''مجھے یہ باتیں کسی سے کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ مصر کی سرزمین نے بہت کچھ دیکھا ہے۔ بہت سے راز ہیں اور انہی میں سے ایک راز کا ہمیں حصے دار بنایا گیا ہے۔ ایک جنگ ہے جو صدیوں پہلے اس زمین پر لڑی گئی تھی اور اب دوبارہ اس جنگ کے شروع ہونے کے آثار ظاہر ہو رہے ہیں۔ پہلے یہ جنگ فرات قبیلے نے لڑی تھی۔ ان کے سردار اراماں برسوں سے اس سرزمین کی حفاظت پر مامور ہیں۔ اراماں وہی بزرگ ہیں جن سے تمہاری ملاقات ہوئی ہے۔ انہوں نے ہمیں بھی اس سعادت میں شامل کر لیا ہے۔ ان کے مطابق یہ جنگ دوبارہ ہو گی اور ہم فرات قبیلے کے ساتھ یہ جنگ لڑیں گے۔ عروخ کی خواہش تھی کہ وہ اس جنگ میں ہمارے قبیلے کو بھی شامل کریں اور اس بار ہماری درخواست منظور کر لی گئی ہے تو بس یوں سمجھو کہ یہ ہماری خوش قسمتی ہے۔'' نیل بولا۔

''آخر تم لوگوں کا دشمن کون ہے اور میرا اس جنگ سے کیا تعلق ہے اور جب سب تیار ہی ہیں تو پھر جنگ شروع کیوں نہیں ہو رہی؟'' جواب ملنے کے باوجود بھی سب کچھ عیاد کے سر پر سے گزر گیا۔

''نیکی کی دشمن بدی۔ دشمن تو برسوں سے یہی ہے۔

جنگ اس لیے نہیں شروع ہو رہی تھی کیونکہ ارامان کو نیکی کے پہرے دار کا انتظار تھا کہ جیسے ہی وہ ظاہر ہوگا، ہم سب اس کے ساتھ کھڑے ہو کر یہ جنگ لڑیں گے۔'' نیل نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

''یعنی میری سربراہی میں؟ مجھے تو کچھ خبر ہی نہیں کہ تم لوگوں کا مقصد کیا ہے؟ میں کیوں پہرے دار بنا اور نہ ہی میں کبھی کسی جنگ کا حصہ رہا ہوں، تو میں کیسے سربراہی کر سکتا ہوں؟'' عیاد نے نفی میں سر ہلایا۔

''عیاد! یہ جنگ تمہاری سربراہی میں ہی لڑی جائے گی۔ تمہارا ہی انتظار ہو رہا تھا۔ اس سے زیادہ تفصیل میں نہیں بتا سکتا۔ تمہیں نیکی کے اس پہرے دار سے ملنا ہوگا جو تم سے پہلے اس سرزمین پر موجود ہے اور اس ذمے داری کو سنبھالے ہوئے ہے۔ بس اتنا کہنا چاہوں گا کہ تم اس کتاب سے مدد لو...... تمہیں سب سمجھ آجائے گا۔'' نیل نے اسے اشارہ دیا۔

''کون ہے وہ شخص؟ وہ بزرگ بھی یہی کہہ رہے تھے کہ وہ خود مجھ سے ملاقات کرے گا مگر وہ تو آیا ہی نہیں...... اور جس اہم مسئلے کی وجہ سے میں نے تمہیں بلایا تھا، وہ بات تو بیچ میں رہ گئی...... نیل! وہ کتاب میرے کمرے سے چوری ہو چکی ہے۔'' عیاد نے دھماکا کیا۔

''کیا......؟ کیا کہہ رہے ہو عیاد......؟ یہ تو بہت خطرناک بات ہے۔ اب کیا ہوگا؟'' نیل بے یقینی سے بولا۔

''مجھے تو خود کچھ سمجھ نہیں آرہا۔ تمہیں اسی وجہ سے تو مدد کے لیے بلایا ہے۔'' عیاد کو معاملات کی سنگینی کا احساس ہو رہا تھا۔

''مجھے عروج کو مطلع کرنا ہوگا۔'' نیل پریشانی سے بولا۔

''کیا تم مجھے اس پہرے دار تک لے جا سکتے ہو جو پہلے سے یہاں موجود ہے؟ شاید وہی ہماری کوئی مدد کر سکے؟'' عیاد نے خود ہی حل پیش کیا۔

''اس کے لیے مجھے ان کی اجازت درکار ہوگی اور یہ کام عروج ہی کر سکیں گے کیونکہ اگر ایسا ممکن ہوتا تو ارامان خود ہی تمہیں ان سے ملوا دیتے۔ یقیناً اس کے پیچھے بھی کوئی وجہ ہوگی۔ مجھے اجازت دو، میں عروج کو ساتھ لے کر ان پہرے دار سے ملتا ہوں۔ ہمیں فوراً ہی اس مسئلے کا سدِباب کرنا ہوگا۔ میں کچھ دیر بعد دوبارہ آؤں گا۔'' نیل یہ کہہ کر اس کا جواب سنے بغیر ہی ہوا میں تحلیل ہو گیا۔

عیاد بے چینی سے کمرے میں ٹہلنے لگا۔ اسے اب نیل کی واپسی کا انتظار تھا۔ نیل کی باتوں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ معاملہ اتنا عام نہیں، جتنا وہ سمجھ رہا تھا۔

☆☆☆

Year 1773

قاہرہ۔ مصر

بگھی محل کی طرف بڑھ رہی تھی۔ یونس اور المیرا خاموش بیٹھے تھے لیکن بات کیے بغیر اس غلط فہمی کو کیسے دور کیا جا سکتا تھا؟

''المیرا! میں تم سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔'' بالآخر یونس نے ہی ہمت کر کے اس سے سوال کیا اور دل سے دعا کی کہ جو وہ سوچ رہا ہے، ویسا کچھ بھی نہ ہو۔ حلیمہ کی کہی گئی ہر بات غلط ثابت ہو۔

''جی پوچھیں۔'' المیرا نے گہری سانس لی۔

ایک نہ ایک دن تو یہ لمحہ اس کی زندگی میں آنا ہی تھا۔ جب اسے سب کے سامنے اپنی اور عیاد کی محبت کا اقرار کرنا تھا تو پھر کیوں نہ آج ہی وہ یہ اقرار کر کے اس بوجھ سے چھٹکارا حاصل کر لیتی۔ یونس اسے عیاد سے بات کرتے ہوئے دیکھ چکا تھا اور شاید اسی بارے میں سوال کرنے والا تھا۔

''مجھے غلط مت سمجھنا مگر اس دفعہ جب تم سے ملاقات ہوئی تو میں نے تمہارے رویے میں کافی تبدیلی دیکھی۔ پہلے تو مجھے یہ لگا کہ شاید یہ صرف مکتب نہ جانے کی وجہ سے ہے مگر مکتب جانے کے باوجود بھی تمہارا رویہ میرے ساتھ محتاط ہے۔ کیا اس بات کے پیچھے کوئی خاص وجہ ہے؟'' وہ اس سے براہِ راست عیاد کے بارے میں سوال کر کے اسے دکھ نہیں پہنچانا چاہتا تھا لہٰذا اسے محتاط طریقے سے سوال کرنا ہی بہتر لگا۔

وہ حلیمہ کی باتوں پر یقین نہیں کرنا چاہتا تھا اور نہ ہی یہ چاہتا تھا کہ المیرا کو یہ پتا چلے کہ وہ حلیمہ کے بہتان کو سچ جان کر اس سے اس طرح سوال جواب کر رہا ہے۔

''جی بالکل...... اس کے پیچھے بہت ہی خاص وجہ ہے اور وہ وجہ یہ ہے کہ میں عیاد کو پسند کرنے لگی ہوں۔ یونس! میں نے ایسے جذبات کبھی کسی کے لیے محسوس نہیں کیے۔ مجھے کوئی جذباتی قسم کی لڑکی مت سمجھیے گا۔ میں نے خود کو کئی دفعہ کٹہرے میں کھڑا کیا اور ہمیشہ ان احساسات کی توثیق کرنا چاہی۔ آپ کو ہمیشہ میں نے اپنے بہترین دوست کی جگہ کھڑا پایا۔ بابا کی پابندیوں کی وجہ سے میں نے مخالف جنس سے دوستی نہیں کی، نہ ہی کبھی کسی کو اپنا دوست بنایا۔ جیسا میں آپ کے لیے محسوس کرتی ہوں، ویسا میں عیاد کے لیے محسوس نہیں کرتی مگر جیسا میں عیاد کے لیے محسوس کرتی ہوں، ویسا میں

کسی کے لیے بھی محسوس نہیں کرسکتی۔ میں جانتی ہوں کہ آپ کو اندازہ ہو گیا ہے، اسی لیے آپ یہ سوال کر رہے تھے۔ میں پھر بھی چھپانا نہیں چاہتی کیونکہ میں نے کوئی جرم نہیں کیا ہے۔ جو بات آپ کو کچھ عرصے بعد پتا چلتی، وہ آج ہی پتا چل جائے تو ہم دونوں کے لیے بہتر ہوگا۔ میں بحیثیت دوست آپ سے تعاون کی درخواست کرتی ہوں اور یہ درخواست بھی کرتی ہوں کہ مجھے غلط سمجھنے کے بجائے میرے احساسات کو سمجھنے کی کوشش کیجیے گا۔ میرا اور عیاد کا رشتہ بہت پاکیزہ ہے۔ انہوں نے تو آج تک میرا چہرہ بھی نہیں دیکھا۔ میں نے بابا کی دی ہوئی اس آزادی کا کوئی فائدہ نہیں اٹھایا بلکہ ان کی عزت کا پاس رکھا ہے۔ اگر آپ کہتے ہیں تو میں آج ہی بابا سے بات کرکے آپ کے لیے اس مشکل کو آسان کردیتی ہوں۔'' وہ روانی میں اس کے دل کو روندتی ہوئی اس کے چہرے سے اس کی حالت کا اندازہ لگا کر اس کی مشکل کو آسان کرنے کی بات کر رہی تھی۔

''میں جانتا ہوں کہ آپ نے کوئی غلط قدم نہیں اٹھایا ہوگا۔ مجھے آپ پر یقین ہے المیرا......! لیکن اگر یہی بات تھی تو آپ نے اس رشتے کے لیے انکار کیوں نہیں کیا تھا؟'' وہ امڈتے آنسوؤں کو روکتے ہوئے سوال کرنے لگا۔ یہ سچ تھا کہ پہلی بار اس کے آنسو اس طرح نکلنے کو بے تاب تھے۔

''تب میں عیاد سے نہیں ملی تھی اور سچ پوچھیں تو ان سے ملنے کے باوجود بھی بہت عرصے تک میں ان جذبات سے انجان رہی تھی۔ یہ سب کیوں ہوا اور کیسے ہوا؟ میں خود نہیں جانتی۔ بس اتنا جانتی ہوں کہ ان کے بغیر زندگی گزارنا مشکل ہوجائے گا۔ آپ پریشان نہ ہوں...... میں بابا سے خود بات کرکے انہیں اپنی پسند سے آگاہ کروں گی تاکہ آپ کو کسی پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔'' وہ اسے تسلی دے رہی تھی یا اس کے دل کا خون کر رہی تھی۔

یونس خاموشی سے اسے تکنے لگا۔ کیا کہتا اسے۔ اس نے تو کوئی بہانہ بنایا ہی نہیں تھا بلکہ صاف صاف اسے اپنے دل کا حال کہہ سنایا تھا۔ نہ کوئی دلیل دی تھی، نہ صفائی پیش کی تھی اور نہ ہی کوئی جھوٹ بولنے کی کوشش کی تھی۔

''آپ ایسا کچھ نہیں کریں گی المیرا......! کیونکہ اگر آپ نے انکار کیا تو آپ کے والد کو شدید دکھ پہنچے گا۔ میں نہیں چاہتا کہ آپ کے کردار پر کسی بھی قسم کی کوئی آنچ آئے یا انہیں میرے والد صاحب کے سامنے رشتہ ختم کرتے ہوئے شرمندگی اٹھانا پڑے۔ کل میں واپس جا رہا ہوں۔ استنبول پہنچتے ہی میں خود انکار کردوں گا۔'' وہ سنجیدگی سے بولا۔

''مجھے امید ہے کہ ہم ہمیشہ اچھے دوست رہیں گے۔ میں آپ کو دکھ نہیں پہنچانا چاہتی تھی یونس......! مگر میں دل کے ہاتھوں مجبور ہو چکی ہوں۔'' المیرا کی آنکھوں میں بھی آنسو آگئے۔ اس نے آج تک کبھی کسی کو دکھ نہیں پہنچایا تھا اور اب اپنے سب سے اچھے دوست کو اس طرح غمزدہ دیکھ کر وہ اداس ہوگئی تھی۔

''میں جانتا ہوں المیرا......! اور ہم ہمیشہ اچھے دوست رہیں گے، یہ میرا آپ سے وعدہ ہے۔ میں ہمیشہ آپ کے لیے دعا کرتا رہوں گا۔'' وہ اسے یقین دلاتے ہوئے بولا۔

باقی کا راستہ خاموشی سے طے ہوا۔ محل پہنچ کر وہ اپنے کمرے میں چلی آئی مگر جب وہ دوپہر کے کھانے کے لیے

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور
ملک بھر میں گھر بیٹھے حاصل کریں
جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ
ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت
ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زرِ سالانہ بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ
پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 3000 روپے
بیرون ممالک کے لیے زرِ سالانہ 50,000 روپے
بیرون ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین
یا منی گرام کے ذریعے رقم ارسال کریں
رابطہ:
مرزا ثمر عباس
0301-2454188
جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی
مین کورنگی روڈ۔ کراچی

نیچے اتری تو کھانے کی میز پر ہونے والی گفتگو سے اسے اندازہ ہوا کہ یونس ان سب کو اپنی روانگی کے بارے میں مطلع کر چکا ہے۔ زبیر اس سے چند دن اور رکنے پر اصرار کر رہے تھے مگر وہ بضد تھا کہ اسے بہت ضروری کام کے سلسلے میں کل صبح ہی روانہ ہونا ہے۔

وہ اس گفتگو کا حصہ بنے بغیر خاموشی سے کھانا کھاتی رہی۔ کھانے کے بعد وہ اپنے کمرے میں آئی تو ملازمہ نے آکر اسے یہ پیغام دیا کہ زبیر بن دمام اسے اپنے کمرے میں بلا رہے ہیں۔ وہ ان کے کمرے میں پہنچی تو صبورہ بھی وہیں پر موجود تھیں۔ ان کے چہروں پر پھیلی سنجیدگی دیکھ کر اس کا دل دھڑکا۔

'کہیں یونس نے انہیں سچائی سے آگاہ تو نہیں کر دیا؟' وہ دل میں سوچنے لگی۔

''آؤ، بیٹھو۔'' زبیر نے اسے کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ انگلیاں مروڑتے ہوئے بیٹھ گئی۔

''کیا تمہارے اور یونس کے درمیان کوئی بات ہوئی ہے؟'' زبیر بن دمام نے سنجیدہ لہجے میں اس سے سوال کیا۔ وہ چونک پڑی۔

''نہیں، ایسا تو کچھ نہیں ہوا...... آپ سے کسی نے کچھ کہا؟'' وہ گھبراتے ہوئے بولی۔ کہاں تو اسے لگ رہا تھا کہ وہ بہادری سے ان کے سامنے اپنی محبت کا اقرار کر لے گی مگر ان کے اس طرح سنجیدگی سے سوال کرنے پر اس کا دل ڈوب جاتا تھا۔

''نہیں، مجھ سے تو کسی نے کچھ نہیں کہا مگر جب سے وہ مکتب سے واپس لوٹا ہے، بہت خاموش خاموش ہے اور پھر اس نے اچانک ہی جانے کا ارادہ کر لیا ہے۔ مجھے سچ سچ بتاؤ الميرا! کہیں تم نے کوئی بے وقوفی تو نہیں کی؟'' وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولے۔

''میں نے ان سے کچھ نہیں کہا۔ آپ چاہیں تو ان سے پوچھ سکتے ہیں۔'' وہ ہونٹ کاٹتے ہوئے بولی۔

''ٹھیک ہے۔ اگر تم کہتی ہو تو یقین کر لیتا ہوں اور ہاں، کل سے تمہارا مکتب جانا بند ہے۔ یہ مضمون مکمل کرنے کی اب کوئی ضرورت نہیں۔ میں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ یونس جب تک یہاں ہے، تب تک تم مکتب جا سکتی ہو مگر اس کے بعد میں تمہیں قطعی اکیلے گھر سے نکلنے کی اجازت نہیں دوں گا۔ اور ہاں، ایک اہم بات...... ہم قاہرہ چھوڑ کر استنبول منتقل ہو رہے ہیں۔ دو ماہ بعد تمہارا نکاح ہے۔ تم یہ محل چھوڑ کر رخصت ہو جاؤ گی تو ہم دونوں بالکل اکیلے رہ جائیں گے۔ اس لیے ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ استنبول منتقل ہو جانا ہی بہتر ہے۔ کم از کم تمہارے قریب تو رہیں گے۔ جب دل چاہے گا، تم سے مل سکیں گے۔ اسی سلسلے میں اگلے ہفتے ہم استنبول روانہ ہو رہے ہیں۔ وہاں چند محل فروخت کے لیے دستیاب ہیں۔ خریدنے سے پہلے میں تمہاری اور تمہاری والدہ کی رائے لینا ضروری سمجھتا ہوں۔ یہاں سے سامان بعد میں منتقل ہو جائے گا، لہٰذا اپنی ضرورت کی تمام اہم اشیا بکسوں میں رکھوانا شروع کر دو۔ تمہارے پاس صرف ایک ہفتہ ہے۔ ہم واپس نہیں لوٹیں گے۔'' وہ اسے تفصیل سے آگاہ کر رہے تھے اور اس کا وجود کسی زلزلے کی زد میں تھا۔

''مگر......'' وہ ان کی بات سن کر صدمے سے گنگ ہو گئی۔

''صبورہ......! تیاریاں شروع کرو۔'' انہوں نے ہاتھ اٹھا کر اسے بات کرنے سے روکا اور صبورہ کی طرف دیکھ کر دوٹوک لہجے میں بولے۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ وہ مزید کچھ نہیں سننا چاہتے۔

وہ اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی آئی مگر اسے ایک پل سکون نہیں تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی نے اس کا دل مٹھی میں قید کر لیا ہو۔ وہ بے چینی سے اپنے کمرے میں ٹہلنے لگی۔

'اب کیا کروں...... عیاد کو کیسے خبر کروں......؟ کیا بابا کو بتا دوں کہ میں...... نہیں اتنی جلدی نہیں۔ اس طرح تو وہ سمجھ جائیں گے کہ میں نے ہی یونس سے کوئی بات کی ہے۔ یا اللہ کیا کروں؟' وہ سوچ میں پڑ گئی۔

''کاش! حلیمہ تم یہاں ہوتیں، میں عیاد کو پیغام بھجوا دیتی۔ میری غیر حاضری اسے پریشان کر دے گی۔ بغیر کسی رابطے کے اس طرح قاہرہ چھوڑ کر جانا......!'' اس کی پریشانی بڑھتی ہی چلی جا رہی تھی۔

اسے اس بات کی فکر نہیں تھی کہ اس کے نکاح کی تاریخ قریب ہے کیونکہ وہ جانتی تھی کہ یونس انکار کر دے گا اور یونس کے انکار کرتے ہی زبیر بن دمام ترکی منتقل ہونے کا ارادہ یقیناً ملتوی کر دیتے اور قاہرہ واپس لوٹ آتے۔ لیکن ان سب چیزوں میں وقت لگنا تھا۔ جانے سے پہلے وہ عیاد کو مطلع کرنا چاہتی تھی تاکہ وہ اس کی طرف سے بدگمان نہ ہو اور اس کا انتظار کرے۔

''اس دفعہ مجھے ہی ہمت کرنا ہوگی۔'' وہ اچانک ٹہلتے ٹہلتے رکی۔

پہلے بھی تو وہ حلیمہ کے ساتھ محل سے چھپ کر باہر نکلا کرتی تھی مگر اس بار دن کے بجائے اس نے رات میں باہر نکلنے کا ارادہ کیا۔ دن میں تو پہرا سخت رہتا تھا مگر آدھی رات کے وقت اکثر پہرے دار اونگھ رہے ہوتے تھے۔ اگر وہ دن میں غائب ہوتی تو سب کو پتا چل جاتا تھا اور حلیمہ کی غیر موجودگی میں اس کا اس طرح باہر نکلنا سب کی نظروں میں آجاتا۔ بابا کو یقیناً اس پر شک ہو جاتا لیکن اگر وہ آدھی رات کو جاتی اور عیاد کو پیغام پہنچا کر اندھیرے میں ہی واپس آجاتی تو کسی کو بھی اس پر شک نہیں ہوتا۔

اسے عیاد کا گھر معلوم نہیں تھا مگر اس نے مکتب کے دروازے کے پٹ میں موجود جھری سے مکتب کے اندر ایک خط لکھ کر ڈالنے کا فیصلہ کیا تاکہ صبح جب یوسف مکتب کھولے تو وہ خط با حفاظت عیاد تک پہنچا دے۔ وہ جانتی تھی کہ مکتب میں سب سے پہلے یوسف آتا ہے۔ یہی ایک طریقہ تھا عیاد کو مطلع کرنے کا۔ وہ فوراً ہی کاغذ قلم لے کر بیٹھ گئی۔

☆☆☆

الفرافرہ کے ریگستان میں رات اتر چکی تھی۔

بگھی والے نے بگھی روکی اور حلیمہ کو وہاں اتارنے کے بعد فوراً ہی وہاں سے روانہ ہو گیا۔ زیادہ کرائے کے لالچ میں وہ وہاں آ تو گیا تھا مگر اس علاقے کے بارے میں مشہور آسیبی واقعات کی وجہ سے خوفزدہ تھا۔

بگھی کے جانے کے بعد حلیمہ نے چاروں طرف دیکھا۔ ڈر تو اسے بھی بہت لگ رہا تھا مگر اپنی خواہشوں کو پورا کرنے کی چاہ اس ڈر پر حاوی ہو چکی تھی۔

"مجھے بھلا ڈرنے کی کیا ضرورت ہے؟ یہاں جن جنات کا بسیرا ہے، وہ تو خود مجھے یہاں لے کر آئے تھے۔" وہ سوچنے لگی۔

"کیا نام بتایا تھا اس نے اپنا.....؟ ہاں غتراض..... غتراض.....!" اس نے غتراض کو پکارا مگر وہاں سے کوئی جواب موصول نہیں ہوا۔

"اوہ، ہاں..... وہ ایسے نہیں آئے گا۔ اس نے کہا تھا کہ مجھے صحرا میں بیٹھ کر وہ الفاظ دہرانے ہوں گے۔" اس نے اپنے عبا کی خفیہ جیب سے وہ پرچہ نکال کر ہاتھ میں پکڑ لیا۔

ریگستان اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا اور وہ گولائی میں گھومتی چٹانیں بہت ہی خوفناک معلوم ہوتی تھیں۔ وہ غتراض کی بتائی ہوئی جگہ پر جا کر بیٹھ گئی۔ اسے ایسا محسوس ہوا تھا جیسے اس کے آس پاس بہت ساری سرگوشیاں ایک ساتھ گونجی ہوں۔ اسے بے اختیار ہی جھرجھری آئی۔ ایک پل کے لیے تو اس کا دل کیا کہ وہ وہاں سے اٹھ کر بھاگ جائے مگر اس خزانے کی چمک اور عیاد کا سراپا اس کی نگاہوں کے سامنے گھوم گیا۔

اب جبکہ وہ اپنی منزل کے اتنے قریب پہنچ چکی تھی تو کسی بے وقوفی کی وجہ سے اس سے دور نہیں جانا چاہتی تھی۔ اس نے خود کو تسلی دی اور کتاب کو گود میں رکھ کر وہ پرچہ کھولا۔ اندھیرے کی وجہ سے اسے تحریر پڑھنے میں مشکل ہو رہی تھی۔ اچانک ہی وہ کاغذ خود بخود روشن ہو گیا۔ حلیمہ کے ہاتھ کانپنے لگے۔

"بس چند لمحے اور حلیمہ! پھر تم اس دنیا پر راج کرو گی۔" اس نے ایک بار پھر سے خود کو تسلی دی اور تحریر پر نظریں جما دیں۔ وہ تحریر کو دہرانا شروع ہوئی۔

وہ اپنی مرضی سے اپنی روح کو شیطان کے حوالے کر رہی تھی۔

وہ اس کے انعامات کو قبول کرنے کی قسم کھا رہی تھی۔

اس کے تحریر پڑھتے ہی چاروں طرف سے آندھی چلنا شروع ہو گئی۔ وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور خوفزدہ ہو کر ادھر اُدھر دیکھنے لگی۔ اچانک اسے ایسا لگا جیسے اس کے جسم میں خون کی جگہ گرم موم دوڑنا شروع ہو گیا ہو۔ وہ گرم گاڑھا مائع اس کی رگوں کو جلا رہا تھا۔

وہ ہذیانی انداز میں چلانا شروع ہوئی۔ کتاب اور وہ کاغذ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے جا گرے۔ اس کے جسم کو سرخ رنگ کی شعاعوں نے لپیٹ میں لے لیا تھا۔ الفرافرہ کا ریگستان اس کی چیخوں سے گونج رہا تھا۔

کچھ دیر اسی طرح تڑپنے کے بعد وہ بے جان ہو کر صحرا کی زمین پر گر پڑی۔ اس کے جسم نے ایک جھٹکا کھایا اور اچانک اس کی آنکھیں کھلیں مگر وہ آنکھیں حلیمہ کی آنکھیں نہیں تھیں۔ وہ غتراض تھا جو اس کی مرضی سے اس کے جسم میں سما چکا تھا۔ اس نے اپنی روح جس کے حوالے کی تھی وہ اسے لے کر جہنم کی وادیوں میں جا چکا تھا۔

غتراض اٹھ کر بیٹھ گیا اور کتاب اٹھا کر ہاتھ میں تھام لی۔ اس کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔ صدیوں پرانا بدلہ لینے کا وقت آ چکا تھا۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور ایک پراسرار طلسم دہرانے لگا۔ اس کے طلسم ختم کرتے ہی صحرا میں بھونچال آ گیا۔

غتراض نے اپنی آنکھیں کھولیں۔ صحرا ان خوفناک ہیئت والے جنات سے بھر چکا تھا۔ وہ ہزاروں کی تعداد میں تھے۔ اچانک ان کے بیچ سے "وہ" چلتا ہوا باہر نکلا اور

غزاض کے ساتھ آکر کھڑا ہوگیا۔ اس کے جسم کی کھال گہرے سرخ رنگ کی تھی۔ آنکھوں کی پتلیاں سفید رنگ سے عاری تھیں اور ان میں سیاہ چمکدار سیال بھرا ہوا تھا۔ اس کے دو لمبے دانت ہاتھی کی طرح منہ کے دہانے سے باہر نکل رہے تھے۔ اسے دیکھ کر سب نے سر جھکا لیا۔

''سردار!'' غزاض، حلیمہ کے روپ میں گھٹنوں کے بل جھک کر بیٹھ گیا اور کتاب اس کے سامنے پیش کر دی۔

''شاباش، غزاض! بدلہ لینے کا وقت آچکا ہے۔ صدیوں سے چھڑی اس جنگ کا اختتام قریب ہے۔ ہم انہیں دوبارہ جگائیں گے اور انسانوں کو آلودہ کر کے اس دنیا پر حکومت کریں گے۔ ارامان کی وجہ سے مجھے سزا کے طور پر اپنے سینگ گنوانے پڑے تھے۔ میری آنکھوں کو سیاہ آگ سے بھر دیا گیا تھا۔ وہ سب واپس لینے کا وقت آچکا ہے۔ ارامان کا متعین کردہ نیکی کا وہ نیا پہرے دار تو بہت بیوقوف نکلا، آسانی سے شکار ہوگیا۔ کتاب بھی ہمارے ہاتھ لگ گئی۔ یہ ہے وہ اصل نسخہ جس میں تقلیم کو جگانے کا طریقہ لکھا ہے۔

''سچ تو یہ ہے کہ ابو عباس نے دو نسخے تیار کیے اور ان میں سے ایک میں تقلیم کو جگانے کا طریقہ تحریر تھا۔ غزاض اسی طریقے کی مدد سے صدیوں پہلے انہیں دنیا میں واپس بلانے میں کامیاب ہوگیا تھا مگر ارامان کے حملے کی وجہ سے اسے یہ کتاب چھوڑ کر وہاں سے بھاگنا پڑا۔ اس کا جڑواں بھائی اس حملے میں مارا گیا اور ارامان کو لگا کہ وہ غزاض کو ختم کر چکا ہے۔ یہ کتاب ارامان کی تحویل میں چلی گئی تھی۔ جو نسخہ ہمارے پاس تھا اس میں یہ صفحات غائب تھے۔ ہم برسوں سے اس کتاب کو حاصل کرنے کی کوشش میں رہے مگر ارامان نے ہمیشہ مضبوط ترین پہرے دار متعین کیے۔

''تقلیم کی آرام گاہوں پر جو بھی پہرے دار تعینات ہوا، وہ نیکی کے اونچے درجوں پر فائز رہا مگر یہ کتاب صرف مسلمان پہرے دار کی تحویل میں رہی اور اس پر ارامان کا پہرا رہا۔ دوسرے پہرے داروں کو وہ صرف چند اہم تحریروں کی نقول ہی فراہم کرتا تھا۔ ہم نے بھی نیکی کے ہر پہرے دار کے ساتھ بدی کا ایک پہرے دار اس کی نگرانی پر لگایا ہوا تھا تاکہ آنے والے وقت میں جسے بھی یہ کتاب ملے، ہم بروقت اقدامات کر کے اس کتاب کو اپنی تحویل میں لیں۔ جب تک یہ کتاب یہاں کے سابقہ پہرے دار ابو ہریرہ کے پاس رہی، ہمیں مسلسل ناکامی کا سامنا کرنا پڑا مگر جیسے ہی یہ کتاب عیاد کو دی گئی تو ہمیں فوراً خبر ملی۔ عیاد اپنی ذمے داریاں قبول کرنے کے لیے تیار ہی نہیں تھا اور نہ ہی اس پر ارامان کا پہرا تھا۔ شاید وہ عیاد پر کچھ زیادہ ہی بھروسا کر بیٹھا۔ ہم اس کی اسی غلطی کے انتظار میں تھے۔

''اور پھر اس لڑکی کی وجہ سے ہمارا کام آسان ہوگیا۔ اس کے نفس نے ہمیں اس پر حاوی کر دیا اور نیکی کے پہرے دار المیرا پر نظر رکھ کر بیٹھے رہے۔ ارامان چاہتا تھا کہ عیاد اپنی ذمے داریاں قبول کر لے تاکہ وہ جلد از جلد ابو ہریرہ کو راج گڑھ بھیج سکے کیونکہ وہاں بالوناتھ کے بعد کوئی پہرے دار آیا ہی نہیں۔ جو بھی پہنچا وہ نیکی کے کمزور ترین درجوں پر تھا۔ اس علاقے میں ہمارا پلڑا بھاری ہے مگر ایڈنبرا اور قاہرہ میں ان کا پلڑا بھاری رہا مگر آج دیکھو...... غزاض کی وجہ سے ہم الفرافرہ میں داخل ہو چکے ہیں۔ وہاں الیگزینڈر اور سنکھیا بھی اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکے ہیں۔ کل پورے چاند کی رات ہے۔ میرے پہرے دار تمام شرائط پوری کرنے کے بعد اس تحریر کی مدد سے تقلیم کو دوبارہ جگا دیں گے اور پھر اس دنیا سے نیکی کا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو جائے گا۔'' وہ اپنے ساتھیوں کو اپنے مقصد سے آگاہ کر رہا تھا۔ اس کی شیطانی فوج قہقہے لگانے لگی۔

''غزاض! تم جانتے ہو ناکہ تمہیں کیا کرنا ہے؟'' وہ غزاض کی طرف پلٹا۔

''سردار! کل یہیں اسی صحرا میں، میں تمام شرائط پوری کر کے حاضر ہو جاؤں گا اور پھر دنیا کے ان تینوں مقامات پر ہمارے پہرے دار ایک ساتھ تقلیم کو جگائیں گے۔ آپ کی سزا ختم ہوگی سردار!'' غزاض بولا۔

''تم سب تیار رہو۔ میں باقی پہرے داروں کو یہ طلسم فراہم کر کے کل یہیں آجاؤں گا۔ الفرافرہ میں جو تقلیم دفن ہے، اسے غزاض آزاد کرے گا۔'' سردار یہ کہہ کر غائب ہوگیا۔

اس کے غائب ہوتے ہی اس کی فوج بھی غائب ہوگئی۔ غزاض بھی ہوا میں تحلیل ہوگیا۔ اس کا رخ قاہرہ کی طرف تھا۔

☆☆☆

عیاد کی پریشانی بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ اسے ایک ذمے داری دی گئی تھی اور اس پر بھروسا کیا گیا تھا۔ وہ کتاب اس کے پاس امانت تھی مگر وہ اس کی حفاظت نہیں کر پایا تھا۔ نبیل کی باتیں سن کر وہ مزید پریشان ہوگیا تھا۔

بے چینی بڑھی تو وہ دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ گلی میں خاموشی تھی۔ شاید سب سو چکے تھے۔ عبداللہ کے گھر سے بھی کوئی آواز نہیں آرہی تھی۔ عیاد نے آسمان کی طرف

دیکھا۔ آسمان صاف تھا، وہ ستاروں کو دیکھنے لگا۔ اللہ رب العزت نے کیسا خوبصورت جال بچھایا تھا۔ ہر شے سے اس کی عظمت، اس کی کاریگری جھلکتی تھی۔ اس نے بے اختیار ہی آنکھیں بند کرلیں۔

''یا اللہ میری مدد کیجیے! مجھے راستہ دکھائیں۔ مجھے شرمندگی سے بچائیں۔'' اس نے دل سے دعا کی۔

اچانک بند آنکھوں کے پیچھے وہ منظر واضح ہوا جب اسے خواب میں کائنات کے توازن کی تسویہ دکھائی گئی تھیں۔

عیاد فوراً اپنے کمرے میں واپس آیا اور مراقبے کی حالت میں بیٹھ گیا۔ اسے یہ علم کچھ عرصہ پہلے ہی عطا کیا گیا تھا جب اس نے کرناک کے ستونوں کے درمیان کائنات کے توازن کی تسویہ دیکھی تھیں۔ وہ اس علم کی مشق نہیں کرسکا تھا کیونکہ اب تک اسے اس عطا کا مقصد سمجھ نہیں آیا تھا مگر آج لگ رہا تھا جیسے اس عطا کا مقصد یہی ہو۔

اس نے اپنی آنکھیں بند کیں اور حلیمہ کا تصور کرنا شروع کیا۔ اچانک ہی بند آنکھوں کے پیچھے ایک منظر واضح ہوا۔ حلیمہ اس کے کمرے میں داخل ہوئی تھی اور چاروں طرف دیکھنے کے بعد وہ اس کی الماری کی طرف بڑھی۔ اس نے عیاد کے کپڑے الٹ پلٹ کر دیکھے اور وہ کتاب اٹھا کر کمرے سے باہر نکل گئی تھی۔ اس کے بعد وہ اندھیرا کے پہرے دار سے باتیں کرتی نظر آئی اور پھر اس نے چوک پر جاکر بگھی والے سے الفرافرہ جانے کا کہا اور پھر اس بگھی کو کالے سایوں نے گھیر لیا۔

اس کے بعد کیا ہوا، یہ دیکھنے میں اسے مسلسل ناکامی کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ اس نے آنکھیں کھولنے کے بعد دوبارہ بند کیں اور اب منظر تبدیل ہوچکا تھا۔

حلیمہ اس رات اس کے کمرے سے باہر نکلنے کے بعد مختلف گلیوں سے ہوتی آگے بڑھ رہی تھی۔ اچانک وہ رکی۔ گلی میں ایک آدمی کھڑا تھا۔ اس نے خود کو کالے کپڑے سے ڈھک رکھا تھا۔ عیاد نے اس آدمی کا چہرہ دیکھنے کی کوشش کی مگر وہ ناکام رہا۔

ذہن کی سلیٹ ایک بار پھر خالی ہوچکی تھی۔

عیاد نے آنکھیں کھولیں۔

اس بات کی تصدیق تو ہوچکی تھی کہ کتاب حلیمہ نے ہی چوری کی تھی اور وہ بھی اس پراسرار آدمی کے کہنے پر مگر وہ آدمی تھا کون اور حلیمہ اس کتاب کو لے کر الفرافرہ کیوں گئی تھی؟

عیاد کے چہرے پر فکر کی لکیریں تھیں۔ اچانک اس کے ذہن میں جھماکا ہوا۔

''قاہرہ کا دجال!'' اس کا قد کاٹھ بھی بالکل اس آدمی جیسا تھا جو حلیمہ سے بولا تھا۔ عیاد اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ یقیناً یہ اسی آدمی کا کام ہے لیکن عیاد چاہ کر بھی اس تک پہنچ نہیں پایا تھا اور اس بار بھی ایسا ہی ہوا تھا۔

وہ ایک ارادہ کرکے اٹھا اور اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ اس کے قدم تیزی سے یوسف کے گھر کی طرف بڑھ رہے تھے۔ یوسف کو پتا تھا کہ اس شخص کا گھر کہاں تھا۔ عیاد کو ہر حالت میں وہ کتاب واپس چاہیے تھی۔ اس نے یوسف کے گھر پہنچ کر گھر کا دروازہ بجانا شروع کیا۔

''کون ہے؟'' کافی دیر بعد یوسف کی والدہ کی آواز دروازے کے دوسری طرف سے اُبھری۔ یوسف کے گھر والے سو چکے تھے اور دروازے پر ہونے والی دستک سے اس کی والدہ کی آنکھ کھل گئی تھی۔ عیاد کو اس بات کا احساس تھا کہ بہت رات ہوچکی ہے مگر اس وقت اس کا کتاب حاصل کرنا زیادہ ضروری تھا۔

''السلام علیکم...... میں عیاد! یوسف کو جگائیں۔ مجھے بہت ضروری کام ہے۔'' عیاد بولا تو یوسف کی والدہ بغیر کوئی سوال جواب کیے فوراً یوسف کو جگانے چل دیں۔ عیاد کے ان پر بہت احسانات تھے۔ وہ یوسف کے معاملے میں عیاد پر مکمل بھروسا کرتی تھیں۔

تھوڑی دیر بعد یوسف باہر نکلا۔ اس کی نیند میں ڈوبی آنکھیں اور چہرے پر پانی کے چھینٹے اس بات کا ثبوت تھے کہ وہ گہری نیند سے جاگا تھا۔

''السلام علیکم عیاد! کیا ہوا؟ سب خیریت تو ہے؟'' وہ فکرمند لہجے میں بولا۔

''وعلیکم السلام! نہیں، خیریت نہیں ہے اور مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔'' عیاد بولا۔

''ہاں، کہو۔'' یوسف اس کا لہجہ سن کر مزید فکرمند ہوا۔

''مجھے اس قاہرہ کے دجال کے گھر لے چلو۔'' عیاد بولا تو یوسف اس کی بات سن کر اچھل پڑا۔

''کیا...... کیا کہہ رہے ہو؟ تم ٹھیک تو ہو؟'' یوسف کی نیند اڑ چکی تھی۔

''میری ایک کتاب چوری ہوگئی ہے اور مجھے شک ہے کہ وہ اسی کے پاس ہے۔ میرے لیے وہ کتاب بہت اہم ہے یوسف! دیر مت کرو۔'' عیاد کافی پریشان نظر آرہا تھا۔

''مگر عیاد......! وہ کتاب کیسے چوری کرسکتا ہے۔ مجھے تو وہ ان پڑھ معلوم ہوتا ہے اور رات کے اس پہر اس کے گھر جانا...... یہاں تو کوئی دن میں بھی اس طرف نہیں

جاتا۔'' یوسف تھوک نگلتے ہوئے بولا۔
''یوسف! تم صرف دور سے اس کے گھر کی نشاندہی کردو، باقی میں دیکھ لوں گا۔'' عیاد بے صبری سے بولا۔
''اچھا، تم رکو۔ میں والدہ کو بتا کر آتا ہوں۔'' یوسف اس کی پریشانی دیکھ کر راضی ہوگیا۔
کچھ دیر بعد وہ یوسف کے ہمراہ مختلف گلیوں سے ہوتا ہوا اس پراسرار شخص کے گھر کی طرف بڑھ رہا تھا۔
''وہ رہا اس کا گھر۔'' یوسف نے ایک گلی میں داخل ہوتے ہی دور نظر آتے گھر کی طرف اشارہ کیا۔ اس کے ہاتھ کانپنا شروع ہو چکے تھے۔ ویسے تو وہ کافی بہادر تھا مگر اس شخص کا جو خوف بچپن سے اس کے دل میں بیٹھا تھا، وہ وقت کے ساتھ کم ہونے کے بجائے مزید بڑھ گیا تھا۔
''ٹھیک ہے، اب تم جاؤ...... اور ہاں، کل میں مکتب نہیں جاؤں گا۔ تم دیکھ لینا۔'' عیاد یوسف سے مخاطب ہوا۔
''عیاد! میں چلتا ہوں تمہارے ساتھ...... اکیلے نہیں جانے دوں گا تمہیں اس کے گھر۔'' یوسف نے بہادر بننے کی کوشش کی۔
''نہیں...... تم جاؤ۔ میں کافی ہوں اس کے لیے۔'' عیاد نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے یقین دلایا۔
''اچھا، میں یہیں کھڑے رہ کر تمہارے لوٹنے کا انتظار کرتا ہوں۔'' یوسف کا دل اسے اکیلے چھوڑنے پر راضی نہیں ہو رہا تھا۔
''میں نے کہا نا، اس کی ضرورت نہیں ہے۔ تم جاؤ'' عیاد زور دے کر بولا تو یوسف سر ہلا کر اپنے گھر کی طرف چل دیا۔
عیاد نے یوسف کے جانے کے بعد وہیں کھڑے ہو کر اس گھر کا جائزہ لیا۔ رہائشی کالونی کے بیچوں بیچ اس کا گھر تھا مگر پھر بھی کوئی اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا بلکہ یوسف کے مطابق اس نے دہشت پھیلا رکھی تھی۔
عیاد اس کے گھر کے دروازے کے قریب پہنچ کر رک گیا اور دروازے پر مسلسل دستک دینا شروع کر دی۔ اسے ذرہ برابر بھی خوف محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ اس شخص نے اس کی کتاب چوری کی تھی، حلیمہ کو ورغلایا تھا۔ اس شخص کا علاج کرنا ضروری ہوگیا تھا۔
''کون ہے؟'' اندر سے وہی سرگوشی نما آواز ابھری۔ شاید وہ جاگ رہا تھا۔
''دروازہ کھولو۔ میں ہوں عیاد!'' عیاد کا لہجہ نہ چاہتے ہوئے بھی سخت ہوگیا تھا۔ اندر خاموشی چھا گئی۔
''دروازہ کھولو ورنہ مجھے اسے کھلوانا اچھی طرح آتا ہے اور میری طرح تم بھی نہیں چاہو گے کہ رات کے اس پہر گلی میں کوئی شور شرابا ہو یا تماشا لگے۔'' عیاد تیز لہجے میں بولا۔
اس کی بات سن کر اندر کھٹ پٹ شروع ہوئی۔ بالآخر دروازہ کھول دیا گیا۔ وہ اپنے اس خوفناک سراپا کے ساتھ دروازے میں کھڑا اسے گھور رہا تھا۔
''میں نے کہا تھا آئندہ میرا پیچھا نہ کرنا۔'' وہ تنبیہی لہجے میں بولا۔
''تم نے مجھے مجبور کر دیا ہے کہ میں تمہارے پیچھے آؤں۔ کہاں ہے میری کتاب؟'' عیاد نے اس کی گردن دبوچ لی۔
''عیاد! یہ غلطی مت کرو۔ میں تمہیں نقصان نہیں پہنچانا چاہتا اور کس کتاب کی بات کر رہے ہو تم؟'' وہ غرایا۔
''تم مجھے نقصان پہنچا بھی نہیں سکتے...... وہی کتاب جو تم نے حلیمہ سے چوری کروائی اور اب تم انجان بن رہے ہو۔ میں تمہیں ایسی سزا دوں گا کہ تمہاری روح تک کانپ اٹھے گی۔'' عیاد نے اسے گھر کے اندر دھکیل کر دروازہ بند کر دیا۔
''عیاد! آخری بار کہہ رہا ہوں، مجھ سے دور رہو۔ میں نے کہا نا کہ میں تمہیں نقصان نہیں پہنچانا چاہتا۔'' اس شخص کا لہجہ سخت ہوگیا۔
عیاد کو اس کے لہجے پر شدید طیش آیا۔ وہ تیزی سے اس کی طرف بڑھا اور اسے گریبان سے پکڑ کر دیوار سے لگا دیا۔
''میں بھی آخری بار پوچھ رہا ہوں کہ کتاب کہاں ہے؟ سیدھی طرح بتا دو ورنہ مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔'' عیاد غرایا۔
اچانک عیاد ہوا میں اڑتا ہوا دیوار سے ٹکرایا اور نیچے گر پڑا۔
''مجھے مجبور مت کرو عیاد!'' وہ شخص اسے گھورتے ہوئے بولا۔
عیاد اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ اس کے چہرے پر حیرت کے آثار تھے۔
''تو تم جادو دکھانا چاہتے ہو؟ تمہیں سبق سکھانا ضروری ہوگیا ہے۔'' عیاد کے ہاتھ ہوا میں بلند ہوئے تھے، ساتھ ہی وہ شخص بھی ہوا میں بلند ہوا اور ایک طرف رکھے کاٹھ کباڑ پر جا کر گرا۔ عیاد نے صحن میں رکھی کلہاڑی اٹھائی اور تیزی سے اس شخص کی طرف بڑھا جو اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔
''عیاد! رک جاؤ۔ کیا کر رہے ہو یہ؟'' اچانک عیاد کو اپنی پشت سے نیل کی آواز سنائی دی۔ عیاد کا بلند ہوا ہاتھ رکا، وہ پیچھے پلٹا۔ نیل کے ساتھ کوئی اور بھی موجود تھا۔ شاید

وہی نیل کے والد عروخ تھے۔
''اس شخص نے ہی وہ کتاب چرائی ہے نیل! انہیں اسے سبق سکھا کر رہوں گا۔'' عیاد غصے سے بولا۔
نیل اور عروخ تیزی سے دجال کی طرف بڑھے۔
''آپ ٹھیک تو ہیں؟'' نیل فکرمندی سے بولا۔
عیاد حیرت سے نیل کو دیکھنے لگا۔
''میں ٹھیک ہوں مگر یہ ٹھیک نہیں لگ رہا۔'' وہ شخص اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔
''کیا کر رہے ہو عیاد؟ تم تو لوگوں کو پہچان لیتے ہو۔ یہاں کیسے اتنی بڑی غلطی کرنے جا رہے تھے؟'' نیل ناراضگی سے بولا۔
''کیسی غلطی؟ یہ دجال، حلیمہ کے ذریعے میری کتاب چوری کروا چکا ہے اور تم اس کی حمایت کر رہے ہو۔'' عیاد کو نیل کے رویے پر حیرانی ہوئی۔
''انہیں دجال مت کہو۔ نام لو ان کا...... ادب سے...... ابو ہریرہ! میں آپ سے عیاد کے رویے کی معافی چاہتا ہوں۔ اس سے یہ غلطی انجانے میں ہوئی ہے۔'' نیل، ابو ہریرہ کی طرف رخ کر کے مؤدبانہ لہجے میں بولا۔
''کوئی بات نہیں...... چلو، اندر چلیں۔ بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔ اصل مسئلہ تو پتا چلے۔'' ابو ہریرہ سنجیدہ لہجے میں بولے۔
عیاد خاموشی سے ہونٹ کاٹنے لگا۔ حالات و واقعات اس کی سمجھ سے باہر ہو چکے تھے۔ ہر لمحے ایک نیا راز کھل رہا تھا۔
''چلو'' نیل نے اسے اشارہ کیا۔ وہ خاموشی سے ان کے پیچھے چلنے لگا...... اور کرتا بھی کیا۔
ابو ہریرہ نے کمرے میں پہنچ کر ان سب کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔
''اب بتاؤ عیاد! کیوں اس قدر طیش میں تھے؟'' ابو ہریرہ نرم لہجے میں بولا۔
''پہلے آپ مجھے بتائیں کہ آپ کون ہیں؟'' عیاد کے ذہن میں بہت سارے سوال گردش کر رہے تھے۔
''میں بھی اسی ذمے داری کو نبھانے کے لیے اس سرزمین پر موجود ہوں جو اب تم نبھانے والے ہو۔ میں نیکی کا پہرے دار ہوں۔'' ابو ہریرہ مسکرایا۔ گو کہ اب بھی اس کا چہرہ وہی تھا جسے دیکھ کر سب سہم جاتے تھے مگر اس کی مسکراہٹ نے اس کے چہرے کا تاثر یکسر تبدیل کر دیا۔
''یہ ہے وہ عظیم ذمے داری جس کی وجہ سے تم یہاں تک

الٰہی کے ہو۔ تم نیکی کے پہرے دار ہو۔ ہمارا سابقہ پہلے بھی پہرے دار اب خدمت لینے والا ہے۔ اس لیے تو تم یہاں آئے ہو۔ جب پکارتا ہے، وہ ہمارا ہم سے ... اسے سمجھانے کا بھی وقت ہے۔ تم اس کا انتظار کرنا اور اس کتاب کی حفاظت کرنا۔'' عیاد کے ذہن میں ان بزرگ کے الفاظ گونجے۔
''نیکی کے پہرے دار؟ تو آپ اس طرح کیوں رہ رہے ہیں؟ میرا مطلب، یہاں تو سب آپ کے خوف میں جیتے ہیں۔'' عیاد الجھے ہوئے لہجے میں بولا۔
''مجھے شہرت کی چاہ نہیں۔ یوں سمجھو یہ چاہ ہی ختم ہو چکی ہے۔ اس سرزمین پر میں صرف اپنی ذمے داریاں نبھانے کے لیے موجود ہوں نہ کہ رشتے بنانے اور نظروں میں آنے کے لیے۔ ہمیں ان شیطانی طاقتوں سے بھی غافل رہنا پڑتا ہے، تہجد کے بعد قاہرہ کی گلیوں میں پہرا دینا ہوتا ہے۔ لوگوں کے ذہن میں طرح طرح کے سوالات آتے ہیں تو میں سب کو کیا جواب دوں کہ میں راتوں میں کیوں ٹہلتا ہوں؟ اس لیے یہ رازداری ہی بہتر طریقہ لگا مجھے۔ ہمارا مقصد اس سرزمین کو شیطانی طاقتوں سے محفوظ رکھنا ہے۔'' ابو ہریرہ سنجیدگی سے بولا۔
''تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا؟ میں نے تم سے ان کی حقیقت پوچھی تھی؟'' عیاد، نیل سے مخاطب ہوا۔
''انہوں نے عروخ سے کہا تھا کہ یہ اپنی شناخت ظاہر نہیں کرنا چاہتے اور ہمیں ان کی ہر خواہش کا احترام کرنے کا حکم ہے۔ تب تک مجھ پر تمہاری شناخت بھی واضح نہیں ہوئی تھی عیاد!'' نیل نے اپنے ساتھ بیٹھے شخص کی طرف اشارہ کرتے ہوئے تفصیل بیان کی۔
''میں خود بھی آپ کے پیچھے آیا تھا۔ آپ کے ذہن تک رسائی حاصل نہیں کر سکا تھا۔ اب مجھے سمجھ آ رہا ہے کہ ایسا کیوں ہوا تھا۔ یقیناً آپ علم میں مجھ سے بہت آگے ہیں۔'' عیاد نے اعتراف کیا۔
''ایسا نہیں ہے عیاد! جو تمہیں عطا کیا گیا ہے، وہ میرے پاس نہیں مگر تمہاری طرح مجھے بھی اپنی سوچوں کی حفاظت کرنا آتی ہے۔ تمہیں وقت کے ساتھ اندازہ ہو گا اپنی صلاحیتوں کا۔'' ابو ہریرہ مسکرایا۔
''آپ مجھے المیرا سے دور رہنے کا کیوں کہتے تھے؟'' عیاد آج ساری الجھنیں دور کرنا چاہتا تھا۔
''تمہاری وجہ سے اس کی جان کو خطرہ ہو سکتا ہے۔ جیسے نیکی کی دنیا میں تمہاری شناخت پہرے دار کی حیثیت سے ہے، ویسے ہی شیطانوں کی دنیا میں تم خطرے کی حیثیت

سے جانے جاتے ہو۔ تم پر قابو پانے یا تمہیں کمزور کرنے کے لیے وہ تم سے جڑے لوگوں کو استعمال کر سکتے ہیں اور المیرا کی طرف جانے والا راستہ تمہارا راستہ نہیں ہے عیاد......! تمہیں صحیح راستے کا انتخاب کرنا ہوگا...... ان میں سے کسی ایک کو چننا ہوگا...... بس یہ یاد رکھنا کہ یہ علم تمہیں اس لیے عطا کیا گیا ہے کہ تم انسانیت کے کام آؤ اور عطا بغیر مقصد کے ہو تو واپس لے لی جاتی ہے۔'' ابو ہریرہ کے یہ الفاظ اسے بہت کچھ سمجھا گئے۔

''تو کیا المیرا ان کی نظروں میں آچکی ہے؟'' عیاد کو یاد آیا کہ اس نے المیرا کی ہتھیلی پر ایک کالے سائے کا پہرا دیکھا تھا۔

ابو ہریرہ نے بغیر کچھ کہے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''انہیں بھی خبر ہے کہ تم یہاں تک کیوں لائے گئے ہو۔ وہ ہر کسی پر نظر رکھے ہوئے ہیں۔'' ابو ہریرہ سنجیدگی سے بولا۔

''میں یہاں کیوں لایا گیا ہوں، کیا ذمے داری ہے اور کس چیز کا پہرے دار ہوں؟ مجھے کسی نے اب تک مکمل بات نہیں بتائی۔'' عیاد بولا۔

''میں بتاتا ہوں۔'' کمرے میں ارامان کی آواز گونجی اور وہ سب بے اختیار ہی اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

''ارامان!'' ابو ہریرہ بولا۔ سب نے ادب سے سر جھکا لیا۔

''تو بالآخر تم دونوں کی ملاقات ہو ہی گئی۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولے۔

''جی ارامان! عیاد اپنے مقصد کے بارے میں جاننا چاہتا ہے۔'' ابو ہریرہ مؤدبانہ لہجے میں بولا۔

''عیاد! آج تمہیں تمام سوالات کے جوابات ملنے والے ہیں۔ آپ سب بھی یہیں موجود ہیں تو ایک بار پھر سے ہم اس مقصد کو دہرا لیتے ہیں جس کے لیے ہم سب اس سرزمین پر جمع ہوئے ہیں۔

''چند صدیوں پہلے یہیں اسی سرزمین پر ابو عباس البونی نے تمہاری ہی طرح ایک مکتب کی بنیاد رکھی اور علم کے خزانے کھول دیے۔ انہوں نے کئی کتب تصنیف کیں۔ انہی میں سے ایک کتاب شمس المعارف بھی تھی جس میں کائنات کے علوم اور اہم راز تحریر تھے مگر اس کتاب کی خاص بات یہ تھی کہ نسخۂ عام نسخۂ خاص سے الگ تھا۔ نسخۂ خاص وہ جو انہوں نے اپنے ہاتھ سے تحریر کر کے صرف اپنی تحویل میں رکھا تھا اور کسی خاص و عام کو اس نسخے تک رسائی حاصل نہیں تھی۔ اس نسخے میں کچھ ایسی مخلوقات کا بھی ذکر تھا جو صدیوں پہلے اس کائنات میں موجود تھیں مگر انہیں یہاں سے اٹھا لیا گیا اور دنیا کے دروازے ان پر بند ہو گئے۔ نہ صرف ذکر بلکہ ان کو دوبارہ اس دنیا میں بلانے کا طلسمان بھی تحریر تھا۔ بالکل ویسے ہی جیسے انسان جنات کو طلسمان کے ذریعے قابو کرنے کی کوشش کرے۔

''نسخۂ خاص کی دو جلدیں تھیں۔ بدقسمتی سے وہ جلدیں شیاطین کے ہاتھ لگ گئیں اور انہوں نے نقلیم کو جگانے کی کوشش کی۔ نقلیم جانتے ہو نا کون تھے؟'' وہ عیاد سے مخاطب ہوئے جو توجہ سے ان کی ساری باتیں سن رہا تھا۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

''میرے قبیلے نے بروقت حملہ کر کے ان سے ایک کتاب حاصل کر لی اور تین نقلیم جو طلسم کے پڑھے جانے کی وجہ سے زمین پر قدم رکھ چکے تھے، انہیں گہری نیند سلا دیا۔

''ہمارے لیے ابو عباس بہت قابلِ احترام تھا۔ اہلِ علم کا رتبہ بہت اونچا ہوتا ہے عیاد......! اس کی جنگ ہماری جنگ تھی۔ وہ تو اس دنیا سے چلا گیا مگر ہم نے یہ ذمے داری تمام عمر کے لیے اپنے کندھوں پر اٹھا لی۔ ہمارے بعد اسے کوئی اور اٹھائے گا۔ تب سے لے کر اب تک ان تینوں مقامات پر نیکی کے پہرے دار وقفے وقفے سے متعین ہوتے رہے تاکہ وہ ان سوئے ہوئے نقلیم کو جگا نہ دیں۔

''بدی کے پہرے دار بھی وقفے وقفے سے کوششیں کرتے رہے لیکن اب تک انہیں اس مقصد میں کامیابی حاصل نہ ہو سکی مگر پچھلے کچھ ماہ سے بدی کی قوتوں میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے اور وہ ان جگہوں پر بار بار چکر لگاتے ہیں۔ مجھے خبر ملی ہے کہ وہی شیطان دوبارہ سے نقلیم کو جگانا چاہتا ہے جس کی سرپرستی میں برسوں پہلے یہ کام سرانجام دیا گیا تھا۔ لہٰذا ہم ایک بار پھر سے اس جنگ کی تیاری کر رہے ہیں۔ ان تین جگہوں میں سے دو جگہوں پر تو نیکی کے پہرے دار موجود ہیں مگر ایک علاقے پر ان کا زور ہم سے زیادہ ہے۔ وہاں نیکی کا کوئی پہرے دار پہنچ نہیں پایا ہے۔ ہماری تیاری پوری ہو چکی ہے...... ہمیں بس تمہارا انتظار تھا تاکہ تم اس ذمے داری کو قبول کر لو اور ہم ابو ہریرہ کو اس علاقے میں روانہ کر دیں کیونکہ ہمارے پاس وقت بہت کم رہ گیا ہے عیاد......! یہ جنگ کسی بھی وقت دوبارہ شروع ہو سکتی ہے۔ ابو ہریرہ کو آج رات ہی نکلنا ہوگا۔ میں ابو ہریرہ کو یہی بتانے آیا تھا۔ اب بتاؤ کیا تم تیار ہو اس ذمے داری کو اٹھانے کے لیے؟'' ارامان بولے۔

عیاد کے پاس جواب ختم ہو چکے تھے۔ وہ کیا کہتا؟ اسے اتنے اہم مقصد کے لیے چنا گیا تھا اور وہ پہلے ہی قدم پر ناکام ہو چکا تھا۔

''مجھے بہت افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑ رہا ہے کہ کتاب چوری ہو چکی ہے۔'' اس نے گھما پھرا کر بات کرنے کے بجائے اصل بات بتانے کا فیصلہ کیا اور یہ بات سن کر نیل سمیت کمرے میں موجود تمام لوگوں کے چہروں پر زلزلے کے آثار نمودار ہوئے۔ ارامان سپاٹ چہرے کے ساتھ اسے تکنے لگے۔

''تم جانتے بھی ہو کہ تم کیا کہہ رہے ہو؟'' ابوہریرہ پریشانی سے بولا۔

''جی، میں اچھی طرح جانتا ہوں اور میں آپ سب سے بہت شرمندہ ہوں مگر میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں وہ کتاب ڈھونڈ نکالوں گا۔ میرے کمرے سے وہ کتاب حلیمہ نامی ایک لڑکی نے چوری کی ہے اور وہ اس کتاب کو لے کر الفرافرہ تک گئی ہے۔'' عیاد بولا۔

ارامان اس کی بات سن کر چونک اٹھے۔

''الفرافرہ ہی وہ مقام ہے جہاں نقلیم سو رہا ہے۔ تمہیں کیسے معلوم ہوا یہ؟'' ارامان بولے۔

''مجھے یہ علم کچھ عرصے پہلے ہی عطا ہوا ہے۔ میں ماضی کے مناظر مراقبے کی حالت میں دیکھ سکتا ہوں۔ میں نے حلیمہ کو ایک ایسے آدمی سے بات کرتے دیکھا جو کالے لباس میں تھا اور اس کے بعد دوسرے منظر میں وہ اس کتاب کو لے کر الفرافرہ کی طرف جا رہی تھی۔'' وہ بولا تو ارامان کے چہرے پر فکر کی لکیریں ابھر آئیں۔

''مگر تم تو منفی طاقتوں کو محسوس کر سکتے ہو پھر حلیمہ کی مرتبہ تم دھوکا کیسے کھا گئے؟'' ارامان نے سوال کیا۔ باقی سب خاموش کھڑے تھے۔

''میں نہیں جانتا مگر ایک بار میں نے المیرا کی دست شناسی کی تھی۔ مجھے اس دن معلوم ہوا تھا کہ اس پر کسی کالے سائے کا پہرا ہے۔ اب مجھے ایسا لگتا ہے جیسے وہ حلیمہ ہی تھی۔ شاید وہ کافی عرصے سے ان طاقتوں سے رابطے میں ہے۔'' عیاد بولا۔

''میں سمجھ گیا...... تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ ابوعباس نے بھی ایسی ہی باتیں کی تھیں...... وہ بھی بہت کچھ پہلے سے جان لیا کرتا تھا مگر ابوعبیدہ کی نیت اور خیالات نہیں جان پایا تھا کیونکہ اس پر اسی شیطان کا پہرا تھا۔ ان کے بھی ذرجے ہیں عیاد......! اس کا مطلب یہی ہے کہ حلیمہ پر ان کی بہت عرصے سے نظر تھی اور وہ یہ منصوبہ بندی بہت پہلے سے کر رہے تھے۔ تمہیں جو علم عطا کیا گیا ہے، وہ عام نہیں ہے عیاد......! اگر یہ علم تمہیں الفرافرہ تک لے گیا ہے تو یہ اس بات کا اشارہ ہے کہ جنگ شروع ہو چکی ہے اور اسے تمہیں ہی لڑنا ہے۔ کل پورے چاند کی رات ہے۔ ان تاریخوں میں سے ایک تاریخ ہے جس دن یہ عمل کیا جاتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ کل رات یہ کوشش دوبارہ کرنے والے ہیں۔ تم اپنی صلاحیتوں پر بھروسا کرو...... اپنے علم پر یقین رکھو عیاد......! تم اس شیطان سے مقابلہ کر سکتے ہو۔ میرا قبیلہ اس جنگ میں تمہارے ساتھ ہوگا۔ ابوہریرہ کو ہم فوراً راج گڑھ روانہ کر رہے ہیں۔ نیکی اور بدی کی اس جنگ میں جیت ہماری ہی ہوگی ان شاء اللہ...... اور ہم کتاب بھی حاصل کر لیں گے۔ عروخ! تمہارا قبیلہ ابوہریرہ کے ساتھ روانہ ہوگا۔ وہ علاقہ تمہارے حوالے۔ تم جانتے ہو نا کہ ابوہریرہ کو وہاں پل بھر میں کیسے پہنچانا ہے؟'' وہ عروخ سے مخاطب تھے۔ عروخ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''ارامان! اگر آپ کی اجازت ہو تو میں عیاد کے ساتھ رکنا چاہتا ہوں۔'' نیل اپنے دوست کو اکیلا چھوڑ کر نہیں جانا چاہتا تھا۔

ارامان نے اسے اجازت دے دی۔

''میں اب تھامس کے پاس جاؤں گا۔ وفد کے لوگ اس کے ساتھ یہ جنگ لڑیں گے۔ آپ سب کو شرائط معلوم ہیں نا؟ ہمیں ان باتوں کا خاص خیال رکھنا ہوگا۔'' ارامان سنجیدگی سے بولے۔

''کیسی شرائط؟'' عیاد بولا۔

''یعنی تم نے اس کتاب کو کھول کر دیکھا بھی نہیں تھا؟'' ارامان ناراضگی سے بولے۔ عیاد نے اپنی نظریں جھکا لیں۔

''وہ نقلیم کو جگانے کے لیے ایک بچے اور ایک عورت کی قربانی کریں گے۔ ہمیں اس قربانی کو ہر حال میں روکنا ہے۔'' ارامان بولے۔

''اگر ان کے پاس ایک کتاب موجود ہے تو وہ دوسری کتاب کو حاصل کیوں کرنا چاہتے تھے؟ وہ یہ کام اس نسخے سے بھی تو انجام دے سکتے تھے جو ان کے پاس موجود ہے اور قربانی کی شرائط بھی اتنی مشکل نہیں پھر انہیں کس بات کا انتظار تھا؟'' عیاد بولا۔

''یہ تمام شرائط انہیں ایک انسان کے ذریعے پوری کروانا تھیں اور انسان بھی وہ جو اپنی روح خود شیطان کے حوالے کر دے۔ یقیناً کوئی انسان اتنی آسانی سے یہ سب

نہیں کرنا چاہے گا۔ انہوں نے برسوں اسے تیار کیا ہوگا۔

''اور...... کتاب انہیں کیوں چاہیے؟ اس کا جواب اس سرخ شیطان کا خاتمہ کر کے حاصل کریں گے۔ اب میں چلتا ہوں۔ تھامس کو خبردار کرنا ہے اور اس تک مدد پہنچانا ہے۔ ابوہریرہ! تم عروخ کے قبیلے ساتھ روانہ ہو جاؤ۔ وقت بہت کم ہے۔ عیاد! تم سے فجر کے وقت ملاقات ہوگی۔'' ارامان یہ کہہ کر ہوا میں تحلیل ہو گئے۔

''ہمیں چلنا چاہیے۔ اجازت دو عیاد! زندگی رہی تو پھر ملاقات ہوگی۔'' ابوہریرہ نے آگے بڑھ کر اسے گلے لگایا اور عروخ کے ساتھ غائب ہو گیا۔

☆☆☆

Year 1773

اسکاٹ لینڈ

کوئی مسلسل گھر کا دروازہ بجا رہا تھا۔ جینیفر کو نیند ٹوٹنے پر بہت غصہ آیا مگر اسے ہی اٹھ کر دیکھنا تھا کہ دروازے پر کون ہے۔

اس وقت ازابیلا انسٹی ٹیوٹ چلی جاتی تھی اور اس کے والد بھی اپنی دکان پر روانہ ہو جاتے تھے لہٰذا وہ گھر پر اکیلی ہی ہوتی تھی۔ وہ درس گاہ دیر سے جاتی تھی لہٰذا یہ وقت وہ دیر تک سو کر گزارتی تھی۔ دروازہ بجانے والے کے انداز سے لگتا تھا کہ آج اسے اپنا دیر تک سونے کا ارادہ ملتوی کرنا پڑے گا۔ جینیفر آنکھیں ملتی ہوئی دروازے کے قریب پہنچی۔

''کون ہے؟'' اس نے نیند سے بھرپور لہجے میں سوال کیا۔

''جینیفر! دروازہ کھولو۔ میں ہوں، الیگزینڈر!'' الیگزینڈر کی آواز سے لگتا تھا جیسے وہ جلدی میں ہو۔

'الیگزینڈر......؟ یہ تو ازابیلا کا دوست الیگزینڈر ہے۔ یہ اس وقت یہاں کیا کر رہا ہے؟' وہ سوچ میں پڑ گئی۔

''جینیفر......! ازابیلا کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی ہے۔'' الیگزینڈر کی آواز آئی تو جینیفر نے فوراً ہی دروازہ کھول دیا۔

''کیا...... کیا ہوا ہے ازابیلا کو؟ کہاں ہے وہ؟'' وہ پریشانی سے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے بولی۔

''وہ انسٹی ٹیوٹ میں ہی ہے۔ تمہارے والد کہاں ہیں؟'' وہ گھر کے اندر جھانکنے لگا۔

''وہ تو گودام پر گئے ہیں۔'' جینیفر پریشانی سے بولی۔

''اور آرتھر؟'' الیگزینڈر نے سب کی غیر موجودگی کا یقین کرنا چاہا۔ ویسے تو اسے اندازہ تھا کہ اس وقت ازابیلا اور آرتھر گھر پر نہیں ہوں گے اور نہ ہی جینیفر کے والد ہوں گے مگر پھر بھی وہ پوری تسلی کر لینا چاہتا تھا۔

''آرتھر تو کل رات ہی فادر کے ساتھ چلا گیا تھا۔ وہ تو گھر نہیں لوٹا۔ کیا وہ انسٹی ٹیوٹ بھی نہیں آیا اور تم بھی یہاں ہو تو ازابیلا کے پاس کون ہے؟'' وہ پریشانی سے بولی۔

''انسٹی ٹیوٹ میں کافی لوگ ہیں۔ تم فکر مت کرو۔ چلو، میرے ساتھ چلو۔ بگھی ساتھ لایا ہوں۔'' وہ اسے ساتھ چلنے کی دعوت دیتے ہوئے بولا۔

''مگر میں...... والد کو تو بتا دوں۔'' وہ پریشانی سے بولی۔

''انہیں گودام سے سوار کروالیں گے۔'' وہ فوراً بولا تو جینیفر اس کے ساتھ چلنے پر راضی ہو گئی۔ اسے ازابیلا کی بہت فکر ہو رہی تھی۔

جینیفر کے بگھی میں سوار ہوتے ہی وہ خود بھی اس بگھی میں سوار ہو گیا۔ کوچوان نے گھوڑے کو چابک مارا اور بگھی پوری رفتار سے روانہ ہو گئی۔

ازابیلا کے والد جو اناج کی بوری گھر پہنچانے کے لیے اس سڑک پر مڑے تھے، جینیفر کو بگھی میں سوار ہوتے دیکھ کر پریشان ہو گئے۔ وہ ازابیلا کے دوست الیگزینڈر کے ساتھ بگھی میں سوار ہوئی تھی۔ انہوں نے اناج کی بوری وہیں چھوڑی اور تیزی سے جینیفر کو پکارتے ہوئے بگھی کے پیچھے دوڑنے لگے مگر بگھی تو کب کی آگے نکل چکی تھی۔ وہ پریشانی سے وہیں کھڑے ہو گئے۔

''آخر جینیفر کہاں گئی ہوگی اور یہ ازابیلا کا دوست اسے کیوں لینے آیا تھا؟'' ان کی فکر بڑھ گئی۔ انہوں نے سامنے سے آتی ایک بگھی کو روکا اور اس میں سوار ہو کر انسٹی ٹیوٹ کا پتا سمجھانے لگے۔ انہوں نے خود ہی انسٹی ٹیوٹ جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

انسٹی ٹیوٹ پہنچ کر انہوں نے انتظامیہ سے ازابیلا کو بھیجنے کی درخواست کی۔ ازابیلا جو ویسے ہی فادر تھامس کا لیکچر ملتوی ہونے کی وجہ سے جلدی گھر لوٹنے والی تھی، انتظامیہ کے ساتھ اپنے والد کو کھڑے دیکھ کر حیران رہ گئی۔ وہ تیزی سے ان کی طرف بڑھی۔

''کیا ہوا والد! آپ یہاں کیا کر رہے ہیں، سب خیر نیت تو ہے نا؟'' وہ پریشانی سے بولی۔

''ہاں، جینیفر کہاں ہے؟'' وہ اس کے پیچھے جینیفر کو تلاش کرتے ہوئے بولے۔

''کیا مطلب...... جینیفر کا یہاں کیا کام؟ وہ تو گھر پر

ہے نا؟'' ازابیلا حیرت سے بولی۔

''نہیں...... وہ تمہارے دوست الیگزینڈر کے ساتھ بگھی میں سوار ہوئی تھی تو مجھے لگا وہ یہیں آئے ہوں گے۔ کہاں ہے الیگزینڈر؟'' وہ پریشانی سے بولے۔

''کیا...... الیگزینڈر کے ساتھ...... مگر الیگزینڈر تو کافی دنوں سے انسٹی ٹیوٹ نہیں آرہا۔ وہ تو مسلسل غیر حاضر ہے۔'' ازابیلا کو شدید گڑبڑ کا احساس ہوا۔

''لیکن وہ تو ابھی ابھی گھر سے جینیفر کو لے کر نکلا ہے۔ اب میں جینیفر کو کہاں ڈھونڈوں گا؟'' ازابیلا کے والد کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔

ازابیلا کے بھی ہوش اڑ گئے۔ جینیفر تو نو عمر تھی۔ اسے تو اپنی درس گاہ کے علاوہ راستوں کا بھی صحیح طرح سے علم نہیں تھا اور الیگزینڈر بھی تو ان کے لیے اجنبی ہی تھا۔

''آپ...... آپ یہیں رکیں۔ میں انتظامیہ سے بات کر کے الیگزینڈر کا پتا لیتی ہوں۔'' ازابیلا کو سمجھ نہیں آیا کہ وہ اور کیا کرے۔

انتظامیہ اسے الیگزینڈر کا پتا دینے کے لیے راضی نہیں ہوئی۔ یہ انسٹی ٹیوٹ کے قوانین کے خلاف تھا۔ اس نے فادر تھامس اور آرتھر کے بارے میں معلوم کرنا چاہا تو اسے مطلع کیا گیا کہ آرتھر، فادر تھامس کے ساتھ ایڈنبرا چلا گیا ہے۔

وہ باپ بیٹی پریشانی کی حالت میں گھر واپس لوٹ آئے اور جینیفر کے لوٹنے کا انتظار کرنے لگے۔ دوپہر ڈھلنے والی تھی مگر جینیفر کا کچھ پتا نہیں چلا تھا۔ نہ جانے الیگزینڈر اسے کہاں لے گیا تھا۔ ازابیلا کے والد نے اسے اپنے طور پر ڈھونڈنے کی بہت کوشش کی مگر وہ ناکام لوٹے۔

''والد! اگر آپ مجھے اجازت دیتے ہیں تو میں ابھی ایڈنبرا روانہ ہو جاتی ہوں۔ آرتھر کو اس بارے میں مطلع کرنا بہت ضروری ہے۔ شاید وہی ہماری کچھ مدد کر سکے۔ فادر تھامس بھی وہیں ہیں۔'' ازابیلا کو ایک یہی حل نظر آرہا تھا ورنہ تو سارے راستے بند ہو چکے تھے۔

''میں بھی چلتا ہوں تمہارے ساتھ۔'' اس کے والد اٹھ کھڑے ہوئے۔

''نہیں، اگر جینیفر واپس لوٹی تو ایسی صورت میں گھر پر کسی کا موجود ہونا ضروری ہے۔ آپ یہیں رکیں۔ میں ایڈنبرا پہنچتے ہی سیدھا چرچ جاؤں گی۔ یقیناً فادر وہیں پر ہوں گے۔ آپ میری طرف سے پریشان نہ ہوں۔ بس جینیفر کی واپسی کی دعا کریں۔'' وہ انہیں سمجھاتے ہوئے بولی تو انہوں نے نہ چاہتے ہوئے بھی اسے جانے کی اجازت دے دی۔

بگھی کا کوچوان ان کا دوست تھا لہٰذا انہیں یہ فکر نہیں تھی کہ ازابیلا اتنا طویل سفر کسی اجنبی کے ساتھ طے کرے گی۔ ازابیلا کو روانہ کرنے کے بعد وہ گھر بیٹھ کر جینیفر کے لوٹنے کی دعائیں کرنے لگے۔

☆☆☆

الیگزینڈر کی بگھی رکنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ جینیفر نے پریشانی سے باہر جھانکا۔

''آخر کتنی دور ہے تمہارا انسٹی ٹیوٹ؟ والد کو بھی سوار نہیں کیا تم نے گودام سے...... ازابیلا نے تو کبھی نہیں بتایا کہ

خرابی

دو مکینک گاڑیوں کے بارے میں تبادلۂ خیال کر رہے تھے۔ ایک بولا۔ ''تمہیں گاڑیوں کی سیٹوں پر چمڑے کے کور اچھے لگتے ہیں یا کپڑے کے؟''

''کپڑے کے۔'' دوسرے مکینک نے جواب دیا۔ ''چمڑے کے کور پر ہاتھ اچھی طرح صاف نہیں ہوتے۔''

(مرسلہ: عاصم خان، کراچی)

دلیل

ٹریفک سارجنٹ نے انگریزی فلموں والی چیزنگ کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک تیز رفتار کار سوار کو روکا تو کار سوار نے معصومیت سے پوچھا۔ ''میرا قصور کیا ہے؟''

''قصور......!'' ٹریفک سارجنٹ نے بڑی مشکل سے غصہ ضبط کرتے ہوئے کہا۔ ''آپ اسّی میل فی گھنٹا کی رفتار سے جا رہے تھے جبکہ اس سڑک پر پچاس میل فی گھنٹا کی رفتار سے زیادہ تیز گاڑی نہیں چلائی جا سکتی۔''

''مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ میں تو اسّی میل فی گھنٹا کی رفتار سے گاڑی نہیں چلا رہا تھا کیونکہ مجھے تو ابھی گھر سے نکلے ہوئے ایک گھنٹا ہوا ہی نہیں۔'' کار سوار نے احتجاجی لہجے میں کہا۔

اس پر ٹریفک سارجنٹ نے ٹوپی اتار کر سر کھجایا، ایک لمحے سوچا اور پھر کار سوار کو جانے دیا۔

(مرسلہ: عاصم خان، کراچی)

اتنا طویل سفر ہے انسٹی ٹیوٹ کا؟'' وہ پریشانی سے بولی۔

الیگزینڈر بغیر کوئی جواب دیے خاموش بیٹھا رہا۔

''کیا ہوا، تم کچھ بولتے کیوں نہیں ہو؟ کتنی دور ہے تمہارا انسٹی ٹیوٹ؟'' وہ اونچی آواز میں چلائی۔

جواباً الیگزینڈر نے اسے ایک زوردار طمانچہ رسید کیا۔ وہ گال پر ہاتھ رکھ کر حیرت اور دکھ سے اسے تکنے لگی۔

''آواز بند کر کے بیٹھو۔ میں ایسے لہجے برداشت نہیں کرتا۔ مجھے مجبور مت کرو کہ میں تمہارا دماغ ٹھکانے لگا دوں۔'' وہ غصے سے بولا۔

جینیفر نے تیزی سے اٹھ کر بگھی سے باہر نکلنے کی کوشش کی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ کچھ گڑبڑ ہے۔ الیگزینڈر نے فوراً ہی اسے بازو سے پکڑ کر دوبارہ بگھی کے اندر پٹخ دیا۔

''تم ایسے نہیں مانوگی۔'' اس نے کوٹ کی جیب سے ایک رومال نکالا اور جینیفر کو بالوں سے پکڑ کر وہ رومال اس کی ناک پر رکھ دیا۔

وہ چیخنے کی کوشش کر رہی تھی مگر اس رومال میں نہ جانے کون سی دوا لگی تھی، اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا اور چند لمحوں کے بعد وہ بے ہوش ہو کر بگھی کی نشست پر گر پڑی۔ الیگزینڈر نے رومال ہٹا کر دوبارہ اپنی جیب میں رکھا اور اسے وہیں پڑے رہنے دیا۔

''شکر ہے۔ اب کم از کم ایڈنبرا پہنچنے تک اس کی بک بک سے تو جان چھوٹے گی۔'' وہ حقارت سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''آج رات پورے چاند کی رات ہے۔ میرا مقصد پورا ہو جائے گا اور پھر میرے پاس عظیم طاقتیں آجائیں گی۔ میں آرتھر کا خاتمہ کر کے ازابیلا کو ہمیشہ کے لیے اپنا لوں گا اور تمہاری موت کا الزام بھی آرتھر کے سر پر ڈال دوں گا۔'' وہ جینیفر کی طرف دیکھتے ہوئے خباثت سے مسکرایا۔

الیگزینڈر نے قربانی کے لیے ایلینا اور جینیفر کا انتخاب کیا تھا۔ ایلینا کی وجہ سے ڈیوڈ مجبور ہو کر خود ہی اسے چابی تک لے جاتا اور باقی کام وہاں موجود شیاطین جنات نے پورا کر دینا تھا۔

کسی کو خبر بھی نہیں ہوئی تھی اور وہ اپنا مقصد پورا ہونے کے اس قدر قریب پہنچ چکا تھا۔ اسے نیکی کے کسی بھی پہرے دار کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔ تھامس کی ایک بیوقوفی کی وجہ سے اس کی منزل کتنی آسان ہو گئی تھی۔ اس نے اتنی اہم چابی کا مقام ایک معمولی سے کوچوان کو دکھا دیا تھا۔ اب الیگزینڈر اس کوچوان کی مدد سے اس چابی تک پہنچنے کے بعد قربانی کی رسم پوری کرتا اور دنیا کی ساری دولت ازابیلا سمیت اس کے قدموں میں ڈھیر کر دی جاتی۔

☆☆☆

ایک سال پہلے

جرمنی

آدھی رات کا وقت تھا۔ ایک جنگل میں الیگزینڈر احتیاط سے آگے بڑھ رہا تھا۔ چاروں طرف ویرانی اور اندھیرا تھا مگر وہ ہاتھ میں پکڑی لالٹین کی مدد سے راستے کی پہچان کر رہا تھا۔ جنگل گھنا ہوتا جا رہا تھا، اچانک اسے دور سے جلتی روشنیاں نظر آئیں۔ وہ ان روشنیوں کی سیدھ میں چلنے لگا۔ بالآخر وہ اس مقام پر پہنچ گیا جہاں سے یہ روشنیاں ظاہر ہو رہی تھیں۔ جنگل کے بیچوں بیچ ایک الاؤ جل رہا تھا۔

اس الاؤ کے اردگرد چار افراد کھڑے تھے۔ ان سب نے سیاہ رنگ کے لمبے چوغے پہن رکھے تھے اور اپنا منہ بھی ڈھک رکھا تھا۔ الیگزینڈر بھی اسی لباس میں آیا تھا لہٰذا ان کے ساتھ جا کر کھڑا ہو گیا۔

''ہمارے تمام ممبران آچکے ہیں لہٰذا اب ہمیں اپنا لائحہ عمل طے کر لینا چاہیے۔'' ان میں سے ایک شخص تحکمانہ لہجے میں بولا۔ باقی سب نے بغیر کچھ کہے اس کی تائید میں سر ہلایا۔

''میں ایڈم وائسہوپٹ آج الیومیناتی نامی تنظیم کی بنیاد رکھ رہا ہوں۔ ہماری تنظیم کا مقصد ہے دنیا پر راج کرنا۔ دنیا ہی سب کچھ ہے۔ ہمیں ایک ہی زندگی ملی ہے اور اسے بھرپور طریقے سے گزارنا ہمارا حق ہے۔ مذہب کے نام پر لگائی گئی پابندیاں صرف انسانوں کو اپنی مرضی کی زندگی جینے سے روکنے کے لیے ہیں۔ ایسے میں ہم صرف اسی کی پیروی کریں گے جو ہمیں یہ آزادی دے گا اور ساتھ انعام واکرام کی بارش بھی کرے گا۔ اس کا مقصد ہمارا مقصد، اس کی جنگ ہماری جنگ۔ آنے والے وقتوں میں تم ہر اس شخص کو کامیاب دیکھو گے۔ دنیا کے سب سے اونچے تخت پر بیٹھا دیکھو گے جو عظیم لوسیفر کے پیچھے چلے گا۔ عہد کرو کہ تم سب اپنی زندگیاں اسی مقصد کے لیے وقف کر دو گے اور اس کے بدلے تم بیش بہا خزانے حاصل کرو گے۔'' اس شخص نے اپنا ہاتھ آگ کے الاؤ کے سامنے اس انداز سے رکھا ہوا تھا جیسے وہ کوئی قسم اٹھا رہا ہو اور باقی سب اس کی پیروی کر کے ویسے ہی کھڑے ہو گئے۔ سب نے اس کے کہے ہوئے الفاظ دہرائے اور اس کے ساتھ قسم اٹھالی۔

اس نے ان سب کے قسم اٹھانے کے بعد زمین پر رکھی ایک شیشے کی بوتل اٹھائی اور بوتل کے ساتھ رکھے تانبے

کے پانچ گلاسوں میں اس بوتل میں بھرا محلول الٹنے لگا۔ وہ محلول لال رنگ کا تھا۔

''یہ انسانی خون ہے۔ تم سب کو یہ پینا ہوگا۔ اس تنظیم میں شامل ہونے کا پہلا اصول۔'' ایڈم بولا تو سب نے بغیر کچھ کہے وہ پیالہ لبوں سے لگالیا۔

''تم سب کو مبارک ہو۔ اب ہم آگے کا لائحہ عمل طے کریں گے۔'' ایڈم بولا اور پھر اس نے اپنے بائیں طرف کھڑے شخص کو دیکھا۔ اس شخص نے بھی چہرے پر کالا کپڑا ڈال رکھا تھا۔ ایڈم کے اس کی طرف متوجہ ہونے پر اس نے اپنے منہ سے وہ کپڑا ہٹادیا۔ اگر کوئی اور اس شخص کا چہرہ دیکھ لیتا تو یقیناً جنگل سے چیختا ہوا بھاگ کھڑا ہوتا مگر ان سب کے دل بہت مضبوط تھے یا شاید وہ اس سے کافی دفعہ مل چکے تھے۔

''میں لوسیفر کا داہنا ہاتھ ہوں۔ میرا نام ریڈ ڈیول ہے اور میں برسوں سے اس کا ایک اہم کام انجام دینے کے لیے چنا گیا مگر نیکی کی قوتوں نے اس کوشش کو ناکام کردیا اور ہم سے ایک اہم کتاب چوری کر کے لے گئے۔ اگر آج وہ کتاب ہمارے پاس ہوتی تو ہم ایک بار پھر سے انسانیت کو آلودہ کرنے میں کامیاب ہوجاتے۔ میں نے ہار نہیں مانی اور میں برسوں سے اس کوشش میں رہا کہ کسی طرح مجھے وہ کتاب مل جائے تاکہ جو ادھورا کام ہم نے کیا ہے، اسے مکمل کرسکیں مگر نیکی کی قوتیں بھی ساتھ ساتھ اپنی کوششیں جاری رکھتی رہیں۔ نیکی کی قوتیں ہر بیس سال بعد اپنا پہرے دار بدلتی ہیں اور آنے والا سال وہی سال ہے جب پرانے پہرے داروں کی جگہ نئے پہرے دار لیں گے۔

''اور اسی سال ایک اہم تاریخ پر پورا چاند بھی آرہا ہے۔ یہ وہی رات ہوگی جب ہم اس کام کو ایک بار پھر سے انجام دے سکتے ہیں اور نقلیم کو جگا سکتے ہیں۔ نقلیم تین مقامات پر سو رہے ہیں۔ انہی مقامات پر نیکی اور بدی دونوں کے پہرے دار موجود رہتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ بدی کے پہرے دار اس بار ہماری اس تنظیم میں سے چنے جائیں اور وہ پہلے سے ان مقامات پر جا کر ان لوگوں پر نظر رکھیں جو ان علاقوں میں ہجرت کر کے آئے ہیں اور نیکی کے پہرے دار بننے کی شرائط پر پورا اترتے ہیں۔

''الیگزینڈر! تمہیں اسکاٹ لینڈ جانا ہوگا۔ وہاں تھامس نامی آدمی نے برسوں سے اس ذمے داری کو سنبھال رکھا ہے اور وہ اس کام میں اتنا محتاط اور اس قدر طاقتور ہے کہ اس نے ان بیس سالوں میں وہاں بدی کے کسی بھی پہرے دار کو ٹکنے نہیں دیا لہٰذا ایڈنبرا کے قلعے میں سوئے ہوئے نقلیم پر نیکی کی قوتیں حاوی رہی ہیں۔ جہاں وہ سو رہا ہے یا دفن ہے، اس مقام کو ایک خاص چابی کے ذریعے بند کیا گیا ہے اور اس چابی کا پتا صرف اور صرف تھامس کو ہی معلوم ہے۔ تمہارا کام یہ ہے کہ تم نے تھامس کے قریب رہنا ہے۔ نیکی کے نئے پہرے دار کو پہچان کر اس کا خاتمہ کردینا ہے اور چابی کے مقام کا پتا لگا کر اس طلسم کو انجام دینا ہے۔ تمہیں یہ سارے کام چاند کی مخصوص تاریخ سے پہلے کرنے ہوں گے۔ کتاب حاصل کرنے کی ذمے داری میری ہے اور میں یہ ذمے داری مقررہ وقت سے پہلے پوری کر کے تم سب کو وہ صفحات لادوں گا جس پر وہ طلسم لکھا ہوگا۔ اس طلسم سے نقلیم کو جگانے کے بعد اسے مطلوبہ قربانی پیش کریں گے اور پھر اس کے بعد اس دنیا پر صرف اور صرف ہمارا راج ہوگا۔ وہ طلسم یا وہ تحریر صرف ایک ہی نسخے میں موجود ہے جسے دنیا میں مکمل کیا گیا اور نقلیم کو جگانے کے لیے قربانی کا جو طریقہ ہے، اسے لوسیفر نے مکمل کیا ہے۔ لہٰذا ان دونوں طاقتوں کے قلم سے لکھے گئے طریقے پر من و عن عمل کرنا ہوگا۔

''سنگھیا! تم راج گڑھ جاؤ گے۔ اس علاقے کی سب سے اچھی بات یہ ہے کہ وہاں بدی کی قوتوں کا پلڑا بھاری ہے۔ لہٰذا اس علاقے میں ہمارا قبضہ ہے۔ اس سرزمین پر جادو ٹونے اور توہمات کی بھرمار کی وجہ سے وہاں نیکی کی قوتیں کمزور پڑتی گئیں مگر ہم اس زمین پر راج کرنے کے باوجود بھی نقلیم کو اس لیے نہ جگا سکے کیونکہ ہمارے پاس وہ کتاب نہیں تھی۔ جبکہ برسوں پہلے ہم نے اس قلعے کو خالی کروادیا تھا جس سے ملحقہ زمین میں نقلیم دفن ہے۔ سنا ہے اب اس قلعے کو دوبارہ بسایا جارہا ہے۔ تم نے اس علاقے میں بطور راج گرو جانا ہے۔ وہ تمہاری ہر بات مانیں گے۔ تمہیں بھی وہ منتر پورے چاند کی رات سے پہلے مل جائیں گے...... مگر تم نے ایک کام کرنا ہے۔ اس قلعے کو خالی مت ہونے دینا کیونکہ اتنے عرصے سے اس سرزمین پر بدی کی جن قوتوں نے ہمارا قبضہ قائم رکھا، ان کو بھینٹ دینا ضروری ہے لہٰذا وہ سب انہی کے خون سے اپنی پیاس بجھائیں گے۔ تم دونوں کو قربانی کی رسم کے لیے ایک عورت اور نوعمر بچے کو اپنی نظر میں رکھنا ہوگا تاکہ عین موقع پر تمہیں اس تلاش میں نہ نکلنا پڑے۔ اس کے لیے کوئی شرط نہیں ہے۔

''تیسرا اور آخری مقام ہے الفرافرہ! یہ وہ مقام ہے جہاں آخری نقلیم سو رہا ہے۔ جیسے راج گڑھ میں ہماری قوتوں کا پلڑا بھاری ہے، اسی طرح مصر میں نیکی کی قوتوں کا

پلڑا ہمیشہ سے بھاری رہا ہے۔ ہمیں وہاں بہت پھونک پھونک کر قدم رکھنا پڑتا ہے۔ یہی وہ خاص مقام ہے جہاں سے ہمیں کتاب ملے گی اور یہیں نیکی کا وہ پہرے دار بھی موجود ہے جس کے پاس وہ کتاب اس وقت بھی موجود ہے مگر ہم اس کی طاقت کے آگے بے بس ہیں۔ ہم یہ کتاب تب حاصل کریں گے جب نیا پہرے دار اپنی ذمے داریاں نبھانے آئے گا اور اسے وہ کتاب دی جائے گی اور یہ ذمے داری غتراض کی ہے۔''

اس نے اپنے ساتھ کھڑے ایک شخص کی طرف اشارہ کیا۔ اس شخص نے اثبات میں سر ہلایا اور اپنے چہرے سے وہ کالا کپڑا ہٹا دیا۔ اس کے سارے جسم اور چہرے تک پر بال اگے ہوئے تھے۔

''غتراض نے چند صدیوں پہلے بھی اس عمل میں کامیابی حاصل کر لی تھی مگر فرات قبیلے کی دخل اندازی کی وجہ سے اس کا جڑواں بھائی مارا گیا جو اسی کی طرح لگتا تھا۔ نیکی کی طاقتوں کو یہ خبر نہیں ہے کہ غتراض زندہ ہے۔ اس نے اپنا ادھورا کام مکمل کرنے کی خواہش ظاہر کی ہے اور مجھے بھی اسی کام کو مکمل کرنے تک کی مہلت ملی ہے لہٰذا ہم دونوں کا مقصد ایک ہے اور ہم صدیوں پرانی اپنی اس ناکامی کو کامیابی میں بدل کر لوسیفر کو خوش کرنا چاہتے ہیں۔

''اس تنظیم کی بنیاد بھی میں نے اسی لیے رکھی ہے تاکہ ہم بدی کے پہرے داروں میں اضافہ کرتے رہیں۔ آنے والے وقتوں میں ہماری یہ تنظیم کھل کر کام کرے گی۔ اسے روکنے ٹوکنے والا کوئی نہیں ہوگا مگر فی الحال ہمیں خفیہ طور پر یہ کام سرانجام دینے ہوں گے۔ ایک اور اہم بات یہ کہ ہم خود سامنے آکر یہ کام نہیں کر سکتے لہٰذا ہم یہ کام انسانوں کے ذریعے ہی لیں گے۔ ایڈم کو میں نے اس تنظیم کا سردار چنا ہے۔ اسی طرح تم دونوں کو بھی اس مقصد کے لیے چنا گیا ہے۔ بدلے میں تم سب بے انتہا انعام و اکرام کے حقدار ہو گے۔ تم دیکھو گے کہ دنیا کیسے تمہارے قدموں میں ڈھیر کر دی جائے گی۔

''دنیا میں کچھ جگہوں پر ایسی حدود قائم ہیں جنہیں صرف انسانوں کی دخل اندازی سے ہی پار کیا جا سکتا ہے۔ لوسیفر کا مقصد شروع سے یہی رہا ہے کہ وہ انسانوں کو ان کی طاقت سے آشنا کرے۔ تم سب بھی ان خاص لوگوں میں شامل ہو جنہیں لوسیفر نے چن لیا ہے۔ اب تم سب اپنے اپنے علاقوں کی طرف روانہ ہو جاؤ اور ایڈم...... تم اس تنظیم کو آگے بڑھاتے جاؤ۔ میں کتاب حاصل کرتے ہی تم دونوں کو وہ صفحات دینے آؤں گا۔ اگر کبھی میری مدد کی ضرورت پڑے تو تم لوگ مجھے بلا سکتے ہو۔ اس ملاقات کا ذکر دوبارہ نہیں ہونا چاہیے۔ اب تم لوگ جا سکتے ہو۔'' اس نے اپنی بات مکمل کر لی تھی۔

غتراض کے علاوہ باقی سب وہاں سے روانہ ہو گئے۔

''سردار! آپ کو کیا لگتا ہے؟ کیا یہ اپنے عہد پر قائم رہیں گے؟'' غتراض نے ان کے جانے کے بعد ریڈ ڈیول سے سوال کیا۔

''بالکل قائم رہیں گے۔ اصل مقصد تو میں نے انہیں بتایا ہی نہیں۔ لوسیفر کا اصل مقصد ہے، انسانوں کو گمراہ کر کے جہنم کی آگ میں جھونک دینا۔ یہ لوگ معمولی سی کامیابی حاصل کرنے کے لیے کچھ بھی کر سکتے ہیں اور تم دیکھو گے آنے والے وقت میں یہ اپنے مقصد سے دور ہو جائیں گے۔ اپنی پہچان، اپنی اصلیت بھول جائیں گے۔ یہ بھول جائیں گے کہ انہیں اشرف المخلوقات بنا کر بھیجا گیا ہے۔ ان کے لیے دنیا ہی سب کچھ ہوگی۔ ہماری یہ تنظیم اور اس کے مقاصد بہت دور دور تک پھیلیں گے اور ہم بھی تو یہی کر رہے ہیں، ان کو دوبارہ سے آلودہ کرنے کے لیے تنظیم کی واپسی۔ تم ان کے سامنے چند سکوں کا یا خوبصورت عورتوں کا ڈھیر لگا دو، تب یہ سب کچھ بھول جائیں گے۔ ہمارے اشاروں پر ناچیں گے اور غلط کو غلط کہنے والوں کے دشمن بن جائیں گے۔ یہ دنیا شراب و شباب، لوٹ مار، قتل و غارت گری اور بے ایمانی کی آماجگاہ بن جائے گی اور لوسیفر اپنا وعدہ پورا کرے گا۔ آج ہم پانچ ہیں، کل ہم پانچ ارب ہو جائیں گے۔'' ریڈ ڈیول نے یہ کہہ کر زور زور سے قہقہے لگانا شروع کر دیے۔

''سردار! میرے لیے کیا حکم ہے؟'' غتراض نے اس کا قہقہہ ختم ہونے کا انتظار کیا۔

''تم بھی مصر روانہ ہو جاؤ۔ ہر نئے آنے والے پر نظر رکھو۔ اس کے ساتھ جڑے لوگوں پر نظر رکھو۔ تم دیکھو کہ اس سے کون کون ملنے آتا ہے۔ کیا نیکی کا پہرے دار اس نئے آنے والے سے ملنے کی کوشش کرتا ہے۔ بس جیسے ہی اسے کتاب ملے گی ہم نے اپنا کام پورا کر دینا ہے مگر یاد رکھنا، یہ کام ایک انسان کے ہاتھوں ہی ہونا چاہیے۔ تم سمجھ رہے ہو نا کہ میں کیا کہہ رہا ہوں؟ ہم ہر کام انہی کے ہاتھوں سے کروائیں گے۔ یہ خود اپنے نفس کے غلام بن کر ہمارا کام کریں گے تاکہ آخر میں سارا الزام، سارا قصور انہی کے سر ہو۔ یہ اپنی مرضی سے اس کام کے لیے راضی ہوں اور اس

کے بعد جو نقصان ہوگا، ہم انہی کو قصوروار ٹھہرائیں گے۔ اس لیے اس تنظیم کا سربراہ بھی ایک انسان ہی ہے۔ وہ تو اس ایک چہرہ ہوگا جو ہمارے مقاصد کی نمائندگی کرے گا۔ اپنا... اپنے جیسوں کو دیکھ کر ہی اس تنظیم میں شمولیت اختیار کریں گے۔" ریڈ ڈیول نے اسے سمجھایا اور اس نے بات سمجھ کر اپنا سر ہلا دیا۔

"چلو اب ہمیں چلنا چاہیے۔ یہ اپنا کام کرتے ہیں اور ہم اپنا کام۔" ریڈ ڈیول نے کہا اور پھر وہ دونوں وہاں سے غائب ہوگئے۔

☆☆☆

Year 1773

قاہرہ۔ مصر

رات گہری ہوتے ہی محل میں سناٹا گونجنے لگا تھا۔ سب سو چکے تھے مگر المیرا جاگ رہی تھی۔ اس نے اپنے کمرے کی کھڑکی سے محل کے پچھلے حصے کا جائزہ لیا۔ اس حصے میں دن کے وقت پہرے دار ہر وقت موجود ہوتے تھے مگر رات کے وقت مختلف اوقات میں چکر لگاتے تھے۔ اس کی توقع کے عین مطابق پچھلے دروازے کے پہرے دار شاید سونے جا چکے تھے۔ یہ ان کا روز کا معمول تھا۔ دن کے پہرے دار اوقات تبدیل ہوتے ہی آرام کی غرض سے کمروں میں چلے جاتے اور رات کا پہرے دار وقفے وقفے سے پچھلی طرف چکر لگاتا۔ اس وقت وہ حصہ خالی پڑا تھا۔ المیرا نے اپنا عبا پہن کر نقاب لگایا اور خط تھام کر آہستگی سے سیڑھیاں اترنے لگی۔ محل کے تمام ملازمین بھی سونے کے لیے جا چکے تھے۔ وہ احتیاط سے چاروں طرف دیکھتے ہوئے باہر نکل آئی مگر باہر نکلتے ہی وہ جلدی سے واپس اندر داخل ہوئی کیونکہ پہرے دار پچھلی طرف کا چکر لگا رہا تھا۔ وہ سانس روک کر کھڑی ہوگئی اور اس کے جانے کا انتظار کرنے لگی۔ تھوڑی دیر بعد وہ وہاں سے مطمئن ہوکر جا چکا تھا۔ المیرا نے سر باہر نکال کر دیکھا اور مکمل اطمینان کے بعد پچھلے حصے کے دروازے کے پاس آ کر اسے کھولا اور گلی میں نکل آئی۔ گلی بھی سنسان پڑی تھی۔ اسے تھوڑا ڈر لگا مگر عیاد تک پیغام پہنچانے کی دھن اس کے سر پر سوار ہو چکی تھی۔ اس معاملے میں وہ یونس پر بھی بھروسا نہیں کرسکتی تھی ورنہ صبح اسے ہی خط دے کر روانہ کر دیتی۔ اس کے قدم تیزی سے قاہرہ کے بازار کی طرف بڑھ رہے تھے جہاں عیاد کا مکتب موجود تھا۔

☆☆☆

[illegible]

گلی [illegible] تھا۔ [illegible] آنکھیں [illegible] کر اسے پہچاننے کی کوشش کی۔ وہ کوئی عورت تھی جو عبا میں تھی اور اس نے اپنا چہرہ بھی چھپا رکھا تھا۔ یوسف کا دل تیزی سے دھڑکنا شروع ہوا۔ آدھی رات کے وقت کون عورت اس طرح قاہرہ کی گلیوں میں گھوم رہی تھی۔

"لل...... لل کون ہو تم؟" اس کا گھر اسی گلی کو پار کرنے کے بعد آتا تھا ورنہ تو وہ وہاں سے کب کا بھاگ گیا ہوتا۔ آگے بڑھنے کے لیے اسے اسی گلی سے گزرنا تھا لہٰذا اس نے ہمت کر کے پوچھ ہی لیا۔

"میں ہوں یوسف...... حلیمہ!" اچانک ہی اسے مانوس سی آواز سنائی دی۔ وہ چونک پڑا۔

"حلیمہ...... مکتب والی حلیمہ؟" اس نے دوبارہ سوال کیا۔

"ہاں، میں وہی حلیمہ ہوں۔" حلیمہ کی آواز سے پریشانی جھلک رہی تھی۔ یوسف کا ڈر ختم ہو چکا تھا، وہ اس کے قریب پہنچ کر رک گیا۔

"کیا ہوا حلیمہ اور رات کے اس پہر تم یہاں کیا کر رہی ہو؟" وہ حیرانی سے پوچھنے لگا۔

"مجھے المیرا نے بھیجا ہے۔ اس کے والدین کو المیرا اور عیاد کے رشتے کے بارے میں پتا چل چکا ہے اور وہ اسے محل سے لے کر جا رہے ہیں۔ وہ بہت پریشان ہے اور عیاد سے ملنا چاہتی ہے۔ ہم دونوں رات ہوتے ہی چپکے سے محل سے باہر نکل آئے ہیں۔ المیرا مکتب کے سامنے عیاد کا انتظار کر رہی ہے۔" حلیمہ کے لہجے سے پریشانی جھلک رہی تھی۔

"تمہیں یہ سب کیسے پتا؟ تم تو محل چھوڑ کر چلی گئی تھی نا اور اگر المیرا تمہارے ساتھ ہے تو یہاں تک کیوں نہیں آئی؟" یوسف کو اس کی باتیں ہضم نہیں ہوئیں۔

"میں محل چھوڑ کر گئی تھی مگر اس سے دوستی تو ختم نہیں کی تھی۔ آج دوپہر کو جب میں اس سے ملنے کے لیے گئی تو مجھے یہ ساری باتیں پتا چلیں اور اسی نے مجھے رات کو آنے کا کہا تھا تاکہ میری مدد سے وہ محل سے باہر نکل سکے۔ اگر وہ اس طرح گلیوں میں گھومتی ہوئی کسی کو نظر آ گئی تو محل کے پہرے دار یقیناً اسے پہچان لیں گے۔ اس کے والد کے آدمی ہر جگہ موجود ہوتے ہیں۔ لہٰذا میں اسے مکتب کے سامنے ایک

کونے میں کھڑا کر کے خود آئی ہوں۔ کہاں ہے عیاد؟ میں اس سے ملنا چاہتی ہوں۔'' حلیمہ بولی۔

''عیاد تو...... عیاد تو اس وقت مصروف ہے۔ وہ نہیں مل سکے گا۔'' یوسف سوچ میں پڑ گیا۔ وہ حلیمہ کو خوفناک آدمی کے گھر تک نہیں لے جانا چاہتا تھا۔

''تم ایسا کرو کہ المیرا کو لے کر میرے گھر آجاؤ۔ جیسے ہی عیاد کی مصروفیت ختم ہوگی، ہم عیاد کے گھر جا کر اس سے ملاقات کرلیں گے۔'' یوسف نے اپنے تئیں اسے بہترین مشورہ دیا۔

''مجھے یہ ٹھیک نہیں لگتا۔ میں نے تمہیں کہا نا وہ گلیوں میں گھوم نہیں سکتی۔ تم میرے ساتھ چلو اور اسے راضی کرو۔ مجھے بھی رات کے اس پہر اکیلے وہاں تک جاتے ہوئے ڈر لگ رہا ہے۔ تم ساتھ ہوگے تو ہمت بندھی رہے گی۔'' حلیمہ ڈرتے ہوئے بولی۔

''اچھا، چلو۔ میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔'' وہ اس کے ساتھ چلنے پر راضی ہوگیا۔

غتراض مسکرایا۔ وہ جانتا تھا کہ یوسف ابھی ابھی عیاد کو ابوہریرہ کے گھر چھوڑ کر واپس آرہا ہے۔ اس سے بہتر بھلا اور کون سا موقع ہوسکتا تھا یوسف کو اٹھالے جانے کا۔

وہی تو قربانی کے لیے استعمال ہونے والا تھا۔

غتراض، یوسف کے ساتھ اس رہائشی علاقے سے باہر نکل آیا۔

اسے خبر ملی تھی کہ ارامان قریب ہی کہیں موجود ہے۔ وہ یہ نہیں چاہتا تھا کہ کسی طرح اس کی بو ارامان تک پہنچے۔ ارامان کے علاوہ اس کی موجودگی اور کوئی محسوس نہیں کرسکتا تھا پھر بھی وہ اپنی اس بو کو روپوش کرنے کے بعد ہی اس علاقے میں داخل ہوا تھا مگر یہ زیادہ دیر تک چھپی نہیں رہتی لہٰذا وہ فوری طور پر رہائشی علاقے سے باہر نکلنا چاہتا تھا۔

اس نے یوسف کو آگے چلنے دیا۔ مکتب وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ غتراض کا ارادہ یوسف کو مکتب والی گلی سے ہی ساتھ لے جانے کا تھا۔ جیسے ہی وہ مکتب والی گلی میں پہنچے تو غتراض ٹھٹک کر رکا۔

مکتب کے قریب ایک لڑکی موجود تھی۔

''المیرا......!'' اچانک یوسف نے آواز لگائی۔

غتراض کو حیرت نے گھیر لیا۔

وہ تو یوسف کو بہانے سے اس طرف لایا تھا۔ اسے اندازہ بھی نہیں تھا کہ اس کا دوسرا شکار خود بخود ہی اس کے جال میں پھنس جائے گا۔ اسے قربانی کی رسم پوری کرنے کے لیے ایک عورت درکار تھی اور وہ تلاش المیرا پر ختم ہوچکی تھی۔ اس کے دونوں شکار اس کے سامنے موجود تھے۔

المیرا ابھی انہیں وہاں دیکھ کر حیران رہ گئی اور تیزی سے چلتے ہوئے ان کے قریب آئی۔

''یوسف! تم اس وقت یہاں کیا کر رہے ہو؟'' وہ حیرت سے بولی تو یوسف نے پلٹ کر حلیمہ کو دیکھا۔

''حلیمہ نے بتایا کہ تم عیاد کو کوئی پیغام دینا چاہتی ہو۔ عیاد مصروف تھا تو میں تمہیں لینے کے لیے یہاں تک چلا آیا۔'' وہ بولا تو المیرا نے چونک کر حلیمہ کو دیکھا۔

''حلیمہ! تمہیں کیسے پتا چلا کہ میں عیاد سے ملنا چاہتی ہوں یا اسے کوئی پیغام دینا چاہتی ہوں؟'' وہ حیرت سے سوال کرنے لگی۔

یوسف اس کا سوال سن کر چونک پڑا۔

اچانک حلیمہ نے اپنا نقاب الٹا۔ وہ دونوں خوف سے چند قدم پیچھے ہٹے۔ وہ چہرہ تو حلیمہ کا ہی تھا مگر وہ آنکھیں حلیمہ کی نہیں تھیں۔ اس کی آنکھوں کا رنگ تبدیل ہوچکا تھا اور اس کے چہرے پر ایک خوفناک مسکراہٹ تھی۔

''کک...... کون ہو تم؟ تم...... تم حلیمہ نہیں ہو سکتیں۔'' المیرا خوفزدہ لہجے میں بولی۔

''المیرا! بھاگو......'' یوسف چلایا۔

وہ دونوں تیزی سے ایک طرف کو دوڑنے لگے مگر اچانک ہی گلی کو چاروں طرف سے کالے سایوں نے گھیر لیا۔ غتراض کے ساتھی آچکے تھے۔

''نہیں...... کوئی ہے...... ہماری مدد کرو......!'' المیرا نے چلانا شروع کردیا۔

یوسف بھی گھبرا کر مدد کے لیے پکار رہا تھا مگر ان دونوں کی پکار کسی نے نہیں سنی۔ غتراض تیزی سے ان کی طرف بڑھا اور پھر اچانک ہی گلی المیرا اور یوسف کی چیخوں سے گونج اٹھی مگر یہ چیخیں لمحوں میں غائب ہوگئیں۔

وہ سائے بھی اس گونج کے ختم ہوتے ہی غائب ہوگئے۔

گلی سنسان پڑی تھی......!

اب نہ وہاں یوسف تھا اور نہ ہی المیرا......!

غتراض اپنا آدھا کام مکمل کرچکا تھا۔

خوف میں لپٹی پوشیدہ رازوں کی کڑیاں ملانے والے ایک رمز شناس کی سنسنی خیز داستان کے باقی واقعات آئندہ ماہ

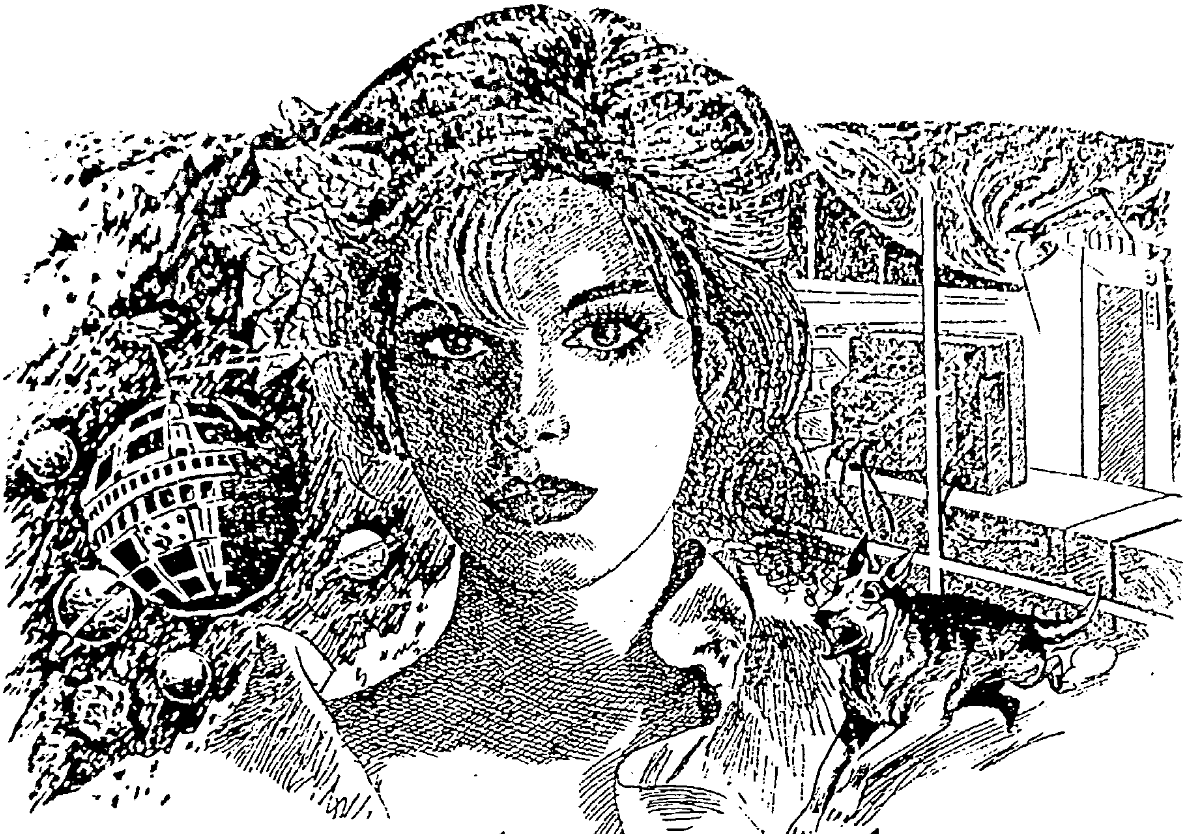

اندھیرے تلے

طیب سنگھانوی

موجودہ دور میں سائنس نے حیرت انگیز ترقی کی ہے... نت نئی ایجادات ہو رہی ہیں... مگر کائنات کی وسعت اور اسرار انسانی شعور کی حدوں سے آگے ہی ہیں... اور کائنات میں ہونے والے ردوبدل اور اس کے اثرات سے نمٹنے کے لیے فی الحال تحقیق ہی ہو رہی ہے... ان رازوں سے پردہ اٹھانے کے لیے ابھی مزید محنت کی ضرورت ہے۔

سورج گرہن کے باعث ہونے والے اثرات کی پُراسرار منظر کشی

22 جولائی 2028ء سڈنی، آسٹریلیا۔ صبح کے ابتدائی لمحات ہی سے دن کی روشنی معمول سے تھوڑی مدھم تھی لیکن لوگوں نے اس پر زیادہ توجہ نہیں دی۔ ساحل پر ہزاروں افراد اپنے کیمروں اور خصوصی فلٹرز کے ساتھ تیار کھڑے تھے۔

ریچل ہارپر، ایک ماہرِ فلکیات اور تجرباتی محقق، ساحل پر اپنے سامان کو ترتیب دے رہی تھی۔ اس کے ساتھ اس کے ہم کار ڈاکٹر جیکسن ریڈ، جو نیویارک سے آئے تھے، ایک ٹیلی اسکوپ اور جدید کیمروں کی جانچ کر رہے تھے۔

ریچل کے ہاتھ تھر تھرا رہے تھے، خوف سے نہیں، بلکہ اس غیر یقینی کیفیت سے جس کا لفظوں میں اظہار مشکل تھا۔

"یہ صرف ایک فلکیاتی منظر نہیں جیکسن! یہ...... یہ ایک لمحہ ہے جو انسان کے شعور کو اپنی حدود سے باہر لے جائے گا۔" ریچل نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا، جہاں سورج کی روشنی معمولی سیاہ دھند میں چھپتی محسوس ہو رہی تھی۔

جیکسن نے سر ہلایا۔ "میں نے کئی گرہن دیکھے ہیں لیکن یہ...... یہ مختلف ہے۔ اس کے بارے میں کچھ عجیب سا احساس ہے۔" وہ چپکے سے اپنے کیمرے کی فوکسنگ کر رہا تھا۔

ایورٹ ہیٹن، ایک انگریز ماہر نیوٹریکل فزکس، جو سڈنی یونیورسٹی کے ساتھ شراکت میں اس پروجیکٹ پر کام کر رہا تھا، نے اپنی نوٹ بک میں کچھ لکھا۔

"چاند کا زاویائی قطر سورج سے زیادہ ہے لیکن زمین کے منحنی زاویے کی وجہ سے سائے کی حرکت کی رفتار اور دائرۂ اثر غیر معمولی ہوگا۔ یہ ایک تاریخی موقع ہے۔"

لیکن ایورٹ کی آواز میں خوشی کے ساتھ ساتھ ایک لرزش بھی تھی، جیسے اسے کسی نامعلوم خطرے کا احساس ہو۔

صبح کے دس بج کر بیس منٹ۔ جیسے ہی جزوی گرہن شروع ہوا، ساحل پر جمع لوگ اچانک ایک ہلکی سی سنجیدگی میں بدل گئے، پرندے خاموش ہو گئے۔ کتے اپنے مالکان کے ساتھ ایک عجیب سا اضطراب محسوس کر رہے تھے۔

ریچل نے ٹیلی اسکوپ کی نظر سورج کی طرف مرکوز کی۔ وہ فوراً چیخ پڑی۔ "جیکسن! دیکھو یہ...... یہ معمول سے مختلف ہے۔"

جیکسن نے اسکرین پر نظر ڈالی۔ سورج کا کنارہ غیر معمولی لہروں اور غیر مستحکم روشنی سے بھرا ہوا تھا، جو عام گرہن میں نہیں دیکھا جاتا۔ وہ اپنے کیمرے کے عدسوں میں حیرت سے گھورتے ہوئے بولا۔ "یہ سورج کا کرونا...... یا کچھ اور؟ روشنی کے یہ دھارے...... جیسے زمین پر نیلے اور سبز رنگ کے شفاف سائے گر رہے ہوں۔"

ایورٹ نے فوراً اپنی نوٹ بک سے ایک جدول نکالی اور گراف میں کچھ نئے ڈیٹا پوائنٹس جوڑے، جو اس سے پہلے کسی نے نوٹ نہیں کیے تھے۔

"یہ الیکٹرو میگنیٹک فیلڈ کی غیر معمولی سرگرمی ہے۔ اس طرح کے پیٹرن پہلے کبھی ریکارڈ نہیں ہوئے۔" اس کی آواز میں خوف اور تجسس کی ملی جلی کیفیت تھی۔

اسی لمحے ساحل کے ایک کنارے پر آرون وکٹر، ایک نوجوان سیاح اور ویڈیو بلاگر، جس نے پوری دنیا میں اپنی سسپنس ویڈیوز کے لیے نام کمایا تھا، موبائل پر براہِ راست نشر کرنا شروع کر دیا۔

"لوگو! یہ دیکھو، سورج...... سورج واقعی غائب ہے۔" اس کی آواز کے ساتھ ساتھ لوگ چیخیں مارنے لگے۔

پانچ منٹ بعد۔ جیسے ہی مکمل گرہن شروع ہوا، ایک م... سی سرسراہٹ ہوا میں محسوس ہوئی۔ لوگ خاموش ہو گئے، ہر شے مکمل طور پر تھم ہوگئی اور ساحل پر ایک نایاب سکون چھا گیا۔

لیکن اچانک ریچل نے محسوس کیا کہ کسی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا ہے۔ وہ گھومی، لیکن وہاں کوئی نہیں تھا۔

"یہ ممکن نہیں۔" اس نے سرگوشی کی۔ جیکسن نے بھی اپنے اردگرد دیکھا لیکن ساحل خالی تھا۔

اسی دوران ایورٹ نے ٹیلی اسکوپ کے ذریعے ایک غیر متوقع چیز دیکھی۔ سورج کے کنارے پر ایک عجیب سا سایہ، جو کہ معمولی کرونا یا دھوپ کا نہیں لگ رہا تھا، حرکت کر رہا تھا۔ وہ فوراً چیخا۔

"یہ کوئی خلائی شے ہے...... لیکن کیسی؟"

ریچل کے کانوں میں اچانک ہلکی سی سرسراہٹ اور دھیمی گھنٹی کی آوازیں گونجنے لگیں۔

'کیا یہ صرف ہمارا دماغ ہے؟' وہ سوچ رہی تھی لیکن آرون نے اپنی لائیو اسٹریمنگ میں دکھایا کہ ساحل پر چھوٹے چھوٹے روشنی کے دائرے ہوا میں تیر رہے ہیں، جیسے کسی غیر مرئی قوت نے انہیں پیدا کیا ہو۔

ایورٹ نے فوراً اپنے لیپ ٹاپ پر سورج کی کرونا کے ماڈلز کھولے۔ "یہ معمولی شمسی سرگرمی نہیں۔ یہ کچھ زیادہ پیچیدہ ہے۔ زمین اور چاند کے درمیان یہ تعامل، سورج کی توانائی کے بہاؤ میں غیر معمولی تبدیلی اور ہماری موجودگی، یہ سب ایک ایسا واقعہ پیدا کر رہے ہیں جسے ہم شاید مکمل طور پر سمجھ نہ سکیں۔"

ریچل نے اپنے کیمرے سے فوٹیج ریکارڈ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ صرف فلکیات نہیں ہے جیکسن! یہ انسانی شعور کے لیے بھی ایک تجربہ ہے۔ دیکھو لوگ سب خاموش، سب حیران، جیسے وقت رک گیا ہو۔"

جیکسن نے نظریں آسمان کی طرف بلند کیں۔ "اور یہ خاموشی...... لگتا ہے کہ زمین بھی اس لمحے کے لیے سانس روک رہی ہو۔"

تین منٹ بعد۔ مکمل گرہن کا نقطۂ عروج آیا۔ سورج کی کرونا ایک شفاف اور شگفتہ حلقے کی شکل میں نمودار ہوئی لیکن اسی لمحے ساحل پر غیر معمولی حرکات شروع ہوئیں۔

چھوٹے چھوٹے روشنی کے نقطے جو پہلے ہوا میں تیر رہے تھے، زمین کی طرف آنے لگے۔ لوگ چیخنے لگے اور آرون نے

لائیو اسٹریمنگ میں کہا۔ ”یہ...... یہ کوئی فلم نہیں، یہ حقیقت ہے۔“

ریچل اور جیکسن نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ایورٹ نے سرگوشی کی۔ ”ہم شاید اس لمحے کی وضاحت سائنسی طور پر نہ کر سکیں، لیکن یہ یقینی طور پر انسانی تجربے کو بدل دے گا۔“

ساحل پر جمع لوگ...... سورج کی کرونا کے شگفتہ حلقے اور ان پر آنے والے روشنی کے عجیب نقطے سب مل کر ایک ایسا منظر پیش کر رہے تھے جس کا علم نہ صرف سائنس دانوں کے لیے بلکہ عام انسان کے لیے بھی ناقابل بیان تھا۔

گرہن کا منظر اب بھی جاری تھا۔ سورج کے کنارے کرونا کی شگفتہ روشنی ایک عجیب سا حلقہ بنا رہی تھی اور مدھم روشنی میں ساحل کے کنارے جمع لوگ حیرت، سکون اور خوف کے مرکب جذبات محسوس کر رہے تھے۔ ریچل ہارپر اور ڈاکٹر جیکسن ریڈ اب تک اپنے کیمروں اور ٹیلی اسکوپ کے ساتھ مصروف تھے، لیکن دونوں کے چہرے پر نظر آنے والی سنجیدگی بڑھتی جا رہی تھی۔

ایورٹ ہینٹن، جواب بھی اپنے لیپ ٹاپ پر ڈیٹا اینالیسز کر رہا تھا، اچانک زور سے بولا۔ ”ریچل، جیکسن! یہ معمول کا کرونا نہیں ہے۔ سورج کی روشنی میں جو غیر متوقع لہریں پیدا ہو رہی ہیں، وہ ہمارے موجودہ سائنسی ماڈلز سے بالکل مختلف ہیں۔ یہ...... یہ کسی غیر مرئی فورس کا اثر لگ رہا ہے۔“

ریچل نے نظریں اوپر اٹھائیں اور فوراً ٹیلی اسکوپ سے دیکھا۔ اس کے کانوں میں اب بھی وہ ہلکی سرسراہٹ اور دھیمی گھنٹی کی آوازیں گونج رہی تھیں، جیسے فضا میں کسی پراسرار توانائی نے گردش شروع کر دی ہو۔

آرون وکٹر اب بھی لائیو اسٹریمنگ میں منظر دکھا رہا تھا۔ ”لوگو! یہ کچھ ایسا ہے جو میں نے اپنی زندگی میں کبھی نہیں دیکھا۔ یہ سورج...... یہ سورج اپنی روشنی میں کچھ ایسا کر رہا ہے جو سائنس بھی سمجھ نہیں پا رہی۔“

ساحل کے کنارے جمع لوگ خاموش ہو گئے اور صرف نرم سرسراہٹ، دھیمی ہلچل اور بحر کی ہلکی لہروں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ چھوٹے بچے زمین پر لیٹ گئے اور آسمان کی طرف حیرت سے دیکھنے لگے۔ کچھ بزرگ اپنی انگلیوں سے سورج کی کرونا کی جانب اشارہ کر رہے تھے، جیسے اس روشنی کے دائرے میں چھپی کسی پراسرار طاقت کو محسوس کر رہے ہوں۔

ریچل نے جیکسن سے کہا۔ ”یہ لمحہ انسانی شعور کے لیے بھی نایاب ہے۔ ہر شخص، ہر حواس یہاں کائنات کے اصولوں کے ساتھ براہ راست رابطے میں ہے۔“

جیکسن نے سر ہلایا لیکن اس کی آنکھوں میں خوف اور تجسس کی ملی جلی کیفیت واضح تھی۔ ”یہ صرف انسانی شعور نہیں ریچل! ارتھن کے تمام مظاہر...... درجۂ حرارت کی کمی، روشنی میں تبدیلی، پرندوں کا خاموش ہونا...... یہ سب چیزیں اس نظام میں کسی بڑے قدرتی اصول کی تصدیق کر رہا ہے۔“

ایورٹ نے ٹیلی اسکوپ کے فلٹر پر نظر ڈالی اور فوراً بولا۔ ”ریچل، جیکسن! دیکھو یہ، سورج کے کنارے ایک سایہ حرکت کر رہا ہے، یہ کوئی خلائی مخلوق یا مصنوعی شے نہیں لگ رہی۔ یہ کسی توانائی کی غیر مرئی شعاعوں سے پیدا ہونے والا اثر ہے۔“

ریچل نے فوراً اپنے کیمرے کی فوٹیج ریکارڈنگ شروع کی۔ ”یہ غیر یقینی کیفیت...... یہ کچھ ایسا ہے جو سائنس بھی مکمل طور پر بیان نہیں کر سکتی۔“

اسی وقت ساحل کے ایک کنارے آرون نے موبائل کیمرا کے زوم پر دیکھا کہ روشنی کے چھوٹے نقطے زمین کی طرف آ رہے ہیں۔ وہ چیخا۔ ”لوگو! یہ حقیقت میں زمین کی طرف آ رہے ہیں۔“

لوگوں میں خوف اور تجسس کا ملا جلا ردعمل پیدا ہوا۔ کچھ لوگ چیخنے لگے، کچھ نظریں نیچے زمین پر مرکوز کر کے یہ سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے کہ یہ نقطے کیا ہیں۔

سڈنی میں مکمل گرہن کے اثرات سب سے زیادہ تھے لیکن اسی وقت نیوزی لینڈ میں بھی لوگ ساحل پر جمع ہو گئے تھے۔ لیام اوکانر، ایک آئرش فلکیات دان، جو نیوزی لینڈ میں گرہن کے سائنسی مشاہدے کے لیے آیا تھا، اپنے ریموٹ سینسرز کا ڈیٹا چیک کر رہا تھا۔

”یہ کوئی معمولی سورج کی سرگرمی نہیں ہے، الیکٹرو میگنیٹک فیلڈ میں غیر معمولی اتار چڑھاؤ ہے۔ اس کے اثرات زمین کے ہر کنارے تک پہنچ سکتے ہیں۔“

لیام نے سائنسی ٹیم سے بات کرتے ہوئے کہا۔ ”ہمیں فوری طور پر عالمی سطح پر مشاہدے کے ڈیٹا کا تجزیہ کرنا ہوگا۔ یہ معمول کے شمسی گرہن سے کئی گنا پیچیدہ ہے۔“

اسی دوران نیویارک میں کیمرا اسٹون، ایک ماہر نیوٹریکل فزکس، اپنے گھر کے لیب میں تمام ریموٹ سینسرز سے ڈیٹا موصول کر رہی تھی۔ وہ چیخ پڑی۔ ”یہ صرف آسٹریلیا تک محدود نہیں۔ الیکٹرومیگنیٹک فیلڈ میں عالمی سطح پر تبدیلی ہو رہی ہے۔ یہ دنیا بھر کے فلکیات کے اصولوں کے لیے ایک چیلنج ہے۔“

سڈنی کے ساحل پر جمع لوگ اب بھی روشنی کے مدھم اثرات اور سایوں کی غیر متوقع حرکت سے خوفزدہ تھے۔ پرندے اچانک خاموش ہو گئے، کتے اپنی جگہ جم گئے اور درختوں کی ہلکی ہلچل بھی غیر معمولی لگ رہی تھی۔

ریچل نے محسوس کیا کہ لوگوں کی آنکھوں میں ایک عجیب سا تجسس اور خوف کا ملا جلا اثر ہے۔ ”یہ لمحہ انسانی شعور کو اپنی محدودیت سے باہر لے جارہا ہے۔“

جیکسن نے نظریں آسمان پر اٹھائیں۔ ”یہ سکون، یہ خاموشی...... یہ شاید انسانی شعور کی سب سے بڑی آزمائش ہے۔ لوگ، جانور اور یہاں تک کہ زمین خود بھی اس لمحے کے لیے رک گئی ہے۔“

تین منٹ بعد۔ سورج کا کرونا انتہائی شگفتہ اور روشنی سے بھرپور حلقے میں نمودار ہوا۔ لیکن اچانک ساحل پر جمع روشنی کے نقطے ایک عجیب ترتیب میں حرکت کرنے لگے۔ جیسے زمین کے ہر شخص کے اردگرد یہ نقطے ایک غیر مرئی طاقت سے جڑے ہوں۔

ایورٹ نے فوراً نوٹ بک میں لکھا۔ ”یہ واضح ہے کہ یہ صرف شمسی توانائی کا اثر نہیں۔ کسی نامعلوم توانائی یا قوت کا مظہر ہوسکتا ہے جس کا تعین سائنس ابھی نہیں کرسکی۔“

ریچل نے اپنے کیمرے کو فوکس کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ منظر انسانی شعور میں ہمیشہ کے لیے ایک چھاپ چھوڑے گا۔ ہم شاید اسے مکمل طور پر سمجھ نہ سکیں لیکن یہ یقینی طور پر زندگی بدل دینے والا لمحہ ہے۔“

گرہن کے اختتام کے چند لمحے بعد روشنی کے نقطے آہستہ آہستہ غائب ہونے لگے۔ ساحل پر موجود لوگ اپنے کیمروں، ٹیلی اسکوپس اور موبائل ڈیوائسز کے ساتھ اس لمحے کو قید کرنے میں مصروف تھے لیکن سب کے ذہن میں وہ سوال رہ گیا۔ ”یہ نقطے کون تھے اور یہ غیر مرئی طاقت کس مقصد کے لیے ظاہر ہوئی؟“

ریچل نے جیکسن کی طرف دیکھا اور دونوں کے چہروں پر وہی سوال تھا جو ہر شخص کے ذہن میں گھوم رہا تھا۔ ”کیا یہ صرف ایک فلکیاتی مظہر تھا یا کچھ اور، جسے ہم ابھی سمجھ نہیں سکے؟“

ایورٹ نے نوٹ بک بند کی اور سرگوشی کی۔ ”یہ لمحہ، یہ پراسرار توانائی شاید انسانی شعور اور سائنس کے درمیان ایک نیا رشتہ قائم کررہی ہے۔“

گرہن کا طویل ترین مرحلہ مکمل ہونے کے بعد بھی دنیا بھر میں اس کے اثرات محسوس کیے جارہے تھے۔ آسٹریلیا، نیوزی لینڈ اور پیسیفک کے جزائر کے ساحلوں پر لوگ اب بھی حیرت وسکون کے ملے جلے جذبات کے ساتھ موجود تھے۔ کچھ لوگ زمین پر بیٹھے سورج کے مدھم سائے کو غور سے دیکھ رہے تھے اور کچھ اپنے کیمروں میں اس لمحے کی تصاویر محفوظ کررہے تھے۔

ریچل ہارپر اب ساحل پر کھڑی تھی، اس کے کیمرے کا عدسہ اب بھی سورج کی جانب مرکوز تھا لیکن اس کے چہرے پر خوف اور تجسس کی ملی جلی کیفیت تھی۔ ”جیکسن! یہ صرف گرہن نہیں تھا، یہ ایک ایسا تجربہ تھا جسے ہم ابھی سمجھ نہیں سکے۔“

ڈاکٹر جیکسن ریڈ نے سر ہلایا۔ ”یہ معمول کے گرہن سے کہیں زیادہ پیچیدہ اور خطرناک تھا۔ روشنی کے نقطے، کرونا کے غیر معمولی حلقے اور وہ غیر مرئی توانائی...... یہ سب کچھ ہمارے سائنس دان ہونے کے ناتے بھی سمجھ سے باہر ہے۔“

ایورٹ بینٹن اپنے لیپ ٹاپ پر ڈیٹا کا بغور تجزیہ کررہا تھا۔ ”یہ غیر معمولی الیکٹرومیگنیٹک سرگرمی دنیا کے تمام کناروں تک محسوس کی گئی۔ ہمارے سینسرز نے شمالی اور جنوبی نصف کرہ میں بھی اس توانائی کے اثرات ریکارڈ کیے ہیں اور یہ صرف فلکیاتی مظہر نہیں بلکہ انسانی شعور اور حیاتیاتی ردعمل پر بھی اثر ڈال رہا ہے۔“

عالمی سطح پر غیر یقینی صورتِ حال کا سامنا تھا۔ نیوزی لینڈ میں لیام او کانر نے اپنے ٹیم ممبرز کے ساتھ ہنگامی اجلاس منعقد کیا۔ ”ہمیں فوراً عالمی سطح پر فلکیاتی اداروں کے ساتھ رابطہ قائم کرنا ہوگا۔ یہ معمول کے شمسی گرہن سے کئی گنا زیادہ پیچیدہ ہے۔ بعض جگہوں پر پرندے دن کے بعد بھی خاموش ہیں اور کئی مقامات پر درجۂ حرارت غیر معمولی حد تک کم ہوا۔“

نیویارک میں کیمرا اسٹون نے اپنی تحقیقاتی ٹیم کو ہدایات دیں۔ ”یہ وقت صرف مشاہدے کا نہیں بلکہ فوری تجزیے کا ہے۔ اگر یہ غیر مرئی توانائی زمین کے مقناطیسی اور فضائی نظام پر اثر ڈال رہی ہے تو ہمیں پیشگی اقدامات کرنا ہوں گے۔“

اس دوران سڈنی کے ساحل پر ریچل اور جیکسن نے ایک اور غیر معمولی منظر دیکھا۔ روشنی کے نقطے جو پہلے ہوا میں تیر رہے تھے، آہستہ آہستہ ساحل کی طرف بڑھ رہے تھے لیکن زمین سے ٹکرانے کے بجائے ایک عجیب سا جھلملاتا سا اثر چھوڑ رہے تھے، جو دیکھنے والوں کے شعور میں سنسنی پیدا کررہا تھا۔

آرون ویکٹر نے فوراً لائیو اسٹریمنگ میں کہا۔ ”لوگو! یہ کچھ ایسا ہے جو سائنس بھی بیان نہیں کرسکتی۔ یہ نقطے...... یہ شاید...... ایک پیغام ہیں۔“

ریچل نے کانپتے ہوئے سر ہلایا۔ ”یہ ممکن ہے کہ یہ کوئی غیر مرئی توانائی ہے جو انسانی شعور اور زمین کے طبیعی مظاہر کو آپس میں جوڑ رہی ہو۔“

گرہن کے اس غیر معمولی مرحلے میں لوگوں کی حسی

تجربات میں تبدیلیاں واضح ہوگئی تھیں۔ بچوں نے زمین پر لیٹ کر آسمان دیکھا اور ان کی آنکھوں میں حیرت کی روشنی تھی۔ بڑے لوگ خاموشی میں غور کر رہے تھے، جیسے ہر لمحہ ایک راز کو فاش کر رہا ہو۔

کچھ افراد نے اپنے جسم میں غیر معمولی توانائی محسوس کی۔ دل کی دھڑکن میں اضافہ، ہلکی لرزش اور کچھ کے لیے یہ لمحہ روحانی تجربے سے کم نہیں تھا۔ سائنس دان بھی حیران تھے کہ انسانی جسم اور شعور کس طرح اس غیر مرئی توانائی کے اثرات کا فوری جواب دے رہا ہے۔

ریچل نے جیکسن سے کہا۔ ''یہ غیر معمولی احساس...... یہ انسانی شعور میں کسی بڑے کائناتی اصول کا ادراک پیدا کر رہا ہے۔''

جیکسن نے نظریں آسمان پر بلند کیں۔ ''یہ سکون، یہ غیر یقینی کیفیت...... شاید یہی وہ لمحہ ہے جو انسانیت کو اپنی محدودیت سے باہر لے جائے۔''

ایورٹ نے فوراً اپنے ڈیٹا کا دنیا کے دیگر سینسرز کے ساتھ موازنہ کیا۔ ''یہ صرف فلکیاتی مظہر نہیں، بلکہ زمین اور سورج کے درمیان ایک پیچیدہ توانائی کا تعامل ہے۔ کچھ سینسرز نے زمین کے مقناطیسی فیلڈ میں بھی غیر معمولی اتار چڑھاؤ ریکارڈ کیا ہے۔ یہ لمحہ شاید انسانی شعور، حیاتیات اور فلکیاتی مظاہر کے درمیان ایک نیا رشتہ قائم کر رہا ہے۔''

لیام اوکانر نے نیوزی لینڈ سے بتایا۔ ''ہم نے دیکھا ہے کہ مکمل گرہن کے دوران جانوروں کا رویہ بھی تبدیل ہوا۔ پرندے خاموش ہوگئے، جانور غیر معمولی حد تک محتاط ہوگئے اور کچھ مقامات پر پانی کے بہاؤ میں بھی عارضی تبدیلی دیکھی گئی۔''

کیمرا اسٹون نے نیویارک سے کہا۔ ''یہ لمحہ سائنس، انسانیت اور فطرت کے درمیان ایک نایاب ربط کا ثبوت ہے اور یہ ربط صرف چند منٹ کے لیے ظاہر ہوا، لیکن اس کے اثرات سالوں تک محسوس کیے جاسکتے ہیں۔''

گرہن کے اثرات صرف آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ تک محدود نہیں رہے۔ پیسفک کے جزائر، جاپان اور امریکا کے کچھ حصوں میں بھی جزوی گرہن اور روشنی کے نقطے دیکھے گئے۔

ریچل نے جیکسن کی طرف دیکھا۔ ''یہ نقطے، یہ سایہ، یہ سب...... ایک پیغام ہوسکتا ہے۔ شاید کسی اعلیٰ کائناتی قوت یا توانائی کا مظہر۔''

جیکسن نے سر ہلایا۔ ''یہ سوالات شاید آج جواب نہ پائیں لیکن یہ لمحہ انسانی شعور اور سائنس کے درمیان ایک ناقابلِ یقین تجربہ ہے۔''

ایورٹ نے اپنی نوٹ بک میں آخری نوٹ لکھا۔ ''یہ واقعہ انسانی تاریخ میں ایک منفرد لمحہ ہے۔ 22 جولائی 2028ء، وہ دن جب سورج، چاند اور زمین کے درمیان کائناتی رقص نے دنیا کے تمام گوشوں میں ایک غیر معمولی توانائی اور سسپنس پیدا کیا۔''

شام کے وقت جب گرہن مکمل طور پر ختم ہوا، روشنی کی معمولی واپسی ساحل پر موجود لوگوں کو حقیقی دنیا میں واپس لائی، لیکن سب کے ذہن میں وہ سوالات رہ گئے۔

یہ روشنی کے نقطے حقیقت میں کیا تھے؟

اس غیر مرئی توانائی کا اصل ماخذ کہاں تھا؟

اور کیا یہ تجربہ انسانی شعور کو کسی نئی حقیقت کی طرف لے جائے گا؟

ریچل نے اپنے کیمرے بند کیے اور جیکسن سے کہا۔ ''ہم نے شاید ایک نایاب لمحے کو دیکھا جو سائنس، انسانیت اور فطرت کے درمیان ربط قائم کر گیا۔ یہ صرف فلکیاتی مظہر نہیں تھا بلکہ ایک ایسا تجربہ تھا جو انسانی شعور کو اپنی حدوں سے آگے لے گیا۔''

جیکسن نے نظریں آسمان پر اٹھائیں۔ ''اور یہی وہ لمحہ تھا جو صدیوں تک یاد رکھا جائے گا، نہ صرف سائنس دانوں کے لیے بلکہ ہر انسان کے لیے جو اس لمحے کی موجودگی میں تھا۔''

ایورٹ نے آخری بار ڈیٹا کی جانچ کی اور سر ہلایا۔ ''یہ لمحہ ہمیں یہ سکھاتا ہے کہ کائنات میں اب بھی بہت کچھ ایسا ہے جو ہم سمجھ نہیں پائے اور شاید یہ غیر مرئی توانائی، یہ نقطے اور یہ سایہ ہمیں آنے والے برسوں میں نئے اسرار کے دروازے کھولنے کا موقع دیں گے۔''

آرون وکٹر نے اپنی لائیو اسٹریمنگ بند کی اور لوگوں نے ساحل پر جمع ہوکر ایک دوسرے سے باتیں کرنا شروع کیں لیکن سب کے دلوں میں وہی سنسنی، وہی پراسراریت اور وہی حیرت کی کیفیت موجود تھی جو گرہن کے آغاز سے لے کر اب تک برقرار رہی تھی۔

22 جولائی 2028ء کا یہ شمسی گرہن صدی کا سب سے طویل گرہن، نہ صرف ایک فلکیاتی مظہر تھا بلکہ انسانی شعور، سائنسی تحقیق اور عالمی سطح پر انسانی تعامل کا ایک منفرد تجربہ بھی تھا۔ یہ واقعہ انسانی تاریخ میں ایک نایاب اور یادگار لمحہ بن گیا جو آنے والی نسلوں کو یہ یاد دلاتا رہے گا کہ کائنات کی وسعت اور اسرار ہمیشہ انسانی شعور کی حدوں سے آگے ہیں۔

⌘⌘⌘

خُوگرفتہ

ملک صفدر حیات

شیطان ازل سے انسان کو بھٹکا رہا ہے... اور اس کے بہکاوے میں آکر وہ اس قدر اخلاقی پستی کا شکار ہو جاتا ہے کہ حیوانیت کی حدوں کو بھی پار کر جاتا ہے... زیرِنظر کہانی بھی ایسے ہی ایک حیوان نما انسان کی ہے جس نے ایک ایسا کام کیا جسے دیکھ اور سن کر انسانیت بھی شرما جائے... مگر بالآخر وہ ملک صاحب کی گرفت میں آہی گیا۔

ہوس کے مارے ایک مجرم کے قبیح فعل کی کہانی

کسی نے کسی سے سوال کیا...... ''تُو کون؟'' کسی نے اس کسی کو جواب دیا...... ''میں خوامخواہ!'' بس بعض لوگ ایسے ہی جھکی، بددماغ اور الجھن زدہ گفتگو کرنے کے عادی ہوتے ہیں۔ وہ بھی ایک ایسا ہی خوگرفتہ تھا۔

اس مختصر تمہید کے بعد میں اصل واقعے کی طرف آتا ہوں۔

ان دنوں میں لالہ موسیٰ کے ایک تھانے میں تعینات تھا بلکہ یوں کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ میری تقرری لالہ موسیٰ کے اکلوتے تھانے میں تھی۔ اس زمانے میں لالہ موسیٰ ایک چھوٹا سا قصبہ ہوا کرتا تھا اور اس کی وجۂ شہرت وہاں کی غلہ منڈی تھی۔ اگر میں غلط نہیں تو آج بھی لالہ موسیٰ کی غلہ منڈی کا شمار پاکستان کی بڑی غلہ منڈیوں میں ہوتا ہے جہاں سے گندم، چاول، دالیں اور دیگر اجناس ملک کے طول و عرض میں بھیجی جاتی ہیں۔ عرفِ عام میں اسے ''اناج منڈی'' بھی کہا جاتا ہے۔

وہ موسم بہار کا آغاز تھا۔ ماہِ مارچ قریب الختم تھا۔ ایک پُربہار اور خوشگوار صبح میں تیار ہو کر تھانے پہنچا تو برآمدے میں دو افراد میرے منتظر تھے۔ ان میں ایک

ادھیڑ عمر مرد اور دوسری خوبصورت عورت تھی۔ میں نے ان پر ایک سرسری سی نگاہ ڈالی اور اپنے کمرے میں آ گیا۔

ایک منٹ کے بعد کانسٹیبل اسمٰعیل میرے لیے ٹھنڈا پانی لے کر آیا تو میں نے اس سے استفسار کیا۔ ''یہ کون لوگ ہیں اور کس کام سے تھانے آئے ہیں؟''

''ان کا تعلق موضع شمشاد نگر سے ہے۔'' کانسٹیبل نے میرا اشارہ سمجھتے ہوئے بتایا۔ ''ملک صاحب! کسی بچے کی گمشدگی کا معاملہ ہے۔''

''ٹھیک ہے، انہیں فوراً اندر بھیجو۔'' میں نے کہا۔

موضع شمشاد نگر میرے تھانے سے محض نصف میل کی دوری پر مغرب میں واقع ایک متوسط گاؤں تھا جس کی آبادی ایک ہزار نفوس کے لگ بھگ قریب تھی۔ شمشاد نگر میں چودھری ارشاد حسین کی حویلی کے علاوہ لگ بھگ ڈھائی سو مکانات تھے۔ چودھری ارشاد سے کئی بار میری ملاقات ہو چکی تھی اور میں نے اسے عام روایتی متکبر چودھریوں کے برعکس ایک خوش اخلاق، وضع دار اور منکسر المزاج انسان پایا تھا۔ اس گاؤں کا نام ارشاد حسین کے دادا چودھری شمشاد حسین کے نام پر رکھا گیا تھا۔

تھوڑی ہی دیر میں فریادیوں کو میرے سامنے حاضر کر دیا گیا۔

مرد کی عمر کا اندازہ میں نے پینتالیس کے آس پاس قائم کیا جبکہ اس کے مقابلے میں وہ عورت خاصی جوان اور حسین تھی۔ گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے میں نے قدرے نرم لہجے میں کہا۔

''بتائیں میں آپ لوگوں کے لیے کیا کر سکتا ہوں؟''

اپنی بات کے اختتام پر میں نے سوالیہ نظر سے باری باری انہیں دیکھا۔ کانسٹیبل اسمٰعیل کی زبانی مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ وہ دونوں کسی بچے کی گمشدگی کے سلسلے میں تھانے آئے ہیں لیکن میں ان کی بپتا انہی کی زبانی سننا چاہتا تھا۔

''تھانیدار صاحب! میرا نام امیر حسین ہے۔'' دراز قامت اور گندمی رنگت والے کم رو مرد نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ ''میں ایک چھوٹا زمیندار ہوں۔ نذیراں میرے پڑوس میں رہتی ہے۔'' اس نے اپنے ساتھ بیٹھی ہوئی خوب رو، گوری چٹی، پُرکشش اور میانہ قد عورت کی جانب اشارہ کرنے کے بعد ان الفاظ میں بات مکمل کر دی۔

''نذیراں بی بی کا بیٹا کہیں گم ہو گیا ہے۔ یہ اکیلی تھانے آتے ہوئے گھبرا رہی تھی اس لیے میں ساتھ آ گیا۔''

''تم نے بہت اچھا کیا امیر حسین!'' میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے سراہنے والے انداز میں کہا۔ ''دکھی اور پریشان حال انسانوں کی مدد کرنا بہت نیکی کا کام ہے اور اگر وہ شخص آپ کا پڑوسی ہو تو یہ نیک عمل عبادت کا درجہ حاصل کر لیتا ہے۔'' پھر میں نذیراں کی جانب متوجہ ہو گیا۔

''نذیراں! تمہارے بیٹے کا نام کیا ہے؟'' میں نے نرم لہجے میں استفسار کیا۔

''اس کا نام تو بابر ہے تھانیدار صاحب!'' اس نے روہانسی آواز میں جواب دیا۔ ''لیکن وہ ''بھولا'' کے نام سے مشہور ہے۔''

''ٹھیک ہے، میں بھی اسے بھولا ہی کہوں گا۔'' میں نے اپنایت آمیز ہمدردانہ انداز میں کہا اور پوچھا۔ ''بھولا کی عمر کیا ہے اور وہ کب سے غائب ہے؟''

''وہ پورے آٹھ سال کا ہو گیا ہے جی۔'' نذیراں نے بتایا۔ ''وہ کل سے گھر نہیں آیا۔'' اس نے لمحاتی توقف کیا پھر بھرائی ہوئی آواز میں اضافہ کر دیا۔ ''تھانیدار صاحب! بھولا میری واحد اولاد ہے، وہ میری زندگی کا سہارا ہے۔ اس دنیا میں ہم ماں بیٹے کا کوئی بھی نہیں ہے۔''

نذیراں کی وضاحت سے میں یہ تو جان گیا تھا کہ بھولا اس کی اکلوتی اولاد تھا مگر ایک اہم سوال باقی تھا۔ سو، میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

''بھولا کا باپ کہاں ہے؟''

''توبا تین سال پہلے اللہ کو پیارا ہو گیا تھا۔'' اس نے بتایا۔

میرے مزید کریدنے پر نذیراں نے مجھے بتایا کہ اس کا مرحوم خاوند یعقوب عرف توبا ایک کھیت مزدور تھا۔ تین سال پہلے ایک رات توبا کی پسلیوں کے نیچے بہت زور کا درد اٹھا تھا۔ گھریلو ٹوٹکے آزمانے کے باوجود بھی جب توبا کی تکلیف میں کمی واقع نہیں ہوئی تو گاؤں کے حکیم دوست محمد کو بلایا گیا۔ حکیم جی نے توبا کی کیفیت کو دیکھ کر اعلان کر دیا کہ یہ درد قولنج ہے۔ بہرکیف، حکیم جی نے توبا کو دوا کھلا دی مگر کوئی افاقہ نہ ہو پایا۔ تمام تر جتن اور علاج

معاملے کا ثبوت تھیں برآمد نہ ہو سکا اور وہ رات بدقسمتی سے توبا کی زندگی کی آخری رات ثابت ہوئی تھی۔

''مجھے تمہارے خاوند کی موت کا دکھ ہے نذیراں!'' اس کے خاموش ہونے پر میں نے ہمدردی بھرے لہجے میں کہا۔ ''بہرحال ابھی میرے سامنے بھولا کی گمشدگی کا معاملہ ہے اور اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے مجھے تمہارا تعاون چاہیے۔''

وہ نمناک آواز میں بولی۔ ''آپ جو کہیں گے، وہ میں کروں گی۔ بس آپ کسی بھی طرح میرے بھولا کو ڈھونڈ نکالیں۔''

''میں نے تم سے پوچھا تھا کہ وہ کب سے غائب ہے؟'' میں نے سوالیہ نظر سے نذیراں کو دیکھا۔ ''مگر تم نے کوئی واضح جواب نہیں دیا؟''

''بھولا روزانہ صبح بدری کی دکان پر کام کرنے جاتا ہے اور شام سے پہلے واپس آجاتا ہے۔'' نذیراں نے دوپٹے کے پلو سے اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے بتایا۔ ''مگر کل وہ دکان سے لوٹا نہیں۔ میں نے پورے گاؤں میں بھولا کو تلاش کیا ہے، حتیٰ کہ بدری کی دکان پر بھی گئی تھی لیکن وہ مجھے کہیں نہیں ملا۔ بدری نے بتایا ہے کہ بھولا کل دن ہی میں چھٹی کر کے گھر چلا گیا تھا۔ اس نے بدری کو بتایا تھا کہ ماں بیمار ہے لیکن...... میں تو بیمار نہیں ہوں تھانیدار صاحب! پھر بھولا نے بدری سے جھوٹ کیوں بولا تھا؟''

''میں جلد ہی تمہارے اس سوال کا جواب تلاش کرلوں گا نذیراں!'' میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا اور پوچھا۔ ''شمشادنگر میں بدری کی دکان کس طرف ہے اور یہ بھی بتاؤ کہ وہ اپنی دکان میں ایسا کیا بیچتا ہے کہ اسے ملازم رکھنے کی ضرورت پیش آگئی اور وہ بھی ایک آٹھ سالہ معصوم بچے بھولا کو؟''

''بدری کا اصل نام بدرالدین ہے تھانیدار صاحب اور اس کی کریانے کی دکان ہے۔'' امیر حسین نے مجھے بتایا۔ ''اور وہ دکان شمشادنگر میں نہیں بلکہ لالہ موسیٰ کے مین بازار میں ہے۔''

''مطلب جی ٹی روڈ کی دوسری جانب؟''

''جی ہاں۔'' امیر حسین نے اثبات میں جواب دیا۔ ''غلہ منڈی کے بہت قریب۔''

''نذیراں! تمہیں کچھ اندازہ بھی ہے کہ جی ٹی روڈ کتنی مصروف اور خطرناک سڑک ہے؟'' میں نے لاپتا بچے کی ماں سے سوال کیا۔ ''اتنے چھوٹے بچے کو تم نے کام پر لگا دیا اور وہ بھی [illegible] نے اس بار۔ بھلا ایسی بھی کون سی مجبوری آن پڑی تھی؟''

''بھولا بہت سمجھ دار اور ہوشیار بچہ ہے تھانیدار صاحب!'' وہ ایک بوجھل سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔ ''وہ ہمیشہ بس اسٹاپ والی جگہ سے ہی پار کرتا تھا۔ وہاں بالکل بھی رش نہیں ہوتا۔ میرا مطلب ہے گاڑیوں کے گزرنے کا رش، اس لیے حادثے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ باقی جہاں تک میری مجبوری کا سوال ہے تو......'' وہ بولتے بولتے رک گئی۔ چند لمحات تک تذبذب کی کیفیت میں مبتلا رہنے کے بعد اس نے اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''توبا کی وفات کے بعد میں نے کھیتوں میں مزدوری شروع کردی تھی۔ کچھ عرصے تک سب ٹھیک ٹھاک چلتا رہا پھر ایک ایسا واقعہ پیش آیا کہ میں نے وہ کام چھوڑ دیا۔''

نذیراں کسی واقعے کا حوالہ دینے کے بعد ایسے خاموش ہوگئی تھی کہ مجھے یہ سمجھنے میں کسی دقت کا سامنا نہیں ہوا کہ وہ واقعہ یقیناً ناخوشگوار اور انتہائی تکلیف دہ ہوگا۔ اس ذیل میں، میں نے بھی مزید کوئی سوال نہیں کیا اور معتدل انداز میں پوچھا۔

''بھولا کب سے بدری کی دکان پر کام کر رہا تھا؟''

''لگ بھگ چھ ماہ سے تھانیدار صاحب!'' اس نے بتایا۔

''اور تمہیں کھیت مزدوری چھوڑے کتنا عرصہ ہوا ہے؟''

''ایک سال...... یا ایک آدھ ماہ اوپر۔''

''تو اب تم دن بھر اپنے گھر میں رہتی ہو؟'' میں نے نذیراں کے چہرے پر نگاہ جما کر سوال کیا۔ ''اور بھولا، بدری کی دکان پر؟''

''تھانیدار صاحب! غریبوں پر قسمت اتنی مہربان نہیں ہوتی کہ وہ آرام سے گھر بیٹھے رہیں۔'' نذیراں نے تلخی سے جواب دیا۔ ''میں نے کھیت مزدوری چھوڑ دی مگر کام سے ہاتھ نہیں کھینچا۔ بھولا کو اس دکان سے اتنے پیسے نہیں ملتے جس سے ہم ماں بیٹا آسانی سے گزارہ کرلیں۔''

''تو پھر تم کیا کرتی ہو؟'' میں نے الجھن زدہ لہجے میں پوچھا۔

''میں لوگوں کے گھروں میں صفائی ستھرائی اور برتن مانجھنے کا کام کرتی ہوں۔'' اس نے بتایا۔ ''بس، میں اس دن کا انتظار کر رہی تھی جب بھولا دکانداری کا ہنر سیکھ لے۔ میں نے یہی سوچا تھا کہ میں اپنے بیٹے کو پرچون کی دکان کھول کر دوں گی اور وہ بھی لالہ موسیٰ کے مین بازار میں مگر... یہ ضروری تو نہیں کہ انسان جیسا سوچتا ہے، ویسا ہو بھی جائے۔''

نذیراں نے دل شکستہ انداز میں بات مکمل کی تو میں نے حوصلہ بڑھانے والے انداز میں کہا۔ ''پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں بہت جلد گمشدہ بھولا کو ڈھونڈ نکالوں گا، پھر سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ تم دیکھ لینا، تمہارا بیٹا کریانہ اسٹور کا تجربہ حاصل کرنے کے بعد اپنی بڑی سی دکان ضرور کھولے گا اور وہ بھی تمہاری خواہش کے عین مطابق۔''

''تھانیدار صاحب!'' وہ بے ساختہ بولی۔ ''سوہنا رب آپ کی زبان مبارک کرے۔''

امیر حسین نے بہ آواز بلند کہا۔ ''آمین!''

''کل صبح جب بھولا گھر سے نکلا تو اس نے کس قسم کا لباس پہن رکھا تھا؟'' میں نے نذیراں سے پوچھا۔

''شلوار اور قمیص۔'' اس نے بتایا۔

''لباس کا رنگ؟''

''ہلکا بھورا۔''

''اور پاؤں میں......؟''

''چمڑے کی کالی چپل۔'' نذیراں نے جواب دیا۔ ''انگوٹھے والی۔''

''ٹھیک ہو گیا۔'' میں نے ان اہم معلومات کو اپنی ڈائری میں نوٹ کرتے ہوئے دریافت کیا۔ ''کیا بھولا پہلے بھی کبھی اس طرح غائب ہوا ہے؟''

''نہیں تھانیدار صاحب!'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ''ایسا پہلی بار ہوا ہے، اسی لیے تو میں بہت زیادہ فکرمند ہوں۔''

''پریشان ہونے سے مسائل کبھی حل نہیں ہوتے نذیراں!'' میں نے اس کی کشادہ اور پرکشش آنکھوں میں دیکھتے ہوئے نرم لہجے میں کہا۔ ''تمہیں ہمت سے کام لینا ہوگا۔ اچھی طرح سوچ کر بتاؤ......!'' لمحاتی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس لی پھر ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔

''تمہاری یا بھولا کی کسی سے کوئی دشمنی تو نہیں ہے؟''

اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔

''نہ... نہ جی!'' وہ جلدی سے بولی۔ ''شمشاد نگر میں ہمارا کوئی بھی دشمن نہیں ہے۔''

''اور شمشاد نگر سے باہر؟'' میں نے بغور اس کی جھیل ایسی گہری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

''نہ اندر اور نہ باہر۔'' وہ سنبھلے ہوئے لہجے میں بولی۔

میں چند لمحات تک نذیراں کے چہرے اور آنکھوں کے تاثرات کا بغور جائزہ لیتا رہا۔ میری تجربہ کار عقابی نگاہ نے یہ تو بھانپ لیا تھا کہ وہ مجھ سے دانستہ کچھ چھپانے کی کوشش کر رہی تھی تاہم اس موقع پر میں نے اصرار سے گریز کرتے ہوئے اس معاملے کو آئندہ کے لیے چھوڑ دیا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

''نذیراں! تمہارے پاس بھولا کی کوئی فوٹو ہے؟''

وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ''جی ہے۔''

''بھولا کی تصویر اس کی تلاش میں بہت مددگار ثابت ہو سکتی ہے۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''نذیراں! کیا تم وہ تصویر مجھے دے سکتی ہو؟''

''ہاں، ہاں...... ضرور۔'' وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے ترنت بولی۔ ''مگر وہ فوٹو گھر میں رکھی ہوئی ہے، اگر آپ کہیں تو میں ابھی لا کر آپ کو دے سکتی ہوں۔''

میں نے تصدیق طلب انداز میں پوچھا۔ ''بھولا کی وہ تصویر تمہارے گھر میں محفوظ تو ہے نا؟''

''جی ہاں...... بالکل محفوظ۔''

''بس، تو تم اس تصویر کو فی الحال اپنی حفاظت ہی میں رہنے دو۔'' میں نے ایک خاص مقصد کے تحت کہا۔ ''میں کسی وقت گھر آ کر تم سے لے لوں گا...... اگر تمہیں کوئی اعتراض نہ ہو تو؟''

''نہ جی...... میں بھلا کیوں اعتراض کروں گی۔'' وہ پُراعتماد لہجے میں بولی۔ ''آپ میرے بھولا کو ڈھونڈ کر میرے پاس لانے والے ہیں۔ آپ جب چاہیں میرے گھر آ سکتے ہیں۔''

''تم واپس شمشاد نگر چلی جاؤ۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میں ابھی سے بھولا کی تلاش کا کام

شروع کر رہا ہوں۔ مجھے جب بھی تمہاری ضرورت محسوس ہوگی، میں کسی کو بھیج کر تمہیں تھانے بلالوں گا۔''

میری بات نذیراں کی سمجھ میں آگئی۔ ''شکریہ تھانیدار جی!'' یہ کہہ کر وہ کھڑی ہوگئی۔ ''مجھے یقین ہے آپ جلد از جلد بھولا کو مجھ سے ملوا دیں گے۔''

''ان شاءاللہ!'' میں نے صدقِ دل سے کہا۔

''میرے لائق جو بھی خدمت ہو، بلاجھجک بتائیں تھانیدار صاحب!'' امیر حسین کھڑے ہوتے ہوئے پرخلوص انداز میں بولا۔ ''نذیراں کا پڑوسی ہونے کے ناتے میری شدید خواہش ہے کہ بھولا کی بازیابی والی مہم میں تھوڑا حصہ میں بھی ڈالوں۔ آپ میری بات سمجھ رہے ہیں نا؟''

''اچھی طرح سمجھ رہا ہوں۔'' میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ''میں آپ کو ایسا موقع ضرور دوں گا۔''

وہ دونوں مجھے سلام کرنے کے بعد رخصت ہوگئے۔

جب میں نے نذیراں سے اس کے کسی دشمن کے بارے میں سوال کیا تھا تو وہ لمحے بھر کے لیے گڑبڑا کر رہ گئی تھی مگر پھر فوراً ہی اس نے صورتِ حال کو سنبھال لیا تھا لیکن اسی ایک متذبذب لمحے میں مجھے بخوبی اندازہ ہوگیا تھا کہ دال میں کچھ کالا ضرور ہے جو وہ امیر حسین کے سامنے ظاہر نہیں کرنا چاہتی۔ اسی لیے میں نے اس کے گھر پر ایک تفصیلی ملاقات کا فیصلہ کرلیا تھا۔

عورت کا حسن اور خوبصورتی ہی اس کے سب سے بڑے دشمن ہوتے ہیں۔ نذیراں حسین و جمیل ہونے کے علاوہ انتہائی جاذبِ نظر بھی تھی۔ اس پر مستزاد وہ ایک بیوہ تھی۔ نذیراں کا غیر محفوظ جوبن اور بے حصار شباب کسی بھی مرد کو اس کی جانب متوجہ ہونے پر مجبور کرسکتا تھا اور قریب سے دشمنی کرنا بہت آسان ہوجاتا ہے۔

☆☆☆

بابر عرف بھولا کی گمشدگی کی رپورٹ تیس مارچ کی صبح میرے تھانے میں درج کرائی گئی تھی، وہ ہفتے کا دن تھا۔ مبینہ طور پر بھولا گزشتہ روز انتیس مارچ کی دوپہر سے غائب تھا۔ میں نے بھولا کی تلاش کا کام وہیں سے شروع کیا جہاں وہ آخری مرتبہ زندہ سلامت دیکھا گیا تھا، یعنی لالہ موسیٰ کے مین بازار میں واقع بدردین عرف بدری کے کریانہ اسٹور سے۔

ہمارے زمانے میں تھانے کا عملہ نہایت ہی مختصر ہوا کرتا تھا اور اس کا سب سے بڑا سبب کرائم ریٹ کا کم ہونا تھا۔ بعض اوقات تو ہفتوں بلکہ مہینوں گزر جاتے تھے اور کسی جرم کی رپورٹ درج کرنے کی نوبت نہیں آتی تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ جہاں آبادی میں اضافہ ہوا، وہاں انسانی خواہشات بھی بے لگام ہوتی گئی ہیں۔ جب کسی معاشرے سے قناعت اور صبر و شکر رخصت ہوجائیں تو ذہنی انتشار اور اخلاقی انحطاط اس سماج کو اپنے مجس زدہ زہریلے نرغے میں لے لیتا ہے۔ ایسے غیر یقینی ماحول میں جرم کو بہ آسانی پھلنے پھولنے کا موقع ملتا ہے۔ اس وقت ہمارے چاروں طرف یہی سب تو ہو رہا ہے۔

میں جب کانسٹیبل بشارت کی معیت میں بدری کی دکان پر پہنچا تو اس وقت دوپہر ہو رہی تھی۔ مذکورہ دکان میرے تھانے سے زیادہ دور نہیں تھی۔ ہم ٹہلتے ہوئے ادھر جا نکلے تھے۔ بدری اپنی دکان پر موجود تھا۔ ہم دونوں پولیس یونیفارم میں تھے اس لیے ہم پر نظر پڑتے ہی وہ کچھ گھبرا سا گیا لیکن جب میں نے نرم لہجے میں اسے اپنی آمد کی غرض و غایت سے آگاہ کیا تو اس کی جان میں جان آئی۔

''بدری! تم نے کیا سمجھا تھا، ہم تمہیں گرفتار کرنے آئے ہیں؟'' میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جما کر معتدل انداز میں کہا۔ ''تمہاری پریشانی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔''

''وہ جناب......! سانپ، چور اور پولیس کی وردی کا اپنا ایک خوف ہوتا ہے۔'' اس نے سنبھلتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''انسان نے کچھ نہ بھی کیا ہو، اندر سے ڈر بہت لگتا ہے۔''

''یہ تو تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو بدری کہ پولیس کی وردی کا ایک خاص رعب اور دبدبہ ہوتا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن تم نے چور اور سانپ والی مثال میں پولیس یونیفارم کو شامل کرکے میرے علم میں اضافہ کیا ہے۔ میں نے تو آج تک یہی سنا اور پڑھا تھا کہ سانپ اور چور کی بڑی دہشت ہوتی ہے۔''

''بس جی......وہ تو ایسے ہی میرے منہ سے نکل گیا تھا۔'' وہ معذرت خواہانہ انداز میں بولا۔ ''مجھے معاف کردیں سرکار!''

''جاؤ معاف کیا۔'' میں نے فراخدلی سے کہا۔ ''تم بھی کیا یاد کروگے کہ کس سخی تھانیدار سے پالا پڑا تھا۔''

بدری خوش ہوگیا اور اس نے ٹھنڈی بوتلوں سے ہماری تواضع کرتے ہوئے مؤدب انداز میں پوچھا۔
''حکم کریں تھانیدار صاحب! میں آپ کی کیا خدمت کروں؟''

بدری کی عمر چالیس سے متجاوز تھی۔ وہ گہرے سانولے رنگ کا مالک ایک پستہ قامت شخص تھا۔ اس کی شکل وصورت ڈھنگ کی تھی اور نہ ہی شخصیت متاثر کن۔ ہر انسان اللہ کی تخلیق ہے لہٰذا اس کی تحقیر کسی بھی طور جائز نہیں۔ میں نے یہاں پر بدری کو مطعون کرنے کے لیے یہ الفاظ استعمال نہیں کیے بلکہ میرے پیشِ نظر صرف اور صرف اس کا حلیہ بیان کرنا تھا۔ اس لیے میرے بیان کو محض بیان ہی سمجھا جائے۔

میرے استفسار کے جواب میں بدری نے مجھے بتایا کہ بھولا کی ماں اس کی دکان سے اپنے گھر کا سودا لینے آتی تھی۔ ہر بار وہ میرے کریانہ اسٹور کی بہت تعریف کرتی اور مجھ سے کہتی کہ میں اس کے بیٹے کو اپنے پاس کام پر لگا دوں۔ بھولا بہت چھوٹا تھا اس لیے میں نے ہمیشہ اسے منع کیا لیکن اس کا اصرار بڑھتا گیا۔ مجبور ہوکر میں نے اس کی بات مان لی اور لگ بھگ چھ ماہ پہلے میں نے بھولا کو کام سکھانے کی غرض سے اپنے پاس رکھ لیا لیکن جلد ہی مجھے اندازہ ہوگیا کہ نذیراں کی ضد کے آگے ہتھیار ڈال کر میں نے ایک سنگین غلطی کردی تھی۔

''کیسی غلطی؟'' میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے پوچھا۔

''مجھے بھولا کو اپنی دکان پر نہیں رکھنا چاہیے تھا۔''

''مگر ہوا کیا؟'' میں نے تیز لہجے میں دریافت کیا۔ ''کیا نذیراں نے کوئی گڑبڑ کردی تھی؟''

''وہ بچاری کیا گڑبڑ کرتی۔'' وہ نفی میں گردن جھٹکتے ہوئے بولا۔ ''قصور ماں کا نہیں، بیٹے کا تھا سرکار!''

میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔ ''کیوں...... بھولا نے ایسا کیا کردیا تھا؟''

''اسے دکانداری سیکھنے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی تھانیدار صاحب!'' بدری نے برا سا منہ بناتے ہوئے جواب دیا۔ ''وہ ایک گھنٹا میری دکان کے اندر ہوتا اور آدھا گھنٹا باہر۔ وہ بچوں کو کھیلتے دیکھ کر ایک دم مچل جاتا تھا، پھر دکان کے کام میں اس کا دھیان نہیں لگتا تھا۔ میں اس کی فطری مجبوری کو اچھے سے سمجھتا تھا۔ بھولا کی عمر کھیل کود کی تھی اور نذیراں نے زبردستی اسے کام پر لگا دیا تھا۔ میں نے کبھی بھولا کو ڈانٹا نہیں، ہاں البتہ کئی بار اسے سمجھانے کی کوشش ضرور کی تھی مگر میری نصیحت کا اس پر خاک بھی اثر نہ ہوا۔ تنگ آکر میں نے اس کے بارے میں ایک فیصلہ کرلیا۔''

بدری سانس ہموار کرنے کی غرض سے متوقف ہوا تو میں نے فوراً سوال داغ دیا۔ ''کیسا فیصلہ؟''

''بھولا کی چھٹی کرنے کا فیصلہ۔'' اس نے انکشاف انگیز لہجے میں کہا۔ ''میں نے سوچ لیا تھا کہ اب کی بار جب نذیراں میری دکان پر آئے گی تو میں بھولا کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے کر کہوں گا...... یہ کام میرے بس کا ہے اور نہ ہی بھولا کے، تم اپنے بیٹے کو لے جاؤ لیکن......''

وہ یکایک خاموش ہوا تو میں نے پوچھا۔ ''لیکن کیا بدری؟''

''کل شام میں نذیراں اپنے بیٹے کو ڈھونڈتے ہوئے یہاں آئی اور اس نے بتایا کہ بھولا گھر نہیں پہنچا۔'' وہ بوجھل آواز میں بولا۔ ''اور آج آپ اسی سلسلے میں تفتیش کرتے ہوئے میرے پاس آئے ہیں...... آہ!'' وہ لمحے بھر کے لیے رکا پھر دکھی لہجے میں اضافہ کردیا۔

''پتا نہیں وہ معصوم بچہ کہاں گم ہوگیا ہے۔''

''نذیراں نے مجھے بتایا ہے کہ گزشتہ روز بھولا اپنی ماں کی بیماری کا بہانہ کرکے جلدی چلا گیا تھا۔'' میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جما کر معتدل انداز میں پوچھا۔ ''مجھے بتاؤ وہ کل کتنے بجے تمہاری دکان سے نکلا تھا؟''

''وہ پیشی (ظہر) کا وقت تھا سرکار!'' بدری نے جواب دیا۔ ''یہی کوئی ڈیڑھ یا دو بجے ہوں گے۔''

''کیا تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ وہ کہاں گیا ہوگا؟''

بدری نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''میں اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھانیدار صاحب! ہاں، میرا خیال ہے بھولا اپنی مرضی سے تو گم نہیں ہوسکتا۔''

''بجھارتیں نہیں ڈالو بدری!'' میں نے تیز نظر سے اسے گھورا۔ ''جو بھی کہنا ہے، صاف اور سیدھے الفاظ میں کہو۔''

''سرکار! بھولا کی عمر صرف آٹھ سال ہے۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''اتنی چھوٹی عمر میں کوئی بچہ گھر سے بھاگنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ ضرور اس کے ساتھ کوئی حادثہ پیش آگیا ہے۔''

''مثلاً کیسا حادثہ؟'' میں نے چونکتے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

''میں ایکسیڈنٹ کی بات نہیں کر رہا۔'' اس نے کہا۔ ''اگر ایسا کچھ ہوا ہوتا تو یہ افسوسناک واقعہ زیادہ دیر تک چھپا نہیں رہ سکتا تھا۔''

''پھر......؟'' میں نے کریدنے والے انداز میں پوچھا۔ ''تمہارے خیال میں بھولا کی گمشدگی کا کیا سبب ہوسکتا ہے؟''

''اغوا۔'' اس نے سرسراتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

میں چند لمحات تک ٹٹولتی ہوئی نظر سے اسے تکتا رہا پھر اضطراری لہجے میں استفسار کیا۔ ''بدری! کیا تمہارے ددھیال میں کسی بندے نے کبھی پولیس کی نوکری کی ہے؟ میرا مطلب ہے تمہارے دادا یا باپ یا پھر کسی چاچے نے؟''

''نن...... نہیں سرکار!'' وہ الجھن زدہ انداز میں بولا۔ ''ایسی تو کوئی بات نہیں۔''

''تمہارے سوچنے کا انداز پولیس والوں جیسا ہے۔'' میں نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا۔ ''اغوا کا امکان میرے ذہن میں بھی ہے۔''

''تھانیدار صاحب! میں نے جیسا سمجھا، وہ آپ کو بتا دیا ہے۔'' اس نے عام سے لہجے میں کہا۔ ''بھولا بہت ہی چھوٹا اور ناسمجھ بچہ ہے۔ ہوسکتا ہے کوئی غلط آدمی اسے بہلا پھسلا کر کہیں لے گیا ہو۔ چھوٹے بچوں کو بہکانا زیادہ مشکل نہیں ہوتا۔''

''تم نے کسی غلط آدمی کا ذکر کیا ہے۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا پچھلے چند روز میں تم نے اپنی دکان کے آس پاس کسی مشکوک آدمی کو ٹہلتے ہوئے یا بھولا کو کسی اجنبی شخص سے بات کرتے دیکھا تھا؟''

بدری نے نفی میں گردن ہلانے پر اکتفا کیا۔

مزید دو، چار سوالات کرنے کے بعد میں نے بدری کو فارغ کر دیا اور رخصت ہونے سے پہلے تاکیدی انداز میں کہا۔

''تم اپنی آنکھیں اور کان کھلے رکھنا۔ کوئی بھی ایسی بات تمہیں پتا چلے جو بھولا کی تلاش میں کام آسکتی ہو تو فوراً تھانے آکر مجھے بتانا۔ بھولا کو ڈھونڈ نکالنا تمہاری بھی ذمے داری ہے بدری! میں کل کسی وقت دوبارہ یہاں کا چکر لگاؤں گا۔''

''جو حکم مائی باپ!'' وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر فدویانہ

حجامتیں کیسی

''خلیل صاحب کا انتقال کیسے ہوا؟''

''وہ ایک ماڈرن قسم کے باربر شاپ میں شیو کرانے گئے تھے جہاں لڑکیاں گاہکوں کا شیو کرتی تھیں۔ ایک لڑکی ان کا شیو بنا رہی تھی کہ ایک چوہا لڑکی کے پاؤں پر سے گزر گیا۔''

☆☆☆

''تمہاری کبھی سرجری ہوئی ہے؟''

''بہت مرتبہ...... کیونکہ میں نائی سے شیو بنواتا ہوں۔''

☆☆☆

''میں بہت جلدی میں ہوں۔ کیا تم میرا کالر موڑے بغیر اور میری گردن کے گرد تولیا لپیٹے بغیر میرا شیو بنا سکتے ہو؟''

''جی ہاں جناب...... اور اگر آپ حکم دیں تو میں آپ کی ٹوپی اتارے بغیر آپ کے بال بھی کاٹ سکتا ہوں۔''

☆☆☆

''تم بہت اچھے حجام ہو۔ تمہاری باتیں سنتے ہوئے پتا ہی نہیں چلتا کہ کب حجامت ہوگئی۔''

''یہ فن مجھے ورثے میں ملا ہے سر!''

''کیا تمہارے والد بھی حجام تھے؟''

''نہیں سر! وہ صرف داستان گو تھے۔ میں نے ان کے پیشے کو ترقی دی ہے۔''

☆☆☆

''سر! آپ کس طرح حجامت بنوانا پسند کریں گے؟''

''تمہاری آواز سنے بغیر۔''

☆☆☆

''سر! میں شیو بنانے کے لیے آپ کے منہ پر جھاگ بنانے لگا ہوں۔ آپ اپنا منہ بند کرلیں۔''

''نہیں...... پہلے تم بند کرو۔''

☆☆☆

''سر! آپ تیزی سے گنجے ہو رہے ہیں۔ کیا آپ اس سلسلے میں کوئی احتیاطی تدبیر کر رہے ہیں؟''

''ہاں، میں اپنی بیوی کو طلاق دے رہا ہوں۔''

(مرسلہ: آمنہ نوید، چنیوٹ)

انداز میں بولا۔
میں کانسٹیبل بشارت علی کے ہمراہ تھانے کی جانب پیش قدمی کرتے ہوئے بھولا کی پراسرار گمشدگی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اگر کل صبح تک اس کی کوئی خیر خبر نہ ملتی تو پھر ''اغوا'' کے بارے میں سنجیدگی سے غور کیا جاسکتا تھا۔ ایک بات جو مجھے ہضم نہیں ہو پا رہی تھی، وہ بھولا کی غلط بیانی تھی۔ سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ اس نے اپنی ماں کی بیماری کا بہانہ کرکے بدری سے جلدی چھٹی کیوں لی تھی؟ بھولا کے اس فعل کی کوئی منطق میری سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ میں نے اپنے ذہن کو زیادہ الجھانا مناسب نہ سمجھا اور یہ سوچ کر اس معاملے کو آگے بڑھا دیا کہ ہوسکتا ہے اس نے کام سے جان چھڑانے کے لیے وہ جھوٹ بولا ہو۔

اچانک ایک آواز نے مجھے چونکا دیا۔ کسی نے مجھے پکارا تھا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو ایک ملازم صورت شخص میری نگاہ کے فریم میں آگیا۔ وہ آدمی میرے لیے قطعی اجنبی تھا لیکن چونکہ اس نے مجھے میرے سرنیم سے پکارا تھا، اس لیے وہ لائق توجہ تھا۔
''ہاں بھئی، تمہیں ملک صاحب سے کیا کام ہے؟'' میں نے اس سے پوچھا۔
''مجھے نہیں تھانیدار صاحب!'' وہ ایک جانب اشارہ کرتے ہوئے جلدی سے بولا۔ ''چودھری صاحب کو آپ سے کوئی کام ہے۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ میں آپ کو بلا کر لاؤں۔''
میرا دھیان چودھری ارشاد حسین کی طرف چلا گیا۔ میں نے اِدھر اُدھر نظر دوڑانے کے بعد قدرے سخت لہجے میں کہا۔ ''چودھری ارشاد تو مجھے کہیں دکھائی نہیں دے رہا؟''
''میں چودھری برکت علی کی بات کررہا ہوں ملک صاحب!''
''اوہ......!'' میں ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔
چودھری برکت علی اور چودھری رحمت علی غلہ منڈی لالہ موسیٰ کے دو مشہور اور معتبر آڑھتی تھے۔ چودھری برکت علی سے میری اچھی دعا سلام تھی اور اتفاق سے اس وقت میں غلہ منڈی کے اندر ہی سے گزر رہا تھا۔
''بشارت علی! تم تھانے جاؤ۔'' میں نے کانسٹیبل سے کہا۔ ''میں چودھری صاحب سے ملاقات کے بعد آتا ہوں۔''

''اوکے ملک صاحب!'' بشارت علی نے فرمانبرداری سے کہا۔
میں چودھری برکت علی کے فرستادہ کے ساتھ ہولیا۔
چودھری برکت علی نے میرا پُرتپاک استقبال کیا۔ رسمی علیک سلیک کے بعد اس نے پُرخلوص انداز میں کہا۔
''ملک صاحب! یہ کھانے کا وقت ہے۔ پہلے میں آپ کے لیے کچھ منگواتا ہوں، پھر آرام سے بات کریں گے۔''
''کھانے کا تکلف نہ کریں چودھری صاحب!'' میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ''کھانے کی بالکل حاجت نہیں ہے۔''
''مجھے تو بہت زور کی بھوک لگ رہی ہے ملک صاحب!'' وہ اضطراری لہجے میں بولا۔ ''اور آپ کو بھی میرا ساتھ دینا ہوگا۔ آپ مشکل سے تو قابو آتے ہیں۔ اگر میری نگاہ نہ پڑتی تو آپ ہاتھ سے نکل گئے تھے۔ میں نے فوراً آپ کے پیچھے اپنے بندے کو دوڑایا اور...... اب آپ یہاں ہیں۔''
''میں ایک بچے کی گمشدگی کے سلسلے میں پوچھ تاچھ کرنے مین بازار کی طرف گیا تھا۔'' میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''بس، ذہن اسی معاملے میں الجھا ہوا تھا اس لیے آپ سے ملاقات کا خیال ہی نہیں آیا۔''
''کوئی بات نہیں، مصروفیت میں ایسا ہوجاتا ہے۔'' اس نے سرسری انداز میں کہا۔ ''اس موضوع پر بھی گفتگو کریں گے، پہلے میں کھانے کا بندوبست کرلوں۔''
سچی بات تو یہ ہے کہ اس وقت مجھے بھی بھوک محسوس ہورہی تھی اور چودھری برکت علی سے میری ایسی بے تکلفی تھی کہ میں اس کے اصرار کے سامنے اپنے انکار کا بند نہ باندھ سکا۔ چودھری نے اپنے ملازم کو بھیج کر مرغ چھولے، مٹن پلاؤ اور گرما گرم تنوری روٹیاں منگوالیں۔
کھانے کے دوران میں بات چیت کا سلسلہ بھی چلتا رہا۔ میں نے چودھری برکت علی کو بھولا کی پُراسرار گمشدگی کے بارے میں تفصیلاً بتایا تو اس نے گمبھیر انداز میں کہا۔
''ملک صاحب! نذیراں بی بی کا لڑکا کل دوپہر سے غائب ہے۔ چوبیس گھنٹے گزر گئے ہیں مگر ابھی تک اس کا کوئی اتا پتا نہیں۔ یہ خاصی تشویشناک صورتِ حال ہے۔''
''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں چودھری صاحب!''

میں نے تائیدی انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''اسی لیے تو میں بھی زیادہ پریشان ہو رہا ہوں۔ بھولا ایک نابالغ اور معصوم بچہ ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ وہ کسی اوباش کے ہتھے نہ چڑھ جائے۔ چھوٹے بچوں کے ساتھ ہونے والی جبر یا زبردستی کے واقعات تو اکثر سننے میں آتے رہتے ہیں۔''

چودھری برکت علی نے چونکے ہوئے انداز میں سوال کیا۔ ''ملک صاحب! کیا آپ کے پاس بھولا کی کوئی فوٹو ہے؟''

''ابھی تو نہیں ہے مگر مل جائے گی۔'' میں نے اسے بتایا۔ ''بھولا کی ماں نے مجھے ایک تصویر دینے کا وعدہ کیا ہے۔''

''آپ پہلی فرصت میں نذیراں سے وہ فوٹو حاصل کر لیں۔'' وہ سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں بولا۔

''کیوں؟'' میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔ ''کیا کوئی خاص بات ہے؟''

''میں ایک نظر اس فوٹو کو دیکھنا چاہتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے۔ میں ابھی جا کر نذیراں سے بھولا کی تصویر لے لیتا ہوں۔'' میں نے اُلجھن زدہ لہجے میں کہا اور پوچھا۔ ''مگر یہ تو بتائیں کہ آپ کے ذہن میں چل کیا رہا ہے؟''

''میں نے......'' وہ انکشاف انگیز لہجے میں بولا۔ ''کل اعجاز کو ایک چھوٹے بچے سے باتیں کرتے دیکھا تھا۔ اس بچے کی عمر آٹھ سے دس سال کے درمیان ہوگی۔ میں تو اس واقعے کو بھول بھال گیا تھا۔ ابھی اچانک ہی یہ بات میرے ذہن میں تازہ ہوگئی ہے۔''

چودھری کے بیان نے میرے رگ و پے میں ایک کرنٹ سا دوڑا دیا۔ میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں استفسار کیا۔

''یہ کب کی بات ہے...... میرا مطلب ہے آپ نے کل کتنے بجے اس بچے کو اعجاز کے ساتھ باتیں کرتے دیکھا تھا اور یہ بھی بتائیں، اعجاز کون ہے؟''

''اعجاز ایک ٹرک ڈرائیور ہے ملک صاحب!'' اس نے معتدل انداز میں جواب دیا۔ ''وہ لگ بھگ چار یا ساڑھے چار کا وقت ہوگا۔ مجھے یاد ہے، دیگر (عصر) کی اذان ہو رہی تھی۔ اعجاز اپنے ٹرک پر مال لوڈ کرا رہا تھا۔''

''یہ اعجاز اس وقت کہاں ملے گا چودھری صاحب؟'' میں نے اضطراری لہجے میں دریافت کیا۔ ''میں ابھی اس سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ ہوسکتا ہے بھولا کے حوالے سے کوئی اشارہ مل جائے۔''

''آپ فی الحال اعجاز سے ملاقات نہیں کرسکتے ملک صاحب!'' چودھری برکت علی نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''فی الحال وہ یہاں نہیں ہے۔ اس سے ملنے کے لیے آپ کو دو دن انتظار کرنا پڑے گا۔''

''اس کی کوئی خاص وجہ؟'' میں نے پوچھا۔

''اعجاز اناج سے بھرا ہوا ٹرک لے کر پنڈی گیا ہے۔'' چودھری نے بتایا۔ ''پرویز بھی اس کے ساتھ ہے۔ جاجی اور پیجا دو دن کے بعد واپس آئیں گے۔ آپ یوں سمجھ لیں کہ یکم اپریل کی شام کو۔''

''جاجی'' اور ''پیجا'' سے چودھری کی مراد اعجاز اور پرویز تھے۔ میں نے پوچھا۔ ''یہ پیجا کون ہے؟''

''پیجا ٹرک کا کلینڈر (کلینر) ہے ملک صاحب!'' چودھری نے جواب دیا۔ ''وہ دونوں ساتھ ہی چلتے ہیں۔''

''آپ ڈرائیور اعجاز اور اس کے کلینر کو کب سے جانتے ہیں چودھری صاحب؟'' میں نے تیز آواز میں استفسار کیا۔

''لگ بھگ دو سال سے۔''

''ان کا چال چلن کیسا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

چودھری نے بتایا۔ ''مجھے ان دونوں سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ باقی دلوں کا حال تو سوہنا رب ہی جانتا ہے ملک صاحب! کسی انسان کی نیت کا کوئی بھروسا نہیں، پتا نہیں کب اس میں فتور آجائے۔''

''چودھری صاحب! آپ کی باتوں نے مجھے بھولا کے حوالے سے بہت زیادہ فکرمند کر دیا ہے۔'' میں نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا۔ ''اب مجھے جانا ہوگا، میں بہت جلد بھولا کی تصویر کے ساتھ آپ سے ملنے آؤں گا۔ دعا کریں کہ بھولا خیریت سے ہو۔''

''اللہ پاک اس معصوم بچے کو اپنی حفظ و امان میں رکھے۔''

''آمین۔'' میں نے صدقِ دل سے کہا۔

اس کے بعد میں نے چودھری برکت علی سے الوداعی مصافحہ کیا اور اس کی دکان سے نکل کر اپنے تھانے کی جانب روانہ ہوگیا۔

میرے تھانے میں عملے کے نام پر صرف پانچ پولیس اہلکار اپنے فرائض انجام دیتے تھے۔ یعنی میں، حوالدار صابر شاہ اور تین کانسٹیبلز جن کے نام علی الترتیب

اسمٰعیل خان، بشارت علی اور فرید حسین تھے۔ مذکورہ تھانے میں میری تعیناتی کو کم وبیش ایک سال ہو گیا تھا۔ اس مختصر سے عملے کے ساتھ تھانیداری کے معاملات ٹھیک ٹھاک چل رہے تھے کہ اب بھولا کی پراسرار گمشدگی نے مجھے خاصا پریشان کر دیا تھا۔

☆☆☆

چودھری برکت علی نے اگرچہ اعجاز اور پرویز کے کردار کے حوالے سے اپنے شک کا اظہار نہیں کیا تھا لیکن میں اس معاملے کو سرسری انداز میں نہیں لے سکتا تھا لہٰذا اسی شام میں نذیراں بی بی سے ملنے اس کے گھر پہنچ گیا تاکہ اس سے بھولا کی تصویر حاصل کر کے اپنی تفتیش کو ذرا تیزی سے آگے بڑھا سکوں۔

وہ عصر اور مغرب کے درمیان کا وقت تھا۔ نذیراں نے میری دستک کے جواب میں دروازہ کھولا اور مجھے گھر کے اندر لے گئی۔ ہم دونوں گھر کے صحن میں بیٹھ گئے۔ وہ میری خاطر تواضع کرنا چاہتی تھی لیکن میں نے صاف انکار کرتے ہوئے کہا۔

''نذیراں! تم جلدی سے بھولا کی تصویر مجھے دے دو، جب تمہارا بیٹا بازیاب ہو جائے گا تو پھر میں دعوت کھانے تمہارے گھر آؤں گا۔''

اس نے فوراً سے پیشتر میرے حکم کی تعمیل کر دی۔ وہ پانچ بائی سات انچ سائز کی ایک بلیک اینڈ وہائٹ فوٹو تھی جس میں بھولا کے سوا اور کوئی بھی نہیں تھا۔ میں اس تصویر کو بغور دیکھ رہا تھا کہ نذیراں نے بھرّائی ہوئی آواز میں پوچھا۔

''تھانیدار صاحب! آپ میرے بھولا کو ڈھونڈ نکالیں گے نا؟''

''ان شاء اللہ...... ضرور!'' میں نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔ ''میں کل ہی اس فوٹو کی درجن بھر کاپیاں بنوا کر آس پاس کے علاقوں میں بھولا کی تلاش کا کام شروع کر دوں گا۔ تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں نذیراں۔ بھولا کو تم تک پہنچانا اب میری ذمے داری ہے۔''

اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ نذیراں کی عمر تیس کے آس پاس رہی ہو گی۔ وہ ایک پرکشش اور پرجمال عورت تھی۔ اس وقت اگرچہ وہ حزن و ملال کا مرقع بنی ہوئی تھی۔ بھولا کی گمشدگی نے اس کا سکھ چین چھین لیا تھا لیکن سوگوار حسن کی بھی ایک اپنی ہی بات ہوتی ہے۔

نذیراں اس دلگرفتگی کے عالم میں کچھ زیادہ ہی دلنشین اور جاذبِ نگاہ لگ رہی تھی۔ میں نے اس کی خوش نمائی کے بارے میں جو بھی کہا، وہ حقیقتِ حال سے زیادہ کچھ نہیں۔

میرے تسلّی بخش الفاظ نے نذیراں کی ڈھارس بندھائی۔ وہ آنکھوں میں اتر آنے والے بے اختیار آنسوؤں کو صاف کرتے ہوئے قدرے توانا اور پرحوصلہ لہجے میں بولی۔

''آپ کا بہت بہت شکریہ تھانیدار صاحب! میں آپ کا یہ احسان زندگی بھر یاد رکھوں گی۔''

''کسی کے احسان کو یاد رکھنا انسان کے اعلیٰ حسب نسب ہونے کی نشانی ہے۔ یہ کم ظرف اور کم اصل لوگوں کے بس کی بات نہیں۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''لیکن صرف احسان مند ہونے سے کام نہیں چلے گا نذیراں!''

''جی......!'' اس نے الجھن زدہ سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔ ''میں سمجھی نہیں تھانیدار صاحب! آپ کہنا کیا چاہ رہے ہیں؟''

قبل اس کے کہ نذیراں کے ذہن میں میری ذات کے حوالے سے کسی قسم کے شکوک وشبہات سر اٹھاتے، میں نے ٹھہرے ہوئے وضاحتی لہجے میں کہا۔

''اس کے علاوہ مجھے تمہارے تعاون کی بھی ضرورت ہے اور یہ کام تم سولہ آنے سچ بول کر ہی کر سکتی ہو۔''

''تھانیدار صاحب! میں نے ابھی تک آپ سے کوئی جھوٹ نہیں بولا۔'' اس نے منت ریز لہجے میں کہا۔ ''آئندہ بھی میں آپ کو ہر بات کھری اور سچی ہی بتاؤں گی۔ آپ پوچھیں، جو بھی پوچھنا چاہتے ہیں۔''

''آج صبح جب تم بھولا کی گمشدگی کی رپورٹ لکھوانے تھانے آئی تھیں تو تمہارے ساتھ امیر حسین نامی ایک شخص بھی تھا۔'' میں نے شکستہ دل نذیراں کے چہرے پر نگاہ جما کر کہا۔ ''اس وقت تم نے مجھے بتایا تھا کہ اپنے خاوند یعقوب عرف قوبا کے انتقال کے بعد تم نے کھیت مزدوری شروع کر دی تھی مگر کچھ عرصے کے بعد تم نے وہ کام چھوڑ دیا تھا۔ تم نے اس کا سبب کوئی ناخوشگوار واقعہ بتایا تھا۔'' میں نے لمحاتی توقف کرنے کے بعد ایک گہری سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''تمہارے پڑوسی امیر حسین کی موجودگی میں اس

موضوع پر میں نے تم سے بات نہیں کی تھی مگر اب میں تفصیل کے ساتھ وہ سب جاننا چاہتا ہوں۔ ہوسکتا ہے اس واقعے کے اندر سے امید کی کوئی کرن پھوٹ پڑے اور میں اس کے سہارے بھولا تک پہنچنے میں کامیاب ہوجاؤں۔"

میں نے جتنی بڑی اور خوش آئند بات کہہ دی تھی، اس کے بعد نذیراں کے پاس انکار یا احتراز کی گنجائش باقی نہیں بچی تھی تاہم اس کے باوجود بھی بولنے سے پہلے مجھے اس کی آنکھوں میں تذبذب کی پرچھائیں بڑی واضح دکھائی دی تھی اور اس کا چہرہ بھی کشمکش کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔

"اس واقعے کا تعلق نیاز علی عرف نیاجا سے ہے تھانیدار صاحب!" وہ ہمت کرتے ہوئے بولی۔ "میں چودھری ارشاد حسین کی زمینوں پر کام کرتی تھی اور وہ نیاجا، چودھری صاحب کا خاص ملازم ہے، وہ تمام کھیت مزدوروں کا نگران بھی ہے۔ وہ...... وہ مجھ پر بری نظر رکھتا تھا۔"

"مثلاً...... کیسی بری نظر؟" میں نے پوچھا۔

نذیراں کی بات کو سمجھنے کے لیے کسی راکٹ سائنس کی ضرورت نہیں تھی۔ جب کوئی عورت کسی مرد کی بری نظر کا ذکر کرے تو درحقیقت وہ اس مرد کی ہوس، حرص اور بدنیتی کی بات کر رہی ہوتی ہے۔ میں نذیراں کے بیان کی تہ میں پہنچ گیا تھا مگر میں چاہتا تھا کہ وہ اپنی زبان سے بھی بتائے۔ اسی لیے میں نے اس سے وہ سوال کیا تھا۔

"ہم سب نیاجا کی نگرانی میں کام کرتے تھے تھانیدار صاحب!" وہ ایک مضمحل اور افسردہ سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔ "روزانہ ہی اس سے میرا واسطہ پڑتا تھا۔ وہ جب بھی مجھے تنہا پاتا تو گھیرنے کے لیے معنی خیز اور گندی باتیں کرتا تھا۔ میں نے پہلے ہی دن سے اس کی نیت کو بھانپ لیا تھا۔ تو با کی وفات کے بعد نیاجا نے مجھے ایک کٹی پتنگ سمجھ لیا تھا جس کا کوئی مالک اور والی وارث نہیں ہوتا۔ وہ جس کے ہاتھ لگ جائے، اسی کی ملکیت کہلاتی ہے مگر میں بیوہ تھی، کوئی کٹی ہوئی پتنگ نہیں۔ سو، میں نے بھی اس کی حوصلہ افزائی نہیں کی تھی۔ میرے مسلسل نظر انداز کرنے سے نیاجا کا غصہ بڑھتا گیا۔ وہ مجھے آسان شکار سمجھا تھا مگر میں کسی بھی صورت اس کے ہاتھ نہیں آرہی تھی...... پھر ایک دن...... !"

وہ بولتے بولتے یکلخت رک گئی۔ میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں استفسار کیا۔ "ایک دن کیا نذیراں؟"

"وہ موسم گرما کی ایک بھری دوپہر تھی۔ میں کھیتوں میں اندر گندم کی کٹائی میں مصروف تھی کہ نیاجا میرے پاس آگیا۔ اس وقت میرے اردگرد کوئی بندہ بشر موجود نہیں تھا۔" نذیراں نے نمی بھرے لہجے میں بتایا۔ "نیاجا نے میری کلائی پکڑلی اور مجھ سے بدتمیزی کرنے لگا۔"

"تم خود کو سمجھتی کیا ہو؟" اس نے غصیلے انداز میں کہا۔ "میں نے تمہاری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا تھا لیکن تم نے میری پرخلوص پیشکش کو بے دردی سے ٹھکرادیا۔ لگتا ہے شرافت کی زبان تمہاری سمجھ میں نہیں آتی۔ ٹھیک ہے، اگر تمہیں زور زبردستی پسند ہے تو یہی سہی۔"

"بات ختم کرتے ہی اس نے مجھے اپنے سینے سے لگانے کی کوشش کی مگر میں نے اس کی یہ سعی کامیاب نہیں ہونے دی اور چلا کر کہا۔ "نیاجے! میرا ہاتھ چھوڑ دو ورنہ میں اتنا شور مچاؤں گی کہ سب لوگ یہاں جمع ہوجائیں گے۔"

"تمہارے چیخنے چلانے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا نذیراں!" وہ ایک مکروہ قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔ "کیونکہ یہاں آس پاس کوئی موجود ہی نہیں ہے۔ میں نے سب کو چھٹی دے دی ہے۔ اس کے بعد ہی ادھر آیا ہوں۔ میری بات مان لو، کسی کو کچھ پتا نہیں چلے گا۔ اگر تم راضی ہوجاؤ تو اس میں ہم دونوں ہی کا فائدہ ہے۔ میں تمہیں گا ہے بگا ہے کچھ پیسے دیتا رہوں گا اور تم......"

"بکواس بند کرو گھٹیا انسان!" میں نے طیش کے عالم میں کہا۔ "میں اتنی بھی کمزور نہیں ہوں کہ تمہاری ناپاک خواہش کے سامنے گھٹنے ٹیک دوں گی۔ اگر تم نے میری کلائی نہیں چھوڑی تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔"

"میری ایک کلائی کو نیاجا نے اپنے مضبوط ہاتھ کی گرفت میں لے رکھا تھا جبکہ دوسرا ہاتھ آزاد تھا اور اس آزاد ہاتھ میں، میں نے تیز دانتوں والی درانتی پکڑ رکھی تھی۔ اپنی بات کے اختتام پر میں نے اس درانتی کو وار کرنے کے انداز میں حرکت بھی دی تھی۔"

"نذیراں! تم مجھے اس درانتی سے ڈرانے کی کوشش کر رہی ہو۔" وہ مذاق اڑانے والے انداز میں بولا۔ "میں انہی درانتیوں، کدالوں، بیلچوں اور پھاوڑوں کے ساتھ کھیل کر بڑا ہوا ہوں۔ چاقو، چھری، نیزے، بھالے اور برچھے بھی میرے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ غصہ تھوک دو اور ٹھنڈے دل سے میری بات پر غور کرو۔

''میں غصہ تھوک دوں؟'' میں نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ ''نیاجا! تم مجھ سے یہی چاہتے ہو نا؟''

''ہاں، ہاں۔'' وہ جلدی سے بولا۔ ''میں اتنی دیر سے تمہیں یہی تو سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں نذیراں!''

''تھانیدار صاحب!'' نذیراں نے اپنی بپتا کے اختتام پر مجھ سے کہا۔ ''میں نیاجا سے شدید نفرت کرتی تھی اور یہ نفرت غصے کی شکل میں میرے منہ کے اندر جمع ہو چکی تھی۔ میں نے نیاجا کی خواہش پوری کر دی۔ اس نے مجھ سے غصہ تھوکنے کو کہا تھا، میں نے اس کے منہ پر تھوک دیا۔''

''پھر......؟'' میں نے پُرتجسس لہجے میں پوچھا۔ ''اس کے بعد کیا ہوا؟''

''جب تک نیاجا اپنا چہرہ صاف کرتا، میں کھیتوں سے نکل گئی تھی۔'' وہ ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔ ''وہ دن اور آج کا دن، پھر میں مزدوری کے لیے کھیتوں کی طرف نہیں گئی۔''

''تمہارے اس رویے پر نیاجا نے کیا ردِعمل دیا تھا؟'' میں نے کریدنے والے انداز میں پوچھا۔ ''یہ تو ہو نہیں سکتا کہ وہ چپ کر کے بیٹھ گیا ہو۔''

''نیاجا انسان نہیں، شیطان ہے تھانیدار صاحب!'' وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔ ''اور شیطان اپنی ہزیمت کبھی فراموش نہیں کرتا۔ لہٰذا میں نے اسی روز اپنی حفاظت کا پکا بندوبست کر لیا تھا۔''

''میں کچھ سمجھا نہیں؟'' میں نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔ ''تم کس بندوبست کی بات کر رہی ہو نذیراں؟''

''میں اسی شام حویلی گئی اور چودھری صاحب کو دن والے واقعے کے بارے میں تفصیل سے بتا دیا۔'' اس نے جواب دیا۔ ''ہمارے چودھری ارشاد حسین صاحب بہت ہی سمجھ دار اور ہمدرد انسان ہیں۔ انہوں نے توجہ سے میری بات سنی اور میرے خاموش ہونے پر کہا...... نذیراں! تم بے فکر ہو کر اپنے گھر جاؤ۔ میں نیاجا کو سمجھا دوں گا۔ آج کے بعد وہ کبھی تم پر میلی نظر نہیں ڈالے گا۔''

''تو کیا چودھری ارشاد کے سمجھانے سے نیاجا پر کوئی اثر ہوا تھا؟'' میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

''ہاں...... بالکل!'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ''پھر کبھی نیاجا نے میرے ساتھ بدتمیزی کرنے کی ہمت نہیں کی۔ میں خود بھی اس سے دور ہی رہنے کی کوشش کرتی ہوں۔ کبھی اتفاق سے ہمارا سامنا ہو بھی جائے تو وہ زبان سے تو کچھ نہیں کہتا، بس بھوکی نظر سے مجھے گھورتا رہتا ہے۔ سچ پوچھیں تو مجھے اس کے اس طرح دیکھنے سے بہت ڈر لگتا ہے تھانیدار صاحب!''

''کیا اس دوران میں کبھی نیاجا نے تمہیں خطرناک نتائج کی دھمکی بھی دی تھی؟'' میں نے نذیراں سے ایک اہم سوال کیا۔

''جی......!'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ''لیکن میں نے اس کے الفاظ پر توجہ نہیں دی تھی۔''

''اس نے تم سے کیا کہا تھا؟''

''نذیراں! تم بہت خوبصورت ہو۔'' اس نے مجھ سے کہا تھا۔ ''مگر تمہارا کوئی محافظ نہیں ہے۔ یاد رکھو، جس باغ کا کوئی رکھوالا نہ ہو، اسے اجڑنے سے کوئی نہیں بچا سکتا۔ تمہاری حفاظت کرنے والا کوئی شوہر ہے اور نہ ہی بھولا کے سر پر باپ کا سایہ۔ اگر تمہیں اپنی بربادی کی پروا نہیں ہے تو اس معصوم بچے ہی کا کچھ خیال کر لو۔ بھولا کے ساتھ کوئی اُونچ نیچ ہو گئی تو تمہاری باقی کی زندگی خون کے آنسو بہاتے ہوئے گزرے گی۔''

نذیراں کے سنسنی خیز جواب نے میرے دماغ میں کھلبلی مچا دی تھی۔ اس کے بیان سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ نیاجا نے بھولا کے حوالے سے اسے سنگین نوعیت کی دھمکی دی تھی۔

''یہ بات نیاجا نے تم سے کب کی تھی؟'' میں نے پوچھا۔

''لگ بھگ ایک ماہ پہلے۔'' وہ سادگی سے بولی۔

اس کے بعد مزید سوال و جواب کی ضرورت باقی رہی تھی اور نہ ہی گنجائش۔ میں نے اس تعاون پر نذیراں کا شکریہ ادا کیا اور اسے خاموش رہنے کی ہدایت دینے کے بعد باہر نکل آیا۔

گلی میں نذیراں کا پڑوسی امیر حسین ٹہل رہا تھا۔ مجھ پر نگاہ پڑی تو وہ میرے نزدیک آ گیا۔ ''ملک صاحب! میں آپ ہی کا انتظار کر رہا تھا۔'' وہ جلدی سے بولا۔ ''السلام علیکم جناب!''

''وعلیکم السلام!'' میں نے اس کے سلام کا جواب دینے کے بعد پوچھا۔ ''خیریت تو ہے، تم کس سلسلے میں اتنی بے تابی سے میرا انتظار کر رہے تھے؟''

''میں نے آپ کو نذیراں کے گھر میں داخل ہوتے

دیکھ لیا تھا۔'' اس نے معتدل انداز میں کہا۔ ''لیکن اندر جانا مجھے مناسب نہیں لگا اس لیے گلی ہی میں رک گیا۔ میں دراصل بھولا کے بارے میں جاننا چاہتا تھا، کیا اس بچے کا کوئی سراغ ملا؟''

''ابھی تو تلاش کا عمل شروع ہوا ہے امیر حسین!'' میں نے کہا۔ ''میں نذیراں سے بھولا کی فوٹو لے کر جا رہا ہوں۔ امید ہے جلد ہی میں گمشدہ بچے تک پہنچ جاؤں گا۔''

''اگر میرے لائق کوئی خدمت ہو تو ضرور بتائیں۔'' اس نے تعاون آمیز لہجے میں کہا۔ ''بھولا کا اچانک غائب ہو جانا نذیراں کے لیے بہت بڑا صدمہ ہے۔ ایک پڑوسی ہونے کے ناتے میں اس دکھی عورت کے لیے کچھ کرنا چاہتا ہوں۔ آپ میرے جذبات کو سمجھ سکتے ہیں۔''

''میں تمہارے جذبات کو نہ صرف سمجھ رہا ہوں بلکہ دل کی گہرائیوں سے ان کی قدر بھی کرتا ہوں امیر حسین!'' میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے نپے تلے الفاظ میں سوال کیا۔ ''مجھے بتاؤ، تم بھولا کے لیے کیا کر سکتے ہو، میرا مطلب ہے اس حوالے سے تمہارے ذہن میں کیا چل رہا ہے؟''

امیر حسین نے آج صبح تھانے میں بھی اپنی خدمات کی پیشکش کی تھی اور ابھی اس کو دیکھ کر مجھے ایک اچھوتا خیال آیا تھا۔ اس نے فرمانبرداری سے جواب دیا۔

''میرے ذہن میں تو کوئی خاص منصوبہ نہیں ہے۔ آپ جو کہیں گے، میں وہ کرنے کی کوشش کر سکتا ہوں۔''

''کوئی خاص منصوبہ نہیں ہے تمہارے پاس تو عام منصوبے ہی سے کام شروع کر دو۔'' میں نے کہا۔ ''میں آج کی رات تم سے کسی کی نگرانی کروانا چاہتا ہوں۔ کیا خیال ہے، یہ کر لو گے؟''

''کیوں نہیں، ضرور کروں گا ملک صاحب!'' وہ پرعزم لہجے میں بولا۔ ''بتائیں کس کی نگرانی کرنا ہے، کیا وہ بندہ شمشاد نگر ہی میں رہتا ہے؟''

''ہاں، وہ اسی گاؤں کا وسنیک ہے۔'' میں نے اثبات میں جواب دیا۔ ''مگر اس کام کے لیے بڑی جرأت کی ضرورت ہوگی۔ کیا تم خود کو ایک دلیر اور حوصلہ مند انسان سمجھتے ہو؟''

''جی ہاں...... آپ اس بندے کا نام تو بتائیں۔'' وہ اصراری لہجے میں بولا۔ ''میں آپ کو مایوس نہیں کروں گا ملک صاحب!''

میں نے انکشاف انگیز انداز میں کہا۔ ''نیاز علی عرف نیاجا......!''

''نیاجا تو چودھری صاحب کا خاص بندہ ہے تھانیدار صاحب!'' وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''اگر میں نیاجا پر نگاہ رکھوں گا تو کیا چودھری صاحب مجھ سے خفا تو نہیں ہو جائیں گے؟''

''میں محسوس کر رہا ہوں کہ تمہیں قانون کی مدد کرنے سے زیادہ چودھری ارشاد حسین کی خفگی کا خیال ہے۔'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''رہنے دو امیر حسین...... یہ تم سے نہیں ہو پائے گا۔''

''ایسی بات نہیں ہے تھانیدار صاحب!'' وہ منت ریز لہجے میں اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے بولا۔ ''ارشاد حسین صاحب اس گاؤں کے چودھری ہیں اور وہ ہم سب کے بڑے بھی ہیں اس لیے ان کا خیال تو کرنا پڑتا ہے۔''

''ارشاد حسین صرف شمشاد نگر کا چودھری ہے اور میں اس پورے علاقے کا تھانیدار ہوں امیر حسین!'' میں نے سپاٹ آواز میں کہا۔ ''خیر، اس معاملے کو یہیں پر ٹھپ کر دو اور مجھے بتاؤ، نیاجا رہتا کہاں ہے؟''

''ڈیرے پر جناب!'' اس نے جواب دیا۔

''وہاں اس کے ساتھ اور کون ہوتا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''اس ڈیرے پر کل تین افراد رہتے ہیں تھانیدار صاحب!'' اس نے بتایا۔ ''نیاز عرف نیاجا، ظہور عرف جھوری اور جمال عرف جمالا۔ یہ لوگ چودھری صاحب کی زرعی اراضی، مال مویشیوں اور کاشت کاری کے معاملات کی نگرانی کرتے ہیں مگر نیاجا، چودھری صاحب کے زیادہ قریب ہے۔''

''شکریہ امیر حسین!'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے معتدل انداز میں کہا۔ ''تم نے قانون سے اچھا تعاون کیا ہے۔''

بات مکمل کرنے کے بعد میں جانے کے لیے مڑا تو وہ ندامت بھرے انداز میں بولا۔ ''ملک صاحب! لگتا ہے آپ مجھ سے ناراض ہو گئے ہیں؟''

''امیر حسین! تمہیں ایسا کیوں محسوس ہو رہا ہے؟''

''آپ...... نیاجا کی نگرانی والی ذمے داری مجھے دیے بغیر ہی یہاں سے جا رہے ہیں نا اس لیے......''

''ایسی بات نہیں ہے امیر حسین!'' میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''دراصل

میں نے نیاجا کی نگرانی کا ارادہ ترک کر دیا ہے۔‘‘
’’پھر میرے لیے کیا حکم ہے جناب؟‘‘
’’تم کل دن میں کسی وقت تھانے آجاؤ۔‘‘ میں نے کہا۔’’میں تمہارے لیے کوئی اور کام نکال کر رکھوں گا۔‘‘
’’جی ٹھیک ہے۔‘‘ وہ خوش ہو گیا۔

میں نے امیر حسین سے مصافحہ کیا اور شمشاد نگر سے نکل کر اپنے تھانے کی جانب بڑھ گیا جو محض نصف میل کی دوری پر واقع تھا۔

ابھی اندھیرا پھیلنا شروع نہیں ہوا تھا۔ ملگجے اجالے نے فضا کو اپنے حصار میں لے رکھا تھا۔ میں خراماں خراماں چلتے ہوئے جی ٹی روڈ تک پہنچ گیا جس کی دوسری جانب لالہ موسیٰ شہر آباد تھا اور وہیں پر میرا تھانہ بھی تھا۔ لالہ موسیٰ اگرچہ اس زمانے میں کوئی باقاعدہ شہر نہیں تھا تاہم میں نے اس کی رونق اور آبادی کی مناسبت سے یہاں ’’شہر‘‘ کا لفظ استعمال کیا ہے۔

میں جی ٹی روڈ کو عبور کرنے کے بعد چند قدم ہی چلا تھا کہ چودھری برکت علی کی فراہم کردہ معلومات میری یادداشت میں روشن ہو گئیں۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ گزشتہ روز سہ پہر کے وقت ڈرائیور اعجاز عرف جاجی کسی نوعمر لڑکے سے باتیں کر رہا تھا۔ چودھری نے مذکورہ لڑکے کی عمر آٹھ، نو سال بتائی تھی اور یہ عمر لاپتا بابر عرف بھولا پر فٹ بیٹھتی تھی۔ چودھری، بھولا کا صورت آشنا نہیں تھا مگر ڈرائیور سے باتیں کرنے والے بچے کی شکل اسے اچھی طرح یاد تھی۔ میں نے نذیراں سے بھولا کی تصویر حاصل کر لی تھی لہٰذا شناخت کے عمل کو مکمل کرنے کی غرض سے میں ایک بار پھر چودھری برکت علی کی دکان پر پہنچ گیا۔

تھانے سے پہلے چودھری کی دکان پر جانے کا فیصلہ خاصا سودمند ثابت ہوا۔ جب میں نے بھولا کی بلیک اینڈ وہائٹ تصویر برکت علی کے سامنے میز پر رکھی تو ایک نظر دیکھتے ہی وہ پرجوش انداز میں بولا۔

’’میں نے پہچان لیا ہے ملک صاحب! یہی بچہ کل ڈرائیور اعجاز سے بات کر رہا تھا۔‘‘

چودھری برکت علی کی تصدیق نے میرے دماغ میں گھنٹیاں سی بجادی تھیں۔ اپنی تسلی کی خاطر میں نے پوچھ لیا۔

’’آپ نے بتایا تھا کہ ٹرک ڈرائیور اعجاز اور وہ بچہ عصر کی اذان کے وقت آپس میں باتیں کر رہے تھے؟‘‘

’’ہاں، بالکل!‘‘ اس نے پریقین لہجے میں جواب دیا۔’’اس وقت چار یا زیادہ سے زیادہ ساڑھے چار بجے ہوں گے۔‘‘

’’مگر دکاندار بدری کا کہنا ہے کہ بھولا ظہر کے وقت اپنی ماں کی بیماری کا بہانہ کر کے گھر چلا گیا تھا۔‘‘ میں نے کہا۔’’ان دونوں اوقات میں کم و بیش ڈھائی گھنٹے کا فرق ہے جبکہ بدری کی دکان سے آپ کی دکان تک آنے میں محض پانچ منٹ لگتے ہیں۔‘‘

’’آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں ملک صاحب!‘‘ وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔’’میں نے مین بازار میں واقع بدری کریانہ اسٹور دیکھ رکھا ہے۔ وہاں سے یہاں آنے میں اگر پانچ منٹ نہیں تو زیادہ سے زیادہ چھ منٹ لگ سکتے ہیں۔ بہرکیف......!‘‘ وہ اپنی سانس کو ہموار کرنے کی غرض سے تھما پھر ان الفاظ میں بات مکمل کر دی۔

’’بھولا ایک بچہ ہے، ہوسکتا ہے وہ دوسرے بچوں کے ساتھ کھیل کود میں لگ گیا ہو۔ آپ فکر نہ کریں، میں اپنے کسی بندے کو بدری کے پاس بھیج کر اس معاملے کی تفصیلات معلوم کرنے کی کوشش کروں گا۔‘‘

’’بہت شکریہ چودھری صاحب!‘‘ میں نے ممنونیت بھرے انداز میں کہا۔’’میں ایک اور معاملے کی تہ تک بھی پہنچنا چاہتا ہوں جناب!‘‘

اس نے بے ساختہ پوچھا۔’’کون سا معاملہ؟‘‘

’’اب یہ تو ثابت ہو چکا ہے کہ کل سہ پہر میں ٹرک ڈرائیور اعجاز کے ساتھ باتیں کرنے والا معصوم بچہ بھولا ہی تھا۔‘‘ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔’’مجھے یہ جاننا ہے کہ ان دونوں میں کس نوعیت کی گفتگو ہو رہی تھی اور یہ بھی کہ کہیں اعجاز عرف جاجی، بھولا کو اپنے ساتھ پشاور تو نہیں لے گیا؟‘‘

’’ملک صاحب! اس حوالے سے میں فی الحال آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتا۔‘‘ وہ معذرت خواہانہ انداز میں بولا۔’’اپنے ان سوالات کے جوابات حاصل کرنے کے لیے آپ کو یکم اپریل کی شام کا انتظار کرنا پڑے گا۔‘‘

چودھری برکت علی غلط نہیں کہہ رہا تھا۔ جس زمانے کا یہ واقعہ ہے، تب ٹیلی فون کی سہولت معدودے چند افراد ہی کو حاصل تھی اور لوگ انہیں رئیس اور نواب سمجھا کرتے تھے۔ چودھری برکت علی اور چودھری رحمت علی آڑھتیوں کا شمار بدقسمتی سے ان اونچی سوسائٹی والے چند

افراد میں نہیں ہونا تھا۔

میں نے تہ دل سے چودھری برکت علی کا شکریہ ادا کیا اور اس کی دکان سے اٹھ کر تھانے آ گیا۔

☆☆☆

اکتیس مارچ بروز اتوار، میں نے ایک سرکاری اہلکار کو شہر بھیج کر بھولا کی تصویر کے درجن بھر پرنٹس بنوالیے۔ دوپہر سے تھوڑی دیر پہلے امیر حسین مجھ سے ملنے آ گیا۔ میں نے اسے فوراً اپنے پاس بلالیا اور ساتھ ہی کانسٹیبل فرید حسین کو بھی۔

''تم دونوں کو ابھی نکلنا ہوگا۔'' میں نے بھولا کی دس تصاویر ان کے سامنے رکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''میں نے ایک کاغذ پر چند جگہوں کے نام لکھ دیے ہیں۔'' میں نے مذکورہ کاغذ بھی ان کی جانب بڑھا دیا اور ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔ ''یہ فوٹوز ان مقامات تک پہنچانا ہیں تاکہ متعلقہ تھانے بھولا کی تلاش میں ہماری مدد کر سکیں۔ بات سمجھ میں آ رہی ہے نا؟''

دونوں نے اثبات میں گردنیں ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ''جی ملک صاحب!''

کاغذ پر درج ان مقامات کا تعلق گجرات، وزیر آباد، گوجرانوالہ، سرائے عالمگیر، جہلم اور کھاریاں...... وغیرہا کے تھانوں سے تھا۔

''تو آپ نے میرے لیے یہ کام نکالا ہے ملک صاحب؟'' امیر حسین نے ہچکچاہٹ کا اظہار کرتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔

''ہاں۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے جواب دیا۔ ''کیا اس میں کوئی خرابی ہے یا میں نے تمہیں ایک ناممکن کام بتا دیا ہے؟''

وہ حیرت بھری نظر سے مجھے تکنے لگا۔

''امیر حسین!'' میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے دوٹوک انداز میں کہا۔ ''میری طرف سے کسی قسم کی زور زبردستی نہیں ہے۔ تم چاہو تو فرید حسین کا ساتھ دینے سے صاف انکار بھی کر سکتے ہو۔'' لمحاتی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس لی پھر بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''تم نے دو، تین بار اپنی خدمات پیش کیں تو میں نے تمہارا دل رکھنے کے لیے کچھ مصروفیت نکال لی تھی۔ اگر تمہارا جی نہیں ٹھک رہا تو پریشانی والی کوئی بات نہیں۔ تم چاہو تو واپس جا سکتے ہو۔''

''ملک صاحب! آپ تو خوامخواہ مجھ پر غصہ ہو رہے

بہترین تحریریں، لاجواب روداد اور اصلی داستانیں پڑھنے والوں کے لیے سرگزشت کا مطالعہ ضروری ہے

ماہنامہ سرگزشت

شمارہ مارچ 2026ء کی جھلکیاں

مرجع خلائق

اس ولی کامل کی داستان جس کے معتقد پوری دنیا میں موجود ہیں

شہنشاہ

اس نے ایک چھوٹی سی غلطی کی اور برسر حکومت رہتے ہوئے بھی مجبور بنا دیا گیا

یاد ماضی

اردو ادب کے ایک صاحب طرز ادیب کی جہدِ مسلسل کی داستان

باکمال اداکارہ

فلمی دنیا کی بہت سی حیران کر دینے والی خفیہ باتیں

ہرجائی

اس بیوی کا احوال جو شوہر کو دھوکا دیتی رہی عجیب انداز سے، دلچسپ سچ بیانی

ان کے علاوہ

طویل کہانی **جان بچا... شکار کہانی... شکاری کا شکار** اور بھی بہت سی پراثر سچ بیانیاں، دلچسپ سچے قصے، معلومات بھری رودادیں

یہ شمارہ بہت خاص ہے، ضرور ملاحظہ کریں

ہیں۔'' وہ نرم لہجے میں بولا۔ ''میرا وہ مطلب نہیں تھا سرکار!''

میں نے خشک لہجے میں پوچھا۔ ''پھر تمہارا کیا مطلب تھا؟''

''آپ نے میرے ذمے جو کام لگایا ہے، اسے نمٹانے کے لیے کم از کم دو دن لگ جائیں گے۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''یہ سارے مقامات ایک دوسرے سے میلوں کے فاصلے پر واقع ہیں۔ اس مشن پر روانہ ہونے سے پہلے مجھے اپنے گھر والوں کو بتانا ہوگا۔ میں یونہی منہ اٹھا کر کہیں نہیں جاسکتا تھانیدار صاحب!''

''بس، اس چھوٹی سی بات نے تمہیں پریشان کردیا ہے امیر حسین!'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میں نے تو تم پر کسی قسم کی پابندی عائد نہیں کی۔ تم اپنے گھر والوں کو اطلاع دینے کے بعد بھی اس مہم پر روانہ ہوسکتے ہو۔''

''پھر تو ٹھیک ہے تھانیدار صاحب!'' اس کے چہرے سے اطمینان جھلکنے لگا۔ ''میں جانے کے لیے تیار ہوں۔''

امیر حسین اور فرید حسین کو رخصت کرنے کے بعد میں نے حوالدار صابر شاہ کو اپنے کمرے میں بلالیا۔ ہر کیس کے حوالے سے میں صابر شاہ کو ضرور اعتماد میں لیتا تھا۔ بھولا کی گمشدگی والے معاملے کی تفصیلات بھی اس کے علم میں تھیں۔ اس تھانے میں میرے بعد وہی سب میں سینئر تھا اور میری عدم موجودگی میں صابر شاہ ہی تھانے کا نظام سنبھالتا تھا۔

''شاہ جی!'' وہ سلام کرنے کے بعد میرے سامنے بیٹھ چکا تو میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''ہر چھوٹی بڑی بات آپ کے علم میں ہے۔ بتائیں کہاں سے شروع کریں؟''

''بھاگ دوڑ تو ہر سمت میں ہم کر ہی رہے ہیں ملک صاحب!'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''کافی دن ہوگئے، ہم نے کسی بندے کو سرکاری مہمان نہیں بنایا۔ ہمارے تھانے کی حوالات بھی ملزموں اور مجرموں کی راہ دیکھ رہی ہے۔''

''شاہ جی! اس وقت ہمارا تھانہ بھولا کی پراسرار گمشدگی کے ساتھ سر کھپا رہا ہے۔'' میں نے حوالدار کے چہرے پر نگاہ گاڑ کر معتدل انداز میں کہا۔ ''اس سلسلے میں بھولا کو غائب کرنے والے شخص کے حوالے سے ہم کچھ نہیں جانتے۔ ہاں، البتہ دو افراد ہمارے شک کے دائرے میں قدم رکھ چکے ہیں۔ میری نظر میں ان دونوں کی حیثیت ملزموں ایسی ہے۔''

''آپ کا اشارہ ٹرک ڈرائیور اعجاز اور چودھری ارشاد حسین کے خاص ملازم نیاز علی کی جانب ہے نا؟''

''ہاں، بالکل۔'' میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ''فی الحال انہی میں سے کوئی ایک بھولا کی گمشدگی کا ذمے دار ہوسکتا ہے۔ چودھری برکت علی نے اعجاز ڈرائیور اور بھولا کو وقوعہ کی سہ پہر باتیں کرتے دیکھا تھا اور نیاز علی کی دھمکی کے بارے میں بھی آپ کو بتا چکا ہوں۔''

''ٹرک ڈرائیور اعجاز کے کردار اور عادات سے ہم قطعی ناواقف ہیں ملک صاحب!'' صابر شاہ پُرسوچ انداز میں بولا۔ ''جبکہ نیاز علی کا کچا چٹھا ہمارے سامنے ہے۔ اس لیے ہمیں بسم اللہ اسی سے کرنا چاہیے۔''

''ویسے بھی اعجاز اس وقت ہماری رسائی میں نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔ ''وہ کل شام تک واپس آئے گا۔''

''تو اس صورتِ حال میں میرے لیے کیا حکم ہے ملک صاحب؟'' صابر شاہ اپنے ہاتھوں کو ملتے ہوئے معنی خیز انداز میں مستفسر ہوا۔

مجھے یہ سمجھنے میں کسی دقت کا سامنا نہیں ہوا کہ حوالدار کے ہاتھوں میں زبردست قسم کی کھجلی ہو رہی تھی اور اس کھجلی کو مٹانے کے لیے اسے کسی شکار کی ضرورت تھی جو سرِدست نیاز علی عرف نیاجا کے سوا اور کوئی ہو نہیں سکتا تھا۔ نیاجا، بھولا کے غیاب میں ملوث تھا یا نہیں، بہرکیف یہ تو طے تھا کہ وہ کوئی اچھا انسان نہیں تھا۔ سو، اس سے ''پوچھ تاچھ'' کرنے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ اس پر تنگی اور سختی جائز تھی کیونکہ اس نے بھولا کی ماں کی زندگی اجیرن کر رکھی تھی۔ تنذیراں تو وہ عورت تھی جو اس کے ہاتھ نہیں آئی تھی ورنہ پتا نہیں اب تک کتنی مجبور ولاچار خواتین نیاجا کی ہوس کی بھینٹ چڑھ چکی تھیں۔

''شاہ جی! آپ کے لیے حکم یہ ہے کہ فی الفور نیاجا کو اٹھالائیں۔'' میں نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ ''اسے ٹھوک بجا کر دیکھتے ہیں کہ وہ اندر سے کس قدر بھرا ہوا ہے۔''

صابر شاہ کا چہرہ کسی انجانی مسرت سے چمک اٹھا۔ اس کے تاثرات سے ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی صدیوں کے بھوکے شکاری کو اس کا من بھاتا کھانا مل گیا ہو۔

''ایک بات اور شاہ جی!'' وہ جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا تو میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''اس اہم موقع پر مجھے ایک بندریا کی بھی ضرورت ہوگی۔ آپ کا وہ مداری دوست کہاں ہے؟''

کرم دین نامی ایک شخص سے صابر شاہ کی بڑی پکی یاری تھی۔ کرم دین عرف کرمو چاچا ایک مداری قسم کا انسان تھا جو بکرے اور بندر کے ذریعے مختلف کھیل تماشے دکھا کر بچوں کو محظوظ کیا کرتا تھا، جواب میں اسے کچھ پیسے مل جاتے تھے۔ یہی اس کی روزی روٹی تھی۔

''کرمو نے کہا جانا ہے ملک صاحب!'' صابر شاہ نے جواب دیا۔ ''وہ ادھر ہی ہے لیکن اس کے پاس بندریا نہیں بلکہ بندر ہے۔''

''بندریا یا بندر سے کوئی فرق نہیں پڑتا شاہ جی!'' میں نے کہا۔ ''میں بس یہ چاہتا ہوں کہ آپ نیاجا کے ساتھ ہی کرمو کو بھی تھانے لے آئیں اور...... اس کے بندر کو بھی۔''

''آخر آپ کرنا کیا چاہ رہے ہیں ملک صاحب؟'' وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے تکنے لگا۔

''ایک بندر کے ذریعے ''بندر تماشا'' ہی کیا جاسکتا ہے شاہ جی!'' میں نے پرمعنی انداز میں کہا۔ ''آپ اپنے ہاتھ پاؤں کی مدد سے نیاجا کی خاطر داری کرنا چاہتے ہیں اور میں کرمو کے بندر کے توسط سے۔''

اس کے بعد حوالدار نے مجھ سے مزید کوئی سوال نہیں کیا۔

اسی سہ پہر نیاجا میرے تھانے کی حوالات میں موجود تھا اور کرمو اپنے بندر اور بکرے سمیت حوالدار کے کمرے میں ''براجمان'' تھا۔ میں نے صابر شاہ کو اپنے کمرے میں بلا کر گہری سنجیدگی سے کہا۔

''پہلی باری آپ کی ہے۔ میں آپ کو ایک گھنٹا دے رہا ہوں۔ آپ اس قلیل مدت میں کشمیر شرف میزبانی حاصل کرلیں، اس کے بعد میری باری آئے گی۔ آج کرمو نہیں، میں آپ کو بندر تماشا دکھاؤں گا۔''

وہ خوش ہوتے ہوئے بولا۔ ''پھر تو بہت مزہ آئے گا۔''

آئندہ ایک گھنٹے تک ٹرائل روم کی جانب سے نیاجا کی کربناک چیخیں اور منت ریز آہ و بکا کا سلسلہ جاری رہا۔ صابر شاہ کو کافی عرصے بعد خوراک ملی تھی، سو اس نے اپنے ہاتھ پاؤں کے ''ارمان'' نکالنے میں کسی کنجوسی یا کوتاہی سے کام نہیں لیا تھا۔ اپنی جاب مکمل کرنے کے بعد جب وہ میرے پاس آیا تو اس کی وردی پسینے سے شرابور تھی۔ اس کی حالت دیکھ کر میں نے پوچھا۔

''شاہ جی! نیاجا کا کیا حال ہے؟ آپ تو اپنے ہی پسینے میں نہا کر آرہے ہیں۔ کہیں آپ نے اسے اس کے خون سے غسل تو نہیں دے دیا؟''

''اگر آپ کا اشارہ ہوگا تو میں نیاجا کی میت کو اسی کے لہو سے غسل دینے میں کسی ہچکچاہٹ سے کام نہیں لوں گا۔'' اس نے مضبوط لہجے میں جواب دیا۔

''اس حد تک جانے کا ابھی وقت نہیں آیا شاہ جی!'' میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا اور پوچھا۔ ''آپ کی تمام تر توجہ اپنے ہاتھ پاؤں کی ''بھڑاس'' نکالنے پر ہی مرکوز رہی تھی یا آپ نے بھولا کی گمشدگی کے حوالے سے بھی اس کی زبان کھولنے کی کوشش کی ہے؟''

''کوشش تو بہت کی ہے ملک صاحب لیکن اس کے منحوس منہ سے کوئی کارآمد بات برآمد نہیں ہوئی۔'' وہ ایک مضمحل سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ''وہ مسلسل اپنی لاعلمی کا اظہار کررہا ہے۔ اب یہی ہوسکتا ہے کہ یا تو وہ انتہائی ڈھیٹ اور سخت جان ہے اور یا پھر بھولا کی پراسرار گمشدگی میں اس کا ہاتھ نہیں۔''

''ٹھیک ہے، میں ٹرائی کر کے دیکھتا ہوں۔'' میں نے اپنی کرسی چھوڑتے ہوئے کہا۔ ''نیاجا ابھی تک ٹرائل روم ہی میں ہے یا آپ نے اسے واپس حوالات میں بند کردیا ہے؟''

''وہ لاک اپ میں ہے۔'' صابر شاہ نے بتایا۔

''اوکے۔'' میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''آپ لاک اپ کے باہر ایک کرسی رکھوا دیں اور کرمو کو اس کے بندر سمیت وہاں لے آئیں۔''

صابر شاہ میرے ارشاد کی تعمیل میں لگ گیا۔

پانچ منٹ کے اندر میرے ڈراما کے لیے ''اسٹیج'' سجا دیا گیا۔ نیاجا حوالات کے اندر ایک دیوار کے ساتھ پشت ٹکائے اور سر جھکائے اکڑوں بیٹھا تھا۔ میں نے حوالات کے باہر رکھی ہوئی کرسی سنبھال لی۔ مداری کرمو میرے پہلو میں کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں وہ رسی تھی جس کے دوسرے سرے پر ایک شریر بندر بندھا ہوا تھا۔ اس بیچارے جانور کو کچھ معلوم نہیں تھا کہ اسے وہاں کس مقصد سے لایا گیا تھا۔ وہ تھانے کی حوالات کو بھی ایک تماشا گاہ ہی سمجھ رہا تھا اسی لیے وہ ہم سب کو محظوظ کرنے کی غرض

[illegible]

"جو حکم سرکار!" کرمو فوراً حرکت میں آگیا۔

میرے اشارے پر صابر شاہ نے حوالات کا دروازہ کھول کر کرمو کے بندر کو اندر کیا پھر آہنی دروازے میں سے اس کی رسی کو گزارنے کے بعد دروازہ دوبارہ بند کردیا۔ رسی کا آزاد سرا کرمو کے ہاتھ میں تھا۔ میں نے تحکمانہ انداز میں کہا۔

"چاچا کرمو! رسی کو ڈھیل دے کر اپنے چھورے (بندر) کو حوالاتی کے نزدیک جانے کا موقع دو مگر اس بات کا خیال رہے کہ کہیں یہ جانور میرے قیدی پر حملہ نہ کردے۔" آخری جملہ میں نے سرگوشیانہ انداز میں ادا کیا تھا۔

کرمو مداری نے میری بات کو اچھے سے سمجھ لیا تھا لیکن نیاجا میرے اس حکم کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا تھا اسی لیے جب وہ بندر نیاجا کے قریب پہنچا تو اس نے خوفناک انداز میں چیخنا چلّانا شروع کردیا۔

"میں نے بھولا کو اغوا نہیں کیا...... میں اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا...... میں بڑی سے بڑی قسم کھانے کو تیار ہوں۔ اللہ کے واسطے مجھے چھوڑ دیں...... میں بے قصور ہوں۔"

اس منت سماجت کے ساتھ ہی نیاجا نے باقاعدہ رونا بھی شروع کردیا۔ نیاجا کے نزدیک کھڑا بندر حیران پریشان اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ حوالاتی اس قسم کے ردعمل کا مظاہرہ کیوں کررہا تھا۔ اس کی اداکاری اور کرتب دیکھ کر تو بچے، بڑے اور بوڑھے خوش ہوا کرتے تھے اور اسے داد دینے کے لیے تالیاں پیٹتے تھے اور ایک نیاجا تھا کہ اس کے سامنے ٹسوے بہا رہا تھا۔ اب اس ناسمجھ جانور کو کیا معلوم کہ نیاجا کا رونا جھوٹ

[illegible]

"تم بلاوجہ کیوں واویلا مچا رہے ہو؟" میں نے درشت لہجے میں نیاجا سے پوچھا۔ "میں نے کب کہا کہ تم نے بھولا کو کہیں چھپا کر رکھا ہوا ہے؟"

اس نے جواب دینے سے پہلے صابر شاہ کی طرف دیکھا اور فریادی لہجے میں کہا۔ "آپ کے حوالدار نے میرے ساتھ بہت زیادتی کی ہے تھانیدار صاحب! اس نے میری ہڈی پسلی ایک کردی ہے سرکار......! یہ بار بار مجھ سے ایک ہی سوال کررہا تھا کہ میں نے بھولا کے ساتھ کیا کیا ہے؟ میں اس کی مار کھا رہا تھا اور میری زبان پر بھی ایک ہی جواب تھا کہ میں بھولا کی گمشدگی کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔" لمحاتی توقف کے دوران میں اس نے تھوک نگل کر اپنا حلق تر کیا پھر ان الفاظ میں اضافہ کردیا۔

"میں یہی سمجھا تھا کہ آپ بھی مجھ سے بھولا کے بارے میں ہی پوچھنا چاہتے ہیں اس لیے میں نے اپنی بے گناہی کا یقین دلانے کے لیے آپ سے فریاد کی تھی۔ بس، اتنی سی بات ہے تھانیدار صاحب!"

"یہ اتنی سی بات تمہاری سنگین غلطی ہے نیاجا!" میں نے کھا جانے والی نگاہ سے اسے گھورا۔ "تم نے ایک حوالدار اور ایک تھانہ انچارج کے درمیان کا فرق ہی مٹا ڈالا ہے۔ حوالدار جو سوچ رہا تھا، وہ بھلا میں کیسے سوچ سکتا ہوں۔"

"مجھے معاف کردیں تھانیدار صاحب!" وہ دونوں

ہاتھ جوڑ کر لجاجت بھرے لہجے میں بولا۔ ''آئندہ میں ایسی غلطی نہیں کروں گا۔''

''شاباش!'' میں نے ڈرامائی انداز میں اسے سراہا اور کہا۔ ''بھولا کی گمشدگی والا کیس حوالدار صابر شاہ کے ہاتھ میں ہے۔ وہ دوبارہ بھی تم سے پوچھ تاچھ کرے گا۔ میں تو کسی اور مقصد سے تمہارے پاس آیا ہوں۔''

میں نیاجا کے دماغ سے اس طرح کھلواڑ کر رہا تھا کہ وہ میری منصوبہ بندی کو سمجھنے سے قاصر تھا۔ اس کی الجھن کا سب سے بڑا سبب وہ بندر تھا جو اس سے تھوڑے فاصلے پر کھڑا عجیب و غریب اور مضحکہ خیز شکلیں بنا کر اسے چڑانے میں مصروف تھا۔

میں نے کرمو کو اشارہ کیا۔ کرمو نے بندر والی رسی کو ڈھیل دیتے ہوئے مخصوص زبان میں کچھ کہا۔ بندر اپنے آقا کے احکامات کی تعمیل میں نیاجا کے نزدیک چلا گیا۔

''یہ کون ہے؟'' میں نے بندر کی جانب انگلی اٹھاتے ہوئے نیاجا سے استفسار کیا۔

نیاجا نے دزدیدہ نگاہ سے مذکورہ بندر کی طرف دیکھا پھر مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے جواب دیا۔

''یہ...... یہ ایک باندر (بندر) ہے۔''

''یہ بندر نہیں، بندریا ہے۔''

''مگر لگ تو باندر (بندر) ہی رہا ہے۔'' وہ الجھن زدہ انداز میں بولا۔

میں نے کڑے لہجے میں پوچھا۔ ''اس تھانے کا انچارج میں ہوں یا تم؟''

''تھانیدار تو آپ ہی ہیں جناب!'' اس نے میکانکی انداز میں کہا۔

''تو پھر میں جو کہہ رہا ہوں، وہی درست ہے۔''

''ٹھیک ہے جی...... یہ باندری (بندریا) ہی ہے۔'' وہ مسکین سی صورت بنا کر بولا۔ ''آپ غلط تھوڑی کہہ سکتے ہیں۔''

''یہ بندریا تازہ تازہ بیوہ ہوئی ہے۔'' میں نے کہا۔

''اس باندری کا گھروالا ابھی ابھی فوت ہوا ہے۔'' نیاجا نے کسی معمول کے مانند فوراً تصدیق کردی۔ ''یہ سن کر مجھے بہت دکھ ہوا ہے۔''

اب نیاجا پوری طرح میری نفسیاتی تفتیش کے ٹرانس میں آچکا تھا۔ ''میں نے سنا ہے......'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے اپنے کام کو آگے

بڑھا دیا۔ ''بیوہ کوئی بندریا ہو یا کوئی عورت، تمہیں فوراً اس سے ہمدردی ہو جاتی ہے؟''

''جج...... جی......!'' وہ متوحش نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔''

''اور اسی ہمدردی کے ہاتھوں مجبور ہو کر تم اس بیوہ کو اپنے سینے سے لگانے کے لیے بے چین ہو جاتے ہو۔'' میں نے زہرخند لہجے میں کہا۔ ''چلو، آگے بڑھو...... اور اس بندریا کو گلے لگا لو۔''

نیاجا نے ایسی نظر سے مجھے دیکھا جیسے میں نے اسے بندریا نہیں بلکہ بھیانک موت کو گلے لگانے کا حکم دے دیا ہو۔ میں نے سخت لہجے میں پوچھا۔

''کیوں...... کیا ہوا؟''

''میں...... ایک باندری کو...... کیسے اپ سینے سے لگا سکتا ہوں؟'' وہ رونی صورت بنا کر بولا۔ ''یہ پنجے مار مار کر میرا حشر خراب کر دے گی۔ میں نے سنا ہے باندروں کے ناخن بہت تیز اور خوفناک ہوتے ہیں۔''

''ذرا ایک سال پہلے کے زمانے کو اپنے ذہن میں لاؤ۔'' میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ''جب کھیت مزدور قوبا کے انتقال کے بعد اس کی بیوی نذیراں نے اپنی گزربسر کے لیے کھیتوں میں کام کرنا شروع کر دیا تھا، وہ تمہاری نگرانی میں تھی اور بھری دوپہر تم نے گندم کی کھڑی فصل کے اندر اسے اپنے سینے سے لگانے کی کوشش کی تھی۔ اس وقت نذیراں کے ہاتھ میں بھی تیز اور خطرناک دندانوں والی درانتی تھی مگر تم کٹائی کرنے والے اس دہاتی اوزار سے ذرا بھی خوفزدہ نہیں ہوئے تھے اور تم نے اپنی ہوس میں اندھے ہو کر نذیراں کو فتح کرنا چاہا تھا۔ کیا جواب میں نذیراں نے اپنا بچاؤ کرنے کے لیے درانتی سے تم پر وار

کیا تھا؟'' میں ذرا دیر کے لیے رکا پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کٹیلے لہجے میں کہا۔

''نہیں کیا تھا، بلکہ تم پر حملہ آور ہونے کے لیے ایک دوسرا راستہ اپنایا تھا۔ یہ بندریا بھی اپنے بچاؤ کے لیے تیز دھار ناخنوں کے بجائے دوسرا راستہ اختیار کرے گی اور تھوک کا کیا ہے، عورت کا ہو یا بندریا کا...... وہ تھوک ہی ہوتا ہے۔''

نیاجا کی حالت ایسی تھی کہ کاٹو تو لہو نہیں اور پیٹو تو آنسو نہیں۔ چند لمحات تک موت سے بھی زیادہ ڈراؤنی کیفیت میں مبتلا رہنے کے بعد وہ روہانسی آواز میں بولا۔

''نذیراں سے بدتمیزی کرنا میری غلطی تھی اور میں نے اپنے اس فعل کے لیے چودھری صاحب سے بہت زیادہ ڈانٹ بھی سنی تھی۔ اب آپ اس واقعے کی یاد دلا کر مجھے اور ذلیل تو نہ کریں۔''

''اچھا...... تو تمہیں اپنی ذلت کا احساس بھی ہوتا ہے؟'' میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اس واقعے کو تھوڑی دیر کے لیے ایک طرف رکھ کر مجھے اس سوال کا جواب دو کہ پچھلے دنوں تم نے بھولا کے حوالے سے نذیراں کو یہ دھمکی کیوں دی تھی...... نذیراں! تم اپنے معصوم بچے ہی کا کچھ خیال کر لو، بھولا کے سر پر باپ کا سایہ نہیں ہے۔ اگر اس کے ساتھ کوئی اونچ نیچ ہو گئی تو تمہاری باقی زندگی خون کے آنسو بہاتے ہوئے گزرے گی۔'' میں نے ڈرامائی انداز میں توقف کیا پھر سرسراتی ہوئی آواز میں بات مکمل کر دی۔

''تمہاری اس خوفناک دھمکی کے ایک ماہ بعد بھولا پراسرار طور پر کہیں غائب ہو گیا ہے۔''

وہ بڑی بڑی قسمیں کھا کر اور ٹکڑے ٹکڑے واسطے دے کر مجھے یہ بتانے اور سمجھانے کی کوشش کرنے لگا کہ بھولا کی گمشدگی میں اس کا ہاتھ نہیں ہے...... وغیرہم!

''بکواس بند کرو۔'' میں نے کڑک دار آواز میں کہا۔ ''تمہارے پاس صرف ایک رات کی مہلت ہے۔ کل صبح تمہیں ہر حال میں سچ بولنا ہوگا۔ اگر تم نے مجھے چکر دینے کی کوشش کی تو میں حوالات ہی میں تمہیں گولی مار دوں گا۔''

میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا مگر پچھلے دو گھنٹوں میں نیاجا جس نوعیت کی صورتِ حال سے گزر چکا تھا، وہ اس کیفیت سے فوری طور پر باہر نہیں آسکتا تھا چنانچہ وہ ہونقوں کی طرح منہ کھول کر وحشت بھرے انداز میں مجھے دیکھنے لگا۔

☆☆☆

یکم اپریل ۲۰۰۰ء کی صبح بڑی [illegible] ثابت ہوئی تھی۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کسی شیطانی قوت نے [illegible] ہوئی کی فضا اور وہاں رہنے والے لوگوں سے [illegible] ''اپریل فول'' کی آڑ میں ایک سنگین مذاق کر دیا ہے۔ ناشتے کے بعد تیار ہو کر تھانے پہنچا تو مجھے بتایا گیا کہ جی ٹی روڈ کے کنارے کسی بچے کی لاش ملی ہے۔

یہ اطلاع ایسی ہولناک اور جگر پاش تھی کہ اپنے کمرے کا رخ کرنے کے بجائے میں کانسٹیبل اسمٰعیل کے ہمراہ جائے وقوعہ پر پہنچ گیا اور جب میں نے میتِ لاش پر نگاہ ڈالی تو میرا دماغ چکرا کر رہ گیا...... جی ہاں...... میں نے لاش کی شناخت میں کوئی غلطی نہیں کی تھی۔ وہ نذیراں بی بی کا آٹھ سالہ جگر گوشہ بابر عرف بھولا ہی تھا جو زندگی سے لامحدود فاصلے پر موت کی آغوش میں پناہ لے چکا تھا۔

بھولا کا بے جان، پھول ایسا بدن مکمل برہنہ حالت میں جی ٹی روڈ کے کنارے پڑا انسان اور انسانیت کے منہ پر طمانچہ رسید کر رہا تھا۔ میں نے ایک چادر منگوا کر بھولا کی لاش کو ڈھانپ دیا۔ تفصیلی معائنے کے بغیر ہی بھولا کے بے لباس جسم کو دیکھ کر مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ موت سے پہلے اسے شرمناک جبری جسمانی اذیت سے گزرنا پڑا تھا۔ یہ سیدھا سیدھا چائلڈ ابیوز (بچوں کے ساتھ زیادتی) کا معاملہ تھا تاہم میں نے اپنے اندازے کی تصدیق کے لیے بھولا کی لاش کو فی الفور پوسٹ مارٹم کی غرض سے ضلعی اسپتال بھجوا دیا۔

آئندہ ایک گھنٹے میں، میں نے جائے وقوعہ کا تفصیلی جائزہ لے کر وقوعہ کا نقشہ تیار کر لیا اور اسی تگ و دو میں کام کی ایک چیز بھی میرے ہاتھ لگ گئی تھی اور وہ چاندی کی ایک مردانہ انگوٹھی تھی۔

متذکرہ بالا انگوٹھی کے اندر پندرہ سے اٹھارہ قیراط وزن کا ایک سنگِ دودھیا (اوپل) جڑا ہوا تھا۔ اس قیمتی پتھر کی ساخت بیضوی تھی اور اس کے گرد سرخ رنگ کے ننھے منے پتھر بھی جڑے گئے تھے۔ میرے محتاط اندازے کے مطابق وہ چھوٹے سرخ پتھر روبی یعنی یاقوت یا پھر گارنٹ (تامڑا) کا چورا تھا۔ پتھروں کی تراش خراش کے عمل میں حاصل ہونے والا یہ چورا لگ بھگ بے قیمت ہی ہوتا ہے جسے کلوگرام کے حساب

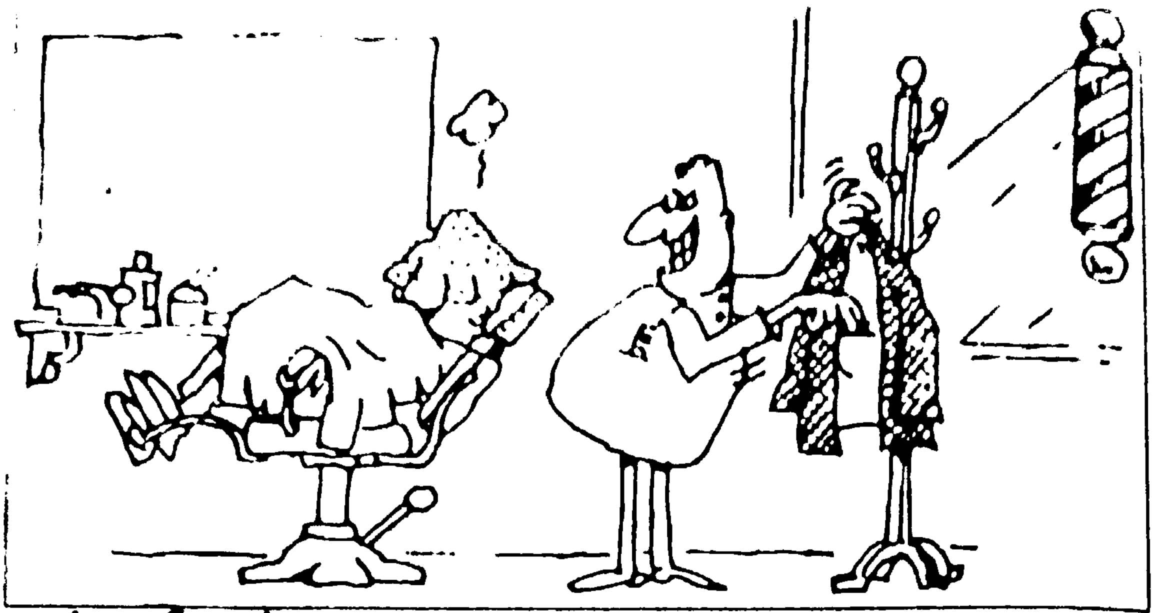

سے تول کر فروخت کیا جاتا ہے۔ یہ چھوٹے پتھر زیورات کی آرائش وزیبائش میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

نذیراں بی بی کی حالت خاصی دگرگوں تھی۔ اس کی زندگی کا واحد سہارا اس طرح اس کا ساتھ چھوڑ گیا تھا کہ بھولا کی موت اس کے دل وجگر اور دماغ کا داغ بن کر رہ گئی تھی۔

انسان کی زندگی ناپائدار اور موت دائمی ہے۔ دونوں میں ازل سے ایک جنگ جاری ہے اور یہ خوفناک سلسلہ ابد تک چلتا رہے گا مگر قدم قدم پر موت، زندگی پر سبقت لے کر اپنی بہادری کا ثبوت دیتی رہتی ہے۔

بھولا کی لاش دریافت ہوجانے کے بعد ٹرک ڈرائیور اعجاز اور چودھری ارشاد حسین کا ملازم خاص نیاز علی خودبخود شک کے دائرے سے باہر نکل گئے تھے کیونکہ جس وقت بھولا کی لاش کو جی ٹی روڈ کے کنارے پھینکا گیا، اعجاز عرف جاجی پشاور میں تھا اور نیاز علی عرف نیاجا میری کسٹڈی میں۔ لہٰذا میں نے نیاجا کو اسی روز رہا کردیا تھا۔

اب میرے سامنے سب سے اہم اور حساس سوال تھا، بھولا کی عزت کو تار تار کرکے اسے موت کے گھاٹ اتارنے والے دیّوث قاتل کا اور اس شقی القلب معاشرتی ناسور تک پہنچنے کا راستہ تھا میرے پاس یعنی چاندی کی اوپلی جڑی انگوٹھی۔

میں نے جائے واردات پر موجود لوگوں سے اس انگوٹھی کے بارے میں پوچھا تو کسی نے مثبت جواب نہیں دیا۔ وہ پورا دن میں نے موضع شمشاد نگر کے رہائشیوں کے انٹرویو کرتے ہوئے گزار دیا تھا۔ ان لوگوں میں مرد، عورتیں اور بچے و بوڑھے سب شامل تھے۔ حتیٰ کہ اس مہم کے حوالے سے میں چودھری ارشاد حسین کی حویلی کا پھیرا بھی لگا آیا تھا مگر کہیں سے بھی کوئی حوصلہ افزا خبر نہیں مل سکی تھی۔ ایک بات تو طے ہوگئی تھی کہ بھولا کے قاتل کا شمشاد نگر سے تعلق نہیں تھا ورنہ وہاں کے رہنے والوں میں سے کوئی تو اس انگوٹھی کو پہچان لیتا۔

آئندہ روز اسپتال سے بھولا کی لاش کے ساتھ ہی پوسٹ مارٹم کی ابتدائی رپورٹ آگئی۔ اس رپورٹ نے میرے تمام تر خدشات اور اندازوں کی تصدیق کردی تھی۔ مذکورہ رپورٹ کے مطابق بھولا کو نیم بے ہوش رکھ کر متعدد بار اس کی روح پر چرکے لگائے گئے تھے اور موت کے بعد اسے سڑک کے کنارے پھینک دیا گیا تھا۔

ظلم وزیادتی اور بربریت کی اس مثال نے میرا خون کھولا کر رکھ دیا۔ بھولا کی تباہی اور بربادی کے ذمے دار اس نامعلوم وحشی درندے کو کیفرِ کردار تک پہنچانے کے لیے میں بے تاب ہوگیا۔ پھر جب میں نے اس چاندی کی انگوٹھی کے بارے میں لالہ موسیٰ کے لوگوں سے پوچھ تاچھ کی تو چودھری برکت علی کی فراہم کردہ معلومات کی روشنی میں، میں بھولا کے مجرم تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا۔

چودھری برکت علی نے دو روز پہلے مجھ سے وعدہ کیا

تھا کہ وہ بدری کے بارے میں چھان بین کر کے مجھے رپورٹ دے گا۔ چودھری کی چھان بین کے نتیجے میں مجھے پتا چلا کہ دو سال پہلے بدری کی بیوی زبیدہ نے اسے چھوڑ دیا تھا اور اس کے بعد بدری اکیلا ہی رہ رہا تھا۔ اس کا گھر دکان کے پچھلے حصے میں تھا۔ میں فوراً زبیدہ کے گھر پہنچ گیا۔

رسمی علیک سلیک کے بعد جب میں نے اسے اپنی آمد کی غرض و غایت بتائی تو اس نے خشک لہجے میں کہا۔ ''میں بدری کا نام بھی نہیں سننا چاہتی۔''

وہ ایک قبول صورت عورت تھی۔ اس کا گھر مین بازار سے ایک گلی کے فاصلے پر تھا۔ میں نے وہ انگوٹھی زبیدہ کے سامنے رکھ دی جو مجھے جائے واردات سے ملی تھی۔

''یہ اسی شیطان بدری کی ہے۔'' وہ غصیلے لہجے میں بولی۔ ''میں نے کتنی مشکل کے بعد اس نامراد سے جان چھڑائی تھی لیکن اس کی چیزیں میرے تعاقب میں رہتی ہیں...... یہ انگوٹھی آپ کو کہاں سے ملی ہے تھانیدار صاحب؟''

آخری جملہ اس نے نفرت بھرے مگر پُراشتیاق انداز میں ادا کیا تھا۔ میں نے ایک ایک لفظ پر دباؤ ڈالتے ہوئے جواب دیا۔ ''معصوم بھولا کی لاش کے پاس سے۔''

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا اور پوچھا۔ ''کیا آپ اسی بچے کی بات کر رہے ہیں جو بدری کی دکان پر کام کرتا تھا اور چند روز پہلے وہ اچانک کہیں غائب ہو گیا تھا اور...... پھر اس کی لاش سڑک کے کنارے پڑی ملی تھی؟''

''ہاں...... بالکل وہی بچہ۔'' میں نے تصدیقی انداز میں گردن ہلائی اور پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کا تذکرہ کرنے کے بعد میں نے نرم لہجے میں کہا۔ ''زبیدہ! مجھے تمہارے تعاون کی ضرورت ہے۔''

''آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں تھانیدار صاحب؟'' وہ نظر چراتے ہوئے مستفسر ہوئی۔

میں چند لحات تک گہری نگاہ سے اسے دیکھتا رہا پھر معتدل انداز میں سوال کیا۔ ''تم نے بدری سے جان کیوں چھڑائی تھی؟''

''سچ سننا چاہتے ہیں؟'' وہ معنی خیز انداز میں بولی۔

''ہاں...... سولہ آنے سچ۔''

''بھولا کی لاش کی رپورٹ کے بعد بھی آپ کی تسلی نہیں ہوئی؟'' اس نے عجیب سے لہجے میں پوچھا۔ ''اس میں سب کچھ تو لکھا ہوا ہے۔''

''میں کاغذ پر لکھی ہوئی عبارت سے زیادہ انسانوں پر بھروسا کرتا ہوں زبیدہ!'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے دوٹوک انداز میں کہا۔ ''میری معلومات کے مطابق تم نے پورے پانچ سال بیوی کی حیثیت سے بدری کے ساتھ گزارے ہیں۔ اس آدمی کے کردار اور عادات کے بارے میں تمہاری رائے کو میں سب سے زیادہ معتبر اور مستند مانوں گا۔''

وہ چند سیکنڈ تک تذبذب کا شکار دکھائی دی لیکن پھر وہ خیالات کے بھنور سے نکل آئی اور اس نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔

''بچے کی رپورٹ میں سب کچھ ٹھیک لکھا ہوا ہے تھانیدار صاحب! بدری اس قبیح شوق میں مبتلا ہے۔ میں نے اس کی یہ غلیظ عادت چھڑانے کی بہت کوشش کی مگر مجھے کامیابی نہیں ہوئی۔ تنگ آ کر میں نے بدری ہی کو چھوڑ دیا۔ مجھے یقین ہے روزِ قیامت وہ کمینہ قومِ لوط کے اندر کہیں کھڑا ہو گا۔''

کسی خاوند کی پرائیویٹ زندگی کے بارے میں اس کی بیوی کی رائے کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ میں نے زبیدہ کا شکریہ ادا کیا اور اس وعدے کے ساتھ میں اس کے پاس سے اٹھ گیا۔

''زبیدہ! تم بدری کی وہ بری عادت تو نہ چھڑا سکیں لیکن میں ہمت ہارنے والوں میں سے نہیں ہوں۔ جب تک میں اس بدبخت کو موت کی سزا نہیں دلوا دوں گا، چین سے نہیں بیٹھوں گا۔ اس طرح بدری کی یہ عادتِ بد بھی اس کے ناپاک جسم کے ساتھ ہی رزقِ خاک بنے گی۔''

میں نے جو کہا، وہ کر کے بھی دکھا دیا۔ بدری کی گرفتاری میں مجھے کسی دشواری کا سامنا نہیں ہوا تھا۔ میرے پاس اس کے خلاف پکے ثبوت موجود تھے اور وہ اوپل جڑی چاندی کی انگوٹھی تو گویا اس کے تابوت کی آخری کیل ثابت ہوئی تھی۔

بدری جیسے ننگِ انسانیت خوگرفتہ لوگوں کا ایسا ہی بھیانک انجام ہوتا ہے۔ جلد یا بدیر...... اس کا انحصار وقت اور موقع پر ہے۔

(تحریر: حسام بٹ)

میگن یہ سوچ رہی تھی کہ اگر وہ اپنے پڑوسیوں سے مل لے اور اپنے نئے محلے کے بارے میں کچھ جان لے تو شاید اسے سب کچھ بہتر لگنے لگے۔ آخر وہ ایک نئے گھر میں تھی اور اوپر سے حاملہ بھی۔ لیکن وہ پہلے بھی دوسری جگہوں پر رہ چکی تھی اور پہلے بھی حاملہ رہ چکی تھی۔ اس کے باوجود اس نے خود کو کبھی اتنا بے چین اور مضطرب محسوس نہیں کیا تھا۔ یہ گھر حقیقت میں اس کے خوابوں کا گھر تھا یا کم از کم تھوڑے سے رنگ و روغن کے بعد ایسا بن سکتا تھا مگر جب وہ ابر آلود خزاں کی ایک صبح گھر جاتے ہوئے آگے بڑھ رہی تھی تو اسے کہیں بھی کوئی گھر پر نہیں ملا۔ ہلکی سی سرد ہوا خشک پتوں کو سرسرا رہی تھی جو اس گھٹن بھری فضا کی پراسراریت میں اور زیادہ اضافہ کر رہی تھی۔ آخری گھر...... اس بار کوئی تو گھر پر ملے۔

دروازے کی گھنٹی بجاتے ہوئے اس نے پیچھے مڑ کر گیلی گھاس پر نظر ڈالی جو ٹوٹی ہوئی شاخوں اور بکھرے ہوئے پتوں سے بھری ہوئی تھی۔ میگن نے اس عمارت کے شمالی رخ پر جمی سبز کائی کو بھی نوٹ کیا۔ دروازہ اچانک کھلا اور اس نے خود کو ایک چھوٹے قد کی عورت کو گھورتا ہوا پایا جو شاید ستر کی دہائی کی تھی اور جس کی بکھری ہوئی سی حالت اس کے گھر سے خوب میل کھاتی تھی۔

''ہاں؟'' اس عورت نے تیکھے انداز میں کہا۔

پڑوسن کی سنائی کہانی پر نوجوان عورت کا اقدام

مکر

لبنیٰ خان

کبھی کبھی کچھ واقعات ایسے ہوتے ہیں جو لمحوں میں کسی کو بھی بوکھلاہٹ کا شکار کردیتے ہیں... کسی کی سنائی ہوئی کہانی حقیقت سے اتنی قریب تر لگتی ہے کہ پھر اس پر یقین کرنے کے سوا چارہ نہیں ہوتا... نہ ہی اس کی تصدیق کی جاتی ہے کہ یہ سچ ہے یا جھوٹ... اور پھر اس کا انجام یہ ہوتا ہے کہ مذکورہ شخص کوئی اہم فیصلہ کر بیٹھتا ہے۔

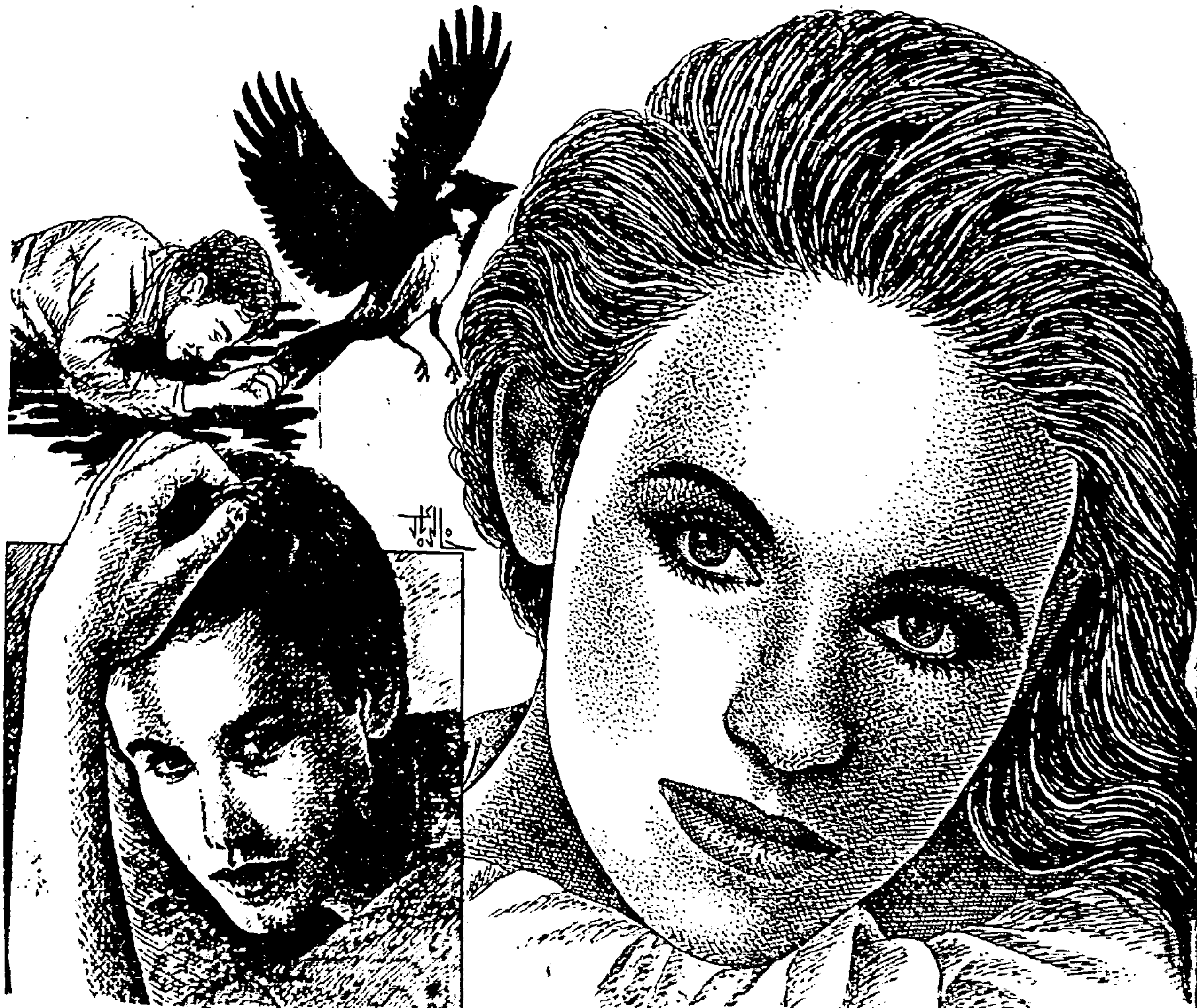

''میں اس محلے میں نئی ہوں، ہم چند دن پہلے ہی گلی کے نیچے والے گھر میں منتقل ہوئے ہیں تو سوچا آ کر ہیلو ہائے ہی کرلوں۔ میرا نام میگن مک گونی ہے۔''

عورت نے اسے سرسری نظر سے دیکھا پھر مڑ کر اندر جانے لگی۔ ''اندر آجاؤ۔'' اس نے جاتے جاتے میگن کو آواز دی۔ ''کافی پی لیتے ہیں۔ میرا نام نینسی ہے...... نینسی بلنٹ!''

میگن نے دروازہ بند کیا اور اس کے پیچھے پیچھے چل دی۔

''تو آپ اس محلے میں کب سے رہ رہی ہیں؟'' جب وہ ایک بے ترتیب سے کچن میں داخل ہوئیں تو میگن نے پوچھا۔ اس نے اپنی جیکٹ کرسی کی پشت پر ٹانگ دی جبکہ نینسی کافی بنانے میں مصروف ہوگئی۔

اس گرم گھر میں ایک پرانے سبز سویٹر میں ملبوس نینسی نے جواب دیا۔ ''سینتیس سال...... آپ کریم لیں گی یا چینی......؟ ام، معاف کیجیے گا، میں بھول گئی ہوں، آپ نے اپنا نام کیا بتایا تھا؟''

''میگن...... لیکن نہیں، شکریہ۔ بس سادہ، بغیر دودھ کے۔ میں اپنا وزن قابو میں رکھنے کی کوشش کر رہی ہوں۔ اس حمل کے دوران پہلے ہی بہت وزن بڑھ گیا ہے۔''

نینسی نے دو مگ میز پر رکھے اور ہلکی سی کراہ کے ساتھ میگن کے پاس آبیٹھی۔

''اگر مجھے پتا ہوتا کہ تم آرہی ہو تو میں گھر ذرا سا سمیٹ لیتی۔ کوئی اور بھی ہے تمہارے ساتھ؟''

''مطلب؟''

''بچے؟''

''اوہ ہاں، میرے دو بیٹے ہیں...... فن اور ڈیکلین، پانچ اور تین سال کے۔ ہم نے سوچا تھا کہ دو پر ہی رک جائیں گے مگر آپ جانتی ہیں، زندگی میں ایسا ہو ہی جاتا ہے۔ اسی لیے ہم نے یہ گھر لیا۔ ہمیں جگہ چاہیے تھی اور اس کی قیمت بھی اچھی تھی...... درحقیقت بہت اچھی۔ اس وقت میری ماما بچوں کو سنبھال رہی ہیں۔''

''ہاں، ایسا ہو ہی جاتا ہے۔'' نینسی نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''کون سا گھر؟''

''گلی میں پانچ گھر چھوڑ کر، اسی طرف۔''

''پانچ گھر چھوڑ کر...... ہاں ہاں، مجھے یاد ہے۔'' نینسی نے ذرا سوچ کر کہا۔

دونوں نے کچھ لمحے خاموشی سے کافی کے گھونٹ لیے۔ میگن نے ناگواری کو دباتے ہوئے اس زرد پڑ چکے مگ کو واپس رکھ دیا۔ میزبان کو شاید اس کا احساس نہیں ہوا۔ وہ خاموشی سے اپنے کپ سے گھونٹ بھرتی رہی اور کھڑکی سے باہر اپنے پہلو والے باغ کی طرف دیکھتی رہی۔

''تمہارے شوہر پولیس افسر ہیں نا؟'' نینسی نے پوچھا۔ ''میں نے ان کی بغیر نشان والی گاڑی کو گزرتے دیکھا ہے۔''

میگن ہنس پڑی۔ ''بغیر نشان والی گاڑیاں کتنی آسانی سے پہچانی جاتی ہیں، ہے نا؟ مارٹن کی نئی نئی پروموشن ہوئی ہے، وہ کیپٹن بن گیا ہے۔ اسی لیے ہمیں لگا کہ ہم یہ گھر خرید سکتے ہیں۔''

''اچھی بات ہے۔'' نینسی نے کہا۔

''قریب ہی ایک پولیس افسر ہونا اچھا ہوتا ہے۔ کیا پتا کب ضرورت پڑ جائے۔''

اسی وقت کھڑکی کے پاس لگے برڈ فیڈر پر ایک سرخ چمک دار کارڈینل پرندہ آبیٹھا۔

''کتنا خوبصورت ہے۔'' میگن بولی۔ پرندے نے شیشے کے پار سے انہیں ایسے دیکھا جیسے پرکھ رہا ہو، پھر دانہ چگنے لگا، گویا اب اسے ان کی کوئی پروانہ ہو۔

''بڑا مغرور سا لگتا ہے۔'' نینسی نے کہا۔ ''ہمیشہ اپنے پروں کو سنوارتا اور گنگناتا رہتا ہے مگر اسے ذرا محتاط رہنا چاہیے۔ یہاں ایک باز بھی ہے۔ یہ اس کا لقمہ بننے والا پہلا نہیں ہوگا۔''

''یہاں باز بھی ہے؟'' میگن نے چونک کر پوچھا۔

''ہاں بالکل۔'' بوڑھی عورت نے کہا اور میز پر پڑی پرندوں کی کتاب کھول لی۔ اس نے ایک کھلے صفحے پر انگلی رکھی جہاں شکاری پرندے کی رنگین تصویر تھی۔ ''یہ رہا۔''

میگن کو اس پرندے کی صورت کچھ زیادہ پسند نہیں آئی۔ قریب سے لی گئی تصویر میں اگرچہ اس کے پر خوبصورت لگ رہے تھے مگر آنکھیں تیز، زرد اور درندہ صفت تھیں۔ چونچ مڑی ہوئی، نکیلی اور بے رحم۔

''کوپرز ہاک...... یہ گانے والے پرندوں کا شکار کرتا ہے۔ میں نے اسے اچانک نمودار ہو کر اس فیڈر سے ایک سے زیادہ پرندے اچکتے دیکھا ہے۔ حتیٰ کہ اگر پرندے اسے آتا دیکھ بھی لیں، تب بھی شاذ و نادر ہی بچ پاتے ہیں۔'' سرخ پروں کی ایک جھلک کے ساتھ کارڈینل بیج بکھیرتا ہوا اڑ گیا مگر باز نظر نہیں آیا۔

''شاید اس نے ہماری باتیں سن لیں۔'' میگن نے کہا۔

''ہوسکتا ہے۔'' نینسی نے ہلکی سی ہنسی کے ساتھ جواب دیا۔

"تو کیا یہ محلہ محفوظ [illegible]؟" مارٹن تو [illegible] [illegible] یہاں کافی عرصے [illegible] آپ جانتی ہوں گی۔"

"محفوظ [illegible]؟" نینسی نے دہرایا اور [illegible] ایک اور گھونٹ لیا۔

"ہاں، مطلب یہاں اسٹریٹ کرائمز نہیں ہوتے [illegible] نہ چھین جھپٹ، نہ فائرنگ، اس قسم کی کوئی بات نہیں۔ یہ جگہ ہمیشہ پرسکون رہی ہے۔ زیادہ تر خاندان ہی آباد ہیں لیکن ہمارے ہاں کچھ واقعات ہوئے ہیں، اگر یوں کہوں۔"

"واقعات...... کیسے واقعات؟"

نینسی نے اپنے سرمئی گھنگرالے بالوں کو کان کے پیچھے اُڑسا۔ "آپ تو جانتی ہیں، گھر کے اندر کی باتیں، کبھی کبھار پڑوسیوں کے ساتھ۔"

"کس قسم کی باتیں؟" میگن جانتی تھی کہ اسے کسی اجنبی سے یہ سوال نہیں کرنا چاہیے تھا مگر وہ محض گپ شپ کے لیے کسی اجنبی کے پاس نہیں رکی تھی بلکہ اس کا مقصد اس محلے کے بارے میں مزید جاننا تھا جہاں وہ اب رہتی تھی۔ ابتدا میں وہ اپنے نئے گھر اور محلے سے خاصی مطمئن تھی مگر آہستہ آہستہ ایک ایسی بے چینی نے اسے گھیر لیا تھا جس کی وہ کوئی واضح وجہ نہیں بتا پا رہی تھی۔

"حمل کی گھبراہٹ ہوگی۔" مارٹن نے اسے یقین دلایا تھا مگر پہلے دو بچوں کے وقت اسے کبھی ایسی بے چینی محسوس نہیں ہوئی تھی۔

اس کی میزبان کے چہرے کی باریک جھرّیاں یوں لگ رہی تھیں جیسے وہ اس کے سوال پر غور کر رہی ہو۔

"ہم نے یہاں اسّی کی دہائی کے آخر میں رہنا شروع کیا۔" نینسی نے وضاحت کی۔ "میں اور میرا شوہر بل، دو بچوں کے ساتھ یہاں آئے تھے۔"

"واقعی؟" میگن بول اٹھی۔ "بالکل ہماری طرح...... آپ کے شوہر کیا کرتے تھے؟"

"پولیس میں تھے...... بالکل تمہارے شوہر کی طرح۔"

"یہ تو کمال ہے۔ اتنا اتفاق کیسے ہوسکتا ہے؟"

نینسی نے اپنی مدھم سبز آنکھیں میگن کی طرف گھمائیں۔ "اس وقت یہ ایک نیا ہاؤسنگ پروجیکٹ تھا اور تقریباً سبھی گھروں میں نوجوان والدین اور بچے تھے۔ گرمیوں میں محلے کی پکنک اور پول پارٹیاں ہوتیں اور خزاں میں بچوں کے لیے ہالووین کی تقریبات منعقد کی جاتیں۔ نوجوان مائیں بھی بچوں کی طرح بلکہ شاید ان سے بھی زیادہ [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] آج [illegible] ایسا [illegible]؟"

میگن نے سر ہلا [illegible] نظریں دوڑائیں۔ [illegible] فریج پر [illegible] تصویریں نظر آئیں، [illegible] بچوں کی [illegible] اور کچھ تازہ تصویریں بھی جو غالباً پوتے پوتیوں کی تھیں۔

"مگر یہ سب زیادہ عرصہ نہ چل سکا۔" نینسی بولتی گئی۔ "اتنا بھی نہیں جتنا چلنا چاہیے تھا۔ مجھے وہ دن بہت یاد آتے ہیں۔ اس وقت ہم نے خوب مزے کیے، پھر اچانک سب کچھ بدل گیا۔ آج کی نسلیں تو ایسی ہیں جنہوں نے کبھی اپنے پڑوسیوں سے ملاقات تک نہیں کی۔ اس لحاظ سے ہم خوش نصیب تھے۔" وہ خالی نگاہوں سے میگن کی طرف دیکھنے لگی۔ "تم اس معاملے میں مختلف ہو۔ مجھے حیرت ہوئی تھی جب تم میرے دروازے پر آئیں۔"

"کیا ہوا تھا، سب کچھ کیوں ختم ہو گیا؟"

ایک لمحے بعد بوڑھی عورت نے پلکیں جھپکائیں اور اُس پڑی۔ "تم یہ پرانی باتیں سننا نہیں چاہوگی۔"

"اب تو آپ نے تجسس میں ڈال دیا ہے، اب تو ضرور جاننا چاہوں گی۔"

"خیر، اس بارے میں یقینی طور پر صرف چار لوگ جانتے تھے اور ان میں سے ایک مائیک رالسٹن مر چکا تھا۔"

میگن نے گھبرا کر دونوں ہاتھ اپنے منہ پر رکھ لیے۔ "اوہ خدایا! کیا کوئی قتل ہوا تھا؟"

"کچھ لوگوں کا یہی خیال تھا۔"

"کیا تفتیش ہوئی تھی؟"

"نہیں۔" نینسی نے جواب دیا۔ "مائیک گھر پر ہاسپس کی نگہداشت میں تھا جب اس کی موت ہوئی۔ وہ صرف چونتیس سال کا تھا اور تقریباً ایک سال سے لیلیے کے کینسر میں مبتلا تھا۔"

"میں سمجھ نہیں پا رہی...... پھر آپ کو کیوں لگتا ہے کہ اسے قتل کیا گیا...... کیا ہوا تھا؟"

"یہ ہالووین 1991ء کی بات ہے۔ ہم نے محلے کی پارٹی اپنے گھر پر رکھنے کی رضاکارانہ ذمے داری لی تھی۔ جب موسم اجازت دیتا، ہم کھلی فضا میں پارٹیاں کیا کرتے

تھے مگر چونکہ کوئی مائیک کو پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا، اس لیے ہم نے سب کچھ خاصا خاموشی سے کرنے کی کوشش کی۔

''میرا خیال ہے، سب ہی لوگ اس بات پر تھوڑی شرمندگی محسوس کر رہے تھے کہ وہ گرل پر بینے برگر اور ہاٹ ڈاگ کھا رہے تھے اور مشروبات لے رہے تھے۔ بچوں کو ظاہر ہے کچھ معلوم نہیں تھا، نہ وہ کچھ سمجھ سکتے تھے۔ وہ اپنی ٹافیوں، چھوٹی پلاسٹک کی ٹارچوں اور سیٹیوں کے ساتھ خوب لطف اندوز ہو رہے تھے۔ انہیں مکمل طور پر خاموش رکھنا ناممکن تھا۔ ہم نے ڈائننگ روم کی کھڑکی میں سی ڈی پلیئر رکھا ہوا تھا جس پر ڈراؤنے گانے اور خوفناک آوازوں کا کوئی میوزک چل رہا تھا۔ بل نے مائیک کے احترام میں آواز کافی مدھم رکھی ہوئی تھی۔

''وہ رات بھی اکتوبر کی ان خوبصورت راتوں میں سے ایک تھی۔ خشک، رنگوں سے بھرپور اور ہوا میں بس سردی کی ہلکی سی آمیزش مگر مجموعی طور پر نہایت خوشگوار۔ ہم نے پارٹی اگلے لان میں رکھی تھی کیونکہ پچھلا صحن بہت چھوٹا ہے۔ پھر زیادہ تر بچے ابھی ٹرک اور ٹریٹ کی عمر کے بھی نہیں تھے، اس لیے ہم نے انہیں صحن میں کھیلنے کودنے دیا۔ ہم نے مختلف جگہوں پر مشعلیں لگا رکھی تھیں اور برامدے اور گاڑیوں کی لائٹس بھی جل رہی تھیں۔ کئی مرد حضرات کے پاس اصلی ٹارچیں تھیں تاکہ اندھیرا بڑھنے پر اپنے بچوں پر نظر رکھ سکیں۔ ابھی صرف شام کے چھ بجے تھے اور ہمارا ارادہ بھی پارٹی صرف ایک گھنٹا اور جاری رکھنے کا تھا۔

''تب بیکی رالسٹن شام کے جھٹپٹے میں سامنے آئی اور حیرت کی بات یہ تھی کہ اس نے ممی کا لباس پہنا ہوا تھا۔ جانتی ہو نا..... گرد آلود سی پٹیوں میں لپٹی ہوئی، چہرے کے سوا پورا جسم ڈھکا ہوا تھا۔ وہ بہت خوبصورت تھی اور عام طور پر ایسا کچھ بھی نہیں کرتی تھی۔ اس کا پورا وجود جیسے مضبوطی سے پیک کیا گیا ہو۔ ہر نگاہ اسی پر جمی ہوئی تھی۔ اس کا سراپا واقعی قابلِ توجہ تھا اور اس لباس میں تو اس نے بلی کے بھیس میں موجود دو ماؤں کو بھی پیچھے چھوڑ دیا تھا۔ میں تو مقابلہ کر ہی نہیں سکتی تھی اور پھر میں حاملہ بھی تھی اور گھر جتنی بڑی لگ رہی تھی۔''

میگن نے سر ہلایا۔ پورا منظر جیسے اس کی آنکھوں کے سامنے چلنے لگا۔

''سب کچھ اتنا عجیب لگ رہا تھا..... اس کا آنا، جبکہ ہمیں معلوم تھا کہ مائیک کے ہاسپس کے عملے کے لوگ پانچ بجے کے بعد بغیر بلائے نہیں آتے تھے۔ یعنی وہ اس وقت گھر میں بالکل اکیلا تھا۔ پھر یہ بھی کہ مائیک کے صحت مند دنوں میں بھی رالسٹن خاندان نے کبھی ہالووین نہیں منایا تھا..... کبھی نہیں۔ جب اسے یقین ہو گیا کہ سب کی نظریں اسی پر ہیں تو اس نے ہاتھ ہلایا اور بلند آواز میں کہا۔

''مائیک نے سب کو ہالووین کی مبارکباد بھیجی ہے۔''

''بیکی نے چند ماؤں سے بات کی، پھر بل مقابلے کی طرف بڑھ گئی جو گرل پر کام کر رہا تھا جبکہ بل بار اور کولر کے لیے سامان لانے گھر کے اندر گیا ہوا تھا۔

''اب تم اندازہ لگا سکتی ہو۔ باقی بیویوں کی نظریں اپنے اپنے شوہروں پر جا ٹکی تھیں اور انہیں وہ منظر بالکل پسند نہیں آ رہا تھا۔ ہر مرد بیکی کو اس لان کو پار کرتے دیکھ رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ اس کے بچے وہیں کھڑے تھے جہاں وہ انہیں چھوڑ آئی تھی، صحن کے کنارے پر۔ اس وقت وہ تین اور پانچ سال کے تھے، بالکل تمہارے بچوں کی عمر کے..... اور ہمیشہ ہی اتنے خاموش اور بے جان سے رہتے۔ وہ دوسرے بچوں کی طرح نہیں تھے۔ ان کے چہرے زرد اور بے رونق سے تھے۔ بیکی نے ایک بار مجھے بتایا تھا کہ وہ انہیں ہر روز شام پانچ بجے سلا دیتی ہے اور وہ فوراً سو جاتے ہیں۔ ہم میں سے کوئی بھی یہ بات سمجھ نہیں سکا تھا۔ ہم تو خود کو خوش قسمت سمجھتے اگر اپنے بچوں کو آٹھ بجے تک بستر پر لے جا پاتے اور وہ نو بجے یا اس کے بعد تک بھی چپ ہونے کا نام ہی نہیں لیتے تھے۔

''بیکی نے پورا اہتمام کیا ہوا تھا۔ چند پٹیاں لٹک رہی تھیں، سنہری بالوں کی لٹیں ہلکی ہوا میں لہرا رہی تھیں۔ وہ واقعی بہت دلکش لگ رہی تھی، مگر مجھے اس کے لباس کے انتخاب نے الجھن میں ڈال دیا تھا۔ اس کا شوہر بسترِ مرگ پر تھا اور وہ خود ایک چلتی پھرتی ممی بنی ہوئی تھی..... یعنی ایک لاش۔ اس نے بل سے کچھ کہا اور وہ سدھائے ہوئے کتے کی طرح فوراً رالسٹن کے گھر کی طرف دوڑ پڑا۔ چونکہ وہ ان کے ساتھ والے گھر میں رہتے تھے اس لیے اس نے مائیک کی کافی مدد کی تھی۔ میری معلومات کے مطابق بیکی نے کسی اور سے کبھی مدد نہیں مانگی تھی۔ بل بھی وقتاً فوقتاً ان کے گھر جایا کرتا تھا کیونکہ وہ بھی سرٹیفائیڈ ای ایم ٹی تھا اور ہاسپس کے پورے نظام سے اچھی طرح واقف تھا۔ چونکہ دن بھر نرسیں آتی جاتی رہتی تھیں اس لیے بیکی کو شام کے وقت ہی کسی مددگار کی ضرورت پڑتی تھی۔ اس زمانے میں بل کی ڈیوٹیاں بار بار بدل جاتیں اور کچھ عرصے بعد اس نے وہاں جانا تقریباً چھوڑ ہی دیا۔ اسے اپنی نیند پوری کرنا ہوتی تھی اور وہ کہتا تھا کہ اگر ضرورت پڑی تو بیکی خود فون کر لے گی۔

''بل سب سنبھال لیتا ہے۔'' وہ مجھ سے کہتا تھا۔

"خیر، مائیک کافی عرصے سے بیمار تھا اور تقریباً نیم بےہوشی کی سی حالت میں چلا گیا تھا۔ کچھ یوں سمجھو جیسے وہ مدہوش ہو مگر کبھی کبھار ہوش میں آ بھی جاتا تھا۔"

میگن نے اثبات میں سر ہلایا اور ٹھنڈی ہو چکی کافی کا ایک اور گھونٹ لیا، پھر فوراً کپ واپس رکھ دیا۔

"میں اسے گرم کر دوں؟" نینسی نے پوچھا۔

"نہیں، شکریہ۔ آپ آگے بتائیں پھر کیا ہوا؟"

"تقریباً پانچ منٹ بعد سل دوڑتا ہوا واپس آیا...... یا یوں کہو دوڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس وقت بھی اس کا پیٹ نکلا ہوا تھا، اب تو وہ اور بھی بھاری ہو گیا ہے۔ وہ گھبرایا ہوا لگ رہا تھا۔ ہم نے بس اتنا دیکھا اور سنا کہ وہ کہہ رہا تھا کہ مائیک کی سانسیں رک گئی ہیں اور بیکی کو فوراً گھر جانا چاہیے۔

"بیکی نے پلک تک نہ جھپکی۔ وہ سیدھی اپنے بچوں کے پاس گئی اور انہیں قریب کھڑی کسی ماں کے حوالے کیا...... شاید ڈیبی فریڈمین تھیں...... اور پھر جس طرح آئی تھی، اسی طرح وہ واپس چلی گئی۔ اتنی ساری بیٹیوں میں وہ کسی اور طرح چل بھی نہیں سکتی تھی۔ بل گھر سے شراب کی آخری بوتلیں لے کر باہر آیا۔ جب اس نے دیکھا کہ سب لوگ ایک جگہ جمع ہو کر سرگوشیوں میں باتیں کر رہے ہیں تو اس نے پوچھا۔

"کیا ہو رہا ہے؟"

"جب میں نے اسے بتایا تو وہ فوراً اندر گیا، موسیقی بند کی، پھر یہ دیکھنے رالسٹن کے گھر چلا گیا کہ آیا وہ بیکی کی کسی کو اطلاع دینے یا انتظامات میں مدد کر سکتا ہے۔ پارٹی تو ظاہر ہے وہیں ختم ہو گئی۔ سب والدین اپنے بچوں کو ساتھ لیتے ہوئے گھروں کو روانہ ہو گئے۔"

نینسی کی سل کے بارے میں حالیہ بات سن کر میگن نے پوچھا۔ "تو کیا سل اب بھی اسی محلے میں رہتا ہے؟"

"نہیں، وہ اس ہالووین پارٹی کے فوراً بعد یہاں سے چلا گیا۔ کبھی کبھار مجھے گروسری اسٹور یا فارمیسی میں دکھائی دے جاتا ہے مگر وہ ہمیشہ ایسے ظاہر کرتا ہے جیسے اس نے مجھے دیکھا ہی نہ ہو۔ میں بھی اس کے ساتھ یہی کرتی ہوں۔"

"کیوں؟"

"مائیک کی موت کے ایک دو دن بعد اس نے اپنی بیوی سیلیا سے اعتراف کیا کہ وہ بیکی سے محبت کرنے لگا ہے اور طلاق چاہتا ہے۔ یہ سنتے ہی سیلیا نے سمجھ لیا کہ اس کی ساری "خیر سگالی" دراصل بیکی کے ساتھ ناجائز تعلق کا پردہ تھی۔ سیلیا خاصی جذباتی عورت تھی اور اگرچہ وہ نہایت پکی کیتھولک تھی مگر اس نے سل کو فوراً گھر سے نکال دیا۔"

نینسی کی آواز [illegible] ایک عجب ٹھہراؤ آ گیا۔ [illegible] ہوئے دانتوں پر چونٹی مارنے لگا۔ [illegible] آنکھ سے اندر بیٹھی دونوں عورتوں کو بھی دیکھ رہا تھا۔

"جیسے میں نے کہا کہ سیلیا جذباتی تھی۔" نینسی نے بات آگے بڑھائی۔ "مگر وہ معصوم عورتوں میں سے بھی تھی۔ سے بھی سل پر شک نہیں ہوا تھا اور جب اس نے بیکی کے لیے اپنے جذبات کا اعتراف کیا تو وہ ٹوٹ سی گئی۔ اس نے یہ اعتراف ایک صبح تب کیا جب ان کے بچوں کو اسکول بس لے گئی تھی۔

"اس کے بعد ہمیں جو پتا چلا، وہ یہ تھا کہ سیلیا نے اسے دھکے دیتے ہوئے سامنے کے لان تک نکالا اور اس کے کپڑوں کا ایک گٹھا گھاس پر پھینک دیا۔ سیلیا چیخ رہی تھی، اسے ہر وہ نام دے رہی تھی جو تم سوچ سکتی ہو اور ساتھ ہی پھوٹ پھوٹ کر رو بھی رہی تھی۔ محلے کے آدھے گھروں نے اس کی چیخیں سنیں...... اور لوگ یہ دیکھنے کے لیے باہر نکل آئے کہ آخر ہو کیا رہا ہے...... سب لوگ...... سوائے بیکی کے۔

"سل نے اپنے چند کپڑے سمیٹے اور اپنی گاڑی کی طرف دوڑا اور وہاں سے نکل گیا۔ میں نے اس کے گالوں پر خاصے گہرے خراشوں کے نشان دیکھے تھے۔ وہ خوش قسمت تھا کہ سیلیا نے اس کی آنکھوں پر حملہ نہیں کیا۔ ان کی شادی کو چودہ سال ہو چکے تھے۔ ان کی بیٹی دس سال کی تھی اور بیٹا بارہ کا۔ تم اندازہ لگا سکتی ہو کہ جب وہ بچے گھر لوٹے ہوں گے تو ان پر کیا گزری ہوگی...... ایک لمحے میں ان کی پوری دنیا بدل گئی۔"

"کتنا گھٹیا آدمی ہے۔" میگن نے زیرِلب کہا۔ اسے اپنا شوہر اور بچے یاد آئے، پھر فوراً بولی۔ "میں اونچی آواز میں نہیں کہنا چاہتی تھی۔"

"فکر نہ کرو۔" نینسی نے کہا۔ "یہ کوئی ایسی بات نہیں جو میں نے خود نہ کہی ہو...... اور نہ کہی ہو۔"

کچھ لمحوں کی خاموشی کے بعد نینسی نے دوبارہ بات شروع کی۔ "مگر وہ بات درست نہیں تھی۔"

"کیا؟" میگن کے چہرے پر حیرت پھیل گئی۔

"آپ کیا کہنا چاہ رہی ہیں؟"

"میرا مطلب یہ ہے کہ سل، بیکی کو چاہتا تھا...... شاید واقعی میں محبت بھی کرتا تھا...... مگر ان کے درمیان کوئی تعلق نہیں تھا۔ تاہم یہ سب سیلیا کا اندازہ تھا۔ بیکی نے تو بس اسے استعمال کیا۔"

"آپ مذاق کر رہی ہیں۔" میگن بول اٹھی۔ "یعنی

اس نے ایک ایسی عورت کے لیے اپنی شادی اور خاندان توڑ دیا جس کے بارے اس کا [illegible] نہیں تھا؟"

"ہاں۔ بات کچھ یوں ہی تھی۔"

"ایک منٹ ٹھہریں۔" میگن نے کہا۔ "کیا سل کا مائیک کی موت سے کوئی تعلق تھا؟ کیا آپ اسی طرف اشارہ کر رہی ہیں؟ کیا اس لیے بیکی نے اسے امید دلائے رکھی؟"

"ایک طرح سے۔ میرا خیال ہے وہ ہالووین معاملہ اُلجھانے کے لیے تھا۔ بیکی نے یہ بات یقینی بنائی کہ سب کو معلوم ہو کہ جب وہ بچوں کو پارٹی میں لانے کے لیے مائیک کو چھوڑ کر گئی تو وہ زندہ تھا اور اتنا ہوش میں بھی کہ اس سے بات کر سکا۔ اس کے مطابق مائیک نے اسے کہا تھا کہ اچھا وقت گزارے اور سب کو ہالووین کی مبارک باد دے۔ ان دس یا پندرہ منٹوں میں جب اس نے یہ الفاظ کہے اور سل ان کے گھر پہنچا تاکہ مائیک کی دیکھ بھال کرے..... تو مائیک مرگیا۔"

"مجھے مائیک کا 'ہیپی ہالووین' کہنا عجیب لگا۔"

"عجیب...... کیسے؟" میگن نے پوچھا۔

"وہ ہالووین کو پسند نہیں کرتا تھا، اس کے خلاف تھا۔ مائیک پختہ عقائد کا مالک تھا اور وہ سمجھتا تھا کہ یہ سب شیطانی ہے۔ وہ پہلی ہالووین پارٹی تھی جس میں بیکی اور اس کے بچوں نے شرکت کی۔ یہ بات بھی مجھے بہت عجیب لگی، خاص طور پر اس حالت میں کہ مائیک گھر میں بسترِ مرگ پر تھا۔ میں نے دل میں سوچا۔

'اس نے ہی کچھ کیا ہے..... یہ انتظار کرتے کرتے تھک چکی ہے۔'

"تو کیا بیکی نے اسے مارا؟" میگن نے پوچھا۔ "کیا آپ یہی سمجھتی ہیں؟"

"نہیں، اس نے خود نہیں کیا۔"

"تو آپ کے خیال میں یہ کام سل نے اس کے لیے کیا؟"

"شروع میں مجھے یہی لگا تھا لیکن اگر تم سل کو جانتیں تو تمہیں بھی لگتا کہ اس میں ایسا کرنے کی ہمت نہیں تھی۔ سل میں کوئی جارحیت یا تشدّد نہیں تھا، یہاں تک کہ سیلیا نے بھی کبھی اس پر ایسا الزام نہیں لگایا۔"

میگن نے سر ہلایا۔ "پھر کون اور کیسے؟ آپ نے کہا تھا کہ پولیس کبھی شامل ہی نہیں ہوئی۔"

"نہیں ہوئی۔" نینسی نے کہا۔ "مائیک ہاسپس کا مریض تھا، ڈاکٹر کی نگرانی میں اور اس کے جسم پر ایسی کوئی واضح علامت نہیں تھی سوائے اس کے کہ اس کی سانس رک گئی اور وہ مرگیا۔ اسی رات مردہ خانے والے لاش لے

۔ اور آگلی پارٹی نے اسے اس سے زیادہ [illegible] کیا۔"

لیکن میگن نے [illegible]

[illegible] اسے اُلجھا ہوا اطمینان سے جا [illegible] تھا۔ نینسی کی کہانی نے اسے اُلجھا دیا تھا اور وہ [illegible] بھی محسوس کر رہی تھی۔ وہ تو امید لگائے بیٹھی تھی۔ شاید پڑوسیوں سے ملنے کے بعد اس کے دل کا بوجھ ہلکا ہو جائے گا مگر یہ ملاقات اسے مزید الجھا [illegible] تھی۔ آخرکار اس نے کہا۔

"مگر مجھے واقعی سمجھ نہیں آرہا نینسی کہ آپ کو یقین کیوں ہے کہ آپ کے پڑوسی کا قتل ہوا تھا، یا یہ سب کیسے ہوا؟"

"نہیں۔" نینسی نے اثبات میں کہا۔ "مجھے بھی کبھی پوری طرح سمجھ نہیں آیا۔ واقعی نہیں۔" وہ شرمندہ سی مسکراہٹ کے ساتھ اپنی مہمان کی طرف دیکھنے لگی۔ "اب مزید گپ شپ نہیں۔" اس نے میز سے کرسی پیچھے کی، گویا گفتگو ختم کرنے کا اشارہ ہو۔ میگن بھی کھڑی ہوگئی۔

"کافی کے لیے شکریہ۔" اس نے کہا۔ "آپ سے مل کر اچھا لگا نینسی! کبھی آپ ہمارے ہاں آئیں۔ شاید آپ مجھے مکمل کہانی بھی سنا دیں۔"

"شاید۔" نینسی نے جواب دیا۔ "مجھے تمہارے خاندان سے مل کر خوشی ہوگی۔"

میگن نے محسوس کیا کہ ان کی حرکت سے کارڈینل ڈر کر اُڑ گیا تھا اور ٹرے اپنی باریک زنجیروں پر جھول رہی تھی۔ جب وہ ڈرائنگ روم سے گزرتے ہوئے سامنے کے دروازے کی طرف جارہی تھیں تو میگن کی نظر دیواروں پر لگی اور شیلفوں پر رکھی تصویروں پر پڑی۔ ہر تصویر میں مسکراتے، ہنستے بچے، نوعمر لڑکے لڑکیاں، جوان لوگ اور ان کے خاندان دکھائی دے رہے تھے۔

"جلدی پھر آنا۔" جب میگن ڈرائیو وے سے نیچے کی طرف جانے لگی تو نینسی نے آواز دی۔

اس رات میگن ٹھیک سے سو نہیں سکی۔ ساڑھے پانچ بجے وہ جاگ اٹھی اور صبح کی مدھم روشنی میں اپنے سوتے ہوئے شوہر کو دیکھنے لگی۔ اس کا دل جیسے کانوں میں دھڑک رہا تھا۔ اسی دن بعد میں جب ڈاک گاڑی اس کے میل باکس کے پاس رکی تو اس نے جلدی سے سویٹر پہنا اور اپنی ماں کو آواز دی۔

"مام! ذرا لڑکوں پر نظر رکھیں، میں ڈاک لینے جارہی ہوں، شاید چند منٹ لگ جائیں۔"

اور وہ تیزی سے دروازے سے باہر نکل گئی۔ وہ

جانتی تھی کہ نینسی ہمیشہ وقت پر اپنی ڈاک لینے آتی ہے اور وہ اس موقع کو گنوانا نہیں چاہتی تھی۔

بلوں اور اشتہاری پرچوں کا گٹھا ہاتھ میں لیے میگن نے بوڑھی عورت کو ہاتھ ہلا کر ہائے کیا۔ جواب کا انتظار کیے بغیر وہ اس کے پاس چلی گئی۔

''صبح بخیر نینسی! آپ کیسی ہیں آج؟''

نینسی نے موسم سے زیادہ بھاری کوٹ پہن رکھا تھا اور میگن کو اپنی طرف آتا دیکھ کر وہ چونک سی گئی۔ ''اوہ...... ہیلو!''

اس نے رسالوں اور اشتہارات کے بنڈل کو اس طرح سینے سے لگالیا جیسے وہ اس کے اور نوجوان پڑوسن کے درمیان ایک ڈھال ہو۔

''نینسی!'' میگن نے تمہید کے بغیر کہنا شروع کیا۔ ''اگر اس ہالووین کی رات جو ہوا تھا، وہ چار لوگوں کو معلوم تھا۔ ایک بیکی تھی اور دوسرا اس کا شوہر جو مر گیا...... تو باقی دو کون تھے؟ آپ نے کہا تھا کہ سل ایسا کرنے کے قابل نہیں تھا۔ اگر یہ سچ ہے تو پھر شک کس پر جاتا ہے؟ باقی سب تو پارٹی میں موجود تھے، آپ بھی۔''

بوڑھی عورت نے چند لمحے خاموشی سے میگن کو دیکھا۔ اس کے سر کے گرد اس کے سرمئی گھنگرالے بال خزاں کی نم ہوا میں لہرا رہے تھے۔ اس کے پیچھے وہی گھر کھڑا تھا جہاں دہائیوں پہلے ہالووین کی پارٹی ہوئی تھی۔ جگہ جگہ سے اکھڑا ہوا پینٹ، نالیوں میں جھانکتی سبز کونپلیں گزرے وقت کا پتا دے رہی تھیں۔

''اس رات ایک شخص نظروں سے اوجھل رہا تھا۔'' نینسی نے کہا۔ ''زیادہ دیر کے لیے نہیں...... مگر اتنی دیر ضرور۔ یاد ہے نا؟'' یہ کہہ کر نینسی نے میگن کی طرف پیٹھ کرلی۔

''اور وہ شخص تمہارا شوہر تھا، ہے نا؟'' میگن نے ہمت کر کے کہا۔ ''اسی لیے تمہارے گھر میں اس کی کوئی تصویر نہیں ہے۔ وہ بیکی کے آنے سے پہلے شراب لینے اندر گیا تھا اور صرف تب باہر آیا جب سل خبر لے کر واپس آیا۔''

نینسی نے جواب دیا۔ ''اندر آجاؤ۔ میں تمہارے لیے چائے بنا دیتی ہوں۔ آج صبح میں ہڈیوں تک ٹھٹھر رہی ہوں۔''

گھر کے اندر آکر اسی مانوس میز کے گرد بیٹھتے ہی میگن خود کو روک نہ سکی۔

''مگر کیسے اور کیوں...... بل ایسا کیوں کرے گا؟''

نینسی کے ہونٹوں کے گرد جھریاں اور گہری ہوگئیں۔

''کیوں...... تو بالکل صاف ہے۔ اس کا بیکی رالسٹن کے ساتھ معاشقہ چل رہا تھا۔ سل بس توجہ ہٹانے کے لیے تھا۔ بیچارہ، اسے کچھ خبر ہی نہیں تھی۔''

''لیکن تم نے تو کہا تھا کہ بل نے مائیک کی مدد کے لیے جانا چھوڑ دیا تھا؟''

''وہ سب تعلق شروع ہونے کے بعد ہوا تھا۔ اسی لیے اس نے جانا چھوڑ دیا تاکہ مجھے شک نہ ہو۔ وہ رات کی ڈیوٹی کے دوران وہاں جاتا تھا، ایک سادہ سی، بغیر نشان والی گاڑی میں، عام کپڑوں میں، اندھیرے کے بعد۔ اس وقت لوگوں کی آمدورفت اتنی نہیں ہوتی تھی اس لیے کسی نے خاص دھیان ہی نہیں دیا اور اگر دیا بھی تو مجھے کسی نے کچھ نہیں بتایا۔ بتاتے بھی کیوں؟ میں اس وقت کئی ماہ کی حاملہ تھی۔''

میگن نے اس سوال کو نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔ ''تمہارا مطلب ہے کہ وہ اسی گھر میں مل رہے تھے جہاں بیکی کا شوہر مر رہا تھا؟ وہ واقعی......'' وہ جملہ مکمل نہ کرسکی۔

''ہاں۔'' نینسی نے آہستہ سے کہا۔ ''کئی بار۔''

''تمہیں کیسے پتا چلا...... تمہیں یقین کیسے ہوا؟''

''ہالووین پارٹی کے بعد کی بات ہے۔ بل، بیکی کے گھر سے لوٹا تو گھر میں سونے کی تیاری ہو رہی تھی۔ میں بچوں کو سلانے کے بعد باتھ روم میں داخل ہوئی تو ایک لمحے کے لیے جو منظر میری آنکھوں کے سامنے آیا، اس نے مجھے چونکا دیا۔ بل آئینے کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ہائیڈروجن پرآکسائڈ کی بوتل تھی اور وہ بڑی احتیاط سے اپنے بازوؤں پر لگے زخم صاف کر رہا تھا۔ یہ سیدھے کٹ نہیں تھے بلکہ ناخنوں سے پڑی ہوئی، مڑی ہوئی خراشیں تھیں۔ میں نے بس ایک جھلک دیکھی کیونکہ جیسے ہی اس کی نظر مجھ پر پڑی، وہ چونک گیا اور فوراً آستینیں نیچے کھینچ لیں۔ مجھے اس وقت کچھ سمجھ نہ آیا۔ میں تو بالکل بے خبر تھی۔ میں سیدھی اس کے پاس گئی اور اس کی ایک آستین اوپر اٹھالی۔''

''یہ زخم تمہیں کیسے لگے؟'' میں نے پوچھا۔ وہ ذرا سنبھل کر بولا۔

''کچھ نہیں، بس ایک ملزم سے ہلکی سی ہاتھا پائی ہوگئی تھی۔ وہ ہتھکڑی لگوانا نہیں چاہتا تھا۔''

''لیکن میں جانتی تھی کہ وہ سچ نہیں بول رہا۔ کچھ زخموں سے اب بھی خون رس رہا تھا اور وہ تو چار بجے سے گھر پر تھا۔ اگر یہ واقعی ڈیوٹی کے دوران ہوا ہوتا تو اب تک زخم تازہ نہ ہوتے۔ ایک لمحے کو خیال آیا کہ شاید کسی اور عورت کا معاملہ ہے مگر فوراً ہی یہ خیال بھی مسترد کردیا۔ یہ خراشیں غلط جگہ پر تھیں۔ یہ کسی محبت بھرے لمس کی نشانیاں نہیں تھیں۔ یہ کسی ایسے انسان کے ناخنوں کے نشان تھے جو بے بسی میں

اپنی جان بچانے کی کوشش کر رہا ہو۔"

نینسی نے مہمان کے سامنے چائے رکھ دی پھر خود بھی بیٹھ گئی۔

"چینی اور دودھ رکھے ہیں۔"

"نہیں شکریہ۔"

"اس رات مجھے بالکل نیند نہیں آئی۔ سوتی جاگتی کیفیت میں کروٹیں بدلتی رہی۔ پچھلی شام کے ٹکڑے میرے ذہن میں بار بار اپنی جگہ بدل رہے تھے۔ بیکی کی اچانک اور سب کی توجہ کھینچ لینے والی آمد، بل کا ایک ایسے کام کے لیے دیر تک غائب رہنا جو پانچ منٹ میں ہو جانا چاہیے تھا، سل کا مائیک کی نگرانی کے لیے بھیجا جانا اور آخر میں...... وہ منظر جو میں نے دیکھا نہیں تھا مگر اب پوری طرح تصور کر سکتی تھی۔

"میرا شوہر، مائیک کے بستر کے پاس کھڑا اس کے چہرے کو تکیے سے دبائے ہوئے، مائیک اپنی جان بچانے کے لیے تڑپتا ہوا، اپنے بڑھے ہوئے ناخن میرے شوہر کے بازوؤں میں گاڑتا ہوا...... وہ مائیک جو محض ایک ڈھانچا رہ گیا تھا، بلی کے بچے جتنا کمزور۔"

اس تصور سے میگن کے بدن میں سنسنی دوڑ گئی مگر اس نے پھر بھی پوچھا۔ "لیکن یہ کیسے ممکن ہے کہ کسی نے دیکھا ہی نہ ہو؟ آپ نے کبھی یہ نہیں سوچا کہ اتنے لوگ آس پاس ہونے کے باوجود وہ بیکی کے گھر کیسے گیا؟"

"میں نے یہ بھی سوچا تھا، بات بہت سادہ تھی۔ شام کا وقت تھا اور سب لوگ ہمارے فرنٹ یارڈ میں تھے۔ بل بس ہمارے پچھلے دروازے سے باہر نکلا اور لان کے پار رالسٹن کے گھر چلا گیا۔ یقیناً بیکی نے دروازہ کھلا چھوڑا ہوا تھا یا پھر اس کے پاس پہلے سے چابی تھی۔ چند منٹ ہی لگے اور پھر وہ اسی راستے سے واپس آ گیا۔ ویسے بھی کوئی نہیں دیکھ رہا تھا اور اس وقت گھروں میں سیکیورٹی کیمرے زیادہ استعمال نہیں ہوتے تھے۔

"جب بل جاگا، میں بستر پر بیٹھی اسے دیکھ رہی تھی۔ میں خود پر قابو نہیں رکھ پائی۔ کیا وہ واقعی اس حد تک جا سکتا ہے؟ یہ سوال میرے اندر چیخ رہا تھا۔ کیا وہ کسی دوسرے انسان کی جان لے سکتا ہے؟

میں نے اس کی آستین اوپر کی اور اس کے بازوؤں پر پڑے زخم دکھائے۔ "مائیک جینا چاہتا تھا بل۔ اپنے بازو دیکھو اور مجھے بتاؤ کہ کیا وہ نہیں جینا چاہتا تھا؟"

وہ بستر پر لیٹا مجھے گھور رہا تھا...... بالکل ایسے کسی ملزم کی طرح ذہن سے تفتیش کی جا رہی ہو...... [illegible] جو ناتھن نے ایک قصہ سنایا تھا۔

پھر وہ دوبارہ کہنے لگا۔ [illegible] لیا۔ "مجھے معاف کر دو نینسی! [illegible] جو کیا اس پر مجھے شرمندگی ہے۔ تم [illegible]"

"وہ اتنی زور سے [illegible] رہا تھا [illegible] کہ [illegible]۔ مائیک نے [illegible] کے بالوں پر ہاتھ پھیرنے کی [illegible]۔ اچانک مجھے احساس ہوا کہ مائیک کیا کر رہا ہے۔ میں نے اسے خود سے دور دھکیل دیا اور پوری قوت سے تھپڑ مارا۔ آخر اس نے ایک عورت کی خاطر ایک آدمی کو قتل کیا تھا۔ وہ تھپڑ اسے ہوش میں لے آیا اور اس کے داڑھی والے گال پر ہاتھ کے نشان ابھر آئے۔ وہ بستر پر بیٹھا غصے سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے کی سختی اور آنکھوں کی چمک سے سب کچھ نمایاں تھا۔ پھر اس نے نہایت سرد آواز میں کہا۔

"اگر تم نے کسی کو بتایا، خاص طور پر مجھے میں تو مجھ سے تفتیش ہوگی نینسی...... اور اگر مجھ پر فردِ جرم عائد ہوئی تو تمہیں عدالت میں میرے خلاف گواہی دینا پڑے گی۔ کیا تم خود کو ایسا کرتے ہوئے تصور کر سکتی ہو؟ بچے ایک دن یہ سب سنیں گے اور اس کے ساتھ جئیں گے۔"

وہ بستر سے اٹھا اور میرے سامنے کھڑا ہو گیا۔ "اور اگر مجھے سزا ہو گئی تو ہم سب کچھ کھو دیں گے۔ میری نوکری، تنخواہ، مراعات، پنشن، یہ گھر۔ ذرا سوچو نینسی! بچوں کے بارے میں سوچو۔ کیا تم یہی چاہتی ہو؟"

پھر اس کے چہرے پر نرمی آ گئی۔ اس نے میرے کندھوں کو تھام لیا۔ "میرا اور بیکی کا قصہ ختم ہو چکا ہے۔ جو میں نے کیا، اس کے بعد مجھے سمجھ آ گیا کہ یہ سب ایک بہت بڑی غلطی تھی۔ میں نے کیسے کسی ایسی عورت کی پروا کی؟ مجھے بہت افسوس ہے نینسی...... ہر بات پر، مجھے معاف کر دو۔ مجھے ایک موقع دو کہ میں سب کچھ درست کر سکوں۔"

"کیا تم نے اسے معاف کر دیا تھا؟" میگن نے آہستہ سے پوچھا۔

نگاہ اٹھائے بغیر نینسی نے جواب دیا۔ "مجھے شرم آتی ہے یہ کہتے ہوئے مگر ہاں، میں چپ رہی لیکن وہ جھوٹ بول رہا تھا۔ چھ ماہ بعد وہ اور بیکی شہر کے دوسری طرف ایک کرائے کے گھر میں اکٹھے رہنے لگے تھے۔ سنا ہے بیکی نے یہاں والا گھر بیچ کر خوب پیسا بنایا اور اس کے علاوہ ایک

بہت بڑی انشورنس پالیسی کی رقم بھی وصول کی۔“

”تو پھر تمہاری طلاق ہوگئی اور اس نے دوبارہ شادی کرلی؟“

”ہاں، طلاق ہوگئی لیکن میں نے یہ ضرور یقینی بنایا کہ سمجھوتے میں مجھے اس کی پنشن کا آدھا حصہ ملے اور بچوں کا ہیلتھ کیئر پلان اور خرچہ ہمیشہ برقرار رہے۔“

پھر اس نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ دوبارہ سر اٹھایا۔ ”لیکن اس نے دوبارہ شادی نہیں کی۔ بیکی نے ایک سال سے بھی کم عرصے میں بل کو چھوڑ دیا اور ایک عمر رسیدہ آدمی سے شادی کرلی..... اسی ڈاکٹر سے جو اس کے شوہر کا علاج کررہا تھا۔“

”تم سنجیدہ تو نہیں ہو؟“ میگن نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔

نینسی نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”ہاں۔ جب مجھے خبر ملی تو میں نے اس اچھے ڈاکٹر کو تعزیتی کارڈ بھیجا تھا۔ وہ شاید مجھے پاگل سمجھا ہو مگر مجھے پورا یقین ہے کہ بیکی کو یہ بات بالکل بھی پسند نہیں آئی ہوگی۔“

میگن اس پر ہنس پڑی پھر بولی۔ ”تو تم نے یہ سب برسوں اپنے دل میں ہی دبائے رکھا؟“

”اور میں کر بھی کیا سکتی تھی؟“ نینسی نے کہا۔ ”بل ٹھیک کہتا تھا، مجھے بچوں کے بارے میں سوچنا تھا۔“

”یعنی اس نے دو خاندان برباد کیے اور اپنے شوہر کو قتل کروادیا۔ اس کے علاوہ محلے کی ہر عورت کے دل میں خوف بھی بٹھادیا۔ ناقابلِ یقین..... وہ اب کہاں ہے؟“

”آخری بار میں نے یہ سنا تھا کہ وہ ڈاکٹر ایک رات پیر پھسلنے کی وجہ سے اپنے ہی سوئمنگ پول میں گر کر ڈوب گیا۔ اس کی موت کے بعد اس نے سب کچھ بیکی کے نام چھوڑا اور وہ فلوریڈا چلی گئی۔ اس کے بعد میں نے اس کے بارے میں کچھ نہیں سنا۔ ممکن ہے اب وہ مرچکی ہو۔ امید ہے ایسا ہی ہو۔“ نینسی نے بات جاری رکھی۔ ”تم کسی کو کچھ نہیں بتاؤ گی نا؟ قتل پر کوئی میعاد ختم نہیں ہوتی، تم جانتی ہو اور اگرچہ بچے اب بڑے ہوچکے ہیں لیکن اگر انہیں اپنے باپ کے کیے کا علم ہوا تو وہ ٹوٹ جائیں گے۔“

”بالکل نہیں بتاؤں گی۔“ میگن نے کہا۔ ”لیکن میرا ایک آخری سوال ہے۔“

”کیا؟“ نینسی نے محتاط لہجے میں پوچھا۔

”اب اس خبیث بیکی کے گھر میں کون رہتا ہے؟“

نینسی نے چند لمحے میگن کو گھورا پھر بولی۔ ”کوئی بھی وہاں زیادہ عرصہ نہیں ٹکتا۔ مائیک اور بیکی کے بعد اب تک کم از کم پانچ بار وہ گھر بک چکا ہے اور ہر بار علیحدگیاں، طلاقیں۔ وہ ایسا گھر ہے جہاں لوگ اور خاندان نہ پنپ سکیں۔ وہ آلودہ ہوچکا ہے میگن!“

”آلودہ؟“ میگن نے دہراتے ہوئے کہا۔ بات کچھ سمجھ میں نہیں آئی۔ پھر اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ اس کے ہاتھ سے مگ میز پر جا لگا اور تھوڑی سی چائے چھلک گئی۔

”تم مذاق کررہی ہو؟ خدا کے لیے کہو تم مذاق کررہی ہو نینسی!“

نینسی نے اپنا رگوں سے بھرا ہوا ہاتھ اس کی طرف بڑھایا اور کہا۔ ”میں نے خود سے وعدہ کیا تھا کہ یہ بات تمہیں تب تک نہیں بتاؤں گی جب تک تم دوبارہ نہ آؤ...... اور تم آگئیں۔ تم مجھے خوش لگتی ہو میگن...... اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ محبت بھری زندگی گزارتی ہوئی۔ میں نے یہ سب تمہیں اسی لیے بتایا تاکہ تم اور تمہارا خاندان اسی طرح خوش رہے۔“

میگن نے اس کے لمس سے بچنے کے لیے کرسی پیچھے سرکائی اور کھڑی ہوگئی۔

”چائے کا شکریہ نینسی! مگر کاش تم نے مجھے یہ سب کبھی نہ بتایا ہوتا۔ مجھے لگتا ہے جو تم نے کیا، وہ ظالمانہ تھا اور سچ کہوں تو مجھے سمجھ نہیں آرہا کہ کیا سوچوں۔ مجھے یہاں سے نکلنا ہے۔“

میگن اس بوسیدہ، دم توڑتے ہوئے گھر سے لڑکھڑاتی ہوئی باہر نکلی اور خاموش گلی میں آگئی۔ اپنے گھر کی طرف تیزی سے بڑھتے ہوئے اس کی نظر ڈرائیو وے میں کھڑی مارٹن کی بغیر نشان والی گاڑی پر پڑی۔ اسے حیرت نہیں ہوئی۔ وہ اکثر آس پاس ہونے پر آجاتا تھا۔ وہ ایک محبت کرنے والا، خیال رکھنے والا انسان تھا اور میگن اور اس کے چھوٹے بیٹے اس سے بے حد قریب تھے۔

وہ رک گئی، سانس پھول رہا تھا۔ اس نے لاشعوری طور پر اپنے ابھرتے پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اپنے نئے گھر کے سادہ، پُرسکون منظر کو غور سے دیکھا۔ ذہن میں خیالات کا طوفان تھا۔ چند منٹ گزر گئے پھر اس نے گہری، کپکپاتی سانس لی، سویٹر کو اپنے گرد مضبوطی سے لپیٹا اور تیزی سے اپنے خاندان کے پاس اندر چلی گئی۔

اور کچھ دن بعد جب میگن کے لان میں رئیل اسٹیٹ ایجنٹ کا ”برائے فروخت“ والا بورڈ لگا تو نینسی مسکرادی۔

⌘⌘⌘

محفلِ شعر و سخن

❁ آصف علی......راولپنڈی

کیسے سنبھال رکھی ہے تونے یہ کائنات
ہم سے تو اک دل بھی سنبھالا نہ جاسکا

❁ عیوق بخاری......ساؤتھ پنجاب

کتنا اچھا ہوگیا ہے جیون میں
جب سے سوچوں کا دھارا موڑا ہے
کچھ بھی نہیں ٹوٹتا قسم سے
جب سے سپنے دیکھنا چھوڑا ہے

❁ فردوس کمال......مظفرگڑھ

کوئی منظر ، کوئی چہرہ ، کوئی لمحہ ، کوئی غم
کچھ بھی ہوسکتا ہے تیرے یاد آنے کا سبب

❁ شگفتہ نور......ٹنڈو آدم

غم کی بارش کیسے ٹوٹ کے برسی ہے
دل کے دشت میں ہر جانب ہریالی ہے

❁ بدر سلطان......ساہیوال

جو روز ایک نئی صبح لے کے آتے تھے
چلے گئے وہ کہاں ماہ و سال پوچھنا ہے

❁ نیر نازلی......سیالکوٹ

گلیوں میں آوارہ ہوں تو گھر کی یاد ستاتی ہے
گھر آئیں تو کاٹنے لگتا ہے ہم کو گھر ہونا بھی

❁ ملک منیر......لاہور

بام پر آج تمہیں دیکھ کے محسوس ہوا
جیسے ترکش کے نہیں تیر کماں کے تم ہو

❁ ضیا عدیل......خوشاب

جتنی شکایتیں تھیں سو تھیں اپنے آپ سے
بستی میں اختلاف ہمیں کب کسی سے تھا

❁ ام ہانی......کراچی

پڑھے فاتحہ کوئی آئے کیوں، کوئی چار پھول چڑھائے کیوں
کوئی آکے شمع جلائے کیوں، میں وہ بے کسی کا مزار ہوں

❁ تبسم شکیل......کراچی

دیکھ اے دل تو نہ پی جامِ محبت کی شراب
بے مزہ ہووے گا جس وقت خمار آوے گا

❁ ناہید اختر......ملتان

ہے عشق کی منزل میں یہ حال اپنا کہ جیسے
لٹ جائے کہیں راہ میں سامان کسی کا

❁ ارم کاشف......ملتان

جو زہر پی چکا ہوں تمہی نے مجھے دیا
اب تم تو زندگی کی دعائیں مجھے نہ دو
ایسا نہ ہو کبھی کہ پلٹ کر نہ آسکوں
ہر بار دور جاکے صدائیں مجھے نہ دو

❁ انعم کمال......حیدرآباد

بے وفا تجھ سے شکایت ہے ستم کی بے جا
کیجیے اس سے کہ جو آگاہ وفا سے کچھ ہو

❁ دلاور خان......مانسہرہ

ان حسرتوں سے کہہ دو کہیں اور جا بسیں
اتنی جگہ کہاں ہے دلِ داغ دار میں

❁ ردا جاوید......بٹل ہزارہ

مجھے نہ سوچ کہ میں ہوں بکھرتا بنتا خواب
مجھے نہ دیکھ کہ اک نقشِ رائگاں ہوں میں
مجھے نہ ڈھونڈ کہ میں ہوں گزرتا اک لمحہ
ابھی تو ''ہونے نہ ہونے'' کے درمیاں ہوں میں

❁ ولید رضا......ساہیوال

جس طرح سے خواب اپنے اندھیروں سے لے لیے ہیں
لے لیں گے یونہی اپنی سحر بھی کبھی شب سے

❁ عظیم احمد......جھنگ سٹی

میں مہکتا ہوں تری خوشبو سے
خود کو تو بھول گئی ہے مجھ میں
کتنا شفاف تھا منظر میرا
کس قدر دھول اڑی ہے مجھ میں

❁ حنظلہ شاہد......سکھر

ناامیدی ہے دیدنی اس کی
جس کو اپنا بھی انتظار نہ ہو

❁ نوشتہ گلزار......سکھر

سر اٹھاتی ہے خواہش تعمیر
جب بھی گرتے مکاں کو دیکھتا ہوں

❁ طاہر مجاہد......پھالیہ

یونہی اک روز بکھر جاؤ گے
یونہی گر اپنے سے شرمندہ رہے

❁ ناصر حسین......روہڑی

شکستہ پر ہے ابھی فلسفہ اسیروں کا
قفس کو توڑ کے نکلے تو زیرِ دام آئے
سمجھ میں آ نہ سکا یہ طلسمِ لیل و نہار
کہ دن طلوع نہ ہو پائے اور شام آئے

❁ میمونہ عزیز......کراچی

ہزاروں ڈوبتے تھے بہاروں کے سہاروں پر
ہزاروں ڈوبنے والے سہاروں کو بھی لے ڈوبے
بھنور میں ڈوب کر ابھرے شکستہ کشتیوں والے
مگر تقدیر کے مارے کناروں کو بھی لے ڈوبے

❁ منیر شگفتہ......وہاڑی

لہو میں سرسراتی آہٹوں کے پھول کھلتے ہیں
یہ لگتا ہے نئی دنیا کی اب تشکیل ممکن ہے

❁ جنید ملک......کراچی

نہ جانے آئی ہے کیسی یہ مجھ میں تبدیلی
کہ بات کرنے کو مجھ سے مچل رہا ہے کوئی

❁ منظور حسین......خانپور

ہم نے کتنے ہی چاند چھوڑ دیے
دل کے بس ایک داغ کی خاطر

❁ عالیہ خان......مظفرآباد

وہ کب کا سامنے بھی آچکا ہے
مگر محوِ سفر حیرت ہے میری

❁ بشریٰ کرن......سوات

اس سے آسان نہ تھی رسمِ تعارف بھی مگر
بات کو آگے بڑھانے میں بہت دیر لگی

❁ دانش عمیر......حیدرآباد

سائے سمٹیں گے کہ ظلمت پر کوئی آنچ نہ آئے
تیرگی چاہے گی ، لیکن نہ اماں پائے گی
سینۂ سنگ کی حدت سے کھلیں گے گلزار
اتنی شدت سے زمانے میں بہار آئے گی

❁ شوکت جاوید......چکوال

کبھی کبھی تو یقیں سے بھی کوئی بات کرو
ہر اک مقام پہ کرتے نہیں ہیں اندازہ

❁ صابر شاہ......خانیوال

آخر آخر ایسا ہوا کہ تیرا نام بھی بھول گئے
اوّل اوّل عشق میں جاناں ہم کتنے جوشیلے تھے

❁ طارق اسماعیل......ہری پور

شریکِ بزم بہت سے حسین لوگ بھی تھے
نہ جانے کیوں ہمیں چہرہ ترا پسند آیا

❁ محمد نواز......ضلع اٹک

تعبیر کی سحر نہ کبھی مل سکی ہمیں
آئے تھے خواب آنکھوں میں کیا کیا لیے ہوئے

❁ قاسم مجید......لاڑکانہ

شبِ وعدہ ابھی تک ختم ہونے میں نہیں آئی
کہ برسوں سے مسلسل ایک آہٹ سن رہا ہوں میں
خدا کا شکر ، احساسِ زمیں مرنے نہیں پایا
ستارے چننے نکلا تھا ، شرارے چن رہا ہوں میں

❁ اسما خان......مری

تم کو اس وقت بھی معلوم نہیں ہے شاید
کہ زمانہ تو بہت دور نکل آیا ہے
آج سلجھائے گی جمہور کی آواز اسے
تم نے تاریخ میں جس بات کو الجھایا ہے

❁ دیدار علی...... چکوال

ایک موہوم ثقافت کے علمبردار و
ایک بے رحم صداقت کا گناہ گار ہوں میں
ایک خوابیدہ مشیّت کے پرستار ہو تم
ایک تابندہ حقیقت کا خریدار ہوں میں

❁ سحر خان...... گوجرانوالہ

اس کا سوچا بھی نہ تھا اب کے جو تنہا گزری
وہ قیامت ہی غنیمت تھی جو یکجا گزری
آج کیا دیکھ کے بھر آئی ہیں تیری آنکھیں
ہم پہ اے دوست یہ ساعت تو ہمیشہ گزری

❁ ثنا صادق...... کراچی

آجا کہ ابھی ضبط کا موسم نہیں گزرا
آجا کہ پہاڑوں پہ ابھی برف جمی ہے
خوشبو کے جزیروں سے ستاروں کی حدوں تک
اس شہر میں سب کچھ ہے بس اک تیری کمی ہے

❁ انجم عزیز...... جہلم

شبِ انتظار کی کشمکش یہ نہ پوچھ کیسے سحر ہوئی
کبھی اک چراغ جلادیا کبھی اک چراغ بجھادیا

❁ راحیلہ خان...... کوئٹہ

تصور سے کسی کے میں نے کی ہے گفتگو برسوں
رہی ہے ایک تصویرِ خیالی روبرو برسوں

❁ شکیل احمد...... شیخوپورہ

یوں ان کو بار بار نہ دیکھ اے نگاہِ شوق
دنیا بہت بری ہے کہیں بدگماں نہ ہو

❁ زاہد اکبر...... تلہ گنگ

مرے دل میں تھا کہ کہوں گا یہ مرے دل میں رنج و ملال ہے
وہ جب آگیا مرے سامنے تو نہ رنج تھا، نہ ملال تھا

❁ شفیق احمد...... ٹنڈو آدم

وہ کارواں کہ جو منزل پہ اپنی جا پہنچا
اسی کے پیچھے رواں صورتِ غبار ہوں میں

❁ عافیہ اعوان...... پشاور

اس کی آنکھوں نے خدا جانے کیا کیا جادو
کہ طبیعت مری مائل کبھی ایسی تو نہ تھی

❁ نازش [illegible]...... [illegible]

[illegible]
[illegible]

❁ فوزیہ نواز...... [illegible]

[illegible]
[illegible]

❁ محمد شفیق...... [illegible]

لالہ و گل سے کس دن ہم نے پہنچنے کے دیے
کتنے دن رونا پڑا ہے مسکرانے کے لیے

❁ ہما خان...... نورپور تھل

پیام بر نہ میسر ہوا تو خوب ہوا
زبانِ غیر سے کیا شرحِ آرزو کرتے

❁ شکیلہ حسن...... کوٹلی

سفر ہے شرط، مسافر نواز بہتیرے
ہزارہا شجرِ سایہ دار راہ میں ہے

❁ ایاز آفریدی...... مانسہرہ

فراقِ یار میں دل پہ نہیں معلوم کیا گزری
جو اشک آنکھوں سے آتا ہے سو بے تابانہ آتا ہے

❁ عاصم چودھری...... بستی

طبیعت اور الجھتی ہے بوئے گل سے مری
میں کیا کروں گا جو خاروں نے ساتھ چھوڑ دیا

❁ انیس شیخ...... گوجرانوالہ

غنیمت جان اے دل جنبشِ ابروئے قاتل کو
بڑی معراج ہے تلوار سے مرنا سپاہی کا

❁ عائشہ انصاری...... کراچی

میں اسے شہرت کہوں اپنی کہ رسوائی کہوں
مجھ سے پہلے اس گلی میں میرے افسانے گئے

❁ فرحان سلیم...... بہاولپور

مدت ہوئی کہ ٹوٹ کے رویا نہیں ہوں میں
اس چین کی گھڑی کو بہت دن گزر گئے

❁ طاہر حسین...... ملتان

چلے آتے ہیں بڑھ بڑھ کر، گرے جاتے ہیں مر مر کر
حضورِ شمع پروانوں کی نادانی نہیں جاتی

کوپن
پرانے ستارے
اپریل
2026

[illegible]

نام : --
پتا : --

کچھ لوگ معاشرے میں اپنی عادات وصفات کی وجہ سے لوگوں کی توجہ کا مرکز بنے رہتے ہیں... کسی کو غصہ بہت آتا ہے تو کوئی اپنی نرم مزاجی کی وجہ سے لوگوں میں مقبول ہوتا ہے... لیکن بعض دفعہ لہجے کی کڑواہٹ بھی کام دکھا جاتی ہے... اور مصیبت کے مارے کسی شخص کو فائدہ دے جاتی ہے۔

کڑوی کسیلی باتیں کرنے والی خالہ کی عقلمندی

خالہ کی کڑواہٹ

عتیق بخاری

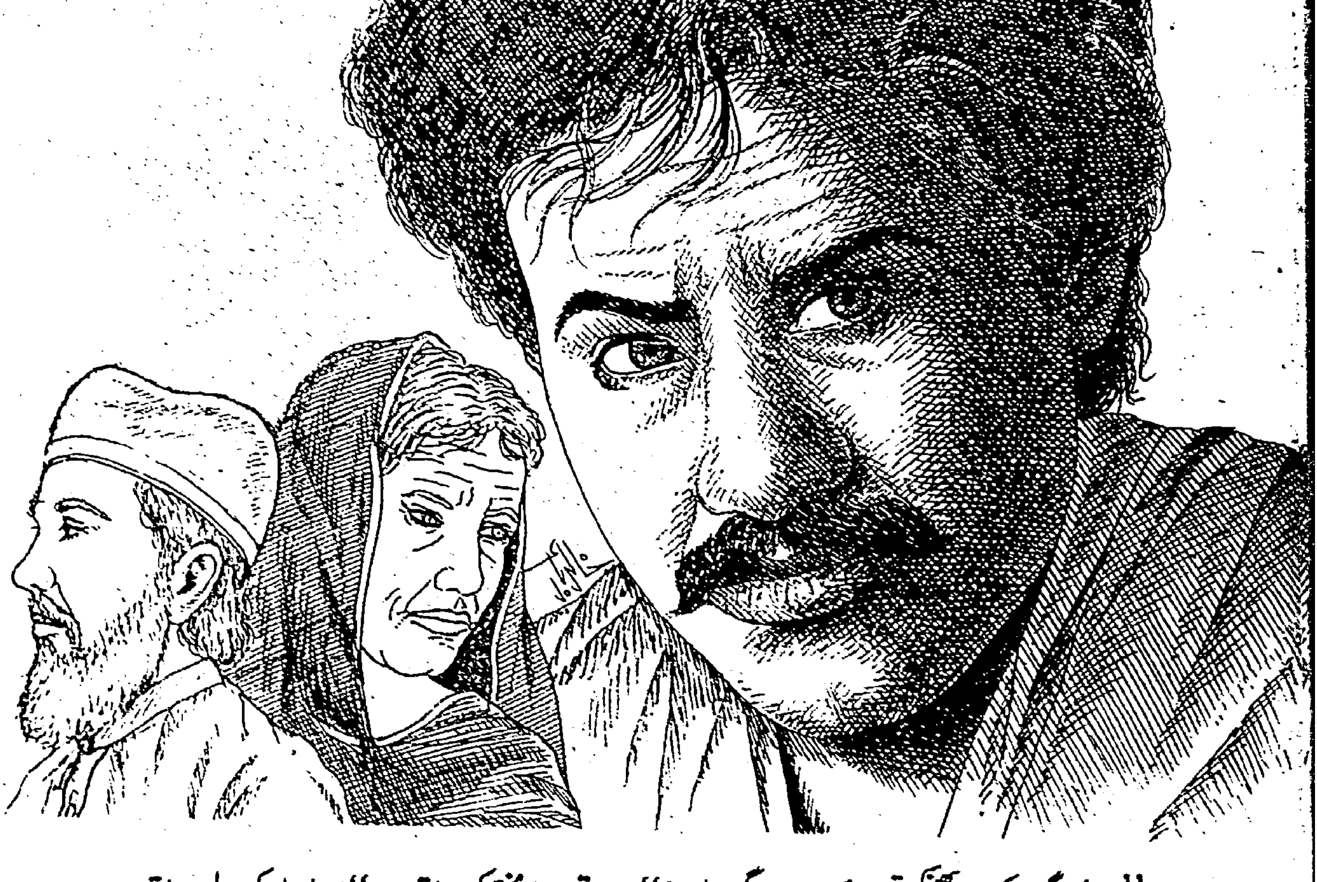

"یہ پھر گیند کیوں پھینکی تم نے میرے گھر میں؟"
صفیہ خالہ نے اونچی آواز میں گھر آئے بچے سے چیخ کر سوال کیا تو وہ بچہ تو سہا ہی، خالہ کو ملنے آئی ہوئی خواتین بھی ہل کر رہ گئیں۔
"خالہ......! وہ انس نے زور سے شاٹ مارا...... میں تو اسے منع کر رہا تھا......" بچہ ڈر ڈر کر بول رہا تھا۔
"میں تو منع کر رہا تھا...... کیا کہہ رہا تھا تو...... آیا بڑا تمیز دار۔ خوب جانتی ہوں میں تم آوارہ گردوں کو۔" خالہ اسی لہجے میں چلا رہی تھیں۔
"یہ کرکٹ کیوں کھیل رہے تھے تم؟" خالہ نے صحن

میں ایک سائز پر رکھے گملوں کے پاس پڑی گیند کو دیکھتے ہوئے تڑک کر پوچھا۔

''وہ... خالہ! ہم سب کو یہ کھیل پسند ہے نا اس لیے۔'' خالہ کی نظروں کے تعاقب میں اپنی گیند کو دیکھتے ہوئے حمزہ نامی بچے نے دھیرے سے کہا۔

''دیکھو ذرا انہیں۔ کھیل بھی وہ پسند ہے جس میں لوگوں کے گھروں کے گملے ٹوٹیں۔ کوئی اور کھیل نہیں کھیل سکتے؟'' حمزہ سے اگلا سوال ہوا۔

''وہ چھٹی تھی نا۔ سب گھروں میں موجود تھے تو سوچا کرکٹ میچ کھیل لیتے ہیں۔'' حمزہ نے گیند اٹھا کر گویا صفائی دی اور تیزی سے باہر نکل گیا۔

''اب دوبارہ گیند نہ آئے نالائقو! ورنہ اس بار شرافت نہیں دکھاؤں گی۔'' باہر نکلتے حمزہ سے خالہ نے چنگھاڑتی آواز میں کہا۔

خالہ صفیہ قصائی کی بیوی تھیں۔ اکثر بچے ان کی عدم موجودگی میں انہیں ''خالہ قصائن'' کہتے تھے۔ یہ نام مذکر، مونث کے حوالے سے نہیں بلکہ خالہ کی چیر پھاڑ والی طبیعت کی وجہ سے پڑا تھا۔

''آپا! اکثر گلی میں کھیلتے بچوں کی گیند آجاتی ہے لیکن میں غصہ نہیں کرتی۔ آخر بچوں نے کھیلنا بھی تو ہے۔ بس، سمجھا دیتی ہوں کہ بیٹا ذرا احتیاط کرنا۔'' جمیلہ بی بی نے ہمت کر کے ذرا سمجھانے کی کوشش کی۔

''ارے تم ہماری گلی کے بچوں کو نہیں جانتیں۔ ناک میں دم کر دیتے ہیں اور مجھے ویسے بھی غصہ زیادہ آتا ہے اس لیے میں تو خوب سنا دیتی ہوں۔ کل تمہارے بھائی (خالہ صفیہ کے شوہر) پر بھی مجھے بہت غصہ آیا تھا۔ دو چار باتوں میں گرما گرمی ہوئی تو کہنے لگا تم ذرا خاموش رہا کرو۔ بس پھر کیا تھا۔ مجھے تو آگ لگ گئی۔ میں اٹھی اور اس کا گریبان پکڑ کر کہا۔ ''تو ہوتا کون ہے مجھ پر حکم چلانے والا۔'' میں نے کالر پکڑ کر ایسا مروڑا کہ اس کے آنے (آنکھیں) باہر آنے لگے۔ سانس رکنے لگا تھا۔'' پاس بیٹھی عورتیں دم سادھے، آنکھیں پھاڑے ''جلالی واقعہ'' سن رہی تھیں۔

''بھائی نے کچھ نہیں کہا کیا؟'' جمیلہ نے بہ مشکل آواز نکال کر پوچھا۔

''اس نے کیا کہنا تھا۔ جانتا ہے میرا غصہ۔ چپ چاپ کھڑا دائیں بائیں دیکھ رہا تھا۔'' خالہ صفیہ نے فخر سے بتایا۔

اتنے میں صفیہ کی بڑی بیٹی پلیٹ میں بھنا ہوا گوشت لے کر آئی۔

''[illegible]'' [illegible]

[illegible]

''[illegible]'' [illegible]

[illegible]

''[illegible]''

''میں تو ابھی کھانا کھا کر آئی ہوں۔ پیٹ میں ذرا سی بھی گنجائش نہیں۔ تمہارا شکریہ۔'' [illegible]

''میرا تو ویسے ہی گوشت سے پرہیز ہے۔ بڑی مہربانی، بس اب چلتے ہیں۔'' کہتے ہوئے آخری خاتون نے چادر اٹھائی اور تینوں خواتین خالہ کے گھر سے باہر نکل گئیں۔

صفیہ خالہ کی بیٹی چرپی والے پیس اٹھاتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ آج نہ جانے کس کی شامت آنے والی ہے۔ خوب گوشت کھانا اور پھر محلے بھر میں دندناتے پھرنا اس کا شوق تھا۔ جو جو اس کے غصے کا شکار ہوتے تھے، وہ کہتے تھے کہ خالہ صفیہ کا کھانا ہی ایسا ہے جس سے اس کا بی پی ہائی ہو جاتا ہے اور پھر شوہر، بچے، محلے والے اور محلے سے ملحقہ بازار کے لوگوں سے ذرا ذرا سی بات پر لڑتی جھگڑتی ہے۔

خالہ اتنی کڑوی اور کسیلی تھیں کہ کڑواہٹ کا لفظ بھی ان کے سامنے چھوٹا لگتا اور آواز اتنی پاٹ دار اور بلند تھی کہ لاؤڈ اسپیکر بھی شرما جائے۔ کسی نہ کسی ہمسائی سے دنگا کرنا، بچوں کو کوسنا ان کا معمول تھا۔ یہ بات زبان زد عام تھی کہ ان کا شوہر ان کی جلالی طبیعت کی وجہ سے ڈرا ڈرا رہتا ہے۔ یعنی باہر والے تو ایک طرف، اپنے بچے اور شوہر ان کے غصے اور لڑاکا پن سے تنگ تھے۔

خالہ کافی ہتھ چھٹ بھی تھیں۔ بیٹیوں کی شادی سے پہلے ان کو اکثر ایک دو ہاتھ جڑ دیتی۔ شادیاں کیں تو دامادوں کی بھی پٹائی ہونے لگی۔

ایک بار کا واقعہ تو بڑا ہی دلچسپ ہے۔ ہوا یوں کہ صفیہ خالہ کی ایک بیٹی فرزانہ نے شادی کے تقریباً چھ ماہ بعد ہی میکے آکر ماں سے ساس کے برے رویے اور شوہر کے ماں کے فرمانبردار ہونے کی شکایت کی۔ وہ صرف چغلی لگا کر ذرا دل ہلکا کرنا چاہتی تھی لیکن صفیہ خالہ نے اس بات کا بتنگڑ بنا لیا اور داماد سے کہا کہ الگ گھر لو یا پھر ہماری بیٹی کو میکے ہی رہنے دو۔ الگ گھر کا اس بے چارے سے بندوبست نہ ہو سکا تو وہ ایک دن بیوی کو منانے آگیا اور کہا کہ اب اس کی ماں بہو سے اچھا سلوک کرے گی۔ میں بھی دھیان رکھوں گا کہ تمہارے ساتھ کچھ برا نہ ہو۔ لڑکی شوہر کے ساتھ جانے کو

تیار ہوگئی کیونکہ وہ تو ناراض ہو کر میکے بیٹھنا نہیں چاہتی تھی۔ خالہ نے فوراً داماد کو گالیوں سے نوازنا شروع کر دیا کہ کیسے میری بچی کو ورغلا رہا ہے۔ پورے محلے کو گرج دار آواز سناتے ہوئے خالہ نے کہا کہ الگ گھر لینے تک لڑکی کے جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

داماد مایوس ہو کر جانے کے لیے کھڑا ہوگیا۔ اتنے میں ایک بچہ محلے سے آیا اور خالہ صفیہ سے کہا کہ آپ کو میری امی بلا رہی ہیں۔ جلدی آئیں، کوئی ضروری کام ہے۔ خالہ گئیں تو خالہ کے بچوں نے بہنوئی سے کہا کہ امی کے باہر جانے سے اچھا موقع ملا ہے۔ تم باجی کو لے جاؤ۔ سب صلح چاہتے تھے۔ لڑکی نے جلدی سے بیگ اٹھایا اور دونوں میاں بیوی تیز قدموں سے بس اسٹاپ کی طرف جانے لگے۔ ادھر یہ ہوا کہ خالہ صفیہ فوراً ہی پڑوس سے گھر واپس آگئیں۔ داماد کے ساتھ ساتھ فرزانہ کو بھی موجود نہ پا کر بچوں سے چیخ کر پوچھا۔ ''کہاں گئی وہ بدبخت؟''

''امی جی! کوئی بات نہیں۔ گھر میں اونچ نیچ ہو ہی جاتی ہے۔ بیٹی کو بٹھائے تھوڑا رکھنا ہے۔ ہم نے ہی کہا تھا......'' بڑے بیٹے نے سمجھانے کی کوشش کی۔

''تیرا تو آ کر قیمہ بناؤں گی۔'' کہہ کر خالہ تقریباً بھاگتی ہوئی بس اسٹاپ کی جانب گئیں۔ ان کا محلہ بازار اور سڑک کے ساتھ ہی تھا۔ بدقسمتی سے بیٹی، داماد کو ابھی تک بس نہیں مل سکی تھی اور وہ بینچ پر بیٹھے تھے۔ خالہ نے انہیں دیکھتے ہی خوب اونچی آواز میں گالیاں دینا شروع کر دیں۔

''کمبخت، کمینی، ماں سے چوری، اس کے ساتھ بھاگ رہی ہے اور یہ بے غیرت کیسے دیدہ دلیری سے میری بیٹی کو لے جا رہا ہے۔ ٹھہرو ذرا، دونوں کی طبیعت صاف کرتی ہوں۔'' شکر ہے سب کو پتا تھا کہ یہ خالہ صفیہ کا داماد اور فرزانہ کا شوہر ہے ورنہ لڑکی پر بھاگنے والی لڑکی کا بدنما داغ لگ جاتا۔

دونوں نے انہیں دیکھتے ہی دوڑ لگا دی۔ آتی بس کو ہاتھ دے کر روکا اور تیزی سے اس میں سوار ہو گئے۔ بس کے چلنے سے پہلے ہی خالہ قریب پہنچ گئیں اور فلموں کے دیسی ولن کی طرح بس میں چڑھ کر کنڈیکٹر کو دھکا دے کر ایک سائڈ پر کیا۔

اسے کون سا حالات کا علم تھا۔ دھکے سے سنبھلتے ہوئے بولا۔ ''او خالہ! رکو تو سہی۔ کہاں جانا ہے؟''

''تیرے باپ کی برات میں جانا ہے۔'' صفیہ خالہ نے سرخ آنکھوں اور لال بھبوکا چہرے کو سامنے کرتے ہوئے کہا تو کنڈیکٹر تھوڑا شرمندہ ہوا اور ڈر کر خاموش ہو گیا۔ اگر وہ ایسا نہ کرتا تو نوازی دا پر تھپڑ قسمت میں لکھا تھا۔

بیٹی اور داماد یوں سہمے بیٹھے تھے جیسے ہیرو، ہیروئن کسی ظالم وحشت گرد یا پ ولن سے ڈر کر بھاگ رہے ہوں۔ خالہ ڈھونڈتے ہوئے ان کے پاس پہنچیں۔ ڈرائیور کو گونج دار آواز میں ابھی گاڑی نہ چلانے کا حکم دیتے ہوئے جوتا اتارا اور داماد پر جوتوں کی بارش کر دی۔

''بے شرم، ماں کے حکم کے غلام، نکھٹو! جب کہا ہے کہ بچی کو نہیں بھیجتا تو پھر کیوں لے آیا ہے اسے؟'' خالہ نے کڑک آواز میں پوچھا اور پھر جوتا رکھ کر داماد کے بال پکڑ کر اسے آگے پیچھے جھٹکتے ہوئے بولیں۔

''ناصر تو جانتا نہیں مجھے؟''

وہ پٹ رہا تھا اور دیگر سواریاں سیٹوں پر سے اٹھ اٹھ کر تماشا دیکھ رہی تھیں۔ داماد کی تسلی بخش مرمت کرنے کے بعد خالہ بیٹی کی جانب متوجہ ہوئیں۔ ڈرائیور بھی پورا پیچھے مڑ کر بڑی دلچسپی سے یہ منظر ملاحظہ کر رہا تھا۔ جونہی صفیہ خالہ نے بیٹی کو مارنا چاہا، داماد کھڑا ہو گیا اور آہستہ سے درخواست کی کہ اپنی بیٹی کو تو سب کے سامنے ذلیل نہ کریں۔ اس کا جملہ پورا ہوتے ہی اس کے منہ پر خالہ کی جانب سے ایک کرارا تھپڑ رسید کیا گیا۔

جوتے کھانے والے کے منہ پر تھپڑ پڑنے سے تارے ناچے تو اس کی ہیرو گیری پل میں ختم ہو گئی۔ گال سہلاتا، ادھر اُدھر شرمندگی سے دیکھتا وہ آرام سے سائڈ پر ہو گیا اور اپنی ہیروئن کو بری سچویشن میں چھوڑ دیا۔ خالہ نے پہلے تو بیٹی کے دو تین دو ہتڑ مارے۔ اس بے چاری کی چادر اتر کر کندھوں سے بھی نیچے گر گئی۔ اس نے جلدی سے پلو سنبھالنا چاہا لیکن اتنی دیر میں خالہ نے اس کی چٹیا پکڑ لی اور اتنے زور سے کھینچی کہ اس کا منہ بس کی چھت کی طرف ہو گیا اور آنکھوں سے درد و شرمندگی کے مارے آنسو نکل آئے۔ بس کی سواریاں، کنڈیکٹر، ڈرائیور جو پہلے حیران پریشان تھے، اب ہنس ہنس کر دہرے ہو رہے تھے۔

دونوں کی خاطر تواضع کرنے کے بعد خالہ صفیہ نے انہیں بس سے نیچے اترنے کا حکم دیا۔ چوٹوں کو سہلاتے، شرمندگی سے سر جھکاتے وہ نیچے اتر گئے۔ کچھ سیکنڈ گزرے تو گویا اچانک چونکتے ہوئے کنڈیکٹر نے بس چلنے کا اشارہ دیا اور ڈرائیور نے بس آگے بڑھا دی۔ اپنی سگی بیٹی اور داماد کے ساتھ ایسا سلوک کرنے والی کے غضب سے بھلا کوئی اور کیسے بچ سکتا تھا اسی لیے آئے روز کوئی نہ کوئی خالہ

کے غضب اور کڑواہٹ کا شکار ہوتا رہتا۔

☆☆☆

''اور سناؤ ساجد! کیسا چل رہا ہے بلکہ یوں کرو کہ صرف یہ بتادو کہ صفیہ خالہ کے ساتھ تمہارے تعلقات کیسے جارہے ہیں؟'' جمشید نے اسٹول پر بیٹھتے ہوئے ہنس کر کہا تو ساجد بھی بے اختیار ہنس دیا اور بولا۔

''یار! یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ سب کو پتا ہے کہ سب سے زیادہ خار وہ مجھ سے کھاتی ہیں۔ گالی، ڈانٹ کا موقع نہ ملے تو گھورتی تو ضرور ہیں۔ ان کا بس نہیں چلتا کہ مجھے محلے سے سامان سمیت باہر پھنکوادیں۔''

کڑوے کسیلے لہجے والی اور غصیلی سی صفیہ خالہ ویسے تو ہر کسی سے لڑنے کے لیے ہر وقت تیار رہتیں لیکن محلے کے ساجد پنکچر والے سے تو انہیں خصوصی بیر تھا۔ ساجد تھا بھی ایسا ہی ایک نمبر کا آوارہ اور کام چور۔ باپ اور تین بھائی مارکیٹ میں اچھی خاصی دکان چلا رہے تھے لیکن وہ پڑھائی درمیان میں چھوڑ کر پہلے تو آوارہ گردی کرتا رہا۔ جب باپ نے طبیعت تھوڑی سی درست کی اور بھائیوں نے ڈانٹا تو گھر کی بڑی سی بیٹھک اور تھوڑا سا صحن کا حصہ شامل کر کے پنکچر کا کام شروع کردیا۔ ان کا گھر محلے کا آخری گھر تھا جس کی ایک سائڈ بازار کی جانب تھی۔ وہاں پر ساجد کام کم اور آوارہ دوستوں سے گپ شپ زیادہ کرتا۔ گھر والے جو اس بات پر خوش ہوئے تھے کہ اب شاید یہ سدھر گیا ہے، اس کے یہ چھن دیکھ کر سر پیٹ کر رہ گئے۔ گھر والوں کی تو اس نے سننا چھوڑ دی تھی لیکن خالہ صفیہ تو اپنے نام کی ایک تھیں۔ آتے جاتے اسے اور اس کے دوستوں کو دو چار سنا دیتیں۔

خالہ جب بھی اس کی جانب آرہی ہوتیں، وہ دوستوں سے آہستگی سے کہتا۔ ''اٹھ جاؤ یار! دیکھو خالہ صفیہ قصائن آرہی ہیں۔'' وہ لفظ ''قصائن'' یوں ادا کرتا جیسے عہدہ بتا کر ڈرا رہا ہو کہ کہیں ان کو ذبح نہ کردیں۔

ایک بار جب خالہ نے اسے کچھ زیادہ ہی جلی کٹی سنادیں تو اس نے جل کر چند لوگوں کے سامنے کہہ دیا کہ جب خالہ صفیہ کی وفات کی خوش قسمت گھڑی آئے گی تو وہ اپنی جیب سے بکرے کے قورمے پر خالہ کا ختم دلوائے گا۔ یہ بات کسی طرح خالہ تک بھی پہنچ گئی تو وہ انتہائی مشتعل ہو کر اس کی دکان پر پہنچیں۔ پہلے تو اسے خوب برا بھلا کہا پھر پوچھا۔

''میرے بارے میں تو خوب بول لیا تم نے۔ اب اپنے بارے میں کیا خیال ہے۔ آنے والے دنوں میں تمہارا کیا ہوگا؟''

جواب میں ساجد بڑی ڈھٹائی اور شرارت سے ہنستے ہوئے بولا۔ ''کیا ہوگا۔۔۔ اس کا پتا نہیں مجھے۔ آنے والے دنوں میں میرا ولیمہ ہوگا۔ ظاہر ہے صفیہ خالہ! ابھی تو ولیمہ کروانے کی عمر ہے نا۔'' بات کرنے کے خالہ سے تصدیق چاہی تو ہر بات کا کرارا جواب دینے، کوسنے، گالیاں دینے والی صفیہ خالہ چپ رہیں اور اسے گھورتی ہوئی چلی گئیں۔ بڑی خالہ کی یہ اچھائی ہی تھی کہ جوان لڑکے کو جواباً موت کا نہ کہا۔

☆☆☆

''ہاں بھئی ساجد! پھر کیا سوچا تم نے؟'' اچانک دکان میں داخل ہو کر عرفان نے بڑے اکھڑے سے لہجے میں سوال کیا۔ کام کرتا ساجد یکدم رک گیا۔ اس نے ہاتھ سے اوزار رکھا اور دھیمی آواز میں بولا۔

''کہا تو ہے کہ موقع دیکھ کر کام کروں گا۔ امی ابی کمرے میں ہوتی ہیں۔ ذرا دھیان سے۔''

''تو بہانے تو نہیں بنا رہا؟'' عرفان نے اسے گھورا۔

''بہانے کیوں بناؤں گا؟ میں جانتا ہوں کام کیے بغیر گزارہ نہیں تو پھر یقین رکھ، میں سچ کہہ رہا ہوں۔'' ساجد نے ہاری ہوئی آواز میں کہا۔

''سچ کہہ رہے ہو تو اپنے ہی حق میں اچھا کر رہے ہو ورنہ دوسری صورت میں تم جانتے ہی ہو۔'' عرفان نے دھمکی دینے والے انداز میں کہا اور باہر نکل گیا کیونکہ گاہک آنے لگے تھے۔ ڈھیٹ، بدتمیز اور بدمعاشی دکھانے والا ساجد مسکین سی شکل بنائے اسے جاتا دیکھ رہا تھا۔

☆☆☆

''تم نے مجھے پاگل سمجھ رکھا ہے کیا؟'' خالہ نے گرج دار آواز میں کہا۔ جواباً اس کے شوہر نے خاموشی اختیار کیے رکھی۔

''میں اگر شرافت سے چپ رہتی ہوں تو یہ مت سوچ کہ تیرے کرتوتوں پر بھی چپ رہوں گی۔'' خالہ نے کہا تو ان کے شوہر نے آنکھیں پھاڑ کر انہیں دیکھا۔ اور تو اور ان کے اپنے بچے منہ چھپائے ہنسنے لگے۔

''کیا ہوگیا ہے تمہیں صفیہ؟ کیوں اس عمر میں میرے کردار پر شک کر رہی ہو؟'' خالہ کے شوہر رشید نے بے چارگی سے کہا۔ اسی دوران رشید کا بھتیجا سجاد گھر میں داخل ہوا اور چچا، چچی کی بحث سننے لگا۔

''چاچی! کیا ہوا ہے؟ مجھے بتاؤ، یہ کس عورت کی بات ہو رہی ہے؟'' سجاد نے چارپائی پر بیٹھتے ہوئے سوال کیا۔

''ارے سجاد پتر! ہونا کیا ہے۔ تیرے چاچے کو

[illegible] بھر رہی ہیں۔ چلمن [illegible]
[illegible] رہا تھا تو میں نے دیکھا [illegible]
والی عورت [illegible] کی [illegible] رہی تھی
تیرے چاچا نے دوبارہ مڑ کر [illegible] دیکھا اور [illegible] ہی بار تو
واپس ہی مڑ آیا اور مجھ سے پوچھنے لگا۔ ''[illegible] رہی ہو۔
بازار سے کچھ منگوانا ہے تو بتا دو۔'' میں نے بھی [illegible] سے
جواب دیا کہ جس کے لیے مڑ کے آئے ہو اسی سے سوال
جواب کرو۔ ڈرامے باز، فوراً ہی کہنے لگا۔ ''تم سے ہی
پوچھوں گا۔ کافی دیر سے کھڑی ہو۔'' اب مجھے یہ بتائے کہ
اصل بات کیا ہے اور کب سے یہ سب چل رہا ہے؟'' خالہ
نے فوراً پوری بات بتائی تو سجاد نے سر سے پاؤں تک اپنے
چچا کا جائزہ لیا۔ گہرا کالا رنگ، بڑھا ہوا پیٹ، سر کے بالوں
سے مکمل محروم، چھوٹی چھوٹی آنکھیں، پھولی ہوئی ناک،
بادامی رنگ کا گھسا ہوا سوٹ۔ اس نے بے اختیار چچا کے
نصیب پر رشک کیا کہ اس عمر اور اس حلیے، خدوخال کے
باوجود خواتین اسے چلمن کی اوٹ سے دیکھتی ہیں۔

''تیرے چاچا کو تو میں دیکھ لوں گی لیکن اس کا کیا کروں
جو ہے ہی بڑی بدتمیز عورت۔'' خالہ نے غصے سے کہا۔

''اور بدذوق بھی۔'' سجاد نے پاس بیٹھے کزن کو کہنی
مارتے ہوئے کہا تو دونوں ہنسنے لگے۔

''صفیہ! میرا دماغ خراب مت کرو۔ خوامخواہ شک
کر رہی ہو۔ کہا تو ہے کہ میں واقعی تمہیں دیکھ کر واپس آیا
تھا۔ کیوں کسی عورت کو بدنام کر رہی ہو؟'' چاچا رشید نے
نوالہ منہ میں ڈالتے ہوئے کہا۔ وہ ڈانٹ اور کھانا اکٹھے
کھا رہا تھا۔

''میں تو کروں گی بدنام۔ جو میرے شوہر پر ڈورے
ڈالے گی، اس کا تو میں قیمہ کر دوں گی۔'' خالہ چلا اٹھیں۔
بچے انہیں دم سادھے دیکھ رہے تھے۔

''صفیہ! دیکھو، اب ہم بوڑھے ہوگئے ہیں۔ اس
طرح کی باتیں ہمیں زیب نہیں دیتیں۔'' چاچا رشید نے کہا
تو خالہ اچھی خاصی چڑ گئیں۔

''دیکھ رشید! مجھے بوڑھی تو کہنا مت...... تو ہی ہوگا
بوڑھا۔ میری شادی تو گھر والوں نے ننھی سی عمر میں تجھ پکی عمر
والے سے کر دی۔ چھوٹی عمر میں نانی بن گئی ہوں پر اس کا
مطلب یہ نہیں کہ میں بوڑھی ہوں۔ دیکھ سجاد پتر! مجھے شادی
سے پہلے بڑا نزلہ رہا ہے اس لیے میرے چند بال سفید
آ جاتے ہیں۔ تو خود بتا کہ......!'' صفیہ خالہ بدتمیزی، ہمسائی
اور چاچا رشید پر جھوٹے الزامات لگانا بند کر کے اپنی ''کم

[illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible]
[illegible] عرفان نے [illegible]
[illegible]

''ہاں [illegible] ہاں، سمجھتا ہوں میں۔ تم [illegible]
چار دن مانگتے ہیں نا تو بس اسی دوران تمہارا [illegible]
گا۔'' ساجد کا لہجہ روہانسا سا اور [illegible] بے چارگی تھی۔

''دل تو چاہا تھا آج ہی تمہاری طبیعت درست کر دوں
لیکن سوچا کہ پرانا یار ہے، ایک بار مزید ٹائم دے دوں۔''
عرفان نے دانت پیسے۔

''نہیں نہیں، تم کچھ مت کرو اور اس بار میرا یقین
کر لو۔'' ساجد تقریباً گڑگڑایا۔ وہ دونوں اس بات سے بے
خبر تھے کہ صفیہ خالہ ایک سائڈ پر اوٹ میں کھڑی ان کی
باتیں سن رہی ہیں۔

''ٹھیک ہے...... ٹھیک ہے۔ اب چار دن بعد
ملاقات ہوگی۔'' عرفان دکان سے نکلنے لگا۔

''عرفان! وہ...... سب چیزیں مجھے دے دو گے
نا؟'' ساجد نے رک رک کر کہا۔

''تم میرا کام کر دو گے تو میں سارے ثبوت تیرے
حوالے کر دوں گا۔'' عرفان رک کر بولا۔

''تمہیں رقم مل جائے گی لیکن مجھے اس بات کا یقین دلاؤ
کہ تم ساری تصویریں دے دو گے۔ پھر سے بلیک میل کرنے
کے لیے کچھ اپنے پاس نہیں رکھو گے۔'' ساجد نے کہا۔

''میں اپنی ماں کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ ایسا کچھ نہیں
کروں گا۔ تم جانتے ہو میں ماں کی قسم جھوٹی نہیں کھا سکتا۔''
عرفان نے مضبوط لہجے میں کہا تو ساجد نے سر ہلا دیا۔ عرفان
دکان سے باہر نکل گیا۔

ساجد اپنی جگہ پر بیٹھا ہی تھا کہ خالہ صفیہ دکان میں
داخل ہوئی۔ ساجد کو بڑی حیرت ہوئی کیونکہ اس سے قبل تو
خالہ بڑبڑاتی یا کوستی، ڈانٹتی دکان کے سامنے سے گزر جاتی
تھی۔ آج وہ اندر آ گئی تھی۔

''ساجد! یہ منحوس عرفان کیا بات کر رہا تھا؟'' خالہ
نے اسے گھورتے ہوئے سوال کیا۔

''وہ...... وہ خالہ...... ہمارے بیچ کی کوئی بات ہے۔ تم
نے کیا سن لیا ہے جو یوں پوچھ رہی ہو؟'' ساجد گڑبڑا سا گیا۔

''بات تو تمہارے بیچ کی ہی ہے لیکن یہ رقم اور

تصویروں کا کیا معاملہ ہے؟ کان کھول کر سن لو، یہ شریفوں کا محلہ ہے۔ تم دونوں کس معاملے پر اور کس کی بات کررہے ہو، مجھے بتاؤ۔'' صفیہ خالہ روایتی انداز میں چلا کر بولیں تو ساجد گھبرا کر کھڑا ہوگیا۔

''خالہ... خالہ... خدا کے لیے آہستہ بولو۔ کوئی سن لے گا۔ کہا تو ہے کہ بس ہے کوئی بات... تمہارے مطلب کی نہیں۔''

''اس نے تجھے دھمکیاں دی ہیں۔ ساری سنی ہیں میں نے۔ بتا ایسے کون سے کرتوت کیے ہیں کہ اس کے سامنے بھیگی بلی بنا ہوا تھا؟ بتا...... جلدی بتا ورنہ میں جاتی ہوں تیری ماں کے پاس۔ وہ بتائے گی تیرے باپ کو اور تیرا باپ خود ہی سب کچھ اگلوالے گا۔'' صفیہ خالہ نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے خوب اونچی آواز میں دھمکایا تو ساجد کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔

''بتاتا ہوں...... بتاتا ہوں خالہ! مگر آہستہ بولو۔ پتا ہے نا میرا گھر دکان کے ساتھ جڑا ہے۔ کہیں آواز میرے گھر نہ چلی جائے۔'' اس نے منت بھرے انداز میں کہا اور پھر بولا۔

''خالہ! میری جان پر بنی ہوئی ہے۔ بڑی مشکل میں ہوں۔ سمجھ میں نہیں آرہا کیا کروں۔ تمہیں بات بتا بھی دی تو کون سا فائدہ ہوجائے گا۔''

''پھر بھی بتا تو سہی۔'' خالہ نے بہت نرم اور دھیمی آواز میں کہا۔

''خالہ! تھوڑی دیر میں گاہک آجائیں گے، میں مصروف ہوجاؤں گا۔ پھر کبھی بات کریں گے۔'' اس نے خالہ کو ٹالنے کی ایک کوشش کی۔

''ہاں، ہاں پتا ہے مجھے تو نوٹ چھاپنے کی مشین ہے۔ بڑا مصروف رہتا ہے۔ میں چلتی ہوں تیری ماں کے پاس۔'' خالہ نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''خالہ...... خالہ! وہ دکان پر جو لڑکا میرے ساتھ کام کرتا ہے، وہ آجائے تو میں تیرے گھر آتا ہوں، وہیں بات ہوگی۔ یہاں کرنے والی نہیں ہے۔'' ساجد نے بالآخر ہتھیار پھینک دیے۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد وہ خالہ صفیہ کے سامنے بیٹھا تھا۔

''خالہ! کسی کو بتائے گی تو نہیں؟'' ساجد نے درخواست والے انداز میں پوچھا۔

''ارے یہ تو بس مجھے ذرا تجسس سا ہوگیا ہے کہ اصل بات معلوم کروں۔ کسی کو بتانے کی کیا ضرورت ہے۔ مجھے لگائی بجھائی کرنے، ادھر ادھر کی باتیں کرنے کا کوئی شوق [illegible] [illegible] [illegible]

''خالہ! یہ عرفان بہت [illegible] ہے۔ اس نے مجھے بڑے برے جال میں پھنسا لیا ہے۔'' ساجد نے [illegible] بڑی تمہید کے بات کرنا شروع کی۔

''اس نے مجھے ایک دن کہا کہ ساجد ایک کام میں میری مدد کردو، ساری زندگی تمہارا احسان مند رہوں گا۔ اس نے کہا کہ اس سے کسی کا نقصان ہوگیا ہے اور اس پر اب بڑی رقم بھرنا پڑے گی۔ میں نے کہا... تو میں کیا مدد کرسکتا ہوں۔ میرے پاس تو بڑی رقم نہیں ہے تو عرفان نے کہا کہ رقم تو ہے۔ بس میں اسے اٹھا کر دے دوں۔

''کہاں سے اٹھا کر دوں؟ اور تم کیوں نہیں اٹھا سکتے؟'' میں شدید حیران ہوا۔

''میرے گھر میں ماں کے کمرے کی الماری میں پیسے ہیں جو کہ مجھے ماں ہرگز نہیں دے گی۔ لیکن وہ تم مجھے دو گے۔'' عرفان نے کہا تو میں مزید حیرت زدہ رہ گیا۔

''عرفان! سیدھی بات کرو، پہیلیاں مجھے سمجھ نہیں آتیں۔'' میں جھنجلا گیا۔

''دیکھو ساجد! کرنا یہ ہے کہ میں کسی طریقے سے سب گھر والوں کو ایک سائڈ پر رکھوں گا۔ ویسے بھی گرمیاں ہیں۔ ہم آج کل پوری فیملی چھت پر سوتے ہیں۔ کبھی کبھار کوئی کسی کام سے نیچے آتا ہے۔ میں اس بات کا دھیان رکھوں گا کہ اس دوران کوئی بھی نیچے نہ آئے۔'' کہہ کر عرفان چپ ہوگیا تو میں نے پوچھا۔

''کس دوران؟'' مجھے بات کچھ کچھ سمجھ آنے لگی تھی۔

''جب تم میرے گھر میں آؤ گے، تمہیں دروازہ کھلا ملے گا۔ الماری کی چابی کا مجھے پتا ہے ماں کہاں پر رکھتی ہے۔ وہ بھی وہیں ہوگی۔ میں تمہیں اس کی جگہ بھی بتادوں گا۔ بس تم آنا، الماری کھول کر رقم چرا کر اور تھوڑا سا الماری کا سامان بکھیر کر چلے جانا اور چابی وہیں پھینک دینا تاکہ گھر والے یہ سمجھیں کہ ان سے غلطی سے چابی گری رہ گئی ہے جس کا چور نے فائدہ اٹھایا۔ تم رقم سنبھال کر رکھنا، میں تم سے لے لوں گا۔''

عرفان نے پلان سمجھایا تو میں پریشان ہوگیا اور فوراً انکار کرتے ہوئے کہا۔ ''اتنی بڑی رقم کی گمشدگی پر تمہارے گھر والے پولیس کے پاس ضرور جائیں گے۔ اگر میں پکڑا گیا تو؟''

اس کے جواب میں عرفان نے کہا۔ ''تم اس کی فکر نہ کرو۔ گھر والے روئیں یا پیٹیں، میں انہیں سنبھال لوں گا اور تمہیں بھی تھوڑی سی رقم بطور انعام دوں گا۔''

''تھوڑی سی بحث کے بعد میں مان گیا کیونکہ مجھے پیسے کا لالچ ہو گیا تھا۔ سب کچھ پلان کے مطابق ہو گیا۔''

''یعنی تم نے اس کے گھر.....'' خالہ صفیہ چلّانے لگی تھیں کہ ساجد نے انہیں روک دیا۔

''آہستہ خالہ! آہستہ..... بتا تو رہا ہوں..... ہاں، میں نے پیسے چرا لیے اور اگلے ہی دن عرفان میرا حصہ مجھے دے کر وہ رقم لے بھی گیا۔ اس نے مجھے بتایا کہ میں نے گھر والوں کو یہ کہہ کر شور شرابے سے منع کیا ہے کہ یہ کسی گھر کے بھیدی کا یعنی کسی قریبی دوست یا رشتے دار کا کام ہے اور میں خود ہی یہ دیکھ لوں گا کیونکہ مجھے کسی پر شک ہے۔ میں جلد اس سلسلے میں کچھ نہ کچھ کر لوں گا۔ پولیس کے بکھیڑے میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔ گھر والوں کو پہلے تو مجھ پر یقین نہیں آ رہا تھا لیکن میں نے انہیں منا ہی لیا ہے۔''

''تو اب کیا کرو گے؟'' میں نے پوچھا۔

''پہلے بھی تم نے ہی کیا تھا، اب بھی تم ہی کرو گے۔'' عرفان نے عجیب انداز میں کہا۔

''کیا مطلب؟'' میں نے پوچھا تو وہ ہنس دیا اور یہ کہہ کر چلا گیا کہ کل آ کر بتائے گا اور..... اور اگلے روز آ کر اس خبیث نے موبائل مجھے پکڑا کر کہا کہ اسے دیکھو۔ اس میں کچھ تصویریں اور ویڈیو ہے۔ میں نے حیران ہو کر پوچھا کہ کون سی تصویریں اور ویڈیو؟

''انہیں دیکھو، پتا چل جائے گا۔ تمہاری ہی ہیں۔'' اس نے ایسے انداز سے کہا کہ مجھے صاف خباثت معلوم ہوئی۔ میں نے جلدی سے تصویریں اور ویڈیو دیکھیں۔ وہ میرے عرفان کے گھر کے کمرے میں داخل ہوتے، الماری کھولنے، پیسے نکالنے کی تھیں۔''

''یہ کیا بے ہودگی ہے عرفان؟'' میں نے خوف و غصے کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ کہا۔

''حیران ہو رہے ہو نا؟ ابھی تو مزید بات بھی کرنا ہے تم سے۔'' وہ موبائل واپس پکڑتے ہوئے بولا۔

''نیچ آدمی، یہ سب کیا ہے..... کیوں کیا تم نے یہ؟'' میرا چیخنے کا دل کر رہا تھا لیکن بدنامی کے ڈر سے میں آہستہ بول رہا تھا۔

''دیکھا ساجد تم نے؟ تم میرے گھر میں چوری کرتے کتنے واضح نظر آ رہے ہو۔ کتنی بری بات ہے چوری کرنا اور وہ بھی اپنے ہی دوست کے گھر میں۔'' وہ خبیث لگ رہا تھا۔

''عرفان! دفع ہو جاؤ..... چلے جاؤ یہاں سے ورنہ میں تمہارے سر پر پتھر مار دوں گا۔'' میں نے دانت پیسے۔

''موبائل میں موجود چیزیں دیکھ کر بھی تم مجھے دفع ہونے کا کہہ رہے ہو..... کمال ہے۔ اس کا صاف مطلب ہے کہ تم اپنے خلاف پکے ثبوت لینا نہیں چاہتے۔ ہاں! میرا خیال تھا کہ جیل جانے سے، بدنام ہونے سے، علاقے میں چور مشہور ہونے سے بچنے کے لیے تم کچھ دے دلا کر یہ سب ڈیلیٹ کروانا چاہو گے۔'' اس کا مکروہ چہرہ اور بھیانک عزائم کھل کر سامنے آ گئے تھے۔

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' میں نے دھیرے سے پوچھا۔ مجھے کافی سمجھ تو آ ہی گئی تھی کہ کیا مطلب ہوگا۔

''منہ مانگا معاوضہ۔'' اس نے جواباً کہا۔

''میرے پاس تو شاید چند ہزار ہوں گے۔ تم جانتے ہی ہو کہ میرا کام کیسا چلتا ہے اور میرا باپ پیسے پیسے کا حساب کر کے مجھے تھوڑا سا جیب خرچ دیتا ہے۔ میں کیسے منہ مانگا معاوضہ دے سکتا ہوں؟'' میں بے بسی سے بولا۔ میرا دل چاہ رہا تھا اس کا منہ نوچ لوں۔ اس کی ہڈیاں توڑ دوں۔ اس نے مکروہ ہنسی کے ساتھ فوراً ہی بتا دیا تھا کہ اگر میں وہ سیل فون چھین کر توڑ بھی دوں تو کوئی فائدہ نہیں۔ تصویریں اور ویڈیو کہیں اور بھی محفوظ ہیں۔

''تمہارے پاس رقم نہیں ہے، یہ میں جانتا ہوں لیکن تم مجھے ان تصویروں اور ویڈیو کی قیمت دے سکتے ہو، مجھے اس کا بھی علم ہے۔ تمہارے گھر میں رقم اور زیور دونوں موجود ہیں۔ ابھی کچھ عرصہ پہلے ہی تو تم نے بتایا تھا کہ تمہاری ماں نے اپنا پرانا اور بھاری خاندانی زیور اب تک سنبھال کر رکھا ہے۔ تم چیزیں مجھے لا دو پھر میں بھی تمہاری وہ تصاویر، ویڈیو ڈیلیٹ کر دوں گا۔''

''عرفان بہت گھٹیا ہے۔ میں نے یار سمجھ کر جو بھید اسے بتا دیے تھے، وہ ان کا فائدہ اٹھا رہا تھا۔ میں نے اسے دوستی کے کافی واسطے دے کر سمجھایا لیکن وہ بالکل نہیں مانا اور اب میرے پاس کوئی چارہ نہیں رہا سوائے اس کے کہ میں اس کا مطالبہ پورا کر دوں۔

''خالہ! یہ بات تھی جو میں نے تمہیں بتا دی ہے۔ ایک طرف تو مجھے اپنے گھر والوں پر ترس آ رہا ہے کہ میں انہیں اتنا بڑا نقصان پہنچا دوں گا، دوسرے یہ خوف بھی تو ہے کہ اتنی بڑی چوری پر کیا وہ چپ رہیں گے۔ پولیس کی تفتیش

میں ان کا اپنا بیٹا پکڑا گیا تو میرا باپ میری ہڈیاں توڑ دے گا کہ پہلے تو نالائق تھا اب گھر میں ڈاکے بھی ڈالنا شروع کر دیے ہیں۔ سمجھ نہیں آرہا کیا کروں۔ میں تو بہت بڑی مصیبت میں پھنس گیا ہوں۔'' ساجد کی آواز بھرا گئی۔

''ویسے جرم تو تو نے کیا ہے ساجد! کیوں لالچ میں آکر اس کمینے کا کہنا مان کر چوری کرنے چلا گیا۔'' خالہ صفیہ نے اسے گھورا۔ جواباً وہ چپ رہا پھر بولا۔

''خالہ! تو بتا کیا کروں؟''

''عرفان کی ماں کو بتادے سب۔ وہ تیرے جوتے تو مارے گی لیکن بیٹے کی حرکت کا اور گمشدہ رقم کا پتا چلنے پر وہ اس کی بھی درگت بنادے گی پھر وہ ویڈیو تیرا کچھ نہیں بگاڑ پائے گی۔ معاملہ کھل جو جائے گا۔'' خالہ صفیہ نے مشورہ دیا۔ اس وقت بالکل نہیں لگ رہا تھا کہ اس کی اور ساجد کی کبھی بنی نہیں۔

''چھوڑو خالہ اس کی ماں کو۔ مجھے تو لگتا ہے کہ اس فراڈ شخص کے گھر والے بھی اس کے ساتھ شامل ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اتنی بڑی چوری پر بیٹے کے دلاسا دینے پر چپ بیٹھے رہتے؟ بیٹا بھی وہ جو کوئی انسپکٹر نہیں بلکہ ایک نمبر کا آوارہ ہے۔ انہیں تو شور مچا دینا چاہیے تھا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ مجھے لگتا ہے...... بلکہ پکا یقین ہے کہ ہمارے گھر کے بھیدی بیٹے سے مل کر پوری فیملی نے مجھے لوٹنے کا پروگرام بنایا ہے۔ مجھے کافی سمجھ آگئی ہے۔'' ساجد نے بتایا تو خالہ کچھ دیر تو آنکھیں پھیلائے اسے دیکھتی رہیں پھر بگڑ کر بولیں۔

''واہ بیٹا واہ...... کتنی جلدی تجھے سمجھ آگئی، ہے نا؟ گردن تک پھنس گیا ہے...... جان کے لالے پڑے ہیں۔ باپ کے جوتے اور پولیس کی مار کا خوف الگ ہے اور ''خوشخبری'' دے رہا ہے کہ مجھے سمجھ آگئی ہے۔ لعنت تیری سمجھ پر اور فٹے منہ تیرا۔''

ساجد پوری بات بتا کر اور ''لعنت، فٹے منہ'' لے کر واپس دکان پر چلا گیا۔ ابھی اسے وہاں پہنچے تقریباً بیس منٹ ہوئے ہوں گے کہ خالہ صفیہ اسے آتی دکھائی دیں۔

''ساجد ادھر آ۔ دو منٹ بات کرنا ہے تجھ سے۔''

خالہ کا لہجہ روایتی تھا۔ دو تین گاہکوں اور کام والے لڑکے کو دکان میں چھوڑ کر ساجد تیزی سے باہر آیا۔ خالہ دکان سے تھوڑا ہٹ کر گلی کی نکڑ پر چلی گئیں۔ ساجد بھی وہیں آگیا۔

''سن ساجد! تیرے پاس کوئی راستہ نہیں رہا سوائے عرفان کی بات ماننے کے۔ تو ایسا کر گھر پر پڑے پیسے اٹھا اور ماں کے زیور رہنے دے۔ اس کے بجائے کچھ اور رقم اٹھا لا۔ یہ کافی بھاری رقم [illegible] لیکن اب [illegible] عارضی طور پر [illegible] برابر تو نہیں لیکن اس کے قریب قریب [illegible] عرفان [illegible] یہ سب بتا دے۔ وہ تھوڑی تھوڑی زیور کی تھی۔ [illegible] آمادہ ہو جائے گا۔ ظاہر ہے اس کا مطالبہ تو پورا ہو جائے گا نا۔ تو کہنا ماں کا زیور تو نہیں اٹھا سکتا لیکن مجھے اس کے بدلے [illegible] رہا ہوں۔ جلدی کر...... تو اس سے ٹائم مانگ رہا ہے نا... مت مانگ اور کل ہی یہ کام کر کے اپنی جان چھڑوا۔''

خالہ نے تیز تیز بات کرتے ہوئے کہا۔ ساجد کا منہ اور آنکھیں دونوں کھل گئے۔

☆☆☆

''بڑا سمجھ دار نکلا ہے ساجد! جلدی کام کر دیا۔ ٹھیک ہے، میں پہنچ رہا ہوں ہوٹل پر۔'' عرفان کی آواز میں منصوبہ مکمل ہو جانے کی خوشی چھلک رہی تھی۔

''تو بھی میرے سامنے میرے خلاف ویڈیو وغیرہ ضائع کرے گا۔'' ساجد نے لجاجت بھرے انداز میں یاد دلایا۔ کچھ ہی دیر میں دونوں اس چھوٹے سے ہوٹل پر موجود تھے جو ان کے محلے سے کچھ ہی دور تھا۔ ساجد نے جیکٹ پہن رکھی تھی اور کرسی پر یوں سمٹ کر بیٹھا تھا جیسے اگر ذرا سا بھی چوکا تو کوئی اس جیکٹ کی اندرونی جیبوں سے وہ سارے پیسے نکال لے جائے گا جن کی وجہ سے جیکٹ پھولی پھولی سی لگ رہی تھی۔

''چلو نکالو اپنا موبائل فون اور میرے سامنے سب ضائع کرو۔'' آہستہ بولتے ہوئے ساجد نے کہا۔

''پہلے میں رقم کا جائزہ لوں گا، اس کے بعد۔'' عرفان ڈھٹائی سے بولا۔

''یہاں سب کے سامنے میں ساری جیبیں تمہارے سامنے کیسے الٹ سکتا ہوں۔ تمہیں معلوم نہیں اس بڑی سی جیکٹ کی جیبوں میں رقم کو کیسے رکھا گیا ہے۔'' ساجد نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے دھیمی آواز میں کہا۔

''تو چلو پھر کہیں ایسی جگہ چلتے ہیں جہاں یہ کام آسانی سے ہو سکے۔ ہوٹل تو ان کاموں کے لیے موزوں ہے ہی نہیں۔'' عرفان نے یکدم کھڑے ہوتے ہوئے کہا اور پھر بولا۔

''بے فکر رہو، مجھے پیسے چاہیے تھے، وہ مل گئے ہیں تو پھر تمہارے خلاف ہر ثبوت تمہارے سامنے ختم کردوں گا اور آئندہ کے لیے تمہارے لیے کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔ میں زبان کا پکا ہوں۔''

ساجد گہری سانس لیتے ہوئے اٹھا ہی تھا کہ صفیہ خالہ

ہوٹل میں داخل ہوگئیں۔ انہوں نے اندر داخل ہوتے ہی چاروں جانب ہوٹل میں نظر دوڑائی جیسے اپنا شکار ڈھونڈ رہی ہوں۔ پھر ان کی نظریں اس ٹیبل پر جا رکی تھیں جہاں عرفان اور ساجد بیٹھے تھے۔

"اچھا تو اس آوارہ کے ساتھ بیٹھا ہے۔" خالہ نے اپنی گونج دار آواز میں وہیں سے کہا جہاں وہ کھڑی تھیں۔ محلے کا ہوٹل تھا، آس پاس کے دکاندار اور قریبی لوگ جو خالہ سے بہت اچھی طرح واقف تھے، سب نے چونک کر خالہ اور پھر ان کی نظروں کے تعاقب میں اس میز کو دیکھا جہاں وہ لال آنکھوں سے گھور رہی تھیں۔

"نامراد کی دکان پر گئی تو لڑکا کہنے لگا بھائی ساجد ہوٹل پر ذرا کام سے گیا ہے۔ میں نے کہا میں بھی تو دیکھوں اس نکمے کو کون سا کام پڑ گیا ہے۔ ہونہہ! جیسا خود آوارہ، ویسوں کے ساتھ ملنا ملانا۔" خالہ خوب اونچی آواز میں گرجتی برستی ساجد کی جانب بڑھ رہی تھیں اور لوگ مسکراہٹ دبا کر دیکھتے ہوئے نیا ڈراما دیکھنے کے منتظر تھے۔

"وہ خالہ بس میں......" ساجد منمنایا۔

"کیا میں میں...... ہیں...... ارے میں تو تجھ پر لعنت بھی نہ بھیجوں۔ ذرا کام کیا پڑ گیا تو تو نخرے دکھانے لگ گیا۔ صبح سے انتظار کر رہی ہوں خبیث!" خالہ کی آواز اونچی ہوتی جا رہی تھی۔ سارے گاہک، ویٹر اور ہوٹل والا کام چھوڑ کر انہیں دیکھ اور سن رہے تھے۔

"خالہ! سن تو لو، بس دو منٹ......" ساجد نے پھر کچھ عرض کرنا چاہا۔

"کیا سنوں؟ اگر تو اسی وقت آجاتا جب میں نے بلایا تھا تو آج مجھے یوں چیخنا چلانا نہ پڑتا۔" خالہ نے واقعی چیخ کر کہا۔

"صرف آج؟" سب کے دلوں سے آواز آئی۔

"گھر میں تھوڑی سی اینٹیں پڑی تھیں، وہ سامنے والے خالی پلاٹ پر رکھوانی تھیں۔ میرے لڑکے ذرا مصروف تھے۔ میں نے کہا ساجد تو اور تیری دکان والا لڑکا آجاتا، صحن بھرا پڑا ہے، خالی کروا دو۔ میں نے سوچا محلے کے بچے ہیں۔ کام کروانے میں کیا حرج ہے۔ چلو دوپہر کا کھانا کھلا دوں گی لیکن دیکھو اسے ذرا، کیسے یہاں فارغ بیٹھا ہے۔" خالہ نے وہاں موجود لوگوں سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

"ہاں بھئی، صحیح کہہ رہی ہیں آپا...... چلے جاؤ ساجد، کروا دو کام۔" ہوٹل والے نے جلدی سے کہا تاکہ اس کا کام خالہ کے جانے کے بعد پھر سے چل سکے۔

"کیا ہے خالہ! تم جاؤ میں پانچ منٹ بعد آتا ہوں۔" ساجد نے کہا۔

"ہرگز نہیں۔" خالہ دہاڑیں۔ "مجھے تمہارا یقین نہیں۔ تم کہیں اور نکل جاؤ گے۔ چلو، ابھی میرے ساتھ چلو۔ زیادہ سے زیادہ آدھا گھنٹا لگے گا۔ سب کام ہو جائیں گے۔ اس کے بعد جہاں دل کرے دفع ہو جانا۔" خالہ نے اس کا بازو پکڑ لیا تھا۔ ساجد نے عرفان کی طرف دیکھا۔ اتنے سارے لوگوں کی موجودگی میں خالہ کا حکم ماننا ہی پڑا ورنہ مزید تماشا لگتا۔

"عرفان! میں آدھے گھنٹے بعد تم سے ملتا ہوں۔" ساجد کہتے ہوئے چلنے لگا۔

"عرفان کیا دشمن ملک سے آیا ہے؟ یہ اپنا بیٹا نہیں؟ یہ بھی تو کام کروا سکتا ہے۔" خالہ نے ساجد کا بازو چھوڑ کر کمر پر ہاتھ رکھتے ہوئے عرفان کی طرف دیکھ کر کہا۔

"خالہ! میں آتو جاتا......" عرفان نے کہنا چاہا۔

"آجا...... آجا۔ تیری کمر کے مہرے کھسک نہیں جائیں گے۔ آجا تو بھی۔" خالہ نے بڑے روایتی رعب سے اصرار کیا تو عرفان دو قدم آگے بڑھا اور ساجد سے کچھ کہنا چاہا ہی تھا کہ خالہ پھر بول پڑیں۔

"ارے ساجد! آجا اب...... دیکھ میں آرام سے کہہ رہی ہوں۔ غصہ مت دلا۔" خالہ نے اتنے "آرام" سے کہا کہ لوگوں کو اپنے کانوں کے پردے اچھے خاصے "بے آرام" ہوتے محسوس ہوئے۔

ساجد اور عرفان ایک دوسرے کو دیکھتے ہوئے بادلِ ناخواستہ خالہ کے ساتھ ہوٹل سے باہر نکل گئے۔ ہوٹل میں موجود لوگوں نے سکھ کا سانس لیا۔ کپ، پلیٹوں کے اٹھائے رکھے جانے کی آواز آنے لگی۔ بیرے خوف سے باہر آکر اپنے فرائض سرانجام دینے لگے۔ ہوٹل والے نے اپنی روزی روٹی کا کام بحال ہونے پر شکر ادا کیا۔

☆☆☆

"یہ دیکھو، اتنا بڑا کام نہیں ہے۔ گھر میں چارپائیاں بچھانا مشکل ہو رہی ہیں۔ بڑی مہربانی ہوگی تمہاری۔ اٹھا دو یہ اینٹیں۔ عادل، آصف...... آجاؤ تم بھی۔" گھر پہنچ کر خالہ نے خلافِ معمول نرمی سے کہتے ہوئے اپنے نواسوں کو بھی بلا لیا جو گلی میں کھیل رہے تھے۔

خالہ کے گھر کے بالکل سامنے گلی پار کر کے خالی پلاٹ تھا۔ چاروں لڑکے وہاں اینٹیں رکھنے لگے۔ چند ہی منٹ میں انہیں جسم میں گرمی محسوس ہونے لگی۔ خالہ گلی کے درمیان میں

کھڑی ہو کر بڑے غور سے کام ہوتا دیکھ رہی تھیں۔

''عرفان، ساجد پتر! سنو۔'' خالہ نے کہا تو دونوں گرتے گرتے بچے۔ خالہ کا لہجہ بہت نرم اور پیار بھرا تھا۔

''تم دونوں نے جو جیکٹیں پہن رکھی ہیں، کافی مہنگی اور اچھی لگ رہی ہیں۔ نہ تم نے غور کیا، نہ میں نے۔ بھلا مزدوروں والا کام کرتے ہوئے یہ مہنگی جیکٹ پہننی چاہیے؟ انہیں اتار کر سائڈ پر رکھ دو۔ ویسے بھی تمہارا جسم گرم ہو رہا ہوگا۔'' یہ سن کر عرفان ذرا ہچکچایا اور ساجد نے تو باقاعدہ جیبوں پر ہاتھ رکھ لیے۔

''نہیں...... نہیں خالہ! ہم دھیان سے کر رہے ہیں کام۔'' ساجد ذرا گھبرا کر بولا۔

''ارے کیا ہوگیا ہے۔ میں جو کہہ رہی ہوں اتارو، تو اتار دو۔ لاؤ، پکڑاؤ مجھے۔'' خالہ نے چنگھاڑتی ہوئی آواز میں کہا تو گلی میں کھڑے لوگوں نے عرفان، ساجد کو یوں دیکھا جیسے کہہ رہے ہوں ''بھائی، مان لو بات۔ کیوں مصیبت کو آواز دے رہے ہو؟''

عرفان نے جیکٹ اتار کر اس کی جیب میں ہاتھ ڈال کر اپنا موبائل فون نکالنا چاہا۔ صفیہ خالہ تو گویا اس کی نگرانی پر کھڑی تھیں۔

''کیوں مٹی والے ہاتھ جیب میں ڈال رہا ہے۔ ہم تیرے پیسے چرا لیں گے کیا؟'' ڈپٹ کر کہتے ہوئے صفیہ خالہ نے اس کے ہاتھ سے جیکٹ ایسے چھینی کہ وہ کچھ نہ کر سکا۔ ساجد کو بھی جیکٹ خالہ کو دینا پڑی۔

گلی بھری ہوئی تھی۔ لوگ آ رہے تھے۔ چھٹی کا دن ہونے کی وجہ سے بچے کھیل رہے تھے۔ اتنے سارے لوگوں کی موجودگی میں زیادہ سوال جواب کر کے بے عزتی کروانے کی دونوں کی ہمت نہ تھی۔

''جلدی کرو جلدی...... سلمٰی! دودھ پتی بنا اور ساتھ بسکٹ بھی رکھ۔ تھوڑا سا کام رہ گیا ہے۔'' خالہ نے لڑکوں کو جلدی کا کہہ کر بیٹی کو حکم دیا۔

''نہ خالہ! اس کی ضرورت نہیں۔'' عرفان ہانپتے ہوئے بولا۔ وہ زیادہ تیزی سے کام کر رہا تھا تاکہ جلد از جلد ساجد سے معاملہ نمٹا کر موٹی رقم لے سکے۔

''کیوں ضرورت نہیں۔ اس کے بعد دوپہر کا کھانا بھی تمہیں کھلانا ہے۔ تم دونوں ٹائم پر پہنچ جانا۔ بھئی جو طے کیا ہے اس کے مطابق ہی کرنا پڑے گا۔'' خالہ نے بڑی فراخ دلی سے کہا اور ساتھ ہی عرفان کو جو اینٹیں خالی پلاٹ پر پھینک کر اب گھر کی جانب اور اینٹیں اٹھانے جا رہا تھا،

روک لیا۔

''یہ تو کیوں اتنی جلدی کر رہا ہے؟ نکمے! تو کیوں رک گیا......؟ میں اس سے بات کر رہی ہوں، تو دفع ہو اور کام کر۔'' عرفان سے بات کرتے کرتے خالہ نے ساجد کو ڈانٹتے ہوئے کہا تو وہ تیزی سے اندر چلا گیا۔

''ہاں تو عرفان پتر! تو سارا دن اِدھر اُدھر پھرتا ہے...... بالکل فارغ...... تیری کوئی نوکری ہے نہ کوئی دکان پھر اتنی جلدی کس چیز کی......؟ اور ایک بات یاد رکھ، جو وقت کی قدر نہ کرے......'' خالہ نے چھوٹا سا لیکچر دے ڈالا۔ عرفان سر جھکائے سن رہا تھا۔ خالہ سے جان چھوٹی تو بقیہ کام مکمل کیا۔

دودھ پتی پینے کے بعد دونوں جانے کے لیے اٹھے۔ جس کمرے میں دونوں بیٹھے تھے، اس کی ایک کرسی پر جیکٹس رکھی ہوئی تھیں جو دونوں نے کمرے میں آتے ہی اٹھالی تھیں۔ اس سے قبل خالہ نے پکڑی ہوئی تھیں اور پھر سلمٰی کو چائے بنانے کا کہتے ہوئے اسے دے کر کہا تھا کہ سامنے والے کمرے میں احتیاط سے رکھ دے۔ چند منٹ بعد دونوں ساجد کی دکان پر تھے۔

''عرفان! اس وقت کوئی نہیں ہے۔ نکال موبائل میرے سامنے۔ سب کچھ ڈیلیٹ کر اور یہ لے جیکٹ...... اس کی جیبوں سے سب نکال لے۔'' ساجد نے دکان کے پچھلے حصے میں جاتے ہوئے کہا۔

''تو پیسے دکھا پہلے۔'' عرفان نے موبائل نکال کر ہاتھ میں پکڑتے ہوئے کہا تو ساجد نے جیکٹ اتار کر اس کے ہاتھ میں تھمادی۔

عرفان نے جیکٹ کی جیبیں کھنگالنا شروع کیں۔ کسی جیب میں کاغذ تھے، کسی میں تہ شدہ اخبار...... ایک بھی روپیہ موجود نہ تھا۔

''یہ کیا مذاق ہے ساجد؟'' جیکٹ پٹختے ہوئے عرفان طیش سے بولا۔

''کیا...... کون سا مذاق؟'' ساجد نے حد درجہ معصومیت سے کہا۔

''اس میں تو کچھ بھی نہیں ہے۔'' عرفان غصے سے کہتے ہوئے کھڑا ہوگیا۔

''ہاں...... تو تیرے موبائل میں بھی تو کچھ بھی نہیں ہے۔'' ساجد نے بے فکری سے کہا۔

''کیا بکواس کر رہا ہے......؟ اس میں......'' عرفان سیل فون پر چند سیکنڈ تیز تیز انگلیاں چلاتا رہا پھر اس کے

چہرے پر زلزلے کے سے تاثرات پیدا ہو گئے۔

''یہ... یہ... یہ کیا ہو گیا؟'' الفاظ ٹوٹ ٹوٹ کر اس کے منہ سے نکلے۔

''وہ جب خالہ تجھے روک کر سوال جواب کر رہی تھیں تو میں نے اینٹیں اٹھانے کے بجائے کمرے میں جا کر تیرا موبائل اٹھا کر سب ضائع کر دیا تھا۔ اپنے خلاف ثبوت اور تیری محنت دونوں۔'' ساجد نے بڑے آرام سے بولتے ہوئے کہا۔ اس کا چہرہ پُرسکون اور لبوں پر مسکراہٹ تھی۔

''ساجد! میں...... میں تیرا منہ نوچ لوں گا۔'' عرفان سیخ پا ہو کر آگے بڑھا تھا کہ ساجد اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

''بس عرفان! تیرا کھیل ختم ہو گیا۔ تیرے پاس اب میرے خلاف کچھ نہیں ہے۔ اگر تو نے ہاتھ اٹھایا تو میں ہاتھ توڑ دوں گا۔ نکل جا یہاں سے۔ زیادہ تماشا لگانے کے بجائے خاموشی اختیار کر ورنہ پھر میرا منہ کھل جائے گا اور تیرے کرتوت کا چرچا ہو جائے گا۔ تیرے گھر والے اگر اس معاملے میں تیرے ساتھ ملے ہوئے بھی ہیں تب بھی علاقے میں تیرے اپنے ہی گھر میں چوری کرنے کی خبر پھیلنے پر تجھ سے لاتعلقی اختیار کر لیں گے اور تو ذلیل و رسوا ہو جائے گا۔ جا نکل یہاں سے۔'' بڑی سنجیدگی سے ساجد بولا۔

''صفیہ خالہ تیرے ساتھ شامل تھی اس کھیل میں؟'' شکست خوردہ عرفان نے قہر آلود نظروں سے اسے گھورتے ہوئے پوچھا۔

''صفیہ خالہ اور میرے ساتھ؟ میں تو خود ہی آج تجھ سے نمٹنے کے لیے یہ کاغذ بھر کر نکلا تھا کہ ہاتھا پائی کر کے یا کسی بھی طریقے سے موبائل تجھ سے چھین لوں گا۔ وہ تو بیچ میں خالہ آ گئی۔ مجھے تو غصہ آیا تھا پھر اسی کی وجہ سے میرا مسئلہ حل ہو گیا۔ وہ تو جا کے میں اس کو بتانا کہ مشقت کرنے کا مجھے کتنا معاوضہ مل گیا ہے۔'' ساجد دل جلانے والے انداز میں مسکرایا۔

''تیرا کیا خیال ہے، تیرے خلاف صرف ایک جگہ ثبوت تھے؟'' عرفان نے ڈرانا چاہا۔

''ہاں...... ہاں...... اور بھی جگہ ثبوت موجود ہیں۔ تیری اتری شکل سے پتا چل رہا ہے۔'' ساجد اطمینان سے بولا۔ عرفان ہار چکا تھا اور اب ہارے ہوئے جواری کی طرح دکان سے نکل رہا تھا۔

☆☆☆

بڑی سی ٹرے میں تیز مرچ مسالے والی کڑھی کا ڈونگا اور بڑی سی پلیٹ میں ابلے چاول لیے ساجد کی ماں صفیہ خالہ کے گھر داخل ہوئی۔

''السلام علیکم آپا!'' ساجد کی ماں نے سلام کرتے ہوئے کڑھی ان کے سامنے رکھی۔

''کیا لائی ہو ساجد کی ماں؟'' خالہ خوش دلی سے مسکرائیں۔

''کڑھی چاول پکائے تھے۔ سوچا آپا کو بھی دے آؤں۔ ویسے میں تو شکریہ ادا کرنے آئی ہوں۔'' ادھر ادھر دیکھتے ہوئے ساجد کی ماں زلیخا نے آہستہ سے کہا۔

''شکریہ کس چیز کا؟'' خالہ نے کڑھی میں سے ایک پکوڑا اٹھا کر منہ میں ڈالتے ہوئے پوچھا۔

''وہ اس آوارہ ساجد کی مدد کرنے پر۔ اس نے مجھے ساری بات بتا دی ہے کہ کس طرح خالہ نے اس کے مسئلے کو سن کر، سارا ڈراما سمجھا کر اور خود اپنے گھر بلا کر اس کی جان چھڑائی ہے۔'' زلیخا کے لہجے میں ممنونیت تھی۔

''بس اس سے کہنا آئندہ دھیان رکھے اور دنیا میں کچھ ڈھنگ سے رہنا سیکھ لے...... پکوڑے بہت مزیدار ہیں۔ تیری بہو رابعہ نے بنائے ہوں گے۔ میں بھی جب نئی نئی بیاہی آئی تو......'' خالہ نے اپنی بات شروع کر دی۔

☆☆☆

''جو میں کہوں، وہ کر...... بس اسے ہوٹل میں بلا لے پھر میں جانوں اور میرا کام۔ میرے گھر میں کافی دنوں سے ایک کونے میں کچھ اینٹیں پڑی ہیں، وہی کام آئیں گی۔'' ساجد کو صفیہ خالہ کی بات یاد آئی اور یہ بھی کہ اس نے کیسے بے ساختہ کہا تھا۔

''کیا اسے اینٹیں مارو گی؟''

''ہاں، مارنی تو چاہئیں اسے بھی اور تجھے بھی۔'' خالہ بگڑ کر بولیں اور پھر اسے سارا ڈراما سمجھایا۔ ساجد اس کے کہے پر عمل کرتا رہا۔

موبائل حاصل کرنے کے لیے خالہ نے دو تین طریقے سوچے ہوئے تھے۔ سب کچھ پلان کے مطابق ہو گیا تھا اور اب ساجد پُرسکون تھا۔ بس اب اسے خالہ سے کیا ہوا وعدہ پورا کرنا تھا کہ آئندہ آوارہ لوگوں سے بچے گا۔

'خالہ کڑوی ہے...... جھگڑالو ہے، سبھی کہتے ہیں اور آج یہی کڑواہٹ، اونچی آواز میں بولنا، جھگڑا کرنا میرے کام آ گیا...... خالہ کی کڑواہٹ نیم اور کریلے جیسی ہے۔ منہ کڑوا ہو جاتا ہے لیکن تاثیر فائدہ دیتی ہے۔' ساجد نے مسکرا کر سوچا۔

⌘⌘⌘

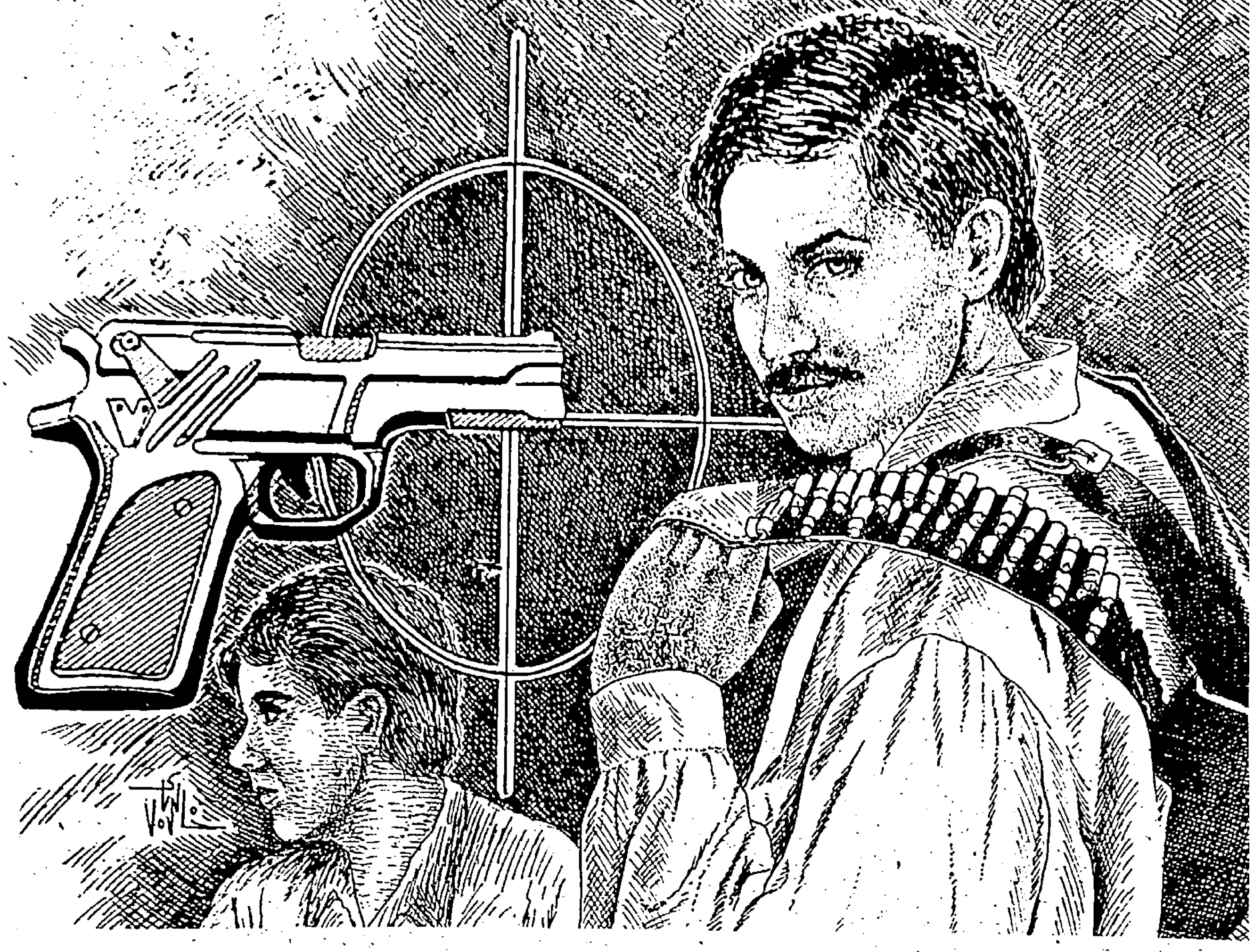

جنگ باز

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

انچاسویں قسط

مقدر کا عروج ہو یا نصیب کا زوال... جانے کن خاموش لمحوں میں زندگی میں شامل ہو جاتے ہیں... لیکن کچھ لوگ تقدیر سے زیادہ تدبیر پر بھروسا کرتے ہیں... وہ جو حالات کی زنجیر میں قید بوسیدہ در و دیوار تک محدود تھا تمام تر معصومیت کے ساتھ شب و روز کی ہنگامہ خیزیوں میں مصروف تھا کہ اچانک حرص و طمع اور لالچ کے مارے... چہروں پر شرفا کا نقاب ڈالے عبرت و مکر کے تمام حربے آزمانے اس کے راستے میں چلے آئے... وہ جو رنگین شاموں... سنگین ہنگاموں اور تحیر انگیز چالوں سے ناآشنا تھا... ایسا بازی گر بن گیا کہ تمام پردہ داروں کی ڈوریاں الجھ کر رہ گئیں... اس کے ذہن میں قید ناآسودہ خواہشوں کا بھنور اسے کسی کل چین سے بیٹھنے نہیں دیتا تھا۔ تقدیر کے سہارے چلنے والا... کچھ اس انداز سے تدبیروں سے اپنی کایا پلٹتا چلا گیا کہ چال بازوں کی تمام چالیں لڑکھڑا گئیں۔

معاشرتی ناسوروں اور درندوں کی خوں ریز سازشوں اور زخم زخم ہونے والے ایک جنگ باز کی دلدوز داستان

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

روشنیوں کا شہر کراچی... اس نے جانے کتنے لوگوں کو اپنے دامن میں ماں کی طرح سمیٹ رکھا ہے۔ ان گنت داستانوں کی امین [illegible] کے کسی کونے میں سہراب خان یعنی میں بھی رہتا ہوں جو ایک غریب محلے میں محبت کرنے والی ماں اور ایک سخت گیر طبیعت کے [illegible] باپ کا ایک ناخلف بیٹا بھی تھا جو ہر وقت باپ کی بے جا مار پیٹ کا نشانہ بنتا رہتا۔ میری ایک بہن بھی تھی راحیلہ۔ مگر نہیں، بعد میں مجھ پر انکشاف ہوا [illegible] میری بہن نہیں تھی، خالہ زاد تھی۔ بچپن میں اس کے ماں باپ ایک ناگہانی حادثے میں مر چکے تھے اور ماں نے اسے [illegible] سے پال پوس کر جوان کیا تھا۔ ماں میری شادی اس سے کروانا چاہتی تھی لیکن میں اب بھی اسے ایک ''بہن'' کے ہی روپ میں دیکھتا تھا۔ میرا باپ [illegible] پیٹا کرتا تھا۔ ایک دن ماں کو اس نے گہرا زخم دیا تو میں برداشت نہ کر پایا اور باپ کے سامنے سینہ تانے کھڑا ہو گیا۔ اس کی دماغ کی رگ پھٹ گئی۔ وہ جہان سے کوچ کر گیا تو گھر میں سکون ہوا۔ غربت اور باپ کی سخت گیر طبیعت نے مجھے ایک حد تک جرائم کی طرف راغب کر دیا تھا مگر میں جلد ہی سنبھل گیا مگر اس ''سنبھلنے'' کی مجھے بڑی قیمت چکانا پڑی۔ میں اور میرا باپ ایک فیکٹری میں معمولی ورکر تھے۔ محلے میں ہی تین ہم عمر لڑکے میرے یار کہلائے۔ ایک کا نام سلیم، دوسرے کا راجو اور تیسرا ماجد تھا۔ ماجد کی جوان بہن فوزیہ میری پہلی اور آخری محبت ٹھہری۔ ہم چاروں جرائم پیشہ گروہ کے آلۂ کار بن گئے۔ اقبال نامی ادھیڑ عمر شخص ہمارا ''باس'' کہلایا۔ اس کا نائب سجاد بیگ تھا۔ اسی گروہ نے ہم چاروں یاروں کو لڑائی بھڑائی کی خصوصی ٹریننگ دی۔ گروہ دیگر جرائم کے ساتھ بھتا خوری بھی کرتا تھا۔ ہمارے فیکٹری مالک سیٹھ سکندر سے بھتا لینے کے لیے ''باس'' اقبال نے ہمیں استعمال کیا۔ میں نے سلیم وغیرہ کو سمجھانے کی کوشش کی مگر وہ میرے ہی دشمن ہو گئے، تاہم میں نے سیٹھ سکندر کے ساتھ نمک حلال کیا اور اسے سب باتیں بتادیں۔ گروہ سمیت میرے تینوں یار میری جان کے دشمن ہو گئے۔ سیٹھ سکندر کی جواں سال خوب صورت بیٹی سدرہ میری ''نمک حلالی'' سے متاثر ہوئی۔ سیٹھ سکندر کا سالا، سجاد بیگ ہی جرائم پیشہ گروہ کے باس اقبال کا نائب تھا۔ میں نے اس کی پلاننگ آشکار کر دی۔ وقت تیزی سے بدلا۔ ماں مر گئی۔ ماجد عرف ماجے کے قتل کا الزام مجھ پر لگا۔ میں لاک اپ ہوا تاہم رہا ہو گیا۔ باس اقبال، سلیم چھالیا اور راجو بوری میرے خون کی بو سونگھتے پھر رہے تھے۔ میں راحیلہ اور فوزیہ کو لے کر کراچی سے سیالکوٹ ہجرت کرنے لگا۔ صادق آباد میں فوزیہ اور راحیلہ سے بچھڑ کر میں باا ثر ''چودھری جی برادران'' کے نرغے میں چلا گیا۔ وہاں بھولے سے میری عجیب حال میں ملاقات ہوئی۔ اس کی منگ سے چودھری شالا جی نے زبردستی شادی کر لی تھی۔ اس کا نام نادو تھا۔ ہم تینوں فرار اختیار کر گئے۔ راستے میں پولیس اور چودھری جی برادران کے حواریوں سے مقابلے میں بھولا مارا گیا۔ نادو میری ذمے داری بن گئی۔ نادو درحقیقت کسی اور سے محبت تھی۔ اس کا نام بختیار تھا۔ بختیار راجن پور میں رہتا تھا۔ فوزیہ اور راحیلہ کو بھی میں نے کسی طرح تلاش کر لیا۔ سیالکوٹ میں ایک ماں بیٹی سے میری شناسائی ہوئی۔ وہ محلے دار تھیں۔ لڑکی نگہت اور ماں شگفتہ خاتون۔ عقدہ کھلا کہ شگفتہ، باس اقبال کی منکوحہ تھی اور نگہت بیٹی مگر شوہر کی مجرمانہ زندگی سے تنگ آ کر شگفتہ اپنی بیٹی نگہت کے ساتھ کراچی سے سیالکوٹ اپنے ماں باپ والے گھر میں آن بسی تھی۔ فائٹنگ کلب کا ایک ماسٹر عرف استاد جوجی میرا دوست بن گیا۔ نگہت اب بھی باپ (اقبال) سے ملاقات کرتی تھی۔ سیالکوٹ میں اس کا بنگلا تھا۔ ایک خفیہ گروہ ''کالی لہر'' سے میرا ٹاکرا ہو گیا۔ یہ جادو ٹونے کرنے والا گروہ تھا۔ عدیل جو کہ جگنو نامی شخص کا بھائی تھا ان کے ہاتھوں مارا گیا۔ جگنو ایک بڑی سیاسی شخصیت کا آلۂ کار تھا۔ وہ میرا دشمن اور بعد میں دوست بن گیا۔ کالی لہر کے رانگا بابا اور میڈم پنچھی سے میری دشمنی عروج پر تھی۔ میرا دشمن باس اقبال بھی ان کی جادوئی ہانڈیوں کی زد میں آ کر اسپتال پہنچ گیا۔ اس کی بیٹی نگہت میری دشمن بن گئی جبکہ اس کی ماں شگفتہ خاتون مجھے بھائی سمجھتی تھی۔ اب میری بیک وقت جنگ بازی باس اقبال کے نائب سجاد بیگ، چودھری جی برادران اور کالی لہر والوں کے ساتھ جاری تھی۔ میں راحیلہ کا پیچھا کرتے ہوئے رانگا بابا کے ٹھکانے پر پہنچ گیا اور اسے اٹھا کر فارم ہاؤس لے آیا۔ مجھے سر پر کچھ مار کر بے ہوش کر دیا گیا اور جب ہوش آیا تو وہ لوگ باور کرانے لگے کہ میں مر چکا ہوں اور میری روح ان کے قبضے میں ہے۔ پھر مجھے حالت بے ہوشی میں قبر میں دفنا دیا گیا۔ انہوں نے کچھ کھلا کر میرے جسم کو مفلوج کر دیا تھا۔ تب ہی غیبی مدد ہوئی اور ایک ماں بیٹی نے مجھے قبر سے نکالا۔ میری حالت دگرگوں تھی۔ پھر میری محسن میرا علاج کرنے لگی۔ ان ماں بیٹی کو گاؤں والوں نے دربدر کر دیا تھا۔ اماں میرے علاج کے لیے سرحد پار سے خاص بوٹی لے آئی تھی اور اس نے دوا [illegible] تیار کر لیا تھا۔ دوا نے مجھ پر جادوئی اثر دکھایا اور میرے اندر طاقت کا خزانہ بھر گیا۔ صمد یار کے گماشتوں نے اماں کی مڑھی کو آگ لگا دی۔ میں انہیں تھانے لے [illegible] انہوں نے مجھے ہی لاک اپ کر دیا۔ میں تھانے سے بھاگ نکلا۔ مجھے شمیلہ خانم نے ایک ڈاکٹر کے کلینک پر ٹھہرا دیا۔ میں اماں اور چنبیلی کے ساتھ وہاں سے نکل کھڑا ہوا اور استاد جوجی کے ٹھکانے پر آ گیا۔ وہاں سے ہم کالی لہر والوں کے ایک ٹھکانے پر پہنچے تو وہاں نزاکت اور راڑاں کی لاشیں ملیں۔ میں نے انتقام لینے کی ٹھان لی۔ ہم کالی حویلی پہنچ گئے۔ وہاں میرا رانگا سے ٹاکرا ہوا۔ رانگا نے استاد جوجی کو شدید زخمی کر دیا۔ میں نے رانگا کی ایک ٹانگ کاٹ ڈالی تاہم رانگا بچ نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ میں دشمن کے ایک اور ٹھکانے پر پہنچا تاہم انہوں نے مجھے قابو کر لیا۔ میں زخمی بھی ہو گیا۔ اچانک وہاں سلیم نے حملہ کر دیا۔ مجھے وہاں سے نکال لیا گیا۔ سلیم اور چودھری برادران نے مجھ سے مفاہمت کر لی۔ راحیلہ بھی انہی لوگوں کے پاس تھی۔ سلیم اور میں نے راجا تیمور کو چھاپنے کی کوشش کی تاہم ہمیں ناکامی ہوئی۔ وہاں سے واپسی پر ایک جگہ ایمبولینس اور پولیس نظر آئی۔ جگنو کو مار دیا گیا تھا۔ میں نے تیمور کو چھاپنے کا ارادہ کیا اور اس کی فیکٹری پہنچ گیا۔ وہ لوگ کوئی ''شے'' لے کر کہیں جا رہے تھے۔ میں نے ان

[illegible]

... ہو گئے۔ وہ بوبورگا کے مجسمے کو حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس نے ھینا کو بھی اغوا کر لیا تھا۔ [illegible] اس لیے اس نے مجھے اپنے ساتھ ملا لیا۔ میں اس مشن میں زخمی ہو گیا اور [illegible] کے جنگل میں پھنس گیا۔ اچانک وہاں کسی گروہ نے حملہ کر دیا اور [illegible] بھی فرار ہو گئی۔ انہوں نے مجھے پکڑ لیا تاہم میرے کہنے پر فوزیہ کو رہا کروا لیا گیا۔ ہم رمنڈو کے پیچھے گئے۔ گروہ کے کچھ ساتھیوں کو رمنڈو نے ہلاک کر دیا۔ رمنڈو کی گاڑی تباہ ہو گئی۔ مجھے ہلاک کرنے کی کوشش کی گئی تاہم میں فوزیہ کے ہمراہ بچ نکلا۔ مجھے ایک لوہانی رپورٹر ملی۔ میں مائرہ کے ساتھ بوبورگا کے مجسمے کو تباہ کرنے نکلا۔ مارا ماری ہوئی۔ واپسی پر مجھے مچھیروں نے پکڑ لیا تاہم میں ان کی گرفت سے نکل بھاگا اور واپس اپنے ٹھکانے پر پہنچ گیا۔ ہم کراچی آ گئے۔ میری ایک خاتون سے ملاقات ہوئی۔ وہ مشہور اداکارہ روبی تھی جو ٹوڈو کو جگنو کی بہن بتاتی تھی۔ اسے میری مدد درکار تھی۔ ہم فوراً روانہ ہو گئے۔ راحیلہ کی نوید نامی شخص کی آلہ کار بن گئی تھی۔ میں راحیلہ کو وہاں سے نکالنے میں کامیاب ہو گیا۔ سدرہ کو سجاد بیگ نے اغوا کر لیا تھا۔ میں نے سدرہ کو اس کے چنگل سے نکال لیا۔ میں نے سلیم چھالیا کا پیچھا کیا اور اس کے ساتھ ہو لیا۔ وہ روبی کو بازیاب کرانے جا رہا تھا۔ ہم نظام شاہ کے فارم ہاؤس پہنچ گئے۔ وہیں کچھ لوگ آ گئے اور مارا ماری ہوئی۔ دلاور شاہ مارا گیا جبکہ وہ لوگ روبی کو اپنے ساتھ لے گئے۔ دلاور شاہ کے قتل کا الزام مجھ پر آیا اور مجھے لاک اپ کر دیا گیا۔ نظام شاہ کے راتب خور انسپکٹر نے مجھے حوالات میں قتل کرانے کی کوشش کی۔ تاہم میں بچ گیا۔ میں نے نئے SHO کو اعتماد میں لے لیا۔ مجھے بری کر دیا گیا۔ فوزیہ اور میری شادی ہو گئی۔ روبی زخمی حالت میں سدرہ کے گھر پہنچ گئی۔ میں روبی سے ملنے پہنچا۔ روبی نے بتایا کہ جگنو کو ھم شاہ اور لاکھا نے مارا تھا۔ میں نے انہیں عبرتناک انجام سے دوچار کرنے کا عہد کر لیا۔ میں نوید کے پھر اکے ولا میں پہنچ گیا۔ میں نے نوید کو زخمی کر دیا اور اس سے بچ گرامیں کی فائل پر دستخط کرا لیے۔ میں وہاں سے نکل پڑا۔ راستے میں راحیلہ سے سامنا ہوا تاہم نوید کے آدمیوں نے راحیلہ پر گولی چلا دی۔ گولی اس کے شانے میں لگی تھی۔ میں نے نوید کے گماشتوں کو ختم کر دیا۔ میں راحیلہ کو جوجی کے ٹھکانے پر لے آیا۔ اس کی حالت سنبھل گئی تھی۔ میں نظام شاہ اور لاکھا سے حساب چکتا کرنے کے لیے نور پور فارم ہاؤس پر پہنچ گیا۔ لاکھا وہاں پہنچا تو فوزیہ اس کے قبضے میں تھی۔ اس نے مجھے زخمی کر دیا۔ وہاں زبیر پہنچا اور ہماری مدد کی۔ میں نے لاکھا سمیت اس کے کئی ساتھیوں کو جہنم واصل کر دیا۔ شگفتہ آنٹی کو ان لوگوں نے ختم کر دیا تھا۔ فوزیہ کی حالت بری تھی۔ ہمارا بچہ اب نہیں رہا تھا۔ میں دفتر جا رہا تھا کہ میں نے جگی کو دیکھا۔ میں اس کا پیچھا کرتا ہوا ان کے ٹھکانے پر پہنچ گیا۔ وہاں نگہت سے میری ملاقات ہو گئی۔ بھانڈیل سائیں کے گماشتوں نے ہمیں دیکھ لیا اور وہ ہمیں ڈھونڈنے لگے۔ ہم وہاں سے نکل کر ایک ہوٹل پہنچ گئے۔ وہاں بوبورگا کے حصول کے لیے بلیک کیٹس اور ریڈ فاکس کے کارندے موجود تھے۔ وہاں دھینگا مشتی ہوئی اور ہم دونوں کارندوں کو اپنے ٹھکانے پر لے آئے۔ ان کے ساتھ وسیم بھی تھا۔ ہم نے انہیں ڈرایا تو وسیم نے اندر کی باتیں بتانا شروع کر دیں۔ ایک کارندہ میرے ہاتھوں مارا گیا۔ ہم بوبورگا کے حصول کے لیے وسیم کو لے کر نکلے۔ وہاں مارا ماری ہوئی۔ وسیم نے دھوکے سے ہمارے ایک آدمی کو مار دیا اور خود نکل بھاگا۔ وہاں جگی کے ساتھیوں سے ٹاکرا ہوا اور اس کا چیلا ہمیں قابو کر کے اپنے ٹھکانے پر لے آیا۔ میں نے وہاں چالاکی دکھائی اور جگی کو وسیم سے بدظن کر دیا۔ وہاں کچھ لوگوں نے دھاوا بول دیا اور مارا ماری میں نگہت کو گولی لگ گئی۔ تاہم نگہت کی جان بچ گئی۔ میں نے ٹکے چودھری کی گاڑی کا پیچھا کیا۔ انہوں نے سلیم کو اٹھایا تھا اور اسے مارنے والے تھے کہ میں نے اسے بچا لیا۔ میں اور سلیم، وسیم اور سجاد بیگ کی تلاش میں نکل پڑے۔ اچانک راستے میں کچھ لوگوں نے ہمیں چھاپ لیا اور میں بے ہوش ہو گیا۔ ہوش آنے پر انہوں نے تشدد کیا۔ انہوں نے انسپکٹر شیراز کی منگیتر کو بھی اٹھا لیا تھا۔ میں نے ان سے ڈیل کر لی اور وہاں سے نکل گیا تاہم میرے ساتھ ان کا ایک آدمی تھا۔ میں نے اسے ٹھکانے لگا دیا۔ اب میں دشمنوں کے ٹھکانے پر پہنچ گیا تھا۔ اچانک وہاں سیاہ سیڈان آ کر رکی۔ میری رگوں میں خون کی گردش تیز ہو گئی۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

اس دُہری اور خطرناک صورتِ حال پر چند ثانیوں کے لیے میں بھی ہکا بکا رہ گیا تھا۔ وہ دونوں نو وارد بھی حیران و پریشان میرا چہرہ تکتے رہے۔

"تم دونوں جلدی سے دوسرے کمرے میں جا چھپو، میں ان سے نمٹتا ہوں۔ خبردار! جب تک میں آواز نہ دوں، کمرے سے مت نکلنا۔"

میرے کہنے کی دیر تھی، وہ دونوں ایک کمرے کی جانب دوڑ گئے اور اندر داخل ہو کر دروازہ بھی اندر سے بند کر دیا۔

میں نے پستول جیب میں رکھا اور چیتے کی طرح لپکتا، چھپتا ہوا ہال نما لاؤنج کے ایسے گوشے میں جا دبکا جدھر سے میں خون کی لکیر والی جگہ کی سمت بھی دیکھتا رہوں اور بوقتِ ضرورت مرکزی دروازے پر بھی میری عقابی نظریں لگی رہیں۔

بلیک کیٹس (را) کا وہ ایجنٹ خاصا سخت جان ثابت ہوا تھا، تاہم مجھے تسلی تھی کہ ابھی خود اس کی حالت کسی خارش زدہ کتے سے کم نہ ہوگی اور وہ زخمی بھی خاصا ہو چکا تھا۔ فوری طور پر بردست مجھے اس سے کوئی خطرہ نہ تھا کیونکہ ابھی وہ اپنی متوقع موت سے راہِ فرار اختیار کرنے کی کوشش میں تھا۔ البتہ یہ ممکن تھا کہ اس نے بھی باہر گاڑی کی آواز سن لی ہو اور اسے اپنے دونوں ساتھیوں، نریندر اور ٹرومین کی آمد پر حوصلہ ہوا ہوگا۔

میں چاہتا تو خون کی لکیر کا تعاقب کر کے اسے دبوچنے کی کوشش کر سکتا تھا، اگر باہر یہ سیاہ سیڈان آ کر نہ رکتی۔ تاہم میں اب اپنے گرد و پیش سے انتہائی محتاط تھا۔

سیاہ سیڈان کا انجن بند ہوا، میں ٹوٹے ہوئے شیشے سے انہیں دیکھنے لگا۔ اب تک یہ لوگ سیاہ پوشی میں تھے مگر اس وقت میں ان کی چال ڈھال اور جسمانی ساخت سے پہچان گیا تھا کہ دونوں انہی تینوں کے ساتھ (لیڈر سمیت) گزشتہ شب شامل رہے تھے، جب ہم پر ہلّا بولا گیا تھا۔

میں نے دیکھا، ایک کی دائیں کلائی زخمی تھی جبکہ دوسرا اپنی بائیں ٹانگ سے لنگڑا کر چل رہا تھا۔ گویا ٹوٹی ہوئی کلائی والا نریندر اور زخمی ٹانگ والا ٹرومین تھا۔

اصل میں، میں یہ جاننا چاہتا تھا کہ انہیں اپنے زخمی ساتھی کی کال تو موصول نہیں ہوئی تھی، جو اپنے پیچھے خون کی لکیر چھوڑ کر اچانک اوجھل ہو گیا تھا۔ لیکن شاید ابھی اسے موقع نہ مل سکا تھا۔

میری تسلی ہو گئی۔ یکلخت میرے اعصاب تن گئے، وہ دونوں لڑکھڑاتے ہوئے اندر داخل ہو رہے تھے۔ ان کے انداز و اطوار سے محتاط روی بالکل بھی عیاں نہ تھی، جس کا مطلب تھا کہ ابھی انہیں میری یہاں موجودگی کے بارے میں علم نہ تھا لیکن پھر بھی مجھے اس زخمی کی جانب سے خطرہ تھا۔

تب ہی ہال سے لاؤنج کی مدھم فضا میں "بیپ" کی ہلکی ہلکی آوازیں اُبھریں۔ یکا یک میں چونکا۔ ان دونوں میں سے ایک کو کال موصول ہو رہی تھی۔ میں نے محتاط نظروں سے خون کی لکیر کی سمت کی طرف دیکھا جو پیچھے کچن کی جانب ختم ہو رہی تھی۔

ٹرومین نے اپنی کلائی میں بندھی ہوئی گھڑی کو یکدم اپنے چہرے کی طرف کر کے کال ریسیو کی اور ساتھ ہی کچھ کہا تھا۔

میری نظریں اس کے چہرے پر جمی رہ گئیں۔ دفعتاً وہی ہوا جس کا شبہ تھا، ٹرومین ایک دم اپنے ساتھی کو مخاطب کر کے چلّایا۔

"نریندر! خبردار، ایک دشمن ادھر ہی چھپا ہوا ہے، مجھے ابھی ڈوکر نے مطلع کیا ہے، وہ خود بھی زخمی ہے اور باغیچے میں چھپا بیٹھا ہے۔ اس مردود نے وکٹائی کو ہلاک کر دیا ہے۔"

دونوں نے پستولیں نکال لیں۔ میرے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ آ گئی۔ "شکاری خود یہاں شکار ہو گیا" والی صورتِ حال ہو گئی۔ "وکٹائی" شاید وہی تنومند شخص تھا جوان کا لیڈر تھا اور میرے ہاتھوں جہنم واصل ہو چکا تھا۔

یوں دو تین سیکنڈ ہی لگے تھے میرے بیلٹ سے پستول نکالنے اور تلے اوپر دو گولیاں فائر کرنے میں۔ سائلینسر لگے پستول کی نال سے دو شعلے نکلے، اس کے ساتھ ہی دونوں کراہ کر لڑکھڑائے۔ ان کے پستول والے ہاتھ زخمی ہو گئے اور دونوں کے آتشیں ہتھیار فرش پر دور جا پڑے تھے۔

تب ہی میں موت بن کر ان کے سامنے آ گیا۔ دوسرا کام میں نے یہ کیا کہ آواز دے کر ان دونوں بنگلے کے رکھوالوں کو فوراً بلا لیا۔ وہ لپک کر آ گئے۔

"تم دونوں کچن والے دروازے سے پیچھے جا کر باغیچے میں چھپے ہوئے ان کے ساتھی کو پکڑ کر لے آؤ مگر ہوشیار رہنا، اگرچہ وہ شدید زخمی ہے لیکن تربیت یافتہ ایجنٹ ہے۔"

مجھے فاتح پا کر ان دونوں کو بھی جوش آ گیا اور وہ تیزی سے کچن کی جانب لپکے۔ اس کے بعد میں ان دونوں کی طرف متوجہ ہوا۔ پستول کی لمبی نال کا رخ ہنوز ان کی طرف تھا۔ بڑے ہی زہرخند لہجے میں ان سے مخاطب ہو کر بولا۔

"تمہارا لیڈر میرے ہاتھوں ختم ہو چکا ہے، آخری کال میں نے ہی اس کے ٹرانسمیٹر پر تم سے وصول کی تھی۔"

میں نے تصدیق کرتے ہوئے دوسرا ہاتھ جیب میں ڈال کر وثنانی کا ٹرانسمیٹر جو میرے لیے بیکار ہو چکا تھا، ان کے سامنے فرش پر اچھال دیا۔ وہ دونوں پھٹی پھٹی آنکھوں سے فرش پر پڑی چھوٹی سی واچ کو یوں تکنے لگے جیسے اپنے لیڈر کی لاش کو گھور رہے ہوں۔

"تم دونوں زخمی بھی ہو اور میرے نشانے پر بھی، حقیقت تو تمہاری عیاں ہو ہی چکی ہے۔" میں نے گویا ان کا حوصلہ مزید کم کرتے ہوئے کہا۔ "میں تم سے کسی تعاون کا بھی محتاج نہیں ہوں، لہٰذا کوئی غلط حرکت تمہیں اپنی جان کی تلافی کی صورت میں ہی کرنی پڑے گی۔"

"کیا چاہتے ہو تم؟" ٹرومین نے زہر خند لہجے میں کہا۔

"دونوں خاموشی سے صوفے پر بیٹھ جاؤ، مجھے دوبارہ بولنا نہ پڑے۔" میں نے اس بار غرا کر کہا۔

"دیکھ نہیں رہے کہ ہم زخمی......"

زریندر نے پرطیش لہجے میں اتنا ہی کہا تھا کہ میرے پستول کی نال نے آتشیں سرگوشی کر ڈالی۔ وہ کراہا اور لڑکھڑا کر صوفے پر جا گرا۔ ٹرومین میری سفاکی بھانپتے ہی خود ہی صوفے پر جا گرا، مبادا اس کا حشر بھی زریندر جیسا ہو۔

"گڈ!" میں نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ "تم لوگوں کی گیم پٹ چکی ہے۔" میں بدستور ذہنی طور پر انہیں حوصلہ شکن کرتا رہا۔

اسی اثنا میں ان دونوں نو واردوں نے بڑا کام کر ڈالا۔ وہ زخمی کو دبوچ کر لے آئے تھے، بلکہ اسے ڈنڈا ڈولی کر کے لائے۔ وہ بے ہوش تھا۔

"یہ جی وہاں بے ہوش پڑا تھا۔ پتا نہیں مر تو نہیں گیا؟" وہ اسے فرش پر ڈال کر بولے اور پھر ان دونوں کی طرف دیکھا۔

"اے...... تم ذرا وہ ٹیلی فون سیٹ ادھر لانا۔" میں نے ایک نو وارد سے کہا۔ اس نے فوراً میرے حکم کی تعمیل کی۔ میں نے اسی وقت انسپکٹر شیراز سے رابطہ کرنے کی کوشش کی۔ کامیابی تو نہیں ہوئی البتہ ان کے خصوصی مخبر کی حیثیت سے کسی ذمے دار افسر کو اہلکاروں سمیت یہاں پہنچنے کا کہا اور سارے حالات بتا دیے۔ چونکہ پہلے بھی را اور موساد (بلیک کیٹس اور ریڈ فاکس) کے ایجنٹوں کو میں ان کی گرفت میں دے چکا تھا، اس لیے میرے کہنے پر فوری عمل ہوا۔

لوکیشن انہوں نے یہاں کے لینڈ لائن نمبر سے خود ہی ٹریس کر لی تھی۔ اس کے بعد میں نے استاد جوجی اور زبیر کو بھی اسی طرح کال کر کے بلوا لیا۔ زبیر میرے پہلے سے ہی دیے ہوئے نمبر کی مدد سے نتھی کی لوکیشن ٹریس کروا چکا تھا۔

تھوڑی دیر بعد آگے پیچھے یہ سب یہاں آن پہنچے اور میرا بوجھ ہلکا ہو گیا۔

☆☆☆

جوجی کے گھر میں خوب رونق لگی ہوئی تھی۔ نگہت اور کبیر رو بہ صحت تھے، سب وہیں جمع تھے۔ میرے اور جوجی سمیت فوزیہ، راحیلہ، چنبیلی، زبیر، پرویز، عارف، سب ہی تھے۔

لیکن ان سب میں گویا "مہمانِ خصوصی" سلیم تھا۔ اسے بھی نگہت اور کبیر کی طرح سامنے ہی ایک بیڈ پر لٹایا گیا تھا۔ اس کے دائیں پہلو پر موٹی سی بینڈیج بندھی ہوئی تھی۔ البتہ کبیر مسلسل احتجاج کر رہا تھا کہ وہ بیمار ہی کب تھا جو اسے یوں بدستور بیڈ ریسٹ کی "سزا" دے رکھی ہے۔

مگر یہ جوجی کا حکم تھا، ہم میں سے کوئی بھی اس کی سفارش کرنے سے قاصر تھا کیونکہ یہ ڈاکٹر کا حکم تھا۔ کڈنی ڈونیٹ کرنے کے بعد ڈاکٹروں نے ہی اسے دو ہفتوں کے بیڈ ریسٹ کی تاکید کر رکھی تھی۔ نگہت کا یہ دورانیہ ایک سے ڈیڑھ ماہ کا تھا۔

ابھی تھوڑی دیر پہلے سلیم کی کتھا سب نے بالخصوص میں نے بڑی دلچسپی اور حیرت سے سنی تھی۔ اس میں کوئی شک نہ تھا کہ سلیم کو زندہ پا کر اور سب کے ساتھ موجود دیکھ کر میرے دل و دماغ مسرت سی محسوس کر رہے تھے۔ یہ اتنے عرصے بعد پہلا موقع تھا کہ مجھے سلیم بہت اچھا اور دیگر جاں نثار ساتھیوں کی طرح "دلبر" سا لگ رہا تھا۔

وجہ اس کا وہ شاندار کارنامہ تھی جس پر سے تب ہی یقین آسکا تھا جب جوجی نے مجھے اس کی تفصیل بتائی تھی، جبکہ ابھی میری طرف سے ایک بات پوچھنا باقی تھی جو میرے لیے حیرت کا سبب بنی ہوئی تھی۔

لہٰذا میرے یہ پوچھنے پر کہ اس روز رات میں تاریک کمرے کی قید میں دشمنوں کے رحم و کرم پر سلیم کو وہ کیا گھاؤ لگایا گیا تھا، جس کے نتیجے میں وہ مزید کوئی آواز نکالے بغیر خاموش ہو گیا تھا اور میں دہل گیا تھا کہ کہیں وہ ہلاک تو نہیں کر دیا گیا۔ نیز میں نے یہ بھی دریافت کیا کہ آخر اس نے بعد میں اس قدر زخمی ہونے کے باوجود محکمہ گیرائی کے انسپکٹر شیراز کی منگیتر شاہینہ کو کیسے ان کی قید سے چھڑا کر خود بھی فرار ہوا...... وغیرہ۔

سب نے اس کی یہ کہانی بڑے غور اور دلچسپی سے سنی تھی، جو اس نے اپنے ہی لفظوں میں بیان کی تھی۔

"جب اس مردار (لیڈر) نے سہراب (مجھے) کسی

اندر سے روشنی آیا تو میں چلا اٹھا۔ اسی وقت کسی نے مجھ پر تاریکی میں وار کیا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے میرے پہلو میں کسی نے داغتی ہوئی سلاخ اتار دی ہو۔ میں کراہ کر نیم بے ہوش سا ہو گیا، پھر شاید مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔ مجھے انہوں نے مردہ سمجھ کر یا پھر یونہی دوسرے کمرے میں لا کر پھینک دیا۔ وہ کہتے ہیں نہ کہ مارنے والے سے بچانے والا زیادہ بڑا ہوتا ہے، مجھے بھی اللہ نے بچا لیا۔

''میرے پہلو میں بہت گہرا زخم آیا تھا۔ شکر تھا کہ اس کمرے میں کچھ روشنی تھی جو اس تنگ سے کمرے کے قدرے اونچائی پر موجود روزن سے آ رہی تھی۔ یہ شاید پو پھٹنے کا اجالا تھا۔ دوسرا یہ کہ میں بند کمرے میں قید تو تھا مگر میرے ہاتھ پاؤں آزاد تھے۔

''مگر میں نے دیکھا، میرے زخم سے خون بہے جا رہا تھا۔ مجھے تکلیف بھی محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے اپنے زخم کا جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ مجھے گولی ماری گئی تھی، شاید سائلنسر لگے پستول سے۔ گولی اندر پیوست تھی، اس نے شاید میرا جگر متاثر کر ڈالا تھا۔ اپنا بہتا خون دیکھ کر ہی انسان کے اوسان خطا ہونے لگتے ہیں لیکن میں نے ہمت و حوصلے سے کام لیتے ہوئے اپنی شرٹ پھاڑی، اس کی پٹی اپنے پہلو پر باندھ دی۔ پوری طرح تو نہیں، البتہ کسی حد تک خون بہنا کم ہوا۔

میں نے دروازے کی طرف دیکھا، وہ بند تھا۔ سپاٹ دروازہ تھا۔ میرے موزے میں ضرور کچھ نہ کچھ چھوٹا موٹا پرزہ رکھا ہوتا ہے۔ بس، یہ میری قوتِ ارادی تھی یا پھر جان بچانے کا جنون و حوصلہ تھا، میں دیوار کا سہارا لے کر اٹھا اور کسی طرح دروازے تک پہنچا۔ اس کے لیور کا اندازہ کیا پھر جراب کے اندر سے ایک پن نما سی تار نکالی اور اس لیور میں گھمانے لگا۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد دروازہ کھل گیا۔

''اتنی کامیابی ملنے کے بعد بھی میں نے کسی جلد بازی سے کام نہیں لیا اور پہلے باہر کی سن گن لی۔ کوریڈور ویران تھا، دوسرے کمرے سے مجھے اسی مردار لیڈر کے باتیں کرنے کی آواز آ رہی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ وہ سہراب (مجھ) سے مخاطب تھا۔ مجھے اندازہ تو تھا کہ سہراب کو ابھی فوری طور پر جان کا خطرہ نہیں تھا، میری اور بات تھی۔

''میں نے نکل کر دوسرے کمرے کی راہ لی۔ وہاں واش روم کیبنٹ میں حسبِ توقع مرہم پٹی کا سامان موجود تھا۔ سب سے پہلے میں نے چند منٹ صرف کر کے باقاعدہ اپنے زخم کا جائزہ لیا۔ شرٹ میں نے اتار دی تھی، اپنے دانتوں تلے ہونٹ دبا کر میں نے زخم کو ہاتھوں کی انگلیوں سے ہوا تو مجھے گولی کا آدھا حصہ اندر نظر آ گیا...... میں نے چاقو کی نوک سے بڑی مشقت سے بعد اسے نکال ڈالا۔ خون کا فوارہ اچھلا تھا مگر مجھے سکون مل گیا۔ وہاں میں نے مرہم لگا کر زخم بند کر دیا، پھر اوپر پٹی باندھ دی۔

''وہیں گولیوں کی شیشیاں بھی پڑی تھیں، ان میں پین کلر اور زخم کو خشک کرنے والی گولیاں بھی تھیں۔ شکر تھا۔ یہ سب ماضی کی میری تربیت میں شامل تھا ورنہ میں اتنا کچھ کہاں کر سکتا تھا۔

''یوں اب باقاعدہ اور ٹھیک طرح سے اپنے زخم کا اندمال کرنے کے بعد میری طبیعت بہتر ہوئی، میرا حوصلہ سوا ہوا اور میں کمرے سے نکلا۔ میرا ارادہ اب سہراب کو ان لوگوں کے چنگل سے آزاد کرانا تھا، لہٰذا جس کمرے سے مجھے آوازیں آ رہی تھیں، میں اسی طرف کو لپکا مگر شکر رہا کہ ابھی راہ میں ہی تھا کہ کمرے کا دروازہ اچانک سے کھلا۔ میں فوراً ایک دیوار کی آڑ میں چلا گیا۔

''کیا دیکھتا ہوں کہ انہی تینوں میں سے ایک سیاہ پوش کوئی وہیل چیئر دھکیلتے ہوئے دوسرے کمرے کی طرف لے جا رہا تھا۔ وہیل چیئر پر کوئی خاتون تھی۔ وہ بھی مجھے ان کی قیدی معلوم ہوئی۔ وہ شخص اسے دوسرے ایک کمرے میں بند کر کے دوبارہ تیز تیز قدموں سے واپس لوٹ گیا۔ میں اب عجیب مخمصے کا شکار ہو گیا کہ کیا کروں؟ آیا اس کمرے کی طرف بڑھوں جہاں سہراب اور وہ لوگ موجود تھے یا پھر اس وہیل چیئر والی مظلوم سی قیدی عورت والے کمرے کا رخ کروں؟

''بالآخر دوسرے خیال پر مجھے عمل کرنا پڑا، کیونکہ مجھے لگا تھا کہ وہ میری کچھ نہ کچھ مدد کر سکتی تھی۔ میں اس کمرے کا بھی دروازہ کھول کر کسی نہ کسی طرح اندر داخل ہو گیا۔ اس عورت سے ملا، اپنا حال سنایا اور جب اس کا حال سنا تو میں دنگ رہ گیا۔

''وہ انسپکٹر شیراز کی منگیتر شاہینہ کمال نکلی۔ چونکہ انسپکٹر شیراز کو میں بھی اس وقت سے جاننے لگا تھا جب سہراب، نکے چودھری کے ٹھکانے پر آیا تھا اور سریتا وغیرہ سے اس کا ٹکراؤ ہوا تھا۔ پھر سہراب نے قانونی طور پر مدد کے لیے انسپکٹر شیراز کو ہی فون کر کے بلایا تھا۔ بہرحال، میں نے شاہینہ کو حوصلہ دیا اور اسی کے مشورے سے میں اسے وہاں سے نکال لے گیا۔ راہ میں ایک دشمن کے ساتھی سے ٹکراؤ ہوا مگر میں اسے زیر کر کے، شاہینہ کو ساتھ لیے نکل بھاگا۔ اس کا

ہتوں بھی میں نے چھین لیا تھا۔

''سہراب کی مجھے کچھ زیادہ فکر نہ تھی، وجہ یہی تھی کہ شاہینہ نے مجھے بتادیا تھا کہ وہ سہراب سے کیا چاہتے تھے اور ابھی جلدی وہ اسے ہلاک کرنے کا بہرحال ارادہ نہیں رکھے ہوئے تھے۔ بہرحال، ہم دونوں کی ہی حالت نازک تھی، شاہینہ بیچاری کا حال مجھ سے زیادہ برا تھا۔ اس پر جسمانی تشدد کیا گیا تھا، خود میرے دائیں پہلو میں اس بھاگ دوڑ کے سبب اذیتیں مچی ہوئی تھیں۔ شاہینہ نے بتایا کہ قریب میں ایک پولیس اسٹیشن ہے، ہمیں کوئی سواری بھی نہیں مل رہی تھی، کیونکہ ابھی ہم کسی آبادی یا مین روڈ سے شاید کافی فاصلے پر تھے، دوسرے یہ منہ اندھیرے کا بھی وقت تھا۔ کسی سے لفٹ بھی نہیں مل پا رہی تھی کہ اچانک ملگجے ماحول میں کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹس نظر آئیں۔ ہم لفٹ کے لیے رک گئے لیکن جیسے ہی وہ گاڑی قریب آئی تو میں دھک سے رہ گیا۔ وہ وہی منحوس کار سیاہ سیڈان تھی۔

''ہم اب بھاگ نہیں سکتے تھے مگر اتنا ضرور کیا کہ نیم اندھیرے میں درختوں کے جھنڈ کی طرف چلے گئے لیکن ہم دیکھ لیے گئے تھے۔ گاڑی رکی اور اس کے ساتھ تیزی سے اس کے اندر سے دو گن بردار افراد (نریندر اور ٹرومین) نکلے۔ میں پہلے ہی انہیں نشانے پر لے چکا تھا اور تلے اوپر دو فائر اس مہارت سے کیے کہ دوسرے کو مجھ پر جوابی فائر کرنے کا موقع نہ مل پائے۔ لہٰذا نتیجے میں ایک کا ہاتھ زخمی ہوا مگر بدقسمتی سے دوسرے پر میرا نشانہ خطا چلا گیا۔ اس نے پوزیشن لے کر کار کی آڑ لینا چاہی تھی کہ میں نے پھر تاک کر تیسری گولی چلائی جو بھاگتے ہوئے اس کی ٹانگ پر لگی۔

''چونکہ اپنے ہتھیاروں سے دونوں ہی محروم ہو چکے تھے، اسی لیے وہ مقابلے پر ٹک تو نہ سکے مگر ٹلے بھی نہیں تھے۔ شاید انہیں اندازہ تھا کہ میں اور شاہینہ زخمی بھی تھے، یہ ہمارے لیے خطرناک اور نازک صورتِ حال تھی۔ اچانک ایک آواز پر میرے کان کھڑے ہوئے، قریب میں کسی گاڑی کے رکنے کی آواز آئی، انجن کے بھاری شور سے اندازہ ہوا کہ کوئی چھوٹا ٹرک یا ڈالا ہوگا۔ میرا اندازہ درست [illegible] تھا۔ میں شاہینہ اور خود کو [illegible] نکلا، وہ دودھ [illegible] سنبھالے ہوئے اس کی طرف بڑھا۔ ڈرائیور اندر [illegible] کلینر قسم کا لڑکا گاڑی کی ونڈ اسکرین صاف کر رہا تھا۔ شاید اس کے وائپر خراب تھے، ونڈ اسکرین پر شبنم کے سبب وہ دھندلا چکا تھا، گاڑی بھی پرانی ہی تھی۔ میں نے قریب جا کر ڈرائیور سے مدد چاہی اور شاہینہ کے بارے میں بھی بتایا کہ وہ

کون تھی [illegible] اور اس نے بڑی ہوشیاری دکھائے ہوئے؟ [illegible] جس کے بارے میں شاہینہ نے مجھے بتا رکھا تھا۔''

☆☆☆

ہم سب نے سلیم پھاپا کی اس دلیری کی بہت تعریف کی جبکہ انسپکٹر شیراز اور شاہینہ تو اس کے دل سے ممنون ہی رہے تھے۔ بہرکیف، سب مجرم گرفت میں آ چکے تھے جبکہ بنگلے کے رانا صاحب، جن کا پورا نام رانا نادر علی معلوم ہوا تھا، انہیں بھی تفتیش میں شامل کیا گیا تھا۔ بعد میں وہ بے گناہ ہی نکلے اور میرا کسی ''سہولت کار'' کا شبہ غلط نکلا لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہ تھا کہ میں اپنے اس خدشے سے غافل رہا۔ مجھے اب بھی یقین تھا کہ سجاد بیگ یا بھانڈیل سائیں کے ان لوگوں کی اعلیٰ قیادت سے خفیہ رابطے اب بھی ہوں گے۔ یہی وجہ تھی کہ ایک بار پھر میں نے راحیلہ اور زبیر کو بھانڈیل سائیں کی ریکی پر مستقل طور پر لگا دیا تھا جبکہ خود میں اکیلا سجاد بیگ کی تلاش میں سرگرداں ہوگیا۔

سلیم نے میرے ساتھ رہنے کی ضد کی تھی مگر میں نے اسے ڈاکٹروں کی تاکید کے مطابق گھر پر ہی بیڈ ریسٹ کے لیے رہنے دیا تھا، البتہ جوجی نے خود میرے ساتھ چلنے کی حامی بھری تھی مگر میں نے اسے بھی منع کر دیا۔

''آئی شاوشے! یار اور نہیں تو کم از کم پرویز یا عارف کو ہی لے جا اپنے ساتھ۔'' جوجی نے کہا۔

''نہیں جوجی!'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ''تم بس گھر پر ہی خود کو یا اپنے کسی ساتھی کو موجود رہنے دینا، کیونکہ ضرورت پڑنے پر کبھی بھی مجھے فون پر کمک بلانا ہی پڑتی ہے، جیسا کہ پیش آمدہ حالات میں ہوا۔'' تھوڑے توقف کے بعد دوبارہ کہا۔

''ابھی تو میڈم پچھی اور اس کے تلنگے گربھ داس کو تلاشنا ہے۔''

''وہ تو ظاہر ہے۔ یار! ہم یہاں الرٹ ہی رہتے ہیں۔'' جوجی نے کہتے ہوئے تسلی دی۔ ''لیکن اگر تو کہے تو میں پچھی اور گربھ داس کی تلاش میں نکل جاتا ہوں۔''

''نہیں۔'' میں نے فوراً انکار میں سر ہلایا۔ ''مجھے یقین ہے [illegible] دونوں ابھی کسی کونے کھدرے میں دبکے ہوئے اپنے [illegible] کے دوران میں [illegible] زخم چاٹ رہے ہوں گے۔ [illegible] یہ فریضہ انجام دوں گا میرے ذہن میں ایک پلان ہے۔''

جوجی نے اپنے سر کو اثباتی جنبش دی۔ میں سہ پہر میں بائیک پر نکل گیا۔ بھرا ہوا پستول میں نے رکھ لیا تھا،

باقی چھوٹے موٹے ہتھیار، چاقو وغیرہ اس پر سوا تھے، جن میں قابلِ ذکر فولادی کانٹوں والا "پنچ کلپ" بھی تھا۔ یہ جوجی نے مجھے خصوصی طور پر دیا تھا۔

کچھ دنوں سے میں ایک اور اہم شے کی ضرورت محسوس کررہا تھا، جس کے بارے میں سوچ رکھا تھا کہ آئندہ اسے بھی ساتھ رکھا کروں گا مگر ہر بار بھول جاتا تھا۔ وہ ایک چھوٹا سا کیسٹ ریکارڈر پلیئر تھا۔ جیسا کہ مذکور ہو چکا، یہ اس زمانے کی داستان ہے جب نیٹ یا اسمارٹ فون وغیرہ نہیں ہوا کرتے تھے اور نہ ہی سی ڈی پلیئر۔ اسے میں نے جیکٹ کی بیرونی سائڈ پاکٹ میں رکھ لیا تھا، باقی چاقو پنڈلی میں اور پستول جیکٹ کی اندرونی جیب میں تھا۔

مجھے سجاد بیگ کی تلاش تھی اور اس رات میں اور سلیم اسی کی تلاش میں نالا ڈیک والے چودھری جی برادران کے خفیہ ٹھکانے کی طرف جارہے تھے کہ راستے میں ان تینوں ایجنٹوں سے خوفناک ٹکراؤ ہو گیا تھا۔

میں مین روڈ سے مضافات کی طرف نکل آیا اور دائیں جانب نالا ڈیک والے کچے راستے پر اتر گیا۔ یہ علاقہ شہری آبادی سے زیادہ دور نہ تھا۔ دائیں جانب کسی نہر کا بلند پشتے والا کراڑا تھا اور بائیں جانب چھوٹے بڑے ٹیلے ٹبوں کا سلسلہ، جہاں کہیں کہیں خودرو جھاڑیاں اور درخت بھی پھیلے ہوئے نظر آتے تھے۔

میں بائیک کو درمیانی رفتار سے دوڑا رہا تھا۔ مطلوبہ مقام سے ابھی میں ایک آدھ میل ہی دور تھا کہ اچانک میری بائیک کا پچھلا ٹائر پنکچر ہو گیا، مجھے بائیک روکنا پڑی۔ نیچے اترا، بائیک گھسیٹتا ہوا ذرا سائڈ پر کی اور اسے ڈبل اسٹینڈ پر لگا دیا۔ پچھلے ٹائر کا جائزہ لیا تو وہ بالکل پچکا ہوا نظر آیا۔ بائیک کے سائڈ کور کے اندر ٹول بکس تھا، اسے کھولا۔ اس سے پہلے ٹول بکس میں پنکچر کا سامان نہ ہونے کے برابر ہوا کرتا تھا لیکن چونکہ مجھے اکثر و بیشتر دور دراز کا سفر کرنا پڑتا تھا، اسی لیے میں نے اس کے ٹول بکس میں پنکچر کا سامان بھی رکھنا شروع کر دیا تھا۔

میں نے ایک گہری سانس لے کر گرد و پیش کا جائزہ لیا، ہر طرف ویرانی تھی۔ سہ پہر تھی، کھلے علاقے کی وجہ سے سردی بھی بہت تھی۔ میں نے ٹائر کھولا، ٹیوب نکالی، چھوٹے ائر پمپ سے ہوا بھر [illegible]

[illegible] پنکچر دیکھنے کے لیے میں نے ذرا نشیب میں اتر کر ایک قدرتی جوہڑ کے پانی میں ٹیوب ڈبو کر پنکچر دیکھا۔ شکر رہا کہ ایک ہی پنکچر تھا۔ اس پر نشان لگایا اور ابھی پلٹنے ہی والا تھا کہ اچانک میری نگاہ دائیں جانب پڑی، جدھر خودرو جھاڑیوں کا سلسلہ نشیب سے جوہڑ تک آرہا تھا۔ وہاں مجھے جوہڑ کے کنارے پر کسی کار کی جھکی ہوئی ڈکی دکھائی دی، جس کا بونٹ والا حصہ پانی کے اندر ڈوبا ہوا تھا۔ میں بری طرح ٹھٹکا۔ ایسا ہی لگا تھا جیسے کار بے قابو ہو کر کچے راستے سے دوڑتی ہوئی بے قابو ہو کر نشیب میں جوہڑ کے اندر جا پڑی ہو۔ ڈکی دھول مٹی میں اٹی پڑی تھی۔

میں نے ٹیوب وہیں پھینکی اور اس طرف کو بڑھا۔ دفعتاً ہی مجھے قریب جھاڑیوں میں کسی کے کراہنے کی آواز سنائی دی، میں اس طرف لپکا۔ دیکھا تو جھاڑیوں سے کسی کی ٹانگ نظر آئی، اس نے پتلون پہن رکھی تھی۔ جھاڑیاں پرے کر کے میں نے اس کے درمیان ایک زخمی انسانی وجود کو دیکھا۔ وہ خون میں لت پت نظر آیا۔ کیچڑ، گارے سے اس کا چہرہ بھی اٹا پڑا تھا۔ میں نے اسے کھینچ کر جھاڑیوں کے جھنڈ سے نکالا تو پتا چلا کہ اس پر فائرنگ کی گئی تھی۔

اچانک ہی میرا دماغ اس وقت بھک سے اڑ گیا جب میں نے اس زخمی انسانی وجود کا اچھی طرح جائزہ لیا۔

یہ زخمی شخص وسیم تھا۔

☆☆☆

جائزہ لینے پر معلوم ہوا کہ اسے دو گولیاں لگی تھیں، ایک بازو میں پیوست تھی اور دوسری دائیں کندھے سے آر پار ہو گئی تھی۔

مجھے حیرت ہوئی، نہ جانے اس کے ساتھ یہاں ایسا کون سا واقعہ پیش آیا تھا۔ لگتا ایسا ہی تھا جیسے کسی نے اس کی کار کا تعاقب کیا ہوگا، پھر یا تو اس کی کار کا ٹائر برسٹ ہوا یا وہ بے قابو ہو کر نیچے جوہڑ میں جا پڑی۔ وسیم نے وہاں سے نکل کر بھاگنے کی کوشش کی ہوگی لیکن تعاقب کرنے والوں نے اسے پھر بھی نہیں چھوڑا اور اسے گولیاں داغ کر لوٹ گئے تھے۔

میں نے جلدی جلدی پانی کے چھینٹے اس کے چہرے پر مارے، اسی سے چہرہ دھویا۔ وہ نیم بے ہوشی کی حالت میں تھا، فوری طور پر میں اس کے لیے کچھ نہیں کر پا رہا تھا۔ اور یب قریب میں بھی مدد کے کوئی آثار نظر نہیں آتے تھے۔ میں اسے ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگا، پینے کے لیے میں بائیک میں موجود تھیلے سے [illegible] [illegible] لے آیا۔ میں نے اس کے خشک پڑتے ہونٹوں کو ذرا وا کر کے اندر چند گھونٹ انڈیلے۔ حلق تر ہوا تو اسے کچھ ہوش آنے لگا۔ مری مری سی ادھ کھلی آنکھیں بھی کھولیں مگر ان کی چمک ماند تھی۔

پوری طرح سے پھر بھی وہ ہوش میں نہ آسکا۔ میں نے ہونٹ بھینچ لیے۔ اس کی کار جوہڑ میں آدھی ڈوبی پڑی تھی،

میری بائیک پنکچر تھی۔ یوں بھی میں اسے بھلا بائیک پر کیسے لے جاسکتا تھا۔ اسے چھوڑ کر میں اوپر راستے پر آگیا۔ دیکھا، چند دیہاتی عورتیں سر پر ٹوکرے رکھے اسی طرف چلی آرہی تھیں۔ یہ چار پانچ کے قریب تھیں، ان میں دو ادھیڑ عمر اور باقی جوان تھیں، البتہ ایک عورت ان سے ذرا پیچھے چلی آرہی تھی۔ اس کے ہمراہ ایک دس بارہ سالہ لڑکا بھی تھا۔ اسی عورت کی نگاہ جانے کیسے ڈوبی ہوئی کار پر پڑی تھی، اسی لیے اس نے چلا کر خود سے آگے چلنے والی ساتھی عورتوں سے کچھ کہا تھا۔

اس کی آواز پر سب کی سب یکدم ٹھہر گئیں اور پیچھے مڑ کر اس کی طرف دیکھنے لگیں۔ آخر الذکر عورت اسی بڑے سے جوہڑ کی طرف اشارہ کررہی تھی۔ سب بھاگی بھاگی اس طرف کو گئیں۔ میں بھی ان کے قریب جا پہنچا، وہ مجھے حیرت اور شک کی نگاہوں سے دیکھنے لگیں۔ میں نے انہیں جلدی جلدی بتایا کہ میں اس طرف سے گزر رہا تھا، میری بائیک پنکچر ہوگئی، پانی کے لیے نیچے گیا تو جوہڑ میں کار ڈوبی دیکھی، پھر کراہنے کی آواز پر میں چونک گیا۔ اب وہ زخمی پڑا تھا، اسے فوری طبی امداد کی ضرورت تھی۔

شکر تھا کہ عورتیں سمجھدار نکلیں، وقت ضائع کیے بغیر ایک عورت نے سر پر رکھا ٹوکرا نیچے پھینکا اور اپنے دونوں ہاتھوں کا بھونپو بنا کر کسی کو ''وے ڈنگرے'' کہہ کر پکارنا شروع کردیا۔

تھوڑی دیر بعد ایک جوان مرد لنگی سنبھالے بھاگا بھاگا کچے راستے کے دوسری جانب سے نمودار ہوکر قریب آگیا۔ مذکورہ عورت نے اس سے بیل گاڑی لانے کو کہا۔

جب تک میں انہیں نشیب میں لے آیا۔ وسیم بے ہوش تھا، ذرا دیر بعد ''ڈنگرا'' نامی وہ نوجوان ایک بیل والی گاڑی دوڑاتا ہوا لے آیا۔ اس پر بچھونے کے طور پر گھاس پھوس اور پرال رکھی تھی۔ اسی نوجوان کے ساتھ مل کر میں نے وسیم کو گاڑی پر ڈالا۔

وہی عورت جو زیادہ ایکٹیو اور سمجھدار نظر آتی تھی، اسی نے بتایا کہ زخمی کو حکیم لالہ جی کے مطب پر لے جانے کا کہا ہے۔ میں نے اس سے اتا پتا پوچھ لیا اور کہا کہ میں بھی پنکچر لگا کر بائیک پر وہیں پہنچتا ہوں...... وغیرہ۔

یہ سارا معاملہ کرنے کے بعد میں نے جلدی جلدی ٹائر میں پنکچر لگایا۔ یہ سب جلدی جلدی نمٹانے کے بعد میں نے اسی قریبی دیہات کا رخ کیا جدھر حکیم لالہ جی کا مطب تھا۔ پوچھتا پاچھتا میں وہیں پہنچا۔ بیل گاڑی باہر ہی کھڑی نظر آگئی، جس کا مطلب تھا وسیم کو اندر [illegible] لایا گیا تھا۔ میں بھی اسی طرف کو بڑھا۔ مطب نما [illegible] کا ٹھکانا سا نظر آیا، ایسا لگا کہ اس [illegible] دیہات میں حکیم صاحب مشہور تھے۔ اب اس دور دراز مقام پر [illegible] تھا۔ ایک زخمی کو کچھ تو ابتدائی طبی امداد مل جاتی، [illegible] خیال تھا کہ یہاں کوئی ایسی مدد ملتی۔

ایک نوعمر سے لڑکے نے مجھ سے آنے کا مقصد پوچھا۔ جب میں نے اسے بتایا کہ میں اس زخمی شخص کے ساتھ ہوں جسے ابھی بیل گاڑی پر یہاں لایا گیا ہے تو اس نے فوراً مطب کے پچھواڑے والی کوٹھری کی جانب اشارہ کردیا۔

میں وہاں پہنچا، اندر وہی عورت اور ''ڈنگرا'' نامی جوان موجود تھے جو وسیم کو یہاں لائے تھے۔ ایک پچکی سا ادھیڑ عمر شخص بھی دیکھا، غالباً یہی حکیم صاحب تھے۔ انہوں نے قراقلی ٹوپی پہن رکھی تھی، نیچے شلوار کرتہ، اوپر سیاہ کوٹ، موٹے سیاہ فریم والی عینک جو دھاگے سے کانوں پر اٹکا رکھی تھی۔ عجیب ہی وضع قطع تھی حکیم صاحب کی بھی۔

وسیم کو ایک چارپائی پر لٹا کر وہ بڑے غور سے اس کے زخموں کا جائزہ لے رہے تھے، پھر انہوں نے سیدھے ہوکر لڑکے کو آواز دی اور اسے کچھ سامان لانے کا کہا، پھر مجھ پر نگاہ پڑی اور باریک سی آواز ان کے حلق سے برآمد ہوئی۔

''آپ کی تعریف؟''

میں نے پہلے سلام کیا پھر اپنا کوئی فرضی نام بتا کر کہا۔ ''وہ جی، میں پاس والی نہر سے گزر رہا تھا، میری بائیک پنکچر ہوگئی تھی، تب ہی میری نظر نیچے نشیب میں جوہڑ پر پڑی تو ایک کار ڈوبی ہوئی دکھائی دی۔ میں نیچے گیا تو یہ زخمی شخص مجھے جھاڑیوں میں گرا ہوا نظر آیا۔ اسی دوران یہ لوگ (میں نے پاس کھڑی دیہاتی عورت اور ڈنگرے کی جانب اشارہ کیا) مل گئے اور انہی بھلے مانس بہن، بھائی کی مدد سے ہم اسے یہاں لاسکے۔''

حکیم نے میری بات توجہ سے سنی، سر کو اثباتی جنبش دی، اسی دوران میں نے وسیم کی خیریت بھی پوچھ لی۔

''میاں! کیا نام بتایا تھا تم نے اپنا؟'' کہتے ہوئے وہ اپنی عینک کا دھاگا یوں درست کرنے لگے جیسے کوئی حسینہ اپنی زلف گرہ گیر کو یونہی چھوتی ہے۔

''طفیل!'' میں نے وہی فرضی نام یاد دلایا۔

''ہاں، میاں طفیل! بات یہ ہے کہ یہ کیس دشمنی کا لگتا ہے، ظاہر ہے پولیس کو بھی مطلع کرنا ہوگا لیکن میں زخمی کو ابتدائی طبی امداد دینے کی کوشش کرلیتا ہوں تاکہ بعد میں

اسے شہر کے کسی بڑے اسپتال لے جایا جاسکے، یہ کام پولیس کرلے گی۔ لہٰذا جب تک تم قریبی تھانے میں اس کی رپورٹ درج کروا آؤ۔''

حکیم صاحب کی بات پر میں سخت اُلجھن کا شکار ہوگیا۔ مجھے سوچتا پا کر وہ پرتشکیک لہجے میں بولے۔

''کیوں میاں طیفی! کوئی مسئلہ ہے؟ سوچ میں پڑ گئے تم تو۔'' مجھے اپنے فرضی نام کے بگاڑ پر کوئی اعتراض نہ ہوا، البتہ حکیم صاحب خالص لکھنوی انداز میں مخاطب تھے۔

میں نے کہا۔ ''نن...... نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں، بس ذرا وہ...... میں کورٹ کچہری سے بچنا چاہ رہا تھا۔'' میں نے سر کھجاتے ہوئے کہا۔ اس دوران وہ دیہاتی عورت اور ڈنگرا نامی مرد پولیس تھانے کا سن کر وہاں سے گولی کی طرح رفوچکر ہوگئے۔ میں انہیں روک سکا نہ ہی حکیم صاحب، کیونکہ مدعا سمیت میں جو وہاں موجود تھا۔

''میاں! جب تم نے انسانی ہمدردی کے ناتے کوئی نیک کام کیا ہی ہے تو اسے اختتام تک بھی پہنچانے کا آخری فرض نبھادو۔ جاؤ شاباش! میں اپنے لڑکے کو تمہارے ساتھ بھیج دیتا ہوں۔'' حکیم صاحب نے مجھے گویا کسی بچے کی طرح پچکار بھی دیا۔ میرا منہ کھلا رہ گیا لیکن پھر فوراً ہی میں نے کہا۔

''ضرور...... ضرور حکیم صاحب! میں اپنا فرض پورا نبھاؤں گا، مجھے اس غریب کی بھی فکر ہے۔ یہ بچ تو جائے گا نا؟ اس کی حالت......''

''میاں طیفی! اس کی فکر نہ کرو تم۔'' حکیم صاحب فوراً میری بات کاٹ کر بولے۔ ''تم میرے بارے میں نہیں جانتے مگر یہاں پورے چک میں ہی نہیں، آس پاس کے علاقوں میں بھی میرے نام کی شہرت ہے۔ میں جراحی بھی کرلیتا ہوں، تم بس قانونی کام نمٹا آؤ پہلے۔''

میں سمجھ گیا حکیم صاحب اصول کے سخت ہیں، ایسے میری جان نہیں چھوڑیں گے، جبکہ مجھے وسیم کے ساتھ رہنا تھا، اس سے پوچھنا تھا کہ اس کے ساتھ ہوا کیا تھا اور کن لوگوں نے اس کے ساتھ یہ سب کیا تھا۔ دوسرا خیال میرے اندر یہ بھی پرورش پانے لگا تھا کہ یقیناً یہ نالا ڈیک والے ٹھکانے سے بھاگا ہوگا، کوئی ایسا واقعہ وہاں پیش آیا ہوگا جس کے سبب اسے وہاں سے بھاگنا پڑا، مگر کیا؟ وہ کیا معاملہ ہوسکتا تھا؟ یہی اسرار بھری تھی مجھے بے چین کیے ہوئے تھی۔ وسیم سے مجھے نئے اور سنسنی خیز انکشافات کی توقع تھی۔

بہرکیف، میں حکیم صاحب کے کہنے، بہ الفاظِ دیگر ضد کی وجہ سے اس لڑکے کے ہمراہ تھانے جا پہنچا۔ حکیم صاحب نے بھی اپنے لڑکے کو شاید سمجھا بجھا کر ہی میرے ساتھ روانہ کیا تھا کیونکہ جب تک میں نے پورا اور سچ بیان نہیں دے دیا، لڑکا بھی وہیں جما رہا تھا، اس کے بعد وہ لوٹ گیا۔

میں بھی اسی بات کا منتظر تھا۔ تھانہ انچارج کوئی اے ایس آئی تھا، مجھے ''لپیٹنے'' کے چکروں میں تھا۔ تب میں نے نہایت سنجیدگی سے خفیہ پولیس کے مخبر کی حیثیت سے اپنا تعارف کروایا اور محکمہ گیرائی جیسے حساس محکمے اور دوسرے کی طرف سے خصوصی جاری کردہ۔ اپنے نام کا کارڈ بھی اسے دکھایا تو اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ وہ مجھے غیر یقینی نظروں سے گھورنے لگا۔ میں نے اسے انسپکٹر شیراز کو فون کرنے کا کہا تو تب جا کر وہ مرعوب ہوا۔

انسپکٹر شیراز سے بات کرنے کی دیر تھی کہ تھانہ انچارج میرے آگے یوں بچھ گیا جیسے وہ نہیں، میں تھانہ انچارج ہوں۔

انسپکٹر شیراز نے اسے سختی سے میرے بارے میں تاکید کردی تھی کہ جیسا میں چاہوں ویسا کرنا ہے۔

''جی سر! حکم کریں، ہم کیا کرسکتے ہیں آگے؟'' سب انسپکٹر جس کا نام مجھے بعد میں توفیق معلوم ہوا تھا، مؤدبانہ بولا۔

''زخمی کا نام صیغۂ راز میں رکھا جائے، جوہڑ والی جگہ سے اس کی گاڑی نکلنے کا انتظام کرو۔ زخمی، حکیم صاحب کے مطب میں موجود ہے، ایک گاڑی کا بندوبست کرو، اسے اسپتال پہنچانا ہوگا۔'' میں نے اسے ہدایات دیں۔ اس نے فوراً دو اہلکار ایک گاڑی سمیت میرے حوالے کردیے۔

میں اسی گاڑی میں جب پورے ٹھسکے کے ساتھ حکیم صاحب کے مطب پر دوبارہ پہنچا تو حکیم صاحب کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔ میرا ''پروٹوکول'' دیکھ کر یقیناً انہیں حیرت ہوئی تھی۔

وسیم کچھ ہوش میں آچکا تھا۔ حکیم صاحب واقعی اپنے کام کے ماہر تھے، ورنہ تو میں ڈر ہی رہا تھا کہیں وہ ''نیم حکیم خطرۂ جان'' نہ ثابت ہوں۔ یوں بھی پنجاب کے حکیموں کی شہرت کم نہ تھی۔

وسیم ہوش میں آگیا تھا لیکن میں ابھی اس کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ جب میں نے دیکھا کہ وسیم کی حالت خطرے سے باہر ہے بلکہ وہ بات بھی کرنے کے قابل ہوگیا ہے، کچھ دوائیاں حکیم صاحب نے سمجھا کر میرے حوالے کردی تھیں، تو میں نے اپنے پروگرام میں تھوڑی سی تبدیلی کردی۔ اسے شہر لے جانے کے بجائے سیدھا تھانے ہی لے آیا۔ سب انسپکٹر توفیق مجھے دوبارہ دیکھ کر اٹینشن ہوگیا۔

تب نے اسے ہدایت کی کہ زخمی کو پوری طرح ہوش آ گیا ہے، اسے الگ کمرے میں پہنچا دیا جائے، میں وہاں اس سے کچھ پوچھ گچھ کرنا چاہتا ہوں، وغیرہ۔

فوراً ہی اس پر عمل کیا گیا اور اب میں ایک خالی کمرے میں وسیم کے سامنے موجود تھا۔ اسے چارپائی پر ڈال کر وہاں لٹا دیا گیا تھا، اس کے سامنے ایک کرسی میرے بیٹھنے کے لیے رکھ دی گئی۔

وقت سہ پہر سے کچھ اوپر ہو چلا تھا، کمرے میں لائٹ آن کر دی گئی تھی۔ وسیم پوری طرح ہوش میں آ چکا تھا اور اس کے چہرے پر الجھن آمیز حیرت کے ساتھ پریشانی کے آثار بھی نظر آئے۔ یقیناً اس کی وجہ میری یہاں موجودگی ہی ہو سکتی تھی۔ تاہم میں نے ہولے سے کھنکھارنے کے بعد انتہائی سنجیدگی سے اسے بہت مختصر الفظوں میں سب بتا دیا۔ تب اس کا چہرہ کچھ پرسکون سا ہوا لیکن الجھن اور پریشانی کی رمق بدستور اس کی آنکھوں سے جھلکتی رہی۔ یہ سب سننے کے بعد بھی اس نامراد نے میرا شکریہ تک ادا کرنا ضروری نہیں سمجھا تھا۔ وہ چپ تھا۔

''کیا واقعہ پیش آیا تھا تمہارے ساتھ؟'' میں نے اس کی جانب گھورتے ہوئے سوال کیا، ساتھ ہی میں نے اس کی نظر بچا کر اپنی بیرونی جیکٹ میں موجود ریکارڈر کا بٹن آن کر دیا تھا۔

''میں اپنے گھر جانا چاہتا ہوں۔'' اس نے میری بات کا جواب دیے بغیر اکھڑ پن سے کہا تو میرا دماغ بھی بھنا گیا۔ اسی لہجے میں غرا کر بولا۔

''یہ تمہارے باپ کی چھت نہیں ہے جس کے نیچے سے تم بہ آسانی کھسک جاؤ گے۔ یہ پولیس تھانہ ہے اور انسپکٹر نے تمہارا بیان لینا ہے۔''

اس نے چونک کر میری جانب دیکھا۔ شاید اسے میرے ایک دم برہم ہونے کی توقع کم ہی تھی۔ ایک گہری سی سانس لے کر وہ چپ ہو رہا۔

''میں نے تم سے کچھ پوچھا تھا؟'' میں نے خشک لہجے میں یاد دلایا۔

''انسپکٹر مجھ سے سوال پوچھنے کیوں نہیں آیا؟''

اس کی ہٹ دھرمی پر اب میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور میں ایک جھٹکے سے اٹھا، پھر اس کے لیٹے لیٹے اس کی گردن ایک ہاتھ سے دبوچ لی۔

''ذلیل! نخرے دکھا رہا ہے، شکر نہیں کر رہا کہ میں نے تجھے کتے کی موت مرنے سے بچایا، ورنہ تیری لاش ادھر ویرانے میں پڑی گدھوں اور [illegible] کی خوراک بن چکی ہوتی۔'' میری آنکھوں سے شعلے برسنے لگے اور [illegible] ہو گیا۔

اس کے حلق سے پھنسی پھنسی آواز خارج ہونے لگی۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا، میں نے اس کی گردن چھوڑ دی۔ وہ ایک ہاتھ سے اسے مسلنے لگا پھر میری جانب نفرت اور عداوت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے استہزائیہ بولا۔

''کیا ہوتا پھر؟ تم سیدھے جیل چلے جاتے۔ بھول گئے، میں نے کورٹ میں تمہارے خلاف پہلے ہی جان کے خطرے کی رٹ جمع کروا رکھی ہے۔''

بڑی مشکل سے میں نے خود کو روکے رکھا تھا، ورنہ اس کی یہ بات سن کر میرا خون کھول اٹھا تھا۔ میں کسی آتش فشاں ہی کے مانند پھٹ پڑتا اور اس حالت میں بھی اس کی درگت بنانے سے باز نہ آتا لیکن چونکہ یہ تھانہ تھا اور پھر موقع محل بھی کچھ ایسا نہ تھا کہ یہاں میں کسی قسم کا ہنگامہ بپا کرتا۔ میں اس کے رویے سے بھی اب یہ خوب سمجھ رہا تھا کہ وہ جان بوجھ کر کسی مقصد کے تحت مجھے ری ایکٹ کروانا چاہ رہا تھا، ورنہ ان حالات اور اس ''حالت'' میں کون اس قسم کے ڈھیلے پن کا مظاہرہ کرتا ہے۔ لہٰذا میں نے ایک گہری سانس لے کر اپنے طیش پر قابو پانے کی کوشش کی اور دوبارہ کرسی پر بیٹھ گیا پھر اس کی طرف دیکھ کر سرد مگر ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولا۔

''تمہیں شاید اس بات کا احساس نہیں کہ تم دھیرے دھیرے خود کو موت کے گڑھے کی طرف دھکیل رہے ہو، تم روز بروز اپنے دشمنوں میں اضافہ ہی کر رہے ہو۔ بومبورگا کا مجسمہ تمہارے لیے اتنا اہم کیوں ہے، میں اس کی وجہ جانتا ہوں مگر یاد رکھو وسیم! وہ ایک انتہائی منحوس کالا پتھر ہے، جس نے اب تک تمہارے اپنے باپ سمیت نہ جانے کتنوں کی جان لے لی اور مزید کب تک یہ خونی کھیل چلتا رہے گا۔''

''مقصد کی بات کرو۔'' وسیم نے میری بات کاٹ دی۔

''تمہارے ساتھ صادق آباد کے ان دونوں چودھری بھائیوں کے نالا ڈیک والے ٹھکانے میں کیا واقعہ پیش آیا تھا؟'' میں نے بھی اگلے ہی لمحے پوچھ لیا۔

''تمہیں اس سے مطلب؟'' وہ پھر ڈھٹائی دکھانے لگا۔

''مطلب اس لیے ہے کہ میں خود سجاد بیگ کی تلاش میں ہوں اور اس کی طاقت کو کمزور کرنا چاہتا ہوں۔'' میں نے طیش میں آئے بغیر اس کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔ میں نے محسوس کیا، اس کے چہرے پر ہٹیلے پن کی لکیریں ذرا کچھ کم ہوئی تھیں۔ میں نے بیان جاری رکھا۔

''اب بومبورگا کے مجسمے کے بل بوتے پر وہ مزید

طاقت پکڑے گا، غیر ملکی ایجنٹوں سمیت وہ کراچی کی طرح یہاں بھی اپنا اثر رسوخ قائم کرنے کی کوشش کرے گا، جس میں اس کا پہلا حریف گڑھ مولا کا بھانڈیل سائیں ہے۔ دونوں چودھری برادران ہیں، جنہیں اس نے بڑی مکاری سے اپنے حریفوں سے لڑوا کر الگ تھلگ کر لیا ہے۔ اب اس وقت تم اگر اپنے اندر عارضی طور پر ہی سہی، صرف مشترکہ مفادات کی ہی خاطر میرا تھوڑا ساتھ دو تو نہ صرف اس گمبھیر اور خطرناک صورتِ حال سے تم بھی چھٹکارا پا سکتے ہو بلکہ بومبورگا بھی تمہارے قبضے میں ہوگا۔''

یہ لالی پوپ دے کر میں چپ ہو رہا اور اپنی گفتگو کی اثر پذیری کو اس کے چہرے اور آنکھوں سے بھانپنے کی کوشش کرنے لگا۔ حسبِ توقع اس کے خاطر خواہ نتائج دکھائی دیے، ساتھ ہی میں نے احتیاطاً اپنی جیکٹ کی بیرونی جیب کو ہولے سے تھپتھپایا۔

پہلے تو اس کا چہرہ سُت کر رہ گیا اور سارا غرور اور اکڑ بھاپ بن کر جاتی رہی، کیونکہ میں نے کچھ اتنا غلط بھی نہ کہا تھا جس کا ادراک اسے بھی تھا۔

''تم کیا کرلو گے؟'' بالآخر اس نے میری طرف دیکھ کر کہا۔ ''ہمارا مشترکہ مفاد کیا ہوسکتا ہے بھلا؟ بومبورگا صرف میری ملکیت ہے، تم اس میں اپنا حصہ کیوں ڈالنے کی کوشش کر رہے ہو؟ اگر تم میری کمزوری......''

''غلط......!'' اسے پٹڑی پر آتے دیکھ کر میں نے درمیان میں کہا۔ ''اس منحوس کالے پتھر پر میں پہلے بھی لعنت بھیجتا تھا اور اب بھی بھیجتا ہوں۔ مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں رہی ہے، اگر ہوتی تو کیا تم بھول گئے...... میری بنگلا دیش والی مہم کے بارے میں تو تمہیں علم ہوگا ہی، میں نے اسے خلیج بنگال کے گہرے پانیوں میں غرق کر دیا تھا۔''

''ہاں، اس پر مجھے حیرت ہوتی ہے۔'' وہ اب بتدریج دھیما پڑنے لگا تھا۔

''کیونکہ اسی منحوس کالے پتھر کی وجہ سے فوزیہ مجھ سے بچھڑ گئی تھی، مجھے اسی لیے اس سے نفرت ہے۔ خیر، کام کی بات یہ ہے کہ تم کیا کہتے ہو؟'' میں نے مقصد کی بات پر آتے ہوئے کہا اور مستفسرانہ نظروں سے اس کے چہرے کو تکنے لگا۔

بالآخر اس نے ایک گہری سانس لے کر بتانا شروع کیا۔ ''مجسمہ میرے پاس سے چوری ہوجانے کے بعد میری سجاد بیگ سے انہی دونوں چودھری برادران نے اپنے شہر والے ٹھکانے پر میٹنگ کروائی تھی......!''

یہ بات مجھے سلیم بتا چکا تھا، تاہم میں اس کے آگے کی بات خاموشی سے سنتا رہا۔

''کیونکہ میں جان گیا تھا کہ مجسمہ میرے پاس سے سجاد بیگ کے سوا کوئی اور نہیں چرا سکتا، اس کی وجہ یہی تھی کہ میں میڈم پچھی اور غیر ملکی ایجنٹوں (بلیک کیٹس اور ریڈ فاکس) کے ڈر سے ایک دوسری غیر ملکی پارٹی سے اس کا خفیہ سودا کرنے کی کوشش میں تھا تاکہ جلد سے جلد اس کا منہ مانگے داموں سودا کر کے روپیہ پیسا، اپنی فیکٹری اور دیگر جائداد فروخت کر کے ہمیشہ کے لیے بیرونِ ملک چلا جاؤں۔ سب کچھ درست سمت پر چل رہا تھا مگر بدقسمتی سے سودے میں اور مجسمہ مذکورہ غیر ملکی پارٹی کے حوالے کرنے میں تاخیر تھی۔ اس عرصے تک میں اسے سنبھال نہیں پا رہا تھا، پریشان بھی تھا کیونکہ والد کے مرنے اور میڈم پچھی سے دشمنی کے بعد میں کمزور پڑ چکا تھا۔ تب میرے ذہن میں سجاد بیگ کا خیال آیا، میں نے اس سے مدد چاہی تو اس نے مجھے مجسمے کو کراچی منتقل کرنے کا مشورہ دیا۔ میں کھٹک گیا اور سخت پچھتایا کہ میں نے اسے کیوں اس راز میں شامل کیا۔ لہٰذا میں نے فوراً اس سے رخ موڑ لیا اور خود ہی بومبورگا کو کسی اور جگہ حفاظت سے رکھنے کے بارے میں غور کرنے لگا لیکن اسی دوران وہ چوری ہوگیا اور میرا یقین کی حد تک شبہ سجاد بیگ کی طرف چلا گیا۔

''بہرحال، میں نے دوستی کی پروا نہ کرتے ہوئے چوری کا الزام سیدھا سجاد بیگ پر لگا دیا اور میری اس سے منہ ماری بھی ہوئی۔ وہ بضد تھا کہ اس نے مجسمہ چوری نہیں کیا بلکہ دیکھا تک نہیں تو چوری کیسے کرے گا، مگر میرا الزام یقینی تھا کہ جیسے ہی میں نے اسے مجسمے کے بارے میں بتایا، اس کے اگلے ہی روز وہ چوری ہوگیا تھا۔''

اس سارے واقعے کا ذکر آچکا ہے، جب میرا بھٹے والی نہر کے ویرانے میں پچھی اور اس کے لنگی پوش سفاک گروپ گربھ داس کے ساتھ خونریز ٹاکرا ہوا تھا جس کے نتیجے میں نگہت بری طرح زخمی ہوگئی تھی۔

''چودھری برادران کو میں نے اس کی شکایت کر دی اور مدد کی بھی درخواست کی۔ ہماری ایک میٹنگ ہوئی لیکن مجھے جلد ہی چودھری برادران (بگی برادران) کی بدنیتی کا اندازہ ہوگیا کہ وہ سجاد بیگ کی بات کو فوقیت دے رہے تھے۔ میں ناکام لوٹ آیا مگر سجاد بیگ پر مجھے بری طرح طیش آ رہا تھا۔ میں نے بھی ٹھان رکھی تھی کہ سجاد بیگ کو نہیں چھوڑوں گا، خواہ گن پوائنٹ پر ہی سہی، اس کے منہ سے اگلوا کر ہی رہوں گا۔

"لہٰذا آج میں یہی تہیہ کر کے گھر سے نکلا تھا اور کسی طرح میں نے پتا چلا لیا کہ سجاد بیگ کی ان دونوں چودھری برادران کے درمیان نالا ڈیک والے ٹھکانے پر کوئی ملاقات ہے۔ میرے ذہن میں کھٹک پیدا ہوئی۔ آخر ان کے بیچ ایسی کیا ملاقات تھی جو انہوں نے شہر والے ٹھکانے کے بجائے شہر سے دور طے کر رکھی تھی۔ اس بات نے میرے اندر پہلے سے زیادہ جوش بھر دیا اور میں پوری طرح سرگرم ہو کر گھر سے نکلا۔ اسی مقصد کے لیے میں نے جیب میں بھرا ہوا پستول بھی رکھ لیا تھا۔ میں اپنی گاڑی میں ان کے نالا ڈیک والے ٹھکانے پر پہنچا مگر اس طرح کہ انہیں خبر تک نہ ہونے دی۔ وہاں ان کی گاڑیاں موجود تھیں اور چند مسلح پہرے دار بھی تھے۔ میں کسی طرح نقب لگا کر اندر داخل ہو گیا اور پھر ان کے درمیان جو گفتگو میں نے سنی، اس نے میرے تن بدن میں ہی آگ بھر دی۔"

اتنا بتا کر وہ ذرا سانس لینے کو رکا۔ میں بڑی دلچسپی سے اس کی گفتگو سن رہا تھا اور میرے اندر بھی دھکڑ پکڑ جاری ہوگئی۔ غالباً مجھے سنسنی خیز انکشافات سننے کی توقع ہو رہی تھی۔

اس نے چند لمحے کے توقف کے بعد پھر کہنا شروع کیا۔

"پھر سجاد بیگ اور چودھری برادران کی آپس کی باتیں سن کر نہ صرف میرے اس شبہے کی تصدیق ہوگئی کہ مجسمہ سجاد بیگ نے ہی چرایا تھا، بلکہ اب چودھری برادران اور سجاد بیگ آپس میں اسے ٹھکانے لگانے کا بھی منصوبہ بنائے ہوئے تھے۔ اس کے لیے انہوں نے کسی مسٹر ڈورل، چنگ ہنگ اور مادام شاریا چوئی نامی اشخاص کو وہاں بلوایا تھا۔ یہ تینوں اسی نامعلوم گروپ کے لوگ تھے، جن سے سجاد بیگ کے خفیہ روابط تھے۔ یہ ہانگ کانگ سے آئے تھے اور سہراب......"

کہتے ہوئے وسیم نے یہاں رک کر میری جانب دیکھا۔

"تمہارے لیے یہ سننا یقیناً سنسنی کا باعث ہوگا کہ یہی وہ لوگ تھے جنہیں تمہاری بھی تلاش تھی، جس کے لیے ان لوگوں نے سجاد بیگ سے رابطہ کیا تھا۔ تمہاری حوالگی یا اغوا کے بارے میں ان کے درمیان پہلے ہی بات چیت ہوتی رہی تھی، انہیں بھی اسی مجسمے کی تلاش تھی۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب میرے اور نگہت کے تعلقات خراب نہیں ہوئے تھے، سجاد بیگ بھی ہمارا حلیف تھا، لیکن سجاد بیگ اور ان لوگوں کی خوش قسمتی رہی کہ گیم ان کے لیے آسان تر ہوتا چلا گیا۔ سجاد بیگ بہ آسانی میرے قبضے سے مجسمہ لے اڑا، انہیں تمہاری بھی ضرورت نہیں رہی۔ اب یہ آپس میں مل بیٹھ کر مجسمے کا سودا کرنے والے تھے، جس کے لیے انہوں نے آبادی سے دور یہاں ڈیرا ڈال لیا تھا۔"

وہ پھر رکا۔ مجھے یاد تھا نگہت نے ہی انکشاف کیا تھا۔ سجاد بیگ کی زبانی اس نے سن رکھا تھا کہ کوئی غیرملکی افراد میری تلاش میں تھے، وغیرہ۔ اس وقت میں نے ان غیرملکیوں کو بلیک کیٹس اور ریڈ فاکس پر ہی محمول کیا تھا۔ چونکہ اس کی کہانی بہ الفاظ دیگر اس کا بیان طویل ہونے لگا تھا، اسی لیے گفتگو کے دوران ہی میں نے غیر محسوس انداز میں اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر کیسٹ پلٹ دی تھی۔ وہ آگے بتانے لگا۔

"اب میں چونکہ ان کی ناک کے نیچے موجود تھا، اسی لیے کسی جوش اور جلد بازی سے کام نہیں لینا چاہتا تھا۔ یہ لوگ مجسمے کا مذکورہ پارٹی سے ایک خطیر رقم کے عوض سودا طے کرنے والے تھے لیکن مجسمے کی موجودگی کے بارے میں کہ وہ کہاں چھپا رکھا تھا، ابھی تک کوئی ایسی بات نہیں سن سکا یا پہلے ہی یہ کر چکے ہوں لیکن اس وقت انہیں پارٹی کا انتظار تھا۔ تب ہی ایک موقعے پر سجاد بیگ کے منہ سے میں نے چودھری برادران سے کہتے سنا کہ اس نے مجسمہ اپنے قبضے میں کسی محفوظ مقام پر چھپا رکھا ہے، سودا بخیر وخوبی طے ہو جانے کے بعد وہ ان کے حوالے کیا جائے گا اور اس کے ہمراہ دونوں چودھری برادران بھی ہوں گے۔ ممکن تھا کہ سجاد بیگ نے ان دونوں بھائیوں کو بھی لالچ دے رکھا ہو کیونکہ ان کی مدد کے بغیر سجاد بیگ یہاں (سیالکوٹ) میں اتنی بڑی اور بھاری بھرکم ڈیل کرنے کے قابل نہ تھا۔

"مذکورہ غیرملکی پارٹی کا اب مجھے بھی بے چینی سے انتظار تھا کیونکہ ظاہر ہے سودا تقریباً طے ہو چکا تھا اور رقم کے سلسلے میں لین دین باقی تھا، اس کے بعد مجسمے کی حوالگی کا مرحلہ آتا اور میں نے بھی تب تک سائے کی طرح ان کے ساتھ چھپے رہنے کا پلان کر رکھا تھا، اسی مقصد کے لیے میں نے اپنی گاڑی بھی ان کے ٹھکانے سے کچھ دور درختوں اور جھاڑیوں کے جھنڈ میں کہیں کھڑی کر رکھی تھی۔

"بدقسمتی یہ ہوئی کہ پارٹی کے پہنچنے سے پہلے ہی میرا بھانڈا پھوٹ گیا۔ مجھ پر ان کے کسی آدمی کی نظر پڑ گئی۔ اس نے بلادریغ گولی چلا دی۔ گولی میرے بازو میں لگی تو اندر بیٹھے سجاد بیگ اور چودھری برادران بھی بری طرح بدکے تھے۔ ان کے پاس بھی اسلحہ تھا، وہ اسے سنبھالے ہوئے باہر کو لپکے، میں بھی دفاعی فائرنگ کرتا ہوا وہاں سے بھاگا اور بڑی مشکلوں سے گرتا پڑتا اپنی کار تک پہنچا تھا کہ ایک اور گولی چلی جو میرے دائیں کندھے کے آر پار ہو گئی۔ میں گر پڑا مگر جان بچانے کی تگ و دو نے مجھے پھر سے کھڑا کیا

اور میں بھی اپنی کار میں سوار ہو کر وہاں سے بھاگا۔ وہ لوگ بھی گاڑی لے کر میرے تعاقب میں تھے۔

''میری کار پر مسلسل فائرنگ ہوتی رہی، خود میری اپنی حالت خراب ہو رہی تھی۔ میں اسٹیئرنگ پر اپنی گرفت قائم نہیں رکھ پا رہا تھا اور اسی لیے راستے پر ایک مقام پر میری کار بے قابو ہو کر جوہڑ میں جا گری یہاں تک کہ نصف ڈوب گئی۔ گدلے پانی نے میری حالت مزید خراب کردی، پھر بھی میں نے کار کا دروازہ کھولنے کی کوشش کی مگر وہ پھنس کر بند ہو چکا تھا۔ میں کھڑکی کے ذریعے باہر نکلا اور گدلے پانی کے اندر ہی اندر چھپتا چھپاتا کنارے پر گھنی جھاڑیوں میں جا پہنچا۔ وہ شاید مجھے مردہ یا ڈوبا ہوا سمجھ کر واپس لوٹ گئے۔ یہ بھی میری خوش قسمتی تھی لیکن بدقسمتی سے میں اپنے ایک اور دشمن کے ہتھے چڑھ گیا۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے گویا اپنی کہانی ختم کر کے مجھے گھورا۔

''کیا مطلب؟ دوسرا دشمن کون؟'' میں نے پوچھا۔

''تم۔''

''اس فضول بحث کو چھوڑو، جس کی حقیقت تمہیں معلوم ہی ہے کہ کون کس کا دشمن ہے۔'' میں تلخی سے بولا۔ ''مجھے اب یہ بتاؤ کہ اگر میں اس وقت نالا ڈیک کا رخ کروں تو کیا سجاد بیگ وغیرہ سے ملاقات ہو جائے گی؟''

''ملاقات......؟'' میری بات سن کر اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔

''میرا مطلب ہے ٹاکرا۔'' میں نے مختصراً وضاحت کی۔

''شاید ممکن ہو، مگر تم کیوں......؟'' اس نے ایک گہری سانس لے کر کہا لیکن دوسرے ہی لمحے چونک کر یوں بولا جیسے اچانک اسے کوئی اہم بات یاد آگئی ہو۔ ''لیکن تم نے یہ نہیں بتایا کہ تم یہاں کیا کرنے نکلے تھے؟''

''میں سجاد بیگ سے وہ مجسمہ حاصل کرنا چاہتا ہوں۔''

''تم...... مگر کیوں......؟'' اس کا منہ کھلا رہ گیا۔ ''ابھی تو تم نے بتایا تھا بلکہ تم اکثر کہتے رہے ہو کہ وہ مجسمہ تمہارے لیے اہم نہیں رہا تم نے تو اسے سمندر برد بھی کر دیا تھا؟''

''ہاں، میں اسی لیے اسے دوبارہ حاصل کرنا چاہتا ہوں۔'' میں نے متانت سے کہا۔ ''مگر اس بار اسے سمندر برد کرنے کی غلطی نہیں کروں گا بلکہ کسی الیکٹرک بھٹی میں ڈال کر بھسم کر ڈالوں گا۔''

''کیا......؟'' اس کے چہرے کے تاثرات یکدم متغیر ہو گئے۔ اگر وہ زخمی نہ ہوتا تو یقیناً میری بات پر چارپائی سے اچھل ہی پڑتا۔ ''یہ...... کیا بکواس ہے؟''

''بکواس نہیں ہے یہ۔'' میں نے بھی زہریلے لہجے میں کہا۔ ''کیا تم اس کی حقیقت جانتے ہو؟''

وہ نظریں چرانے لگا لیکن پھر جھجک کر بولا۔ ''مجھے یا تمہیں اس کی حقیقت سے کیا لینا دینا؟ بس، کچھ لوگ اس کے حصول کے لیے لگے ہوئے ہیں۔''

''لوگ نہیں، بلکہ دشمن عناصر اور خطرناک غیر ملکی ایجنٹ کہو۔'' میں نے تلخی سے کہا۔ ''یہ ایک آسمانی بلا ہے، کسی زمانے میں یہ ایک ویران صحرا میں آسمان سے شہاب ثاقب کی صورت میں ٹپکا تھا، بعد میں تحقیق سے پتا چلا کہ اس میں ایک خطرناک تابکاری جوہر پایا جاتا ہے، جس کے ذریعے خطرناک ایٹمی ہتھیار تیار کیے جا سکتے ہیں جو آج کے ایٹمی ہتھیاروں کے مقابلے میں سو گنا زیادہ تباہی پھیلا سکتے ہیں۔ سب سے زیادہ اس کے حصول کے لیے اسرائیل سرگرم ہے، جو خود کو ہر وقت گریٹر اسرائیل بنانے کے جنون میں مبتلا رہتا ہے اور جسے ان مسلم ایٹمی ممالک بالخصوص پاکستان سے ازلی پرخاش ہے، وہ انہیں سرنگوں کرنے کا ناپاک منصوبہ بنانا چاہتا ہے۔''

''بھاڑ میں جائیں سب۔'' وہ نخوت سے بولا۔ ''مجھے رقم سے مطلب ہے اور تم یہ کب سے...... سوچ ہے کھا کے حج پر چلے ہو؟'' میں اس کی سنتا رہا۔ وہ آگے بولا۔

''بے وقوفی مت کرو، اب تم ہی میرا ساتھ دے سکتے ہو۔ ذرا اس دولت کا تصور کرو سہراب! جو ہمیں اس مجسمے کے عوض مل سکتی ہے۔ مجھے لگتا ہے اب تم ہی میری مدد کر سکتے ہو، مجھے اعتراف ہے کہ تم ایک نڈر اور جنگجو شخص ہو، تمہاری پلاننگ بہت اچھی ہوتی ہے۔ پہلے میں سمجھتا تھا کہ تمہاری قسمت ہی اچھی ہے کہ تم اپنے مخالفوں کے سامنے ڈٹ جاتے ہو اور بالآخر انہیں شکست سے دوچار کر ڈالتے ہو مگر دھیرے دھیرے مجھے اس بات کا بھی اندازہ ہوا کہ نہیں، تمہارے اندر ایسی عقلی اور جسمانی صلاحیتیں بھی موجود ہیں، جن سے تم کامیابی سمیٹتے ہو۔ آؤ سہراب! ہم ایک ہو جائیں، مجسمے کی واپسی کے حصول کے لیے میرا ساتھ دو، میری اس معاملے میں کئی گروپوں سے ڈیلنگ ہے۔ بس ایک بار مجسمہ میرے قبضے میں آ جائے، تم دیکھنا، ہم پر دھن برسے گا۔ میرا وعدہ ہے کہ تمہیں نصف کا حصے دار بناؤں گا۔ ہم بیرونِ ملک چلے جائیں گے اور......''

''تمہاری بکواس سننے کے لیے اب میرے پاس فضول وقت نہیں رہا۔'' میں نے درمیان میں اسے ٹوک دیا۔ ''یہ گھٹیا باتیں جو تم مجھ سے کہہ رہے ہو، اس میں تمہارا قصور

نہیں، کیونکہ تم آخر راجا تیمور کی اولاد ہو۔ اس کے سر پر بھی یہی جنون سوار رہتا تھا، حالانکہ اللہ نے تمہیں کس قدر نوازا ہے، فیکٹریاں ہیں، جائدادیں ہیں لیکن افسوس تمہاری ہوس ختم نہیں ہوتی۔ یہ بھی خدا کی طرف سے تم جیسوں کے لیے ایک عذاب ہی ہوتا ہے۔ کاش تم یہ فلسفۂ حیات سمجھ لو۔‘‘

نہایت زہریلے لہجے میں اس سے یہ کہتے ہوئے میں کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا اور وہ ہونق بنا میرا چہرہ تکتا رہ گیا۔ پھر یکدم جیسے غصہ، بے بسی اور شکست خوردگی کے عالم میں پھٹ پڑا۔

’’میں جانتا ہوں، خوب اچھی طرح جانتا ہوں۔ تم بھی اکیلے ہی اس مجسمے کو ہضم کرنا چاہتے ہو، سچ ہے یہ کہ کوئی بھی آدمی دولت کے معاملے میں کسی کو حصے دار بنانا پسند نہیں کرتا، تم بھی اسی لالچ میں مبتلا ہو۔‘‘

’’میں نے کہا نا کہ اس سوچ میں تمہارا کوئی قصور نہیں، تم باپ بیٹے کی سوچ ہی ایسی ہے، یعنی جیسے تم خود ہو، دوسروں کو بھی ویسا ہی سمجھتے ہو۔‘‘

اس کا چہرہ خجالت، غیظ اور دیرینہ عداوت کے باعث اور بھی مکروہ نظر آنے لگا تھا۔ وہ مجھے گھورتا رہا پھر بولا۔

’’لیکن تم جا کہاں رہے ہو؟ بیٹھو، ٹھیک ہے، تم کیا چاہتے ہو؟ اپنا مطالبہ بتاؤ۔ کیا تم آدھے سے زیادہ حصہ چاہتے ہو؟‘‘ اس کی نچلے درجے کی سوچ وہیں اٹکی ہوئی تھی۔

میں نے زہریلی مسکراہٹ سے کہا۔ ’’میں پورا حصہ چاہتا ہوں اور تمہیں اس سے بالکل بے دخل کر دینے کا ارادہ بھی رکھتا ہوں۔‘‘

’’تم اپنی بکواس بند نہیں کرو گے؟‘‘ وہ دیوانگی پر اتر آیا۔ ’’یاد رکھنا سہراب! تم مجھے دھوکا نہیں دے سکتے اور...... یہ بھی کان کھول کر اچھی طرح سن لو کہ میری مدد کے بغیر تم اس بیش قیمت مجسمے تک نہیں پہنچ پاؤ گے۔‘‘

’’یہ وقت بتائے گا۔‘‘ میں نے اسے تپانے کے لیے بے پروائی سے اپنے کندھے اُچکائے۔

’’بھاڑ میں جاؤ تم...... مجھے تمہاری کوئی ضرورت نہیں، میں خود یہ سب کر سکتا ہوں۔ مجھے کسی کی مدد کی، ساتھ کی ضرورت نہیں ہے۔ تم مجھے سمجھتے کیا ہو آخر؟ میں اب ایک منٹ بھی یہاں ٹھہرنا پسند نہیں کروں گا۔‘‘

اس کے منہ سے جھاگ اڑنے لگا، اس نے چیخیں مارنا شروع کر دیں۔ ’’اے انسپکٹر! میں اب اس منحوس جگہ سے روانہ ہونا چاہتا ہوں، میرے لیے گاڑی کا بندوبست کرو، جلدی۔‘‘

اس کی چیخ پکار سے تھانہ انچارج توفیق اور اس کے ہمراہ دو اہلکار بھی دوڑتے ہوئے وہاں آگئے۔ پہنچے تو وہ صاحب فراش چارپائی پر پڑے وسیم کو گھورتے، پھر میری طرف تکنے لگے، جیسے پوچھ رہے ہوں کہ ’’معاملہ کیا ہے؟‘‘

’’انسپکٹر توفیق!‘‘ میں نے سنجیدگی سے مخاطب کیا اور وسیم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

’’اسے کہیں جانے نہ دیا جائے، میں یہاں سے انسپکٹر شیراز کو ادھر ہی بلوا رہا ہوں۔ چلو، میں نے ایک کال کرنی ہے۔‘‘ کہتے ہوئے میں نے دروازے کی جانب قدم بڑھا دیے۔ سب انسپکٹر اپنے دونوں اہلکاروں کو تحکمانہ انداز میں کچھ ہدایات دینے لگا۔ اپنے عقب میں مجھے وسیم کے مغلظات بھرے جملے اور خطرناک نتائج کی دھمکیاں سنائی دیتی رہیں۔

میں نے انسپکٹر شیراز کو فون کر کے ساری بات بتائی اور وسیم کے آئندہ عزائم کے بارے میں بھی آگاہ کرتے ہوئے کہا کہ اسے ابھی کچھ روز اپنی کسٹڈی میں رکھے۔ اگر وہ زیادہ اکڑ دکھائے تو اسے وہ کیسٹ سنا دی جائے، جس میں ساری باتیں میں نے ریکارڈ کر رکھی تھیں، وغیرہ۔

بعد میں انسپکٹر توفیق کو میں نے مزید کچھ ہدایات دیں پھر کیسٹ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے تاکید کی کہ اسے انسپکٹر شیراز کے حوالے کر دیا جائے۔ اس کی طرف سے پوری یقین دہانی کرانے کے بعد میں مطمئن ہو کر وہاں سے چلا آیا اور اپنی بائیک پر سوار ہو کر نالا ڈیک کی طرف بڑھ گیا۔

رات ہو چکی تھی۔ ابھی ابتدائی پہر تھا۔ بائیک کی ہیڈ لائٹس وغیرہ درست تھیں، میں کچے راستے پر اندھیری سنسان جگہوں سے گزرتا ہوا بالآخر مطلوبہ مقام پر جا پہنچا۔ تھوڑے فاصلے پر بائیک روکی، جہاں جنگل، جھاڑیاں اور درختوں کے جھنڈ تھے۔ بائیک کو ایک پیپل کے درخت تلے کھڑا کر کے لاک کیا پھر ایک چھوٹی سی ٹارچ روشن کر کے اس مختصر سی عمارت کی جانب بڑھ گیا جس کا ہیولا دور سے کسی بھوت بنگلے سے کم نظر نہیں آتا تھا۔

بادی النظر میں یہ کسی پرانے گودام کی عمارت کا ہی منظر پیش کر رہی تھی۔ ایک دو سو واٹ کا پیلا بلب عمارت کی پیشانی پر روشن تھا لیکن مجھے یہ دیکھ کر سخت مایوسی ہوئی کہ وہاں باہر کوئی گاڑی نہیں کھڑی تھی جس کا مطلب تھا کہ اندر کوئی بھی موجود نہیں۔

اگرچہ موجودہ حالات میں مجھے اس کی پچاس فیصد توقع پہلے ہی تھی کیونکہ ایک تو وقت بہت بیت چلا تھا، پھر وسیم کی ’’مہم جوئی‘‘ کے بعد یہ لوگ بھی اِدھر اُدھر ہو گئے ہوں

گے۔ جہاں تک ممکنہ طور پر ان کے اور کسی غیر ملکی پارٹی کے درمیان کوئی خفیہ ڈیلنگ ہونا تھی، یا تو وہ منسوخ ہوگئی تھی یا پھر وسیم کے رنگ میں بھنگ ڈالنے پر ملتوی ہوچکی ہوگی۔ یہی کچھ میں ہونٹ بھینچے سوچتا رہا، اس کے بعد پھر میں نے واپسی کا سوچا لیکن ذہن میں ایک تجسس تھا کہ اب آیا ہوں تو اندر داخل ہوکر دیکھ لینے میں کیا حرج ہے۔

یہ سوچ کر میں نے ایک نظر گردوپیش پر ڈالی۔ دور نزدیک تاریکی اور سناٹے کے سوا کچھ نہ تھا۔ پوری تسلی کے بعد میں آگے بڑھا اور جیسے ہی عمارت کے دروازے کے قریب پہنچا تو ٹھٹک کر رک گیا۔

دروازہ کشادہ چوکھٹ کا تھا، چونکنے کی وجہ اس کا ایک پٹ تھوڑا سا وا ہونا تھا۔ تاریکی اور فاصلے سے یہ بند ہی نظر آتا تھا مگر قریب پہنچنے پر یہ معلوم ہوا کہ دروازہ پوری طرح بند نہ تھا۔

ایسا کیوں تھا؟ میرے ذہن میں سوال اٹک کر رہ گیا۔ اس کا مطلب تھا، اندر کوئی تھا۔ اس خیال کے آتے ہی میرے اعصاب یکلخت تن گئے۔ میں پہلے سے زیادہ محتاط ہوگیا۔ کھلے پٹ کو میں نے چھوا تک نہیں اور اندر جھانکا۔ اندر مجھے بہت ہلکی روشنی محسوس ہوئی تھی۔ کسی ذی نفس کے آثار بھی نظر نہیں آتے تھے۔ مجھے کچھ الجھن آمیز حیرت ہوئی تھی۔ مجھے اندر کسی گڑبڑ کا احساس ہوا، ایسی گڑبڑ جو ہونے والی نہیں، بلکہ ہوچکی ہو۔

تب ہی میں نے تھوڑے سے کھلے پٹ کو چھوا اور اسے باہر ذرا سا اور وا کیا۔ اس کے بعد میں غڑاپ سے اندر تھا، لیکن چوکنا انداز میں جیسے ہی میں اندر داخل ہوا تب ہی مجھے کسی کا سایہ بجلی کی سی تیزی سے حرکت کرتا محسوس ہوا اور اگر میں بروقت جھکائی نہ دیتا تو وہ مجھ پر پل ہی پڑتا۔

اس کے ہاتھ میں مجھے کوئی ایسی فولادی شے چمکتی نظر آئی جو اس نے میری گردن پر مارنے کی کوشش کی تھی، اگر یہ ضرب مجھے پڑجاتی تو یقیناً میں ڈھے ہی جاتا۔ وار خالی جاتے ہی وہ سایہ اپنی ہی جھونک میں آگے نکل گیا اور پھر میں نے اسے سنبھالا نہیں لینے دیا۔ عقب میں جا کر اس پر جست بھری۔ جھونک میں آگے نکل جانے کے سبب اس نے گرتے گرتے خود کو کمال مہارت اور غضب کی پھرتی سے سنبھالا تھا لیکن تب تک میں اس کے سر پر جا پہنچا تھا۔

وہ مہیب سی چمکتی شے اس کے ہاتھ سے چھوٹی نہیں تھی، وہی اس نے نصف دائرے میں لہرا کر مجھ پر پھر کوئی مہلک وار کرنے کی کوشش کی تھی۔ پلٹ کر وار کرنے کے سبب وہ اس گانتی مہیب شے کو سر سے بلند کی ٹانگوں پر چلاتا تھا کہ میں یکدم اچھلا اور سامنے آن ایک ٹانگ اس کے چہرے پر اس قدر زوردار انداز میں رسید کی کہ اس کے حلق سے کراہ آمیز غراہٹ برآمد ہوئی اور وہ ایک بار پھر الٹ گیا۔

تب ہی میرا دماغ بھک سے اڑ گیا، جب میں نے مدھم روشنی میں اس کا جائزہ لیا۔ اس نے لنگی پہن رکھی تھی اور اوپری جسم برہنہ تھا۔ اس نے ہاتھ میں جو گانتی والی مہیب شے پکڑ رکھی تھی، وہ درحقیقت ایک دھاردار اور چوڑے پھل والا چھرا تھا۔

''لنگی پوش چھرا بردار گروپ......!'' دفعتاً ہی میرے ذہن میں ابھرا۔

یہ بھی کے لنگی پوش چھرا بردار گروپ کا آدمی لگا، جس کا سرغنہ درندہ صفت گربھ داس تھا۔ میرے رگ و پے میں سنسناہٹ سرایت کرتی چلی گئی۔

'یہ یہاں کیا کررہا تھا؟' میرے پاس یہ سوچنے کا وقت نہیں تھا کیونکہ اگلے ہی لمحے سنبھلتے ہوئے کمال مہارت سے اس نے چھرا میری جانب اچھال پھینکا۔

اس گودام نما مدھم روشنی والے ہال میں جیسے خونی کھیل کی ابتدا ہوگئی۔ ''شپ، شپاشپ'' کی مہیب آواز سے چھرا فضا میں گردش کرتا ہوا کسی منحوس چمگادڑ کی طرح لپکا اور میں جو پہلے ہی اس خطرناک ہتھیار اور داؤ سے بچنے کے لیے ذہنی طور پر خود کو تیار کرچکا تھا، یکایک تالی کوانڈو کے انداز کی جست بھر کر نہ صرف اس کے مہلک چرکے سے بچ گیا بلکہ ایک پل میں اس خطرناک تنومند مقابل لنگی پوش کے سر پر جا پہنچا۔

ایک لمحے کے لیے تو وہ بھی اپنا وار خالی جاتے اور پھر مجھے اپنے قریب پا کر دم بخود سا رہ گیا لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے حرکت کی۔ بھلا اب میں اسے کہاں موقع دینے والا تھا، ایک ڈبل پنچ کا گھونسا بنا کر میں نے اس کی تھوڑی پر رسید کرڈالا۔

اس کے حلق سے غوں غاں کی اذیت بھری آواز برآمد ہوئی اور وہ خاک چاٹنے لگا۔ وہ پیٹ کے بل زمین بوس ہوا تھا۔ میں نے اسی پر بس نہیں کیا، اپنی جگہ سے اچھلا اور پوری قوت سے اپنے بدن سمیت اس پر یوں آن پڑا کہ میرے دائیں ہاتھ کی کہنی اس کی ریڑھ کی ہڈی پر پڑی تھی۔

اس کے حلق سے ذبح ہوتے بکرے جیسی آواز نکلی۔ ہڈی ٹوٹ چکی تھی، وہ ایک دم ہی بے حس و حرکت ہوگیا۔ میں لمبے لمبے سانس لیتا رہا اور اس کی طرف غور سے تکتا رہا۔

وہ آخری سانسوں پر تھا پھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے اس نے آخری ہچکی لی اور فنا کے گھاٹ اتر گیا۔

میں نے یکدم اِدھر اُدھر محتاط نظریں دوڑانا شروع کر دیں، مبادا اس کے اور ساتھی بھی کہیں گھات لگائے کسی کونے میں چھپے بیٹھے ہوں مگر اور کوئی ذی نفس مجھے دکھائی نہ دیا۔

اس بار دھاڑ سے فرصت ملی تو میں کہیں جا کر گرد و پیش کا تفصیلی جائزہ لینے کے قابل ہوا۔ ایک ہی بلب روشن تھا، وہ بھی بہت کم پاور کا تھا۔ اس کی مقدور بھر یرقان زدہ روشنی میں مجھے یہ ہال سا کمرا ہی لگا جسے لاؤنج یا بیٹھنے کے طور پر بھی استعمال کر لیا جاتا تھا۔ اس کے وسط میں سادہ سا فرنیچر تھا، جو بکھری حالت میں پھیلا ہوا دکھائی دیا مگر اگلے ہی لمحے میں سن ہو کر رہ گیا۔

وسط میں جدھر عام سا فرنیچر بکھری حالت میں دھرا پڑا تھا، وہیں ان کے بیچ میں کٹے پھٹے دو تین افراد کے بے سدھ پڑے جسم دکھائی دیے، جن کے کپڑے خون سے بھرے تھے۔ ہال میں اگرچہ بلب اور ٹیوب لائٹس بھی نصب تھیں لیکن انہیں دانستہ بجھا رہنے دیا گیا تھا، جبکہ صرف ایک ہلکے پاور کا بلب روشن رکھا تھا۔ اس کا مقصد کیا ہو سکتا تھا؟ یہی کہ فوری طور پر اس طرف کسی کی نگاہ نہ پڑ سکے۔ یہ کام یہی لنگی پوش انجام دے سکتا تھا یا پھر اس سے پہلے کوئی یہاں قیامت مچا کر گیا ہوگا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ یہ سارا گھن چکر آخر کس کا ہو سکتا ہے؟ دشمن کے دشمنوں کا یا پھر...... دوسرا کوئی خیال میرے ذہن میں نہ آ سکا۔ وجہ یہی تھی کہ بوموبورگا کا وہ کالا منحوس پتھر سب کے لیے ہی موت کا پیامبر بنا ہوا تھا۔ ہر کوئی اس کے حصول کے لیے ایک دوسرے کی گردنیں مارنے سے نہیں چوکتا تھا۔

میں نے ہونٹ بھینچ لیے۔ سب سے پہلے دروازہ بند کیا، ایک ٹیوب لائٹ اور ایک بلب مزید روشن کر دیا۔ اب ہال کافی حد تک روشن ہو چکا تھا۔ فرش پر بھی خون پھیلا ہوا تھا، میں لنگی پوش کی لاش پھلانگتا ہوا آگے بڑھا۔

کل تین لاشیں تھیں۔ میں جھک کر انہیں پہچاننے کی کوشش کرنے لگا تھا کہ اچانک ایک لاش نے حرکت کی۔ اب میں اسے ''لاش'' نہیں کہہ سکتا تھا۔ میں اس کی جانب متوجہ ہوا۔ اس کی ٹائٹ بلیک جینز میں ملبوس ٹانگیں مجھے نظر آئیں جس کی ''سبک خرامی'' سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ کوئی نسوانی وجود ہو سکتا تھا۔ اس کا بقیہ دھڑ ایک دوسری لاش کے نیچے تھا اور اس کے اوپر کرسی ڈھلکی پڑی تھی۔

اچانک اس کی کراہ بلند ہوئی۔ میرا اندازہ غلط نہ تھا، وہ ایک نوجوان عورت تھی۔ میں نے اسے کسی نہ کسی طرح گھسیٹ گھساٹ کر الگ کیا اور سنبھالا دیا تو یکدم چونک پڑا۔ وہ کوئی غیر ملکی خوبصورت سی لڑکی تھی، کچھ ایسی زیادہ زخمی بھی نہیں معلوم ہوئی۔ اس کی پیشانی پر زخم تھا جہاں سے خون بہہ کر خشک ہو گیا تھا۔ بال سیاہ، حد درجہ ملائم اور گھنے تھے، شرٹ بنیان ٹائپ سلیولیس تھی، جہاں سے اس کی گوری گوری بانہیں، گداز شانے عیاں نظر آئے۔ وہ بلاشبہ ملکوتی حسن اور جسمانی تناسب کا ایک شاہکار ہی تھی۔

میں نے پانی لے کر اس کے چھینٹے اس کے چہرے پر مارے۔ اس نے غوں غاں کی آوازوں کے ساتھ آنکھیں کھول دیں جو ہلکی براؤن تھیں۔ یہ مجھے کوئی فلپائنی یا چینی لڑکی لگی تھی۔

وہ خاصی ہراساں ہو گئی۔ آنکھیں پھیلا کر مجھے دیکھا اور پھر اِدھر اُدھر گردن گھمائی، پھر جیسے اسے سب یاد آنے لگا، پھر اس کی آنکھوں کی اشتباہ انگیزی عیاں ہوئی۔ چند ثانیے کے لیے تو میں نے اس کی آنکھوں کو یوں سکڑتے دیکھا جیسے مجھے پہچاننے کی کوشش کر رہی ہو لیکن پھر وہ مجھ سے انگریزی میں مخاطب ہوئی تو اس کی باریک سی آواز اور لب و لہجے سے ظاہر ہونے لگا کہ وہ مشرقی وسطی یا مشرقی ایشیا کے کسی خطے کی تھی۔

''تت...... تم کون ہو...... یہ...... یہ کون لوگ تھے؟''

میں بھی انگریزی میں ہی اس سے بولا۔ ''یہی سوال میں تم سے پوچھنا چاہتا ہوں۔ یہاں کیا ہوا تھا، کس نے یہ خونریزی کی ہے؟'' یہ پوچھتے ہوئے ساتھ ہی میرا ذہن تیزی سے اس کے بارے میں اندازے قائم کرنے میں مصروف ہو گیا۔

مجھے یہ بھی انہی میں سے ایک لگی تھی، جو سجاد بیگ وغیرہ کے ساتھ کوئی خفیہ ڈیلنگ کرنے والے تھے اور ان کے نام بھی جو وسیم کچھ دیر قبل میرے گوش گزار کر چکا تھا۔ یہ تین نام تھے...... مسٹر ڈورل، چنگ ہنگ اور مادام شاریا چوئی...... نیز وسیم نے بھی مجھے بتایا تھا کہ یہی وہ غیر ملکی پارٹی تھی جنہیں میری تلاش تھی اور وہ اس سلسلے میں سجاد بیگ سے مدد لینا چاہتے تھے۔

''مادام شاریا چوئی......!'' اس لڑکی کے بارے میں اچانک ہی میرے اندر یہ نام چمکا، تاہم میں نے سوچ رکھا تھا کہ میں نے اسے اپنی کیا شناخت بتانا تھی اور کیسے اس کے منہ سے یہ سب اگلوانا تھا، کیونکہ اتنی آسانی سے وہ مجھے سچ

بتانے والی نہ تھی۔ بشرطیکہ یہ وہی تھی جس کا مجھے اب کچھ کچھ اندازہ ہو چلا تھا۔

"لیکن......" وہ کچھ کہتے کہتے تھمی، ایک بار پھر اپنی صراحی دار اور ملائم جلد والی دودھیا سی گردن اِدھر اُدھر گھمائی، تب ہی اس کی نگاہیں قریب لنگی پوش پر پڑیں۔

اس نے میری جانب ایک جھٹکے سے دیکھ کر سوال کر ڈالا۔ "یہ......اسے......تم نے ہلاک کیا ہے؟" ایک بار پھر مجھے اس کی آنکھوں میں غور کرنے کے انداز کا سکڑاؤ محسوس ہوا۔ وہ مسلسل مجھے پہچاننے کی کوشش میں تھی۔ ممکن تھا ہم دونوں ہی گویا سابقہ اور غائبانہ حوالوں سے ایک دوسرے کو پہچاننے کی سعی میں تھے۔

"ہرگز نہیں۔" میں نے منصوبے کے عین مطابق دروغ گوئی سے کام لیتے ہوئے اپنے سر کو نفی میں جنبش دی اور اس کی تسلی کے لیے آگے بولا۔

"میں تو ادھر سے گزر رہا تھا، ویرانے میں اس عمارت کا دروازہ کھلا دیکھ کر اندر جھانکا تو مجھے گڑبڑ کا احساس ہوا۔ خیر، تمہیں اسپتال لے چلتا ہوں اور...... پولیس کو بھی انفارم کرتے ہیں۔"

"نہیں۔" اس نے میری توقع کے عین مطابق نفی میں سر ہلایا۔ "میں ٹھیک ہوں...... آہ۔" تب ہی وہ کراہی اور بے اختیار اپنا ایک ہاتھ پیشانی کے زخم پر رکھا۔

"تمہارا بہت سا خون بہہ نکلا ہے۔ تمہیں کمزوری ہو رہی ہوگی؟" میں نے دانستہ دوستانہ لہجہ اختیار کرتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ "دیکھو، میں تمہاری مدد کرنا چاہتا ہوں۔ تم مجھے بہت اچھی لگی ہو۔" میں نے خود کو "شوقین" سا ظاہر کیا اور معنی خیز انداز میں اس کی طرف دیکھ کر مسکراتا بھی رہا۔

وہ بھی مجھے غور سے دیکھنے لگی۔ شاید اندر ہی اندر کچھ سوچ رہی تھی۔ اس نے پہلے تو کسمسا کر خود کو درست حالت میں کیا۔ میں نے اس کی گزارے لائق مرہم پٹی کی۔ وہ مجھ سے کچھ مانوس سی ہوئی، پھر بولی۔

"تم...... میری مدد کر سکتے ہو؟"

"یقیناً۔" میں یکدم بولا۔ "لیکن یہ سب کیا ہے، کیا ہوا تھا یہاں، کس نے کیا اور کیوں؟" ساتھ ہی میں نے اپنے مقصد کے سوال بھی داغ ڈالے۔

وہ ایک دم پریشان سی نظر آنے لگی، یوں جیسے اسے دوبارہ اس خونریزی کا خدشہ ہو، لہٰذا اسی لہجے میں بولی۔

"دیکھو، تم مجھے فوراً یہاں سے کسی محفوظ مقام پر لے چلو۔ مجھے ڈر ہے کہیں وہ لوگ دوبارہ یہاں کا رخ نہ کریں۔" کہتے ہوئے وہ اٹھ کھڑی ہوئی، پھر اس نے لاشوں کا جائزہ لیا جو کہ میں بھی لے چکا تھا۔ ان دو میں سے ایک میرے لیے غیر شناسا جبکہ دوسرا مجھے چودھری تجی برادران کا آدمی لگا۔ یہ مجھے ان کے شہر والے ٹھکانے میں کہیں نظر آ چکا تھا، باقی ایک کا مجھے یہی اندازہ ہو سکا تھا کہ وہ سجاد بیگ کا آدمی ہوگا۔

"یہ...... اسے کس نے ہلاک کیا؟ کون اسے مار سکتا ہے؟" لڑکی نے سوچتے ہوئے انداز میں سب سے آخر میں لنگی پوش کے قریب جا کر خود کلامیہ بڑبڑا کر کہا۔

میں بڑے غور سے اس کی حرکات و سکنات اور لہجے سے کچھ اندازے قائم کرنے میں لگا رہا۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ وہ خود کو اور اپنے حواسوں کو جلد ہی سنبھال رہی تھی، یوں جیسے اسے کسی بات کی جلدی ہو۔ حالانکہ اس کی پیشانی کے علاوہ مجھے اس کی بائیں ٹانگ کی گوری چٹی ایڑی میں بھی زخم نظر آیا تھا اور ایسا ہی زخم اس کے دائیں ہاتھ کی کلائی پر بھی تھا، جدھر میں نے پٹی لگا دی تھی۔ وہ اسی سبب چلنے کے دوران کچھ لڑکھڑا بھی رہی تھی لیکن اس نے کمال ہمت اور قوتِ ارادی کے بل بوتے پر خود کو فعال رکھا ہوا تھا، ساتھ ہی اس کے چہرے پر اور براؤن سی آنکھوں سے عجیب سی مسرت بھی مترشح تھی، ایسی مسرت جیسے اسے اپنی جان بچ جانے پر خوشی ہو۔ حقیقت بھی یہی تھی کہ جس طرح یہاں خونریزی مجھے نظر آئی تھی، اس میں اس لڑکی کا بچ جانا معجزہ ہی تو تھا۔

ابھی میں اس کے بارے میں یہی کچھ سوچ رہا تھا کہ اچانک اس لڑکی نے ایک عجیب اور چونکا دینے والی حرکت کر ڈالی جس نے مجھے ہکا بکا کر کے رکھ دیا۔

اس نے یکدم مجھ پر ہلا بول دیا۔ چونکہ مجھے اس سے حملے کی بالکل بھی توقع نہ تھی تو میں مار کھا گیا۔ پل کے پل اس نے ایسا داؤ کھیلا کہ اپنی دوسری ٹانگ سے مجھے اڑنگا لگایا، میں ذرا گرنے کے انداز میں جھکا، پھر میرے سنبھلتے سنبھلتے ہی اس نے تیزی سے میرے اوپری جسم پر ہاتھ پھیرا اور میری پشت پر جیکٹ کے نیچے بیلٹ میں اڑسے ہوئے پستول کے ابھار کو محسوس کرتے ہی اس نے نکال کر ہاتھ میں پکڑ لیا اور مجھے دھکا دے کر وہ میری طرف تان لیا۔

میں نے اسے اس قدر موقع کیوں دیا تھا، کیا میں اتنا ہی اناڑی تھا؟ ورنہ تو مدِمقابل کے پہلے ہی حملے پر میں اسے دوسرا موقع دینے کا قائل ہی نہ تھا لیکن میں نے اسے یہ سب دانستہ کرنے دیا۔

اب جو میں نے اس کا چہرہ دیکھا تو دنگ رہ گیا۔ خوبصورت ریشمی سے سیاہ بالوں اور گہری سی تیز آنکھوں والا سرخی مائل اس کا سپید چہرہ یکایک مجھے شعلہ فشاں دکھائی دینے لگا۔ میں نے حیرت

سے منہ کھولے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ی ی...... یہ کیا......؟"

"ہاں، تم کون ہو، سچ سچ بتاؤ۔" اس نے کسی جنگلی بلی کی سی غراہٹ سے مشابہ آواز میں مجھ سے کہا۔

"کیا مطلب؟" میں بدستور خود کو بوکھلایا ہوا ظاہر کرتا رہا۔

"اس آخری شخص نے جو یہاں موجود ہوگا، تم پر اچانک حملہ کیا تھا مگر تم اس پر حاوی آگئے اور اسے ہلاک کر ڈالا۔ کیا میرا اندازہ غلط ہے؟" کہتے ہوئے اس نے پھر مجھے گہری نگاہوں سے گھورا۔

"تمہارا اندازہ بالکل درست ہے۔" میں نے مسکرا کر کہا۔ اب میں سمجھ چکا تھا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔

"تم...... سراب کھان (سہراب خان) ہو۔" اس نے اپنے تئیں دھماکا کیا۔

"اور تم...... مادام شاریا چوئی ہو۔" میں نے بھی جوابی دھماکا کیا۔ جھوٹ بولنے کا اب وقت نہ رہا تھا۔ میں نے پلان میں ضرورت اور حالات کے مطابق تبدیلی لازمی سمجھی۔ وہ بری طرح چونکی۔

"تمہارے باقی دو ساتھی، مسٹر ڈورل اور چنگ ہنگ کہاں ہیں؟"

"تت...... تم ایک خطرناک آدمی ہو، تم نے ہی یہ ساری خونریزی مچائی ہوگی۔" وہ یکدم بولی۔ اس کی خوبصورت آنکھیں اب شعلے برسانے لگیں، ساتھ ہی میں نے اس کی مخروطی انگلی کو پستول کے ٹریگر پر حرکت کرتا محسوس کیا اور اسی وقت اپنی جگہ سے اچھلا۔

گولی چلی، دھماکا ہوا، جب تک وہ دوسرے فائر کے لیے سنبھلی، میں اس کے سر پر پہنچ چکا تھا۔ کھڑی ہتھیلی کا وار اس کے پستول والے ہاتھ پر کیا جس سے وہ چھوٹ کر پرے جا گرا۔ وہ یکدم پھرکی کی طرح ایڑی پر گھومی اور رائٹ ہک کی ضرب میری پسلیوں پر رسید کرنی چاہی، تب تک میں گھوم کر خود کو اس جاں کش ضرب سے بچا چکا تھا بلکہ ایک لات بھی اس کی پشت پر لگائی۔ اس کے حلق سے باریک چیخ ابھری اور وہ دور جا پڑی لیکن گرتے ہی وہ کسی بلی کی طرح اچھلی اور جس مقام پر وہ جا پڑی تھی، ادھر پستول تھا مگر اس کا صرف اس پر ہاتھ ہی پڑ سکا تھا کیونکہ تب تک میں بھی اپنی جگہ چھوڑ چکا تھا۔

میرا بوٹ اس کے نازک ہاتھ پر پڑا، دوسرا بوٹ اس کی زخمی پیشانی پر۔ بلبلاتی اونٹنی کی طرح وہ چیخی اور ڈھے گئی۔ سانسیں تیز تھیں، حواس مختل پڑنے لگے، تاہم ہوش میں تھی لیکن کچھ کرنے کے قابل نہ رہی۔

میں نے جھک کر پستول اٹھا لیا۔ اس کی پیشانی کا زخم دوبارہ کھل چکا تھا۔ وہاں سے اب جھل جھل خون بہنے لگا، وہ کراہنے لگی۔ میں نے پاس رکھی کرسی کو ایک ٹانگ سے اپنی جانب کھینچا اور اس پر آرام سے ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر براجمان ہو گیا۔

"ہم...... مادام شاریا چوئی! اب تم مجھے ساری کہانی بتاؤ گی کہ یہاں کیا ہوا تھا؟" میں نے سرد اور خشک لہجے میں کہا۔ وہ ہنوز ہانپ رہی تھی۔ میں نے اس کی حالت خاصی قابلِ رحم کر ڈالی تھی۔

"تت...... تم، وحشی درندے......!" وہ اتنا ہی کہہ پائی۔

"شکریہ، دشمن مجھے اسی لقب سے یاد کرتے ہیں اور مجھے یہ اچھا لگتا ہے۔" میں نے خار میں آنے کے بجائے حظ اٹھانے کے انداز میں استہزائیہ کہا۔

"لیکن میں بہرحال تم لوگوں کو تو اپنا دشمن نہیں سمجھتا تھا، پھر تم نے مجھ پر وار کیوں کیا؟" میں نے جیسے آخر میں اپنا جملہ مکمل کیا۔

یہ میری مکاری تھی جس کی اثر پذیری اس کے چہرے سے اس طرح عیاں ہوئی کہ وہ دوبارہ نہیں بولی اور خود کو پرسکون کرنے لگی، میں بھی چپ رہا۔ تب اس نے فرش پر لیٹے لیٹے کروٹ لے کر مجھ سے کہا۔

"شاید میں کسی غلط فہمی کا شکار ہوگئی تھی۔" مکاری کا جواب مجھے بھی مکاری سے ہی ملا تھا۔

"چالاکی اور دھوکے کے بجائے سیدھی بات کرو گی تو ہمارے درمیان کوئی غلط فہمی نہیں رہے گی۔" کائیاں میں بھی تھا۔ جو یہ خود تھے، وہی میں بھی خود کو ظاہر کرنے کی کوشش میں رہا۔

"تم نے ٹھیک کہا، آہ......!" کہتے ہوئے وہ کراہی۔

"پلیز! میرا زخم...... کچھ کرو۔" اس نے بیچارگی سے التجا کی۔

"تاکہ تم دوبارہ مجھ پر ہلا بول دو۔" میں نے زہریلے لہجے میں کہا۔

"نہیں۔" وہ اس حال میں بھی تھوڑا سا مسکرائی، بڑی کشش تھی اس کی مسکراہٹ میں۔

"تم اور ہم جس دنیا سے تعلق رکھتے ہیں، وہاں اعتبار اور بھروسے کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔" میں نے اب رفتہ رفتہ جال پھینکنا شروع کیا۔ "اور...... ایک بار دھوکا کھانے کے بعد تو بالکل بھی نہیں۔ میرا ارادہ تو تھا کہ شاید ہم ایک دوسرے کی کوئی مدد کر سکیں کیونکہ مجھے اندازہ ہوگیا ہے کہ میرا اور تم لوگوں کا مقصد ایک ہی ہے۔ اگر مل بانٹ کر کھائیں گے تو ہم دونوں ہی کی شکم سیری ہو جائے گی۔"

"میں مانتی ہوں... اپنی غلطی۔" وہ بولی۔

"اب کوئی فائدہ نہیں۔" میں نے بدستور سرد لہجے میں کہا۔ "اب تمہیں اس کا کوئی ٹھوس ثبوت دینا ہوگا، تب ہی شاید بات بنے۔" میں نے کندھے اچکائے۔

"پلیز! میرے زخم سے خون مسلسل بہہ رہا ہے، میں مر جاؤں گی، کچھ کرو۔ مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوگیا ہے۔" وہ کراہی۔ "باقی تم نے ٹھیک کہا ہے کہ ہم دونوں جس دنیا سے تعلق رکھتے ہیں، اس میں دل بانٹ کر رکھنا ہی عقلمندی ہے...... آہ۔"

اس پر نقاہت طاری ہونے لگی۔ جب میں نے دیکھا کہ اس کی میں نے اچھی طرح جسمانی اور بالخصوص "ذہنی" تحور کردی ہے تو میں اٹھا اور اس کے زخم کی دوبارہ دیسی ساختہ پٹی کر ڈالی۔

"شکریہ...... لیکن ہمیں یہاں زیادہ دیر نہیں رکنا چاہیے کیونکہ وہ لوگ دوبارہ یہاں آسکتے ہیں۔ ہم یہاں بالکل بھی محفوظ نہیں ہیں۔" شاریا نے کہا۔ میں غور سے اسے دیکھ رہا تھا۔ بظاہر نازک اندام سی بانگ کانگ کی دوشیزہ، ذہنی طور پر بھی مستعد تھی اور جسمانی بھی، البتہ بار بار کھلتے سلگتے زخموں نے اسے بے حال سا ضرور کر ڈالا تھا۔

میں بھی کچھ ایسا ہی سوچ رہا تھا۔ شاریا میرے لیے ضروری ہوگئی تھی، اس سارے اسرار سے اب وہی پردہ اٹھا سکتی تھی۔ میں نے پستول اپنی جگہ پر اڑسا۔ اس کے بعد اسے سہارا دے کر اٹھایا۔ اسے چکر سا آگیا، سہارا لینے کے لیے اس نے میرا کندھا تھام لیا۔ میں اب بھی اس سیانی بلی سے محتاط ہی تھا لیکن اب شاید ایک تو اس میں وہ سکت نہ رہی تھی یا پھر اس نے مجھ سے تعاون کرنا ہی مناسب جان لیا تھا۔

"باہر میری بائیک کھڑی ہے، لیکن بائیک تم چلاؤ گی۔ کیا تم خود کو ٹھیک سمجھ رہی ہو؟" میں نے کہا۔

مجھے یقین تھا کہ اسے بائیک تو چلانا آتی ہی ہوگی کیونکہ میں اسے اپنے عقب میں بٹھا کر بائیک نہیں چلا سکتا تھا، وجہ یہی تھی کہ وہ دوبارہ وہی حرکت نہ کر ڈالتی جس سے وہ میرے ہاتھوں اس حال کو پہنچی تھی۔ پستول نکالنا اس کے لیے کوئی مسئلہ نہ ہوتا۔

میری بات کا مقصد سمجھ کر وہ دلکش سے انداز میں میری طرف دیکھ کر مسکرائی، پھر ہولے سے اثبات میں اپنا سر ہلا دیا۔

میں اسے سہارا دے کر باہر لے آیا۔ میں نے اسے بتا دیا تھا کہ بائیک تک پہنچنے کے لیے ذرا دور پیدل چلنا پڑے گا، اسے میں نے کچھ فاصلے پر درختوں کے جھنڈ میں چھپایا ہوا ہے۔

اچانک میں بری طرح چونک پڑا۔ تاریکی میں مجھے تھوڑی ہی دور ایک روشنی نظر آئی، میرا اس پہ بری زور سے دھڑکا۔ یہ کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹس تھیں۔ میں رک گیا۔ شاریا بھی بے چین سی ہوگئی۔ شاید اس کی بھی نگاہ اس طرف پڑ چکی تھی۔

میں نے تیزی سے کچھ سوچا اور پھر شاریا کے نازک اندام وجود کو دونوں ہاتھوں میں اٹھا کر تیزی سے قریبی جھاڑیوں کی سمت بھاگا۔ وہ بوکھلائی نہ کراہی، غالباً صورت حال کی نزاکت کا اسے بھی اندازہ تھا۔ بائیک کی سمت چند قدمی کے بعد میں وہیں جھاڑیوں میں ایسی جگہ رک گیا کہ بائیک بھی قریب تھی اور میں یہاں سے چھپ کر ان لوگوں پر بھی نگاہ رکھ سکتا تھا۔

شاریا کو میں نے آہستگی سے بھربھری مٹی والی زمین پر اتار دیا اور اسے آواز نہ نکالنے کی تاکید کر کے اس سمت دیکھنے لگا جدھر تقریباً ڈھائی میٹر چوڑا کچا راستہ عمارت تک چلا گیا تھا۔ تاریکی میں میری نظریں کسی عقاب کی طرح کام کرنے لگیں۔

"کون لوگ ہوسکتے ہیں یہ؟" شاریا بولنے سے باز نہ آئی تاہم اس نے سرگوشی میں ہی کہا تھا۔

"شش...... مجھے دیکھنے دو۔" میں نے ہولے سے کہا۔

گاڑی کو میں دیکھتے ہی پہچان گیا، یہ ڈبل ڈور ڈالا نما گاڑی چودھری جی برادارن کی تھی، جس کے پچھلے حصے میں دو مسلح افراد تھے اور گاڑی رکتے ہی وہ چھلانگ مار کر اترے تھے۔ جبکہ ڈرائیونگ سیٹ سے بھی ایک آدمی برآمد ہوا، یہ ڈرائیور تھا۔ اس نے بھی گاڑی سے اترتے ہی ہاتھ میں پسٹل لے لیا تھا۔ دوسری جانب کے دروازے سے میں نے نکے چودھری وراب جی کو بھی تیزی سے اترتے دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں پہلے ہی سے ریوالور دبا ہوا تھا۔

مجھے یہ دیکھ کر کچھ حیرت سی ہوئی۔ ان میں وڈا چودھری شالا جی نہیں تھا جبکہ یہ گاڑی اسی کے استعمال میں رہی تھی۔ نکا چودھری وراب جی کے پاس کار تھی۔ تو پھر شالا جی کہاں تھا؟ جبکہ سلیم اور وسیم سے حاصل کردہ معلومات کے مطابق شالا جی بھی یہاں کے "معاملات" میں سرگرم ہونے لگا تھا۔ بہرکیف، یہ لوگ تیزی سے اندر کی جانب لپکے۔

"دیکھو، تم یہاں سے ہلنا بھی مت۔" میں نے شاریا کو تاکید کرنے کے انداز میں ہولے سے کہا۔ "مجھے ان کی گفتگو سننا ہوگی۔ شاید بوبورگا کے مجسمے کے بارے میں کچھ معلومات حاصل ہوسکیں۔"

"لیکن تم...... اگر انہوں نے تمہیں دیکھ لیا تو؟" وہ تشویش ناک لہجے میں بولی۔

"تم فکر نہ کرو، میں ان سے نمٹنا جانتا ہوں۔"
"مگر یہ ہیں کون؟ کیا تم انہیں پہچانتے ہو؟"
"ہاں۔" میں نے اس کی تسلی کے لیے کہا تاکہ وہ مجھے اپنا ہمنوا سمجھتی رہے اور میرے ساتھ ہی رہے۔ "[illegible] گروہ انہی لوگوں کے ہتھے میں تھا مگر اب کیا [illegible] ہیں، یہ مجھے وہاں جاکر چھپ کر جاننا پڑے گا۔"
"اوکے۔ میں ادھر ہی ہوں۔" شاریا بولی۔
کسی خدشے کے تحت میں نے کہا۔ "دیکھو، اب ہم ایک دوسرے کے ساتھ ہیں۔ مقصد ہمارا ایک ہے لیکن اگر تم میرا ساتھ چھوڑنا چاہتی ہو تو بے شک جہاں جانا چاہو، چلی جانا، پھر مشترکہ منصوبے والا ہمارا معاہدہ ختم ہو جائے گا۔"
"ہرگز نہیں۔" وہ نفی میں سر ہلا کر بولی۔ "میں تمہارے ساتھ ہوں۔"
میں نے مطمئن ہو کر اپنا سر ہلا دیا۔ امید تو تھی کہ وہ ایسی ویسی کوئی حرکت نہیں کرے گی، کیونکہ اس کی "گوٹ" میں نے اپنے پاس پھنسا دی تھی۔ بہرکیف، میں آگے بڑھ گیا۔ وہ چاروں اندر جا چکے تھے۔ جیسے ہی میں لپک کر دروازے کے عقب میں چھپ کر اندر کی سن گن لینے لگا تو مجھے نکے چودھری کی غصے میں چلاتی آواز سنائی دی۔
"وہ ذلیل، حرام زادہ وسیم! یہ سب اسی کا گل کھلایا ہوا لگتا ہے۔ اگر وڈے پاجی کو خدانخواستہ کچھ ہو گیا تو میں......"
غیظ و غضب تلے وہ اپنا جملہ پورا نہ کر سکا، اس کے چلانے کی آوازیں آتی رہیں تو اسی دوران اس کے کسی گماشتے نے کہا۔
"اللہ خیر کرے گا جی، وڈے چودھری صاحب ٹھیک ہو جائیں گے، اسپتال والے ان کا علاج کر رہے ہیں۔"
دوسرے نے بھی تسلی دینا ضروری سمجھا۔ "پر چھوٹے چودھری صاحب! آپ کو اسپتال میں ہی موجود رہنا چاہیے تھا، میں اور غلامو ہیں نا، اس وسیم کو پاتال سے بھی گھسیٹ لائیں گے۔"
میں ان کی باتیں سن کر چونک پڑا۔ نکے چودھری کی "وڈے پاجی" سے مراد اپنا بڑا بھائی چودھری شالا جی ہی تھا مگر اسپتال......اس کے ساتھ ایسا کیا ہوا تھا؟ اور پھر وسیم-----کیا یہ ساری خونریزی وسیم نے پھیلائی تھی؟ مگر کیسے؟
اسی وقت پہلے والے آدمی کی آواز آئی، جو شاید آخر الذکر گماشتے کے مطابق غلامو ہی تھا۔
"پر چھوٹے چودھری صاحب! لگتا نہیں ہے کہ یہ وسیم ہی کی اتنی بڑی جرأت اور کارستانی ہوگی، ہم تو خود اس کے پیچھے گئے تھے جب اس نے سجاد بیگ کو ہلاک کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس کی کار تو گندے جوہڑ میں جا گری تھی۔"

[illegible]
تصدیق نہ تھی [illegible]
حرکت نہیں کی ہوگی۔ [illegible]
"ارے [illegible]
یہاں نہیں [illegible]"
اچانک ایک تیسرے [illegible] ان کا ڈرائیور تھا۔ میں نے [illegible] سے چیکاری۔ میرا اندازہ ٹھیک [illegible] تھا جو ایک کونے میں پڑی [illegible] تھا اور باقی سب بھی وہاں جمع ہو کر تیزی سے [illegible] جارہے تھے۔
"اس کا مطلب ہے جب وڈے پاجی کو زخمی حالت میں ہم اسپتال لے کر دوڑے تھے تو یہاں کوئی [illegible] تھا۔" نکے چودھری نے بڑبڑاتے ہوئے کہا اور میرا دل تیزی سے دھک دھک کرنے لگا۔
"لیکن سمجھ میں نہیں آیا کہ آخر مسٹر ڈوول، چینگ بینگ کہاں چلے گئے؟"
"وہ تو جی سجاد بیگ کے ساتھ ہی حملے کے وقت نکل گئے تھے۔" دوسرے حواری نے بتایا۔
"اوہ---- یہاں تو معاملہ ہی اور لگ رہا ہے، پر گوری شاریا کی بھی لاش غائب ہے۔" یہ انکشاف غلامو نے کیا تھا۔
"لگتا ہے وہ بھی صرف زخمی یا بے ہوش ہوئی تھی۔ کیا خبر وہ بھی ہوش میں آنے کے بعد نکل گئی ہو۔"
"اس کا مطلب ہے میرا اندازہ ٹھیک نہیں۔" نکا چودھری پھر غرایا۔ "یہ وسیم کے ہی آدمی ہو سکتے ہیں۔ اس نے اندرون خانہ بھانڈیل سائیں سے.....لیکن نہیں----" اچانک میں نے نکے چودھری کو کہتے کہتے تھمتے پایا۔
"ہم سہراب خان کو کیوں بھول رہے ہیں؟"
میرا اب وہاں مزید کھڑے رہنا فضول ہی تھا۔ کوئی خاص کام کی بات معلوم نہیں ہوئی تھی۔ ان کا شک حملہ آوروں کے سلسلے میں وسیم کی طرف ہی جا رہا تھا، جبکہ خود مجھے بھی ابھی تک اندازہ نہ ہو پایا تھا کہ یہ کس کی حرکت ہو سکتی ہے۔ البتہ اتنا علم ہوا کہ یہاں ان کی میٹنگ جاری تھی، وسیم غصے میں ہنگامہ کر کے نکلا، بعد میں میٹنگ کے دوران کسی نامعلوم گروہ نے

حملہ کیا، جس کے نتیجے میں وڈا چودھری شدید زخمی ہو کر اسپتال پہنچ گیا۔

شاریا وہیں موجود تھی جہاں میں نے اسے چھوڑا تھا۔ ہم تیزی سے حرکت میں آئے۔ بائیک مجھے ہی سنبھالنا اور چلانا پڑی۔ شاریا میرے پیچھے بیٹھ گئی۔ وہ بار بار پوچھتی رہی کہ کیا معلوم ہوا۔

میں نے ابھی اسے کوئی جواب نہ دیا اور بائیک دوڑانے لگا۔ ہیڈ لائٹس روشن تھیں، رات کے تاریک سناٹے میں بائیک کچے راستے پر ہچکولے کھاتی آگے بڑھ رہی تھی۔

اسی دوران میں نے شاریا کو بتایا کہ کچھ خاص معلومات نہ ہوسکیں، نہ ہی میں ان لوگوں کو جانتا بھی ہوں۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ یہ وہی لوگ ہیں جنہوں نے ہلا بولا تھا اور تمہیں بھی زخمی کر کے مرا ہوا سمجھ کر لوٹ چلے تھے، وغیرہ۔

میں نے دانستہ شاریا سے دروغ گوئی سے کام لیا تھا کیونکہ بقول وسیم کے، یہ لوگ تو ایک دوسرے کے حلیف تھے۔ اگر میں نکے چودھری وغیرہ کے بارے میں شاریا کو بتاتا تو وہ مجھے ان سے ملنے، ان کے پاس جانے کا اصرار کرتی جو ظاہر ہے میرے لیے تو ممکن نہ تھا۔

''میں اسی لیے جلدی پلٹ کر دوڑا آیا ہوں کہ انہیں اب تمہاری تلاش ہے کیونکہ انہوں نے تمہاری لاش، یعنی تمہیں غائب پایا ہے اور جان چکے ہیں کہ تم زندہ تھیں اور ہوش میں آتے ہی بھاگ کھڑی ہوئیں۔''

میں نے آخر میں دانستہ اسے ڈرانے کے لیے ایک شوشا چھوڑا تا کہ وہ پوری طرح ذہنی اور جسمانی طور پر میری گرفت میں رہے۔ وہ واقعی ڈر سی گئی۔ اگرچہ اس میں کوئی شک نہ تھا کہ وہ خود بھی ایک بڑے کریمنل گروہ سے تعلق رکھتی تھی لیکن آخر جس طرح یہاں خونریزی مچائی گئی تھی، اس سے وہ بہرحال ڈری ہوئی ضرور تھی۔

یوں بھی اس منحوس مجسمے کو حاصل کرنے کے لیے کئی پارٹیاں سرگرم تھیں۔ میرا اپنا ذاتی خیال لنگی پوش گروپ یعنی مجھی اور گربھ داس کی طرف جاتا تھا لیکن یہ اڑچن سمجھنے سے میں بہرحال قاصر ہی رہا کہ آخر پھر ان کا ایک ساتھی یہاں کیا کرنے لوٹا تھا یا پھر وہ جاسوسی کرنے آیا تھا؟ ابھی میں یقین سے اس بارے میں بھی کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔

''اب کہاں جا رہے ہیں؟'' معاً عقب میں بیٹھی شاریا نے پوچھا۔

''میرے ٹھکانے پر۔'' میں نے ہیلمٹ کا وائزر اٹھا رکھا تھا۔

''کہاں ہے تمہارا ٹھکانا؟''

''شہر میں۔''

''چلو ٹھیک ہے، پھر مجھے اپنے ہوٹل اتار دینا۔'' میرے دونوں ساتھی مسٹر ڈورل اور چنگ ہنگ بھی یقیناً وہیں گئے ہوں گے۔'' وہ بولی۔ ''وہ یقیناً مجھے زندہ دیکھ کر خوش ہوں گے، ورنہ انہوں نے بھی مجھے مردہ ہی سمجھ لیا تھا۔''

میں نے کوئی جواب نہ دیا اور اسے شہر لے جانے کے بجائے راہ میں آنے والے اسی تھانے کا رخ کیا جہاں کا انچارج سب انسپکٹر توفیق تھا، کیونکہ ابھی میں نے شاریا چوئی سے بھی بہت سے سوالات کرنے تھے۔ مثلاً جس وقت ان کی آپس میں میٹنگ چل رہی تھی، اس وقت مجسمہ کس کے پاس اور کہاں تھا؟ حملہ آور کتنے تھے، کس شکل و شباہت کے تھے۔ اگر مجسمہ وہیں کہیں تھا تو کیا نامعلوم حملہ آور وہ مجسمہ لے جانے میں کامیاب ہو گئے تھے؟

دفعتاً ایک خیال بجلی کی سی تیزی سے میرے ذہن رسا میں ابھرا۔

یہ بھی تو ہوسکتا تھا کہ ان کے بیچ ہی کسی نے ایک پارٹی کو دھوکا دینے کی کوشش کی ہو اور مجسمے کی وہاں موجودگی کا یقین ہوتے ہی اچانک شب خون مارا ہو، تو پھر ایک ہی پارٹی کا نام آتا تھا جو وہاں ان کے ساتھ موجود تھی۔

''مسٹر ڈورل، چنگ ہنگ اور مادام شاریا چوئی!'' یہ خیال آتے ہی یکایک میرے پورے وجود میں سنسنی دوڑ گئی کیونکہ ان کی ایک ساتھی میری پشت پر براجمان تھی۔

میں نے بائیک کی رفتار اچانک دھیمی کردی لیکن دوسرے ہی لمحے میرے پیچھے بیٹھی ہوئی شاریا چوئی نے وہی حرکت کر ڈالی جس کی مجھے کم سہی لیکن توقع تھی مگر آخر الذکر ادراک سے مجھے اس حوالے سے بھی یقین کی حد تک خطرے کی بو آ گئی تھی۔

بڑی پھرتی کے ساتھ اس نے میری بیلٹ میں اڑسے ہوئے پستول کو نکالنا چاہا تھا مگر میں بھی کائیاں تھا، ایک بار اس سے دھوکا کھا کر دوسری بار بھلا کیسے کھا سکتا تھا۔ پستول میں نے سامنے جیکٹ کی اندرونی جیب میں ڈال لیا تھا۔

اپنی کوشش میں ناکام ہوتے ہی شاریا نے بائیک سے چھلانگ لگا دی۔

معاشرتی ناسوروں اور درندوں کی خوں ریز سازشوں اور زخم زخم ہونے والے ایک جنگ باز کی دلدوز داستان کے مزید واقعات اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیں

مشہور ہونے کے لیے غلط طریقہ اپنانے والے جوڑے کی داستان

موجودہ دور میں سوشل میڈیا ایک بہت بڑا پلیٹ فارم بن گیا ہے... ہر کوئی اس کا استعمال کر رہا ہے... چاہے صحیح طریقے سے یا غلط... انہوں نے بھی وائرل ہونے کے لیے سوشل میڈیا کا سہارا لیا... لیکن مشہوری کے لیے ایک ایسا کام کیا کہ جان کے لالے پڑ گئے... اب انہیں اپنی کامیابی کا انتظار تھا۔

تماشا

عائشہ نصیر

شام کی ہنگامہ آرائی اپنے اختتام کو پہنچ چکی تھی۔ مونرو اسٹریٹ کے سب وے پلیٹ فارم پر زرد بلب جاگنے لگے تھے۔ سام کیلسن اپنے کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ پھنسائے کھڑا اس لڑکی کو الیکٹرک گٹار بجاتے اور گاتے ہوئے سن رہا تھا۔ اس کے سامنے رکھا پرانا، ٹوٹا پھوٹا ایمپی فائر کسی زخمی جانور کی طرح کراہ رہا تھا اور وہ گرد و پیش سے بے نیاز گاتی چلی جا رہی تھی۔ اس کے بول صرف بول نہیں تھے، انگارے تھے جو ہوا میں معلق رہتے اور اگلے ہی پل

برف کی طرح دل پر آن گرتے۔ اس کی آواز میں جلتی ہوئی راکھ کی گرمی تھی اور پرانے زخموں کی ٹھنڈک۔ کیلسن کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی اور وہ ساتھ ساتھ جھومنے لگا۔

وہ لڑکی دیکھنے میں کوئی اٹھارہ برس کی لگتی تھی مگر سڑکوں پر جینے والوں کی عمروں کا اندازہ ہمیشہ دھوکا دے جاتا ہے۔ یہ بھی ممکن تھا وہ تیس کی ہو، ممکن تھا اس سے بھی زیادہ کی۔ کچھ لوگ سڑکوں پر بوڑھے نہیں ہوتے مگر ان سے وقت چھین لیا جاتا ہے، جیسے کسی کے ہاتھ سے گھڑی اتار کر پھینک دی جائے۔

اس نے پرانی نیلی جینز پہن رکھی تھی اور ایک بالکل سفید ٹی شرٹ۔ اس کا چہرہ دبلا تھا، فاقوں اور رتجگوں سے تراشا گیا مگر پھر بھی اس کے چہرے پر کمزوری نہیں، ایک عجیب سی کشش تھی۔ دانت بے حد سفید تھے، بال چھوٹے اور سیدھے تھے، گندم کی سنہری بالیوں جیسے۔ نیلی آنکھیں ایسی تھیں کہ دیکھنے والا لمحہ بھر کو بھول جائے کہ وہ سب وے کے سرد پلیٹ فارم پر کھڑا ہے۔ ان میں کہیں دور کا آسمان اور کہیں بہت پرانا دکھ ٹھہرا ہوا تھا، یا وُں ننگے تھے۔

''ہے!'' شور کو چیرتے ہوئے کیلسن کی آواز ابھری۔ ''تم بہت اچھا گاتی ہو۔''

اچانک سامنے آجانے والی خوبصورتی ہمیشہ اسے خوش کردیتی تھی، اندھیرے کمرے میں اچانک کھلنے والی کسی روشن کھڑکی کے مانند۔ یہ عادت اس حادثے سے پہلے بھی اس کے ساتھ تھی۔ اس دن سے پہلے جب ایک گولی نے اس کے دماغ کے ایک کونے کو زخمی کردیا تھا اور اس کے بعد جذبات اور زبان کے درمیان جو باریک سا پردہ ہوتا ہے، وہ پھٹ گیا تھا۔ اب جو دل میں ہوتا، وہی زبان پر آجاتا تھا، بنا اجازت، بنا احتیاط کے۔

جس لڑکے نے اسے گولی ماری تھی، وہ اب مر چکا تھا مگر مرجانا ہمیشہ خاموشی نہیں لاتا۔ کیلسن جب اداس ہوتا، اس سے باتیں کرلیتا تھا۔ پچھلے چھ دنوں سے ایک اور آواز بھی اس کے ساتھ جڑ گئی تھی۔ ایک پلمبر، ہنری اسٹکلر۔ ایک عام سا آدمی، جس کا نام ہی اس کی زندگی جتنا بھدا اور بوجھل تھا۔ کیلسن کو بس اتنا معلوم تھا کہ وہ اپنی گرل فرینڈ کے ساتھ گرین بے میں کہیں چھپا ہوا ہے، کسی سستے کمرے میں، کسی بند پردے کے پیچھے۔

ہنری اسٹکلر کی بیوی نے طلاق کے کیس کے لیے تصویریں کھینچنے کا کام کیلسن کو سونپا تھا مگر قسمت نے یہاں بھی حسبِ عادت اسے ایک چپت رسید کردی تھی، جب ڈرائیونگ کرتے ہوئے لمحہ بھر کو اس کی نظر چوکی اور اس کی گاڑی سڑک پر نکلے ایک فائر ہائیڈرینٹ سے ٹکرا گئی۔ لوہا مڑا، پانی پھوٹا اور زندگی ایک بار پھر پٹڑی سے اتر گئی۔ اسی لیے اب وہ ٹرین میں سفر کررہا تھا...... اور کرتا رہتا، جب تک گاڑی کی مرمت نہ ہوجاتی۔ یہ مجبوری اسے اندر ہی اندر چڑچڑا کیے ہوئے تھی۔

مگر اس پلیٹ فارم پر، اس شور کے بیچ اس لڑکی کی موسیقی نے اس کے اندر کا شور خاموش کردیا تھا۔ چند لمحوں کے لیے اس کے سر میں چیختی ہوئی یادیں دب گئیں، مردہ آوازیں پیچھے ہٹ گئیں۔

اس نے جیب سے بیس ڈالرز نکالے اور گلوکارہ کے گتے کے ڈبے میں ڈال دیے۔ لڑکی نے ایک نظر اسے دیکھا اور گانا جاری رکھا۔

اسی لمحے دو ہائی اسکول کے لڑکے زور زور سے ہنستے ہوئے ان کی طرف بڑھ آئے، شرارت ان کے چہروں سے ٹپک رہی تھی۔

کیلسن نے ان لڑکوں سے چلّا کر کہا۔ ''چپ رہو۔'' پھر فوراً ہی اضافہ کیا۔ ''پلیز!''

لڑکے رک گئے۔ دونوں ذرا پیچھے کھڑے ہوگئے، جیسے ایک مارنے کے لیے تیار ہو اور دوسرا توجہ بٹانے کے لیے۔

''اسے سنو۔'' کیلسن نے کہا۔ ''بس اسے سنو۔''

وہ لمحہ بھر کو رک کر واقعی سننے لگے، پھر وہ بھی ویسے ہی مسکرانے لگے جیسے کچھ دیر پہلے کیلسن مسکرایا تھا۔

''سنا تم نے؟'' کیلسن بولا۔

''زبردست۔'' ایک لڑکے نے کہا۔

''بالکل، یہی تو میں کہہ رہا ہوں۔'' کیلسن نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

تھوڑی ہی دیر میں گلوکارہ کے گرد لوگ جمع ہونے لگے۔ کوئی بزنس سوٹ میں ملبوس آدمی، ایک لاطینی جوڑا جن کا بچہ اسٹرولر میں سو رہا تھا، ایک سیاہ فام عورت جس کے ہاتھ میں آرٹ انسٹی ٹیوٹ کا بیگ تھا اور وہی ہائی اسکول کے لڑکے۔

لڑکی نے گٹار پر زور سے انگلیاں چلائیں اور پھر وہی مصرع دہرایا۔

''تم آگ کے بیچ بھی کتنے سرد ہو...... تم......''

اچانک ایک ٹرین دھاڑتی ہوئی اسٹیشن میں داخل ہوئی۔ لوہے کی وہ چیخ ایسی تھی کہ اس نے سب سے خوبصورت سُر کو بھی کچل کر رکھ دیا۔ نازک شیشے پر ہتھوڑے کی ضرب جیسے۔ ہوا لرز اٹھی، پلیٹ فارم کانپ گیا۔

کیلسن نے بے اختیار ٹرین کی طرف بھی چلّا کر کہا۔

"چپ رہو۔"

ٹرین نے جواب میں اور زیادہ شور مچایا۔

اسی لمحے گلوکارہ کی سفید ٹی شرٹ پر ایک گلابی سا دھبا ابھرا۔ پہلے پہل وہ کسی جادو جیسا لگا، جیسے کپڑے پر اچانک کوئی ننھا سا پھول کھل آیا ہو۔ ایک لمحے کو آنکھ نے ماننے سے انکار کیا، پھر وہ دھبا پھیلنے لگا، گہرا ہوتا گیا، سرخ...... بالکل ویلنٹائن کے دن کے گلاب جیسا۔

جب ٹرین کی آواز چیخ میں بدل گئی اور پہیے پٹڑی پر چیخنے لگے، لڑکی کے ہاتھوں سے گٹار پھسل کر ایک کھوکھلی سی آواز کے ساتھ کنکریٹ کے فرش پر گرا۔

اس کے اردگرد کھڑے لوگ بس اسے گھورتے رہے، کوئی آگے نہ بڑھا، کوئی چیخ نہ نکلی۔ سب ایسے دیکھ رہے تھے کہ شاید زمین پر گرجانا بھی اس کے گانے کا حصہ ہے، کوئی آخری سُر جو ابھی ختم نہیں ہوا۔

پیچھے ٹرین کے دروازے دھڑ دھڑاتے ہوئے کھل گئے۔ ہوا کا ایک جھونکا آیا، ساتھ ہی ہجوم کی بے چینی بڑھی۔ لوگ تیزی سے یوں لپک کر ٹرین میں سوار ہونے لگے جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ ہائی اسکول کے لڑکوں میں سے ایک نے تیزی سے اِدھر اُدھر دیکھا، گتے کے ڈبے میں ہاتھ ڈالا، کیلسن کے بیس ڈالرز اٹھائے اور بند ہوتے دروازوں کے بیچ سے پھسلتا ہوا اندر کود گیا۔

ٹرین کے روانہ ہوتے ہی پلیٹ فارم پر اب صرف کیلسن تھا، ایک لاٹھی والا بوڑھا آدمی اور کنکریٹ پر پڑی وہ لڑکی۔

کیلسن اس کے پاس جھکا۔ اس کی سانسیں بھاری تھیں، خون اس کی قمیص پر پھیلتا جارہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ارتکاز نہیں تھا۔

"کیا ہوا؟" لڑکی کی آواز بے حد دھیمی تھی۔

"لگتا ہے کسی نے تمہیں گولی ماری ہے۔" کیلسن نے کہا۔ اس کی آواز میں پیشہ ورانہ ٹھنڈک تھی۔ آخر وہ کبھی پولیس والا رہا تھا اور اب ایک پرائیویٹ ڈیٹکٹیو۔

لڑکی کی نظریں بھٹکیں پھر واپس اس پر آٹھہریں۔

"مجھے بہت سردی لگ رہی ہے۔" اس کا جسم کانپنے لگا تھا۔

"مجھے معلوم ہے۔" کیلسن نے آہستہ سے کہا۔ اسے وہ سرد صبح یاد آگئی جب وہ خود کنکریٹ پر پڑا تھا، جب خون گرم تھا مگر بدن برف بنتا جارہا تھا۔ وہ جانتا تھا یہ سردی موسم کی نہیں ہوتی۔

"میں مر رہی ہوں نا؟" اس کے لہجے میں یقین تھا۔

انتخابات

ایک بار لکھنؤ میں انتخابات کا بازار گرم تھا۔ حکیم شمس الدین اپنے علاقے سے امیدوار تھے۔ کچھ ستم ظریفوں نے ان کے مقابلے میں چوک کی ایک مشہور طوائف دلربا کو کھڑا کردیا۔ زندہ دلانِ لکھنؤ میں سے کسی نے پھبتی کسی۔ یہ پھبتی گلی کوچوں میں گونجنے لگی۔

"دل تو دیجیے دلربا کو، ووٹ دیجیے شمس الدین کو۔"

(مرسلہ: حنا خان، مری)

الیکشن سلیکشن

الیکشن جیتنے (اور ہارنے) کی زبردست تیاریاں ہورہی تھیں اور ایک امیدوار تقریر کررہا تھا۔

"جو کل گزر گیا، وہ ماضی تھا اور آنے والا کل مستقبل ہے۔ آنے والے کل اور مستقبل کو دیکھیے۔ گزرے ہوئے کل اور ماضی میں کیا ہوا، بھول جائیے۔ ماضی کی ہر بات کو بھول جائیے۔"

"لیکن میرے پچاس ہزار مت بھولنا جو تم نے ماضی میں لیے تھے۔" ایک آواز آئی۔

(مرسلہ: اسما ممتاز، کراچی)

"نہیں۔" کیلسن فوراً بول اٹھا۔

وہ اُلجھ گئی۔ "تمہیں کیسے پتا؟"

"دل کی خواہش ہے۔" کیلسن کی آواز دھیمی ہوئی۔

لاٹھی والا بوڑھا آدمی فون پر 911 پر بات کررہا تھا۔

کیلسن نے لڑکی سے کہا۔ "بس چند منٹ سنبھل کر رہو۔"

"کس کے لیے؟" اس کی آنکھیں بند ہونے لگی تھیں۔

"میرے لیے۔" کیلسن نے کہا۔ "پلیز......!"

جب پیرامیڈکس آئے اور اسے اسٹریچر پر لٹایا گیا، تو پولیس والوں نے کیلسن اور بوڑھے آدمی کو روک لیا۔ تھوڑی دیر بعد پولیس ڈیٹکٹیو وینس جانسن سیڑھیاں اتر کر آئی۔ اس نے ہاتھ کی ہتھیلی سے پیشانی پونچھی اور اپنی ہتھیلی کو دیکھ کر منہ بنایا اور جب اس کی نظر کیلسن پر پڑی تو منہ کے زاویے اور بگڑ گئے۔

"آہا...... وینس!" کیلسن نے کہا۔

"کیا؟" اس نے تیز لہجے میں پوچھا۔

"تمہیں دیکھ کر اچھا لگا وینس!"

وہ بڑبڑائی۔ "مجھے نہیں۔" وہ جانتی تھی یہ سب اس

کے لیے گھنٹوں کی پوچھ گچھ اور کاغذی کارروائی کا سبب بننے والا تھا۔

بوڑھے آدمی نے کیلسن کی طرف اشارہ کیا۔ ''اس آدمی نے لڑکی کی جان بچائی ہے۔ ایمبولینس آنے تک اسے باتوں میں لگائے رکھا، ہوش میں رکھا۔ آپ کو سننا چاہیے تھا یہ کیا کہہ رہا تھا۔''

وینس نے اس آدمی کو یوں گھورا گویا اپنی نگاہوں سے ہی بھسم کر دے گی، پھر دوبارہ کیلسن کی طرف متوجہ ہوئی۔

''مجھے ایسے کیسز سخت ناپسند ہیں۔'' اس نے کہا۔ ''ان بے گھر، آوارہ لوگوں کی دشمنیاں...... کسی نشے کی پڑیا پر۔ ڈیپارٹمنٹ کے پاس وسائل نہیں ہوتے، آخر کیوں وقت ضائع کیا جائے کسی ایسے انسان پر جس کی کسی کو پروا ہی نہ ہو؟''

''یہ والی مختلف لگتی ہے۔'' کیلسن نے کہا۔

وینس کی نظر اس لڑکی کے الیکٹرک گٹار پر جا ٹھہری جو خون کے ایک تالاب میں پڑا تھا۔

''اس کا مختلف ہونا میرے کام کو آسان نہیں کرے گا۔'' وہ بیزاری سے بولی۔

بیس منٹ تک اس نے کیلسن اور بوڑھے آدمی سے سوالات کیے، پھر بوڑھے کو جانے دیا اور کیلسن سے دوبارہ پوچھ گچھ شروع کر دی۔ ''تم نے شوٹر کو نہیں دیکھا؟''

''میں نے فائر کی آواز تک نہیں سنی۔'' کیلسن نے کہا۔ ''ٹرین کا بہت شور تھا۔''

''اس کے آس پاس پچیس لوگ تھے؟''

''کوئی اتنے ہی ہوں گے۔''

''تم نے کسی کو روکنے کی کوشش نہیں کی؟'' وینس نے اگلا سوال کیا تو کیلسن اسے گھورنے لگا۔

''میں کوئی پولیس والا ہوں؟''

وینس نے ایک گہری سانس لی۔ ''صاف ظاہر ہے، نہیں۔'' پھر پوچھا۔ ''تمہارے پاس گن ہے؟''

''نہیں، کیوں؟'' کیلسن چونکا۔

''کیونکہ اگر ہوتی تو مجھے لینا پڑتی۔'' وینس نے کندھے اُچکائے۔

''کیا تمہیں لگتا ہے میں نے اسے گولی ماری ہے؟'' اس کے لہجے سے ناراضی جھلکی۔

''میرے لگنے یا نہ لگنے سے فی الحال کچھ نہیں ہوگا، جب تک سچ سامنے نہ آجائے۔''

''اسپتال جا کر اس سے بات کرو، اگر وہ زندہ ہو۔''

کیلسن کے اس مشورے پر وینس نے اسے بھی انہی نظروں سے گھورا جن سے بوڑھے کو خاموش کروایا تھا۔

کیلسن نے کہا۔ ''یہ نہیں چلے گا۔''

''کیا؟'' وینس کی تیوری اور چڑھی۔

''ان بیویوں والی گھوری سے تم مجھے چپ نہیں کرا سکتیں۔''

وہ نظریں جمائے رہی۔ ''گھر جاؤ۔'' اس نے کہا۔ ''جو دیکھا ہے، اس پر غور کرو۔ کچھ یاد آئے تو مجھے فون کرنا۔''

☆☆☆

اسی رات ایک نیوز چینل کا رپورٹر رش یونیورسٹی اسپتال کے باہر کھڑا تھا۔ اس کے پیچھے ایمبولینس کی نیلی سرخ بتیاں سیاہ آسمان پر چمک رہی تھیں۔ وہ بتا رہا تھا کہ نامعلوم خاتون کی حالت مستحکم ہے اور زخم جان لیوا نہیں۔ چینل نے تیس سیکنڈ بعد خبر ختم کی اور کمرشل چلنے لگا۔

اس رات کیلسن نے خواب دیکھا کہ وہ لڑکا جس نے اس کی پیشانی میں گولی ماری تھی، سب وے کی گلوکارہ میں بدل گیا ہے اور وہی گانا گا رہا ہے جو وہ لڑکی گا رہی تھی۔

وہ جاگا تو اس نے دوبارہ ٹی وی آن کر لیا۔ اب نیوز والوں کے پاس اس عورت کا نام آچکا تھا۔

ڈیزی برنارڈ۔ عمر اٹھائیس سال۔ اسٹریٹ میوزیشن۔

اس کی تصویر اسکرین پر آئی۔ ایک پروفیشنل بلیک اینڈ وائٹ فوٹو، چھوٹے بال بائیں آنکھ پر گرتے ہوئے۔

کیلسن نے آہستہ سے کہا۔ ''میں اس سے محبت کر سکتا تھا۔''

ڈاکٹروں نے بتایا کہ وہ آئی سی یو سے باہر آچکی ہے۔ پولیس کے پاس نہ کوئی مشتبہ تھا، نہ کوئی محرک۔ عوام سے اپیل کی گئی کہ جو بھی شوٹنگ کے وقت پلیٹ فارم پر موجود تھا، پولیس سے رابطہ کرے۔

کیلسن نے ٹی وی بند کر دیا۔

نہاتے ہوئے وہ وہی دھن گنگناتا رہا جو ڈیزی گولی لگنے سے پہلے گا رہی تھی، پھر اس نے سرمئی پینٹ پر گہری رنگ کی قمیص پہنی، کارن فلیکس کا پیالا بھرا، ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھا اور ہیریسن اسٹریٹ پولیس اسٹیشن فون ملایا۔

فون وینس جانسن نے اٹھایا۔ ''یس؟''

وہ مسکرایا۔ ''صبح بخیر وینس!''

''کیلسن!'' وینس نے اس کا نام ایسے ادا کیا جیسے منہ میں نیم گھل گیا ہو۔

''تو آخر اس کی فیملی مل ہی گئی، ہے نا؟'' کیلسن کے

لہجے میں سوال نہیں تھا۔
"تمہیں ایسا کیوں لگتا ہے اور تم اس معاملے میں اتنی دلچسپی کیوں لے رہے ہو؟"
"نیوز والوں کو اس کی تصویر اور کہاں سے ملتی؟" کیلسن نے کہا۔ "اور میں نے اس کی جان بچائی۔ اس بوڑھے کی بات نہیں سنی تم نے؟"
"باتیں کر کے؟" ڈینس نے طنز کیا۔ "یہ تو زخموں پر نمک چھڑکنے کے مترادف ہے۔"
"میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟" کیلسن کراہا۔
"تم نے ابتدا ہی ایسے کی تھی۔ تمہاری دس باتوں میں سے شاید ایک سننے کے قابل ہوتی ہے۔"
"اچھا بس...... اتنا بتا دو، نیوز والوں کو تصویر کس نے دی؟" کیلسن اس کی باتوں کا برا مانے بغیر بولا۔
"اگر میں بتا دوں تو کیا تم میرا پیچھا چھوڑ دو گے؟"
"کوشش کروں گا۔" اس نے کہا۔
"اس کا ایک سابق بوائے فرینڈ ہے، نام ہے ٹونی زینگر!" اس نے بتایا۔
"شکریہ...... لیکن تم کب سے مجھے معلومات دینے لگی ہو؟"
"میں کچھ نہیں دے رہی، وہ خود رپورٹرز سے باتیں کر رہا ہے۔ دوپہر بارہ اور شام چھ بجے دیکھ لینا۔"
فون کٹ گیا۔
کیلسن باہر نکلا اور ڈائیورسی ایل اسٹیشن تک پیدل گیا۔ وہاں سے ڈاؤن ٹاؤن کی ٹرین لی، پھر لائن بدلی اور میڈیکل ڈسٹرکٹ کے اسٹاپ پر اترا۔ رش یونیورسٹی اسپتال کے کیمپس میں داخل ہوا۔ ایک سفید، چار بازوؤں والی عمارت جو دور سے کسی بہت بڑی تتلی جیسی لگتی تھی۔
استقبالیہ پر بیٹھی عورت نے اسے پانچویں فلور کا راستہ بتایا۔
جب وہ ڈیزی برنارڈ کے کمرے میں داخل ہوا تو بولا۔ "کم از کم ایک گارڈ تو بٹھا دیتے۔"
ڈیزی کا چہرہ تھکا ہوا تھا۔ گھاس جیسے سنہری بال پسینے سے پیشانی سے چپکے ہوئے تھے۔ اسپتال کے گاؤن کے نیچے اس کا سینہ پٹیوں سے بھرا تھا۔ اس نے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ سجائی۔
"تم؟" اس نے کہا۔
"میں۔" کیلسن نے بھویں اٹھائیں۔
"مجھے یاد ہو تم۔" اس نے آنکھیں سکیڑیں، جیسے درد کش دواؤں کے بیچ یادداشت ڈھونڈ رہی ہو۔ "ہم ساتھ گا رہے تھے۔"
"میں نہیں، تم گا رہی تھیں۔"
"تم بھی گا رہے تھے، شاید تمہیں خود سنائی نہ دیا ہو۔" وہ بولی۔
"ممکن ہے۔" اس نے کہا۔ "میرے منہ سے باتیں نکلتی رہتی ہیں۔"
"تمہاری آواز بہت خراب ہے۔" وہ ہنسی تو ہنسی سینے میں درد بن کر گونجی۔ وہ کراہ کر رک گئی۔
"تم سب کی طرح ٹرین میں کیوں نہیں چڑھ گئے؟"
"میں تمہارا گانا پورا سننا چاہتا تھا۔" وہ بیڈ کے قریب آ کھڑا ہوا۔
کھڑکی کے باہر صبح کا آسمان صاف اور نیلا تھا۔
"مگر انجام افسوسناک ہوا۔" اس کی آواز ہلکی تھی۔
"تمہیں کس نے گولی ماری؟" کیلسن نے پوچھا۔
وہ پھر اسے دیکھنے لگی۔ "تم پولیس والے ہو؟"
"میں پولیس والوں کو تنگ کرتا ہوں۔"
"میرے والد بھی پولیس میں تھے۔" اس نے کہا۔ "میں ان سے بات نہیں کرتی۔"
"پھر شوٹر کو پکڑوانے کی امید کیسے رکھتی ہو؟"
"کس نے کہا؟ میں چاہتی ہوں کہ وہ پکڑا جائے۔"
"وہ؟" اس نے لمحہ بھر سوچا۔ "ٹونی زینگر؟"
نام سنتے ہی اس نے اٹھنے کی کوشش کی تھی مگر درد سے پھر تکیے پر گر گئی۔ "تم اسے کیسے جانتے ہو؟"
"تمہارے ایکس کو؟" کیلسن نے کندھے اچکائے۔ "میری طرح باتونی ہے، لگتا ہے توجہ پسند ہے یا کم از کم کیمرے۔"
"ہاں، تم پولیس والے ہی ہو۔" اب ڈیزی کے لہجے میں یقین تھا۔
"بہت پہلے تھا۔" اس نے سر ہلایا۔ "پھر مجھے گولی لگی اور میں نے ریٹائرمنٹ لے لی۔" اس نے پیشانی کے اس گڑھے کو چھوا جہاں گولی لگی تھی۔
"بدصورت بھی ہو۔" وہ مسکرائی۔
"مگر دل کا اچھا۔ میں پرائیویٹ کام کرتا ہوں۔ لگتا ہے تمہیں مدد کی ضرورت ہے۔"
"سب وے پر لوگوں کی بخشش لینے والی تمہیں فیس کیسے دے گی؟" اس نے سوال کیا۔
"پچھلے کلائنٹ کا چیک ابھی چل رہا ہے۔" کیلسن بولا۔
وہ اسے گھورتی رہی، پھر دوبارہ کھڑکی کی طرف دیکھنے لگی۔
"میں یہاں سے نکلنا چاہتی ہوں۔"

''اتنی جلدی کیا ہے؟'' کیلسن نے کہا۔ ''ڈاکٹروں کو تمہیں ٹھیک کرنے دو۔''
''میں ڈاکٹروں سے ٹھیک نہیں ہوں گی۔'' اس نے آنکھیں موندیں۔
''اپنے بوائے فرینڈ سے بریک اپ کی وجہ سے؟'' کیلسن نے پوچھا۔
اس کی خاموشی ہی جواب تھی۔
''محبت درد دیتی ہے، میں سمجھتا ہوں۔''
''مجھے نہیں لگتا۔'' ڈیزی نے اس کی طرف دیکھا۔
اس نے پھر پیشانی کو چھوا۔
''جب مجھے گولی لگی تھی تو دماغ کے اگلے حصے کا ایک ٹکڑا خراب ہوگیا۔ وہ حصہ جو انسان کے رویّے کو کنٹرول کرتا ہے۔''
''اوہ......!'' وہ متوجہ تھی۔ ''مگر اس کا مجھ سے کیا تعلق؟''
''میری بھی ایک سابقہ بیوی ہے۔'' اس نے کہا۔
''پہلے وہ میری محبوبہ تھی، بعد میں ہماری شادی ہوئی، بچہ بھی ہوا۔'' اس نے بات جاری رکھی۔ ''پھر مجھے گولی لگی، میں بدل گیا اور میری بیوی نے مجھے نکال دیا۔ تو جب تم کہتی ہو، میں نہیں سمجھتا تو سویٹ ہارٹ! میں بہت اچھے سے سمجھتا ہوں۔''
ڈیزی کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آئی۔ ''لیکن تمہیں مجھ سے کچھ حاصل نہیں ہوگا، میں کسی اور سے پیار کرتی ہوں۔''
''جانتا ہوں۔'' وہ بولا۔
''پھر میری مدد کیوں کرنا چاہتے ہو؟''
''میں نے کہا نا......!'' اس نے آہستہ سے کہا۔ ''میں تمہارا گانا پورا سننا چاہتا ہوں۔ مجھے ٹونی زیلگر کے بارے میں بتاؤ۔''
ڈیزی کے چہرے پر تکلیف کے تاثرات ابھرے۔
''وہ میرے بینڈ میں ڈرم بجاتا ہے۔''
کیلسن نے پوچھا۔ ''تم نے اسے گولی مارتے دیکھا؟''
''نہیں۔'' اس نے نفی کی۔
''مگر وہ اسٹیشن پر بھیڑ میں تھا؟''
''مجھے نظر نہیں آیا۔'' وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔
وہ اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگا۔ ''پھر...... تمہیں شک ہے کہ گولی اس نے ماری؟''
''وہ سمجھتا ہے ہم دونوں مل کر بڑا نام بنائیں گے۔''
''تمہاری آواز میں وہ صلاحیت ہے۔'' کیلسن کا انداز سراہنے والا تھا۔
''مگر اسے تال کا احساس ہی نہیں۔'' ڈیزی کہہ رہی تھی۔ ''اس نے ڈیمو ریکارڈنگز کے پیسے دیے، تشہیری تصویریں بنوائیں، پھر میں نے اس سے کہہ دیا کہ وہ بہت خراب ڈرمر ہے۔''
''وہ بات اسے بری لگی ہوگی۔'' کیلسن نے اس کا اندازہ لگایا۔
ڈیزی نے ایک گہری سانس لی۔ ''کرایہ بھی وہ دیتا تھا۔ اس نے مجھے گھر سے نکال دیا، مگر میں اس کے منہ پر کچھ کہے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔'' اس نے کہا۔
''خراب ردھم سے بدتر کچھ نہیں۔'' کیلسن نے تائید میں سر ہلایا۔
''کچھ چیزیں اس سے بھی بدتر ہیں مگر تب مجھے احساس نہیں تھا۔'' وہ بولی۔ ''کیا تم نے کبھی سب وے میں رہ کر دیکھا ہے؟ جب اس نے مجھے نکالا تو اس نے جان سے مارنے کی دھمکی بھی دی۔ ٹونی نے مجھے خود گولی ماری یا کسی اور سے یہ کام کروایا۔''
''اگر تمہیں یقین ہے تو پولیس کو بتانا ہوگا۔'' کیلسن اسے گھورنے لگا۔
''کبھی نہیں۔ میں اس سے محبت کرتی ہوں۔'' اس نے قطعی لہجے میں کہا۔
''وہ تمہیں مارنے کی کوشش کرے پھر بھی......؟'' کیلسن کو یقین نہیں آیا۔
''میں نے اسے دکھ دیا، اس نے مجھے۔''
''یہ ایسے نہیں چلتا۔'' کیلسن کا لہجہ تیز ہوا۔
''مجھے معلوم تھا تم نہیں سمجھو گے۔'' وہ مسکرائی۔
اس نے تاسف سے اس لڑکی کو دیکھا۔ پٹیوں میں جکڑی، درد میں، مگر اس کے اندر لوہے جیسی سختی تھی۔ اسے خیال آیا شاید وہ سب وے پر اپنے عاشق کے بارے میں نہیں، خود اپنے بارے میں گا رہی تھی۔ چاہے اسے ڈاکٹروں سے زیادہ مدد کی ضرورت ہو، وہ ٹوٹی ہوئی حالت میں بھی آگے لڑکھڑاتی رہے گی۔
''ٹھیک ہے۔'' اس نے کہا۔ اس نے بٹوا کھولا، ایک کارڈ نکالا اور بیڈ کے پاس رکھ دیا۔ ''اگر میری ضرورت پڑے تو فون کرنا۔'' وہ دروازے کی طرف گیا پھر رک گیا اور پلٹ آیا۔ ''کم از کم یہ تو بتادو کہ گانے کے آگے کے بول کیا ہیں؟''

☆☆☆

اسی شام ایک نیوز چینل کے چوڑے چہرے والے اینکر نے شوخ دھاری دار ٹائی پہنے خبر دی کہ ڈیزی برنارڈ پر

ہونے والی فائرنگ میں پولیس کے پاس ابھی تک کوئی ثبوت نہیں۔ پھر اس نے بتایا کہ ڈیزی کا نام سابق پولیس چیف ریمنڈ برنارڈ کی بیٹی ہے، جسے رشوت اور تشدد کے اسکینڈل میں نوکری سے نکال دیا گیا تھا۔

چینل نے ایک انٹرویو دکھایا۔ سرخی میں لکھا تھا۔

''ٹونی زیلگر ...... دوست اور بینڈ میٹ......''

سرخ بالوں اور زرد رنگت والا لڑکا اپنٹوں کے بنے فلیٹ کی سیڑھیوں پر کھڑا تھا۔ اس نے خوشی ظاہر کی کہ ڈیزی زندہ بچ گئی۔ اس نے کہا کہ وہ چاہتا ہے ڈیزی واپس گھر آجائے۔

''کچھ تو گڑبڑ ہے۔'' کیلسن بڑبڑایا۔

اس نے آواز تیز کردی۔ ٹونی نے ڈیزی کو شکاگو کی سب سے باصلاحیت موسیقار کہا، پھر رپورٹر کو ایک ڈیمو ریکارڈنگ دی جس کا نام ڈیزی زی تھا۔ یہی ان کے بینڈ کا نام بھی تھا۔

اس کے بعد چینل نے ایک ویڈیو کلپ دکھایا۔ شہر کی ایک سڑک کے کونے پر ٹونی اسٹول پر بیٹھا ڈرم سیٹ کے پیچھے تھا، ڈرم اسٹکس ہوا میں اٹھائے، شامل ہونے کو تیار۔ سامنے ڈیزی الیکٹرک گٹار تھامے وہی مصرع گا رہی تھی جو کیلسن کے ذہن میں اتر چکا تھا۔

کلپ ختم ہوا تو اینکر مسکراتا نظر آیا۔ اس نے رپورٹر کو دیکھ کر حیرت سے مسکرا کر کہا۔ ''ارے، واقعی اچھی ہے نا؟''

''ہم۔'' کیلسن نے چینل تبدیل کی اور ٹی وی بند کر دیا۔

اس نے فون پر یوٹیوب کھولا اور ڈیزی زی کو تلاش کیا، دو ویڈیوز ملیں، ایک پر صرف اٹھارہ ویوز تھے اور دوسری پر تیرہ۔

دونوں میں ڈیزی کی آواز لفظوں کو نرمی سے چھوتی تھی۔ ڈرم پر ٹونی بڑی مشکل سے اس کے ساتھ چل پا رہا تھا۔

اس رات جب کیلسن نے لائٹ بند کی، ڈیزی کی دھن اسے نیند کی طرف ہلکورے دیتی رہی۔ اگلی صبح وہ جاگا تو بستر پر لیٹے لیٹے اس نے فون پر وہی گانا چلایا۔ اب ویوز ستائیس ہزار ہو چکے تھے۔

دوسری ویڈیو پر کلک کیا۔ اکتیس ہزار۔

راتوں رات ڈیزی زی کے آٹھ نئے، بالکل اصل گانے بھی آچکے تھے۔ ہر ایک پر دس سے بیس ہزار ویوز تھے۔ کیلسن ایک کے بعد ایک گانا سنتا گیا۔

وہ نہایا، کارن فلیکس کا پیالہ کھایا، ایل ٹرین پکڑی اور صبح دس بجے دوبارہ ڈیزی کے کمرے میں داخل ہوا۔

اسما قادری کے سحر انگیز قلم سے

نیا شاہکار

جانباز

امارت کے نشے میں چور...... کمزوروں پر ظلم اور اپنے زیردست لوگوں کی عزتوں کو پامال کرنے والے ظالموں کی خودسری و دیدہ دلیری......

ظلم کے خلاف سینہ سپر نوجوان کی داستان

اسے اپنی محبت کو حاصل کرنے کا جنون بھی تھا اور مجرموں سے ٹکرانے کا حوصلہ بھی۔

تہلکہ خیز واقعات کا سلسلہ......

سسپنس کے صفحات پر جلد آرہا ہے

حالانکہ اسپتال میں ایک وقت میں صرف دو وزیٹرز کی اجازت تھی مگر اس وقت نو لوگ مریض کے ارد گرد تھے۔

وِنڈی سٹی لائیو کی تین رکنی ٹیم ایک نرس کو ڈیزی کے وائٹلز چیک کرتے ہوئے فلمبند کر رہی تھی۔ ایک فوٹو گرافر جس کے گلے میں کیمرا لٹک رہا تھا، اپنے اسسٹنٹ کو ہدایت دے رہی تھی کہ کھڑکی اور بیڈ کے درمیان کھڑا ہو جائے۔

نیلی شرٹ اور سفید پتلون میں ملبوس ایک آدمی ڈیزی کے سامنے کاغذ لہراتے ہوئے بولا۔ ''ٹو پاک، ٹنگ ٹائٹ، ففٹی سینٹ، میگن دی اسٹالین...... سب کو گولی لگی، اب ڈیزی برنارڈ! سینے میں لگی یہ گولی ہیرا ہے اور میں جوہری ہوں۔ بس دستخط کر دو، میں اس ہیرے کو ستارہ بنا دوں گا۔''

''دفع ہو جاؤ۔'' ڈیزی نے کہا۔

بھورے رنگ کے ٹو پیس سوٹ میں ملبوس ایک شخص نے بریف کیس بیڈ کے پائینتی رکھ کر بڑے ڈرامائی انداز میں کھولا۔

''تمہیں ایک مستند منیجر کی ضرورت ہے۔'' اس نے چمکدار کیٹلاگ نکالتے ہوئے کہا۔ ''ہماری فرم''

''نکل جاؤ۔'' ڈیزی نے کہا۔

کھڑکی کے پاس کرسی پر بیٹھا ٹونی زیگلر یہ سب دیکھ دیکھ کر ہنس رہا تھا۔

''میں نے کہا تھا نا۔'' اس نے کہا۔

ڈیزی قہر اور تاسف کی ملی جلی نگاہوں سے دیکھنے لگی۔ ''میں تقریباً مر گئی تھی۔''

''مگر اب دیکھو خود کو، تم بالکل ٹھیک ہو۔'' ٹونی بولا۔ ''لائٹس، کیمرا، ایکشن۔'' وہ ہاتھ سے کسی ڈائریکٹر کے مانند اشارے کرنے لگا۔

ڈیزی نے ہونٹ بھینچ لیے۔ ''یہ سب تم نے میرے لیے کیا؟''

''ہمارے لیے جان!'' اس نے آنکھ ماری۔

ڈیزی نے گہری سانس لی اور نرم پڑ گئی۔ ''اوہ، ٹونی!''

کیلسن دونوں کے بیچ آ گیا۔ ''یہ سب تم نے کیا؟'' وہ بے یقینی سے ٹونی کو گھور رہا تھا۔

ٹونی نے اسے ایسے دیکھا جیسے پوچھ رہا ہو، تم کون ہو اور پھر پوچھ بھی لیا۔ ''تم کون ہو؟''

''میں نے سب وے میں اس کی جان بچائی تھی۔'' کیلسن نے جتایا۔

وہ طنزیہ انداز میں مسکرانے لگا۔

''ہسپتال میں [illegible] تم کیا جانتے ہو؟''

کیلسن نے ڈیزی کی طرف دیکھا۔ ''کیا تم پتہ بتاؤ گی؟''

ڈیزی ہاری ہوئی سی لگ رہی تھی۔

''مجھے تو یقین نہیں آ رہا۔''

''تمہیں اندازہ بھی ہے، گولی ذرا سا بھی اِدھر اُدھر لگتی تو سیدھی دل میں اتر جاتی۔'' وہ تقریباً چلا اٹھا۔

''لیکن کچھ ہوا تو نہیں نا؟ میں اپنے کام میں ماہر ہوں۔'' ٹونی اِترایا۔ ''اسے بتاؤ سویٹ ہارٹ!''

کیلسن نے جیب سے فون نکالا۔

''میں پولیس کو فون کر رہا ہوں۔''

ٹونی بول اٹھا۔ ''ٹولیٹ، میں پہلے ہی کر چکا ہوں۔''

کیلسن حیران رہ گیا۔ ''تم خود کو پکڑوا رہے ہو؟''

''ہاں۔'' اس نے سر ذرا سا خم کیا۔

''تم جیل جاؤ گے؟'' کیلسن نے دوبارہ تصدیق چاہی۔

''تھوڑی مدت کے لیے۔''

''میں باہر تمہارا انتظار کروں گی۔'' ڈیزی نے کہا۔

''اچھا پلان تھا نا؟'' ٹونی نے کہا۔

''اس پر تو گانا بننا چاہیے۔'' ڈیزی نے کہا۔

''وائرل تو ہو ہی گئی ہو۔'' ٹونی بولا۔

ڈیزی مسکرائی۔ ''تم بھی ہو گئے ہو۔''

''اوہ میرے خدایا!'' کیلسن جھلاہٹ سے کمرے میں ناچ کر رہ گیا۔ وہ واقعی ڈیزی کو محبت میں چوٹ کھائی کوئی زخمی لڑکی سمجھا تھا...... اور وہ کیا نکلی۔ وائرل ہونے کے جنون میں مبتلا بیمار ذہنیت نسل کی نمائندہ۔

پولیس کے آنے تک انتظار میں ٹونی اپنے فون پر انگلیاں چلاتا رہا۔

''Please don't leave me کے چورانوے ہزار اسٹریمز ہو گئے ہیں۔'' اس نے کہا۔

''اور You kill me کے اسی ہزار۔''

''واہ۔'' ڈیزی نے کہا۔

کیلسن مڑ کر جانے لگا، پھر رک گیا، اس نے کہا۔

''کیا میرے لیے ایک کام کر دو گی...... کیا اپنے گانے کا باقی حصہ سنا دو گی؟''

ڈیزی نے آنکھیں بند کیں، گہری سانس لی، اندر، باہر...... پھر وہ گانے لگی۔

⌘⌘⌘

ایران کے علاقے مازندران میں ایک گاؤں نور نامی ہے۔ یہاں کا میرزا عباس شاہ ایران کی مجلس وزارت کا ایک رکن تھا۔ اس کو لوگ احتراماً میرزا بزرگ نوری کہتے تھے۔ اس نے ایک نہایت خوبصورت عورت سے شادی کی تھی۔ اس سے ایک بچہ ۱۸۳۱ء

میرزا یحییٰ صبح ازل

ضیا تسنیم بلگرامی

انیسویں صدی عیسوی میں ایران کے شہر تہران اور شیراز سے فتنوں کی یلغار شروع ہوگئی اور ایک ہی وقت میں متعدد افراد نے طرح طرح کے دعوے شروع کردیے۔ ان کے ذہن چونکہ خود بھی صاف نہیں تھے اس لیے ان کے دعوے بھی مبہم تھے۔ وہ نبی تھے، مہدی تھے، مسیح تھے اور من یظہرہ اللہ (وہ جو اللہ کی طرف سے ظاہر ہوا) میرزا یحییٰ صبح ازل بھی انہی میں سے ایک تھا۔ اس کو اپنے دعوے پر اتنا یقین تھا کہ کوئی اس کو متزلزل نہ کرسکا۔ پھر انہی میں سے ایک مدمقابل شخصیت نمودار ہوگئی اور ان کا خود ساختہ پن دو حصوں میں تقسیم ہوگیا۔

خودساختہ مدعیان نبوت میں سے ایک جس کا اردو میں بہت کم ذکر کیا گیا

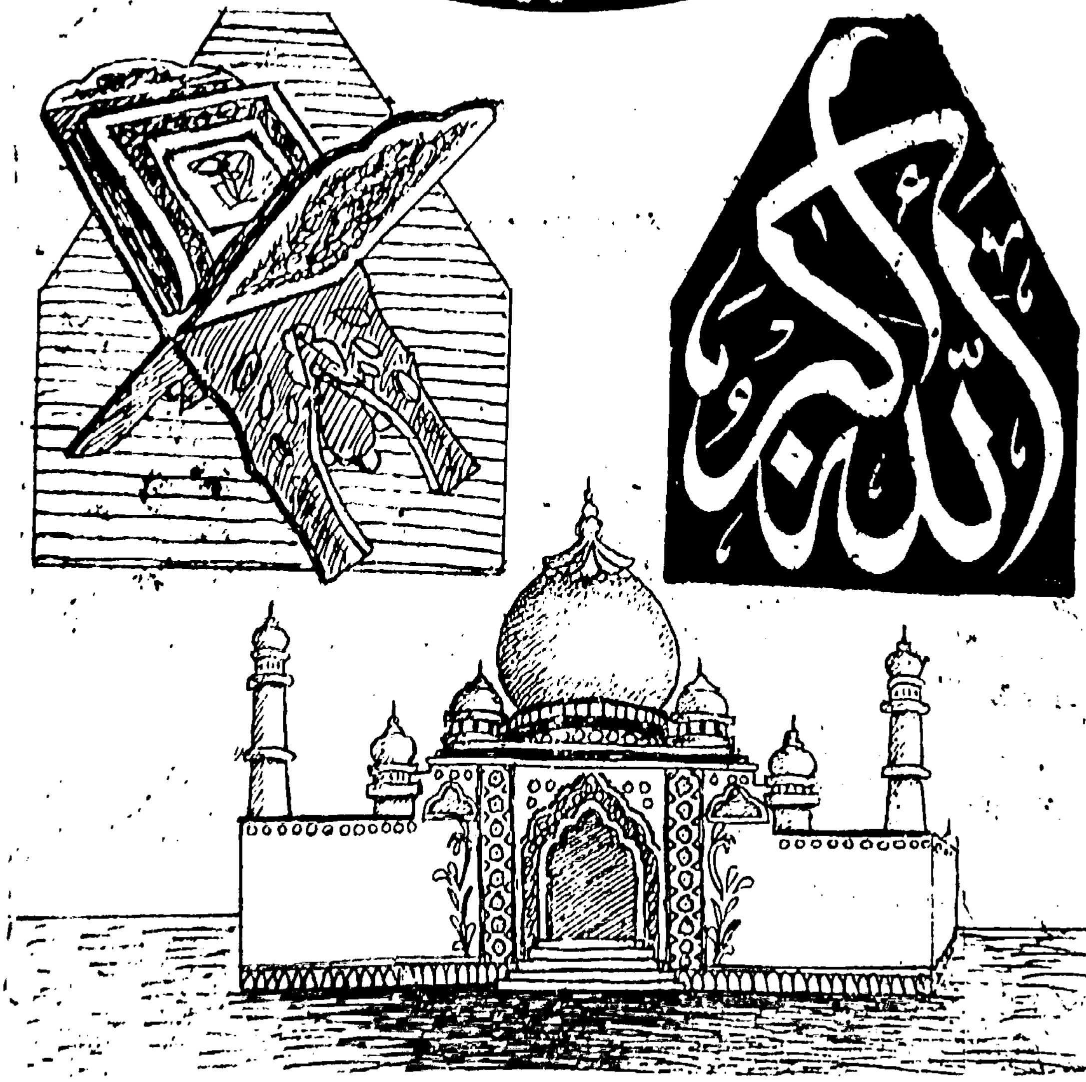

[illegible]

میرزا بزرگ نوری نے [illegible]

لڑکی نے جواب دیا ''[illegible] گزار دی ہیں۔''

میرزا بزرگ نوری نے کہا ''[illegible] کی ضرورت ہے۔''

لڑکی نے شوخی سے کہا۔ ''میں [illegible] کر رہے ہیں۔''

میرزا بزرگ نوری نے اپنی صفائی پیش کی ''[illegible]''

لڑکی نے دھمکی دی۔ ''آپ یاد رکھیے، اگر آپ نے [illegible] دوسری شادی [illegible] کہیں اور چلی جاؤں گی اور پھر دوبارہ اس گھر میں آنا ناممکن ہو جائے گا۔''

میرزا بزرگ نوری دل ہی دل میں [illegible] اور کسی نہ کسی طرح ظاہر ہو کے رہتی۔

اس طرح چھ ماہ گزر گئے۔ لڑکی نے دوبارہ کہا۔ ''اب آپ مزید ٹال مٹول نہ دیں اور اگر آپ شادی [illegible] ورنہ انکار کر دیں تاکہ میں دوسری طرف دیکھوں۔''

میرزا بزرگ نوری نے جواب دیا۔ ''میں دراصل اس لیے مجبور ہو رہا ہوں کہ میری بیوی ابھی دوسری شادی کے لیے تیار نہیں۔ میں اس کو راضی کرنے کی کوشش کر رہا ہوں اور امید تو یہی ہے کہ میں اس کو راضی کر لوں گا۔''

لڑکی نے کہا۔ ''اور اگر وہ راضی نہ ہوئی تو؟''

میرزا بزرگ نوری نے جواب دیا۔ ''پھر بھی میں دوسری شادی کروں گا لیکن میں اپنی پہلی بیوی [illegible] صرف یہ چاہتا تھا کہ یہ کام نہایت خوش اسلوبی سے ہو جائے اور ہمیں کسی معرکے کا سامنا نہ کرنا پڑے۔''

لڑکی نے کہا۔ ''جو عورت محض شک و شبہ کی بنا پر جھگڑا کر رہی ہے، وہ دوسری شادی پر کس طرح آمادہ ہو جائے گی؟''

میرزا بزرگ نوری نے اس کو اپنے فیصلے سے آگاہ کیا۔ ''اس وقت میں جس حویلی میں رہ رہا ہوں، بہت بڑی ہے اور اگر میں چاہوں تو اس میں چار بیویاں رکھ سکتا ہوں۔''

لڑکی نے کہا۔ ''کیا آپ واقعی چار شادیاں کریں گے اور ان چاروں کو اسی حویلی میں رکھیں گے؟''

میرزا بزرگ نے جواب دیا۔ ''میں صرف دو شادیاں کروں گا۔ ایک تو پہلے ہی کر چکا ہوں، دوسری تم سے کروں گا۔''

لڑکی خاموش ہو گئی اور اس خاموشی نے میرزا بزرگ نوری پر بڑا اثر کیا۔ وہ گھر گئے اور اعلان کیا۔ ''اب تو وہ مجھ سے زیادہ انکار نہیں کرے گی۔ میں نے خوب سوچ سمجھ کے یہ فیصلہ کیا ہے اور اب تو دیکھے گی کہ میں کیا ہوں اور میری بیوی کیا ہے۔ میں تو صرف اس بات سے ڈر رہا تھا کہ اگر شادی کے بعد تم دونوں میں اتفاق نہ ہوا اور لڑائی جھگڑا جاری رہا تو اس کا اثر ہم سب پر پڑے گا اور خاص کر اولاد پر۔ اس کی اولاد بھی خراب ہو گی اور تیری بھی۔''

لڑکی نے کہا۔ ''میں کچھ نہیں جانتی، آپ کو جو کچھ کرنا ہے، جلدی کریں ورنہ میں اکتا جاؤں گی اور کسی اور طرف دیکھنے لگوں گی۔''

اس روز میرزا بزرگ نوری حویلی میں داخل ہوئے تو ان کی تیوریوں پر بل تھے، پیشانی پر شکنیں پڑی ہوئی تھیں، [illegible]

میں کرختگی تھی۔ کچھ برتن راستے میں رکھے ہوئے تھے، ان کو لات ماری جس سے سارے برتن منتشر ہو گئے اور خدمت گار ہاتھ باندھ کر سامنے کھڑے ہو گئے، پوچھا۔ ''آج یہ آپ کو غصہ کس پر آرہا ہے، آخر اس کی کوئی خاص وجہ ہے؟''

میرزا بزرگ نوری نے خدمت گاروں کو ڈانٹ دیا اور کہا۔ ''آئندہ تم میں سے کوئی میرے معاملات میں دخل نہیں دے گا۔''

اس کے باوجود ایک خدمت گار نے میرزا بزرگ نوری سے پوچھا۔ ''اگر آپ نے دوسری شادی نہ لی تو اس کا سب سے زیادہ اثر اس لڑکی پر پڑے گا اور اس کی آہ سے آپ کو کون بچائے گا؟''

اس روز جب بیوی نے یہ دیکھا کہ اس کا شوہر مشتعل ہے اور ایسا لگتا ہے جیسے اس کا دماغی توازن درست نہیں ہے تو وہ کسی حد تک سمجھ گئی کہ اس غصے اور اشتعال کا سبب وہی لڑکی ہو سکتی ہے جس سے اس کا شوہر شادی کرنا چاہتا ہے۔ ایک شبہ یہ بھی گزرا کہ کہیں کسی بات پر اس لڑکی سے اس کے شوہر کی ان بن تو نہیں ہو گئی اور اسی ان بن کی وجہ سے میرزا بزرگ نوری کا غصے سے برا حال ہو رہا ہے۔

بیوی نے نہایت نرمی سے پوچھا۔ ''خدانا خواستہ آپ کی طبیعت ناساز تو نہیں۔ آج اپنے خدمت گاروں کے سامنے بھی سنجیدہ اور بردبار نہیں رہے، اس کی خاص وجہ؟''

میرزا بزرگ نوری نے جواب دیا۔ ''اے نیک بخت خاتون! میں نے کسی سے کوئی وعدہ کیا تھا اور وعدے کو پورا کرنا اللہ کو بہت محبوب ہے۔ کیا تو یہ پسند کرے گی کہ میں اللہ کی نظر میں ناپسندیدہ قرار دیا جاؤں؟''

بیوی نے جواب دیا۔ ''آپ کو اپنا وعدہ ضرور پورا کرنا چاہیے مگر یہ خیال رہے کہ اللہ کو دل دکھانا بھی پسند نہیں ہے۔ اگر آپ کے ایفائے عہد سے کسی کی دل آزاری ہو رہی ہو تو آپ کو اس دوسرے گناہ سے بھی بچنا چاہیے۔''

میرزا بزرگ نوری سمجھ گئے کہ اس کی بیوی کا یہ اشارہ کس طرف ہے۔

انہوں نے جواب دیا۔ ''میں جو کام کرنا چاہتا ہوں وہ مذہباً جائز ہے اور کسی جائز کام کے کرنے سے اگر کسی کی دل آزاری ہو رہی ہو تو اس دل آزاری کی وجہ سے جائز کام کو روکنا بھی تو مناسب نہیں۔''

بیوی نے نہایت تلخ لہجے میں کہا۔ ''آپ مجھ سے پہیلیاں نہ بجھوائیں۔ میں خوب سمجھتی ہوں، آپ کیا کہنا اور کیا کرنا چاہتے ہیں۔''

میرزا بزرگ نوری نے کہا۔ ''اگر تو مقصد سمجھ چکی ہے تو پھر تجھ کو کچھ بتانے کی ضرورت بھی نہیں اور ایک جائز کام کے لیے تیری اجازت بھی ضروری نہیں رہی۔''

بیوی نے اب اپنے غصے اور اشتعال کا مظاہرہ شروع کر دیا۔ اس کے ہاتھ میں سبزیاں کاٹنے والی چھری تھی۔ اس کو اس نے دیوار پر کھینچ مارا اور غصے سے کہا۔ ''آپ اگر دوسری شادی کرنا چاہتے ہیں تو بصد شوق کریں لیکن یہ یاد رہے کہ اس شادی میں میری مرضی شامل نہیں ہو گی اور میں اس کو کبھی بھی قبول نہیں کروں گی۔''

میرزا بزرگ نوری نے کہا۔ ''ٹھیک ہے، تو اس سے کبھی بھی خوش نہیں رہے گی تو پروا نہیں۔ میں تو یہی چاہتا ہوں۔ تو بس اجازت دے دے ورنہ میں اپنی مرضی سے شادی کر لوں گا اور تجھ کو بعد میں یہ شکایت بھی نہیں رہے گی کہ میں نے تجھ کو بتائے بغیر دوسری شادی کر لی۔''

اس روز دونوں میاں بیوی ایک دوسرے سے کشیدہ خاطر رہے۔ کسی نے آپس میں بات نہیں کی۔ دونوں ہی معلوم نہیں کیا کچھ سوچتے رہے۔ اس روز دونوں نے ہی کھانا بھی پیٹ بھر کے نہیں کھایا۔

میرزا بزرگ نوری کے دل و دماغ میں ایک طوفان پرورش پا رہا تھا۔ کچھ دیر ذہنی کشمکش میں مبتلا رہنے کے بعد وہ فوراً اس لڑکی کے پاس پہنچے اور کہنے لگے۔ ''میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ تجھ سے اسی وقت شادی کر لوں۔ تو آجا، ہم اسی وقت شادی کرتے ہیں۔''

لڑکی کو اس پر اعتراض ہوا۔ وہ یہ شادی باقاعدہ، عزیز و رشتے داروں کی موجودگی میں کرنا چاہتی تھی۔

اس نے کہا۔ ''میرزا بزرگ! شادیاں اس طرح نہیں ہوتیں جس طرح آپ کرنا چاہتے ہیں۔ میں تو اس شادی کو سخت ناپسند کرتی ہوں۔ آپ دن تاریخ مقرر کریں اور عزیز، رشتے داروں اور دوست احباب کو شرکت کی دعوت دیں۔ میں ان سب کی موجودگی میں دلہن بنوں گی۔''

شادی کی تاریخ طے پا گئی جو پندرہ دن بعد کی تھی۔
میرزا بزرگ نوری خوش خوش حویلی میں داخل ہوئے اور اپنی ایک خدمت گار خاتون کو حکم دیا۔ "جاؤ اپنی بی بی کو بلالاؤ۔"
پرانی نشست گاہ جہاں بیوی کو بلوایا گیا تھا، مہمانوں کے لیے مخصوص تھی۔
میرزا بزرگ نوری نے اپنی بیوی کا منہ تکا اور کہا۔ "آج میں نے اللہ کی رضا کو پورا کرنے کے لیے شادی کے لیے ٹھیک پندرہ دن کے بعد کی تاریخ مقرر کر دی۔ اب میری خوشی میں تم کو بھی شامل ہونا چاہیے۔"
بیوی نے کہا۔ "میں آپ کی خوشی میں شامل تو ضرور ہوں گی مگر بے دلی اور افسردگی کے ساتھ۔ مرضی مولا از ہمہ اولیٰ۔"
اس روز کے بعد پہلی بیوی کا غصہ بتدریج بڑھنے لگا۔ وہ یہ تاثر دیتی رہتی کہ وہ اس فیصلے سے خوش نہیں ہے اور یہ ناخوشی کہیں بھی، کسی بھی وقت اور کسی بھی صورت میں ظاہر ہو سکتی ہے۔
آخر وہ دن آ گیا کہ میرزا بزرگ نوری دولہا بن کے لڑکی کے گھر پہنچ گئے۔ عزیز و اقارب، دوست احباب سب ہی اس شادی میں شریک تھے۔
خلاف توقع بیوی نے نہ صرف شادی میں شرکت کی بلکہ دلہن سے ملاقات شادی سے پہلے ہی کر لی، پوچھا۔ "کیا تو مجھ کو جانتی ہے؟"
لڑکی نے جواب دیا۔ "ہاں، میں یہ جانتی ہوں کہ آپ میرے ہونے والے شوہر کی عزیزہ ہیں۔"
بیوی نے کہا۔ "درست ہے مگر کون سی عزیزہ؟ وہ عزیزہ جس پر رشتہ ختم ہو جاتا ہے اور وہ رشتہ جس سے تو اس وقت وابستہ ہو رہی ہے۔"
لڑکی نے فرطِ جذبات میں اپنے ہونے والے شوہر کی پہلی بیوی کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا۔ "امید ہے کہ آپ مجھ کو قبول فرما لیں گی۔"
بیوی نے جواب دیا۔ "یہ شادی میری مرضی سے نہیں ہو رہی ہے۔"
لڑکی نے کہا۔ "پھر یہ شادی کس کی مرضی سے ہو رہی ہے؟"
بیوی نے جواب دیا۔ "میرزا بزرگ نوری کی مرضی سے۔ اب جب تم میری حویلی میں آؤ گی تو تم اس کے کسی گوشے میں بیٹھ جاؤ گی۔ میرا تم سے کوئی تعلق نہ ہوگا۔"
لڑکی نے کسی بھی قسم کی بحث سے گریز کرتے ہوئے کہا۔ "بہرحال، کچھ بھی ہو، اب تو شادی ہونے والی ہے۔"
شادی ہو گئی۔ دلہن حویلی پہنچ گئی۔ اس کو حویلی کا وہ گوشہ دیا گیا جو الگ تھلگ اور حویلی کے بڑے حصے میں واقع تھا۔
رات بھر دونوں میاں بیوی سکون سے رہے لیکن پہلی بیوی اپنے بچے میرزا حسین علی کے ساتھ اپنے شوہر کو برا بھلا کہتی رہی۔ بچہ بھی اپنے باپ سے کوئی زیادہ خوش نہیں نظر آ رہا تھا۔
اسی طرح کئی دن گزر گئے۔ اس دوران میرزا بزرگ نوری نے کئی بار یہ کوشش کی کہ دونوں بیویاں ایک جگہ جمع ہو جائیں مگر بس اتنی کامیابی نصیب ہوئی کہ بارہ سالہ بچہ میرزا حسین علی اپنی نئی ماں سے کسی قدر مانوس ہو گیا۔ وہ اپنے باپ کی عدم موجودگی میں اپنی نئی ماں کے پاس آتا اور اس سے باتیں کرتا رہتا۔ جو باتیں ہو... ان میں سے خاص باتیں ازبر کر لیتا اور پھر انہیں اپنے دوستوں میں مزے لے لے کر سناتا رہتا۔ اس کے ہم جماعت بچے بھی اس کی باتوں سے لطف اندوز ہوتے رہتے۔
ایک روز کسی دوست نے میرزا حسین علی سے کہا۔ "دوست! ابھی تو تم اپنے باپ کی دوسری شادی سے بہت خوش نظر آتے ہو مگر اس وقت تمہاری خوشی رخصت ہو جائے گی جب تمہاری دوسری ماں کے گھر میں تمہارا بھائی پیدا ہوگا۔"
میرزا حسین علی نے جواب دیا۔ "میں اپنے اس بھائی سے بھی محبت کروں گا کیونکہ ماں دوسری سہی، باپ تو ایک ہے۔"
اور ٹھیک ایک سال بعد جب میرزا حسین علی کی عمر تیرہ سال تھی، دوسری ماں کے بطن سے ایک لڑکا پیدا ہوا۔ ماں کی طبیعت بہت خراب تھی۔ اطباء اور دائی حویلی میں مستقل ٹھہرے ہوئے تھے اور ذرا ذرا سی دیر میں مریضہ کا جائزہ لے رہے تھے۔ کسی بداحتیاطی کی وجہ سے یا کسی اور وجہ سے زچہ کی حالت خراب ہوتی جا رہی تھی۔ دائی کا خیال تھا کہ زچہ کو کسی وجہ سے زہر باد ہو گیا۔
میرزا بزرگ نوری مستقل اپنی دوسری بیوی کے پاس رہ رہا تھا۔ پہلی بیوی کو پھر شکایت پیدا ہو گئی۔ اس نے کہا۔ "اب

میں مزید ناانصافی برداشت نہیں کر سکتی۔ آپ تو اپنی نئی نویلی بیوی کے ہو رہے۔''
شوہر نے جواب دیا۔ ''اس کی حالت بہت خراب ہے، میں اس کو کس طرح تنہا چھوڑ سکتا ہوں۔''
دونوں میں کچھ دیر تک تلخ کلامی ہوتی رہی لیکن بے فائدہ۔
میرزا حسین علی کو ایک بھائی مل گیا تھا اور وہ اس خوشی میں از خود رفتہ ہو رہا تھا۔ وہ اپنے بھائی کے پاس بیٹھا اسے کھلاتا رہتا۔
دوسری ماں کو میرزا حسین علی بھی اچھا لگتا تھا۔ وہ اس سے بہت اچھی طرح پیش آتی تھی، حقیقی اولاد کی طرح تک۔ جب سے طبیعت خراب ہوئی تھی، وہ میرزا حسین علی سے اچھی طرح نہیں مل سکی تھی۔ جب وہ زندگی سے مایوس ہوگئی تو میرزا حسین علی کو اپنے پاس بلایا اور اپنے بیٹے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ ''میرزا حسین علی! تجھ کو اپنا یہ بھائی کیسا لگتا ہے؟''
میرزا حسین علی نے بچے کو گود میں اٹھالیا اور اسے پیار کرتے ہوئے کہا۔ ''میرا بھائی بہت پیارا ہے اور مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔''
بیمار ماں نے پوچھا۔ ''کیوں میرزا حسین علی! اگر میں مرجاؤں تو کیا تم اپنے بھائی کو اچھی طرح رکھو گے اور اس کو کبھی دکھ تو نہیں دو گے؟''
میرزا حسین علی نے جواب دیا۔ ''اللہ آپ کو صحت یاب کرے اور میرا بھائی اپنی ماں سے محروم نہ ہو۔ یہ میرا بھائی ہے اور میں اس کو ہمیشہ اور ہر حال میں خوش رکھوں گا۔''
دوسری ماں کا علاج ہوتا رہا اور وہ اللہ کے پاس جاتے جاتے واپس آگئی۔ وہ اکثر کہا کرتی تھی کہ مجھ کو صحت یاب میرزا حسین علی کی دعاؤں نے کیا ہے کیونکہ ایسا مخلص اور نیک بیٹا کسی سوتیلی ماں کو بمشکل ہی ملتا ہے۔
اسی طرح کچھ دن اور گزر گئے۔ دوسرے بیٹے کا نام یحییٰ رکھا گیا اور میرزا حسین علی کا زیادہ وقت اپنے چھوٹے بھائی کے پاس گزرتا تھا۔ اس نے اپنے دوستوں سے یحییٰ کو ملوایا۔ وہ اکثر گلی کوچوں میں اسے اپنے ساتھ لے کے نکل جاتا۔
میرزا حسین علی کی ماں کو بیٹے کی یہ روش اچھی نہیں لگتی تھی اور اس کی کوششیں رہتی تھیں کہ میرزا حسین علی اپنے سوتیلے بھائی سے محبت نہ کرے اور دور دور رہے لیکن اس کو یہ نہیں معلوم تھا کہ میرزا بزرگ نوری اپنے بیٹے کو یہ سمجھاتا رہتا تھا۔ ''یحییٰ تیرا بھائی ہے اور تجھ کو ہمیشہ اس کو حقیقی بھائی جیسی محبت دینی ہے کیونکہ تم دونوں کے اتحاد سے دونوں ہی کو فائدہ پہنچے گا اور نااتفاقی میں نقصان اٹھاؤ گے۔''
حویلی میں کشیدگی برقرار تھی۔ پرانے خدمت گار پہلی بیوی کا حکم زیادہ مانتے تھے اور یہ بات بھی دوسری بیوی کے لیے بہت تکلیف دہ تھی۔ وہ میرزا بزرگ نوری سے خدمت گاروں کے رویے کی شکایتیں بھی کرتی رہتی تھی۔ آخرکار میرزا بزرگ نوری نے یحییٰ اور اس کی ماں کے لیے دو خدمت گار خواتین الگ مقرر کردیں۔
میرزا بزرگ نوری نے اپنے بڑے بیٹے میرزا حسین علی کی تدریس کا سلسلہ مدرسے سے زیادہ گھر میں رکھا۔ اساتذہ حویلی میں آتے اور اسے پڑھا کے چلے جاتے۔ یہی رویہ اور روش یحییٰ کے ساتھ روا رکھی گئی تھی۔ اس کے لیے بھی اساتذہ حویلی میں آنے لگے۔ دونوں بھائی غیر معمولی ذہین تھے۔ تہران میں ان کا قیام تھا اور تہران میں عالم و فاضل حضرات کی کوئی کمی نہیں تھی۔ ابھی یحییٰ کی عمر چھ سال تھی کہ ماں کا اچانک انتقال ہوگیا۔ انتقال سے پہلے اس نے اپنے شوہر سے رو رو کے درخواست کی۔ ''اگر میں مرجاؤں تو مجھ کو قبر میں بھی اس وقت تک اتارا نہیں جائے گا جب تک میرا بیٹا یحییٰ بے قرار رہے۔''
میرزا بزرگ نوری نے پوچھا۔ ''تم نے کس طرح سمجھ لیا کہ تم مرجاؤ گی؟''
بیوی نے جواب دیا۔ ''پچھلے کئی دن سے میں مسلسل یہ خواب دیکھ رہی ہوں کہ میں زمین سے اٹھا کے آسمان پر پہنچادی گئی ہوں۔ میں نے اس مسلسل خواب سے یہی مطلب لیا کہ میں دنیا سے اٹھالی جاؤں گی۔''
میرزا بزرگ نوری نے جواب دیا۔ ''خوابوں پر یقین نہ کرنا۔ یہ عمر تیرے مرنے کی نہیں ہے۔''
بیوی نے جواب دیا۔ ''اپنا حال میں خود بہتر جانتی ہوں۔ میری حالت اندر سے بہت خراب ہے۔ اگر میں مرجاؤں تو میرے بچے کو اپنی پہلی بیوی کے حوالے نہ کرنا کیونکہ وہ میرے بیٹے کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کرے گی۔''
میرزا بزرگ نوری نے کہا۔ ''بہرحال، مجھے یحییٰ بھی بہت عزیز ہے اور اس کو کوئی دکھ پہنچائے، یہ میں نہیں دیکھ سکتا۔''
اس کے بعد بیمار عورت نے غلاموں کے ذریعے میرزا حسین علی کو بلوایا۔ جب وہ آگیا تو اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر آہستہ آہستہ سہلانے لگی، پوچھا۔ ''یحییٰ تجھ کو کیسا لگتا ہے؟''

میرزا حسین علی نے جواب دیا۔ ''بہت پیارا، یہ تو مجھے اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز ہے۔''
ماں نے اس کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ ''یہ ابھی نادان ہے اور اس کے سر پر باپ کے علاوہ تیرا بھی ہاتھ ہونا چاہیے۔''
میرزا حسین علی نے جواب دیا۔ ''آپ تو اس کی فکر ہی نہ کریں۔ میں جو کھاؤں گا۔ اس کو بھی کھلاؤں گا، جو پہنوں گا، اس کو بھی پہناؤں گا۔ یہ میرا چھوٹا بھائی ہے۔ کسی بھی حقیقی بھائی سے بھی زیادہ۔''
لیکن اب میرزا حسین علی کو بھی ذرا تشویش ہوئی۔ ماں سے پوچھا۔ ''لیکن بات کیا ہے، آپ اتنی پریشان کیوں ہیں؟''
دوسری ماں نے اس کو مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ''بیٹے! اس بار میں واقعی مر جاؤں گی۔''
میرزا حسین علی نے بڑے دلاسے دیے اور یہ یقین دلانے کی کوشش کی کہ اس کے مرنے کے دن ابھی نہیں ہیں۔
لیکن ماں کا انتقال ہو گیا۔ اب حویلی میں یحییٰ کو اپنی سوتیلی ماں کے علاوہ سب ہی کی محبت میسر تھی اور سوتیلی ماں کی محبت میسر نہ ہونے کی وجہ سے حویلی کے خدمت گار بھی یحییٰ سے دور دور رہتے تھے۔
میرزا بزرگ نوری کو دربار سے کم فرصت ملتی تھی اور جب فرصت ملتی تھی تو اس دوران بیوی کا رویہ یحییٰ سے اچھا ہو جاتا تھا۔
بزرگ نوری نے اپنے خدمت گاروں سے علیحدگی میں پوچھا۔ ''تم لوگ یحییٰ کے ساتھ کس طرح پیش آتے ہو؟''
ایک خدمت گار نے آہستہ سے جواب دیا۔ ''جناب! ہم لوگ تو ہمیشہ بہت اچھی طرح پیش آتے ہیں۔''
میرزا بزرگ نوری نے دوسرا سوال کیا۔ ''اور میرزا حسین علی کی ماں! وہ کس طرح پیش آتی ہے؟''
اسی خدمت گار نے جواب دیا۔ ''یہ سوال آپ اسی سے کریں جس سے متعلق ہے۔''
میرزا بزرگ نوری نے کہا۔ ''میں سوال اس سے بھی کروں گا مگر اس سے پہلے تم سب سے سوال اس لیے کر رہا ہوں کہ میں جانتا ہوں کہ میرے سوال کا جواب تم سے بہتر کوئی اور نہیں دے سکتا۔''
دوسرے خدمت گار نے میرزا بزرگ نوری کے پاس سے گزرتے ہوئے آہستہ سے کہا۔ ''اس گھر میں یحییٰ کے ساتھ اچھا سلوک نہیں ہوتا۔ ہم لوگ بے بس ہیں کہ کچھ بول نہیں سکتے اور بیگم صاحبہ نے سختی سے منع کر دیا ہے کہ ان کے رویے کا ذکر آپ سے نہ کیا جائے۔''
یہ شکایتیں میرزا بزرگ نوری کو پہلے بھی مل چکی تھیں لیکن ذرا مبہم اور شک و شبہے کے ساتھ لیکن جب ایک حقیقت پسند اور سچے انسان کی حیثیت سے ایک خدمت گار سچ بولنے پر مجبور ہو گیا تو یقین کرنا پڑا۔
یہ باتیں سن کر میرزا بزرگ ناراض ہو گیا۔ اس سلسلے میں اس نے اپنی بیوی سے کچھ اس طرح گفتگو شروع کی۔ ''جن بچوں کی مائیں یا باپ مر جاتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ کس قسم کا سلوک کرنے کا حکم دیا ہے؟''
بیوی نے غصے میں جواب دیا۔ ''میں جانتی ہوں، آپ یہ سوال کیوں کر رہے ہیں۔ میں یحییٰ کے ساتھ بہت اچھی طرح پیش آتی ہوں اور اچھی طرح جانتی ہوں کہ باپ یا ماں سے محروم بچے کے ساتھ کس طرح پیش آنا چاہیے۔''
میرزا بزرگ نوری نے جواب دیا۔ ''لیکن میں نے جو سنا ہے وہ کچھ اور ہے۔ تم یحییٰ کے ساتھ اچھی طرح نہیں پیش آتیں۔''
اس شکایت نے قیامت کھڑی کر دی۔ بیوی نے اتنا شور مچایا کہ حویلی میں بھونچال آ گیا اور آخر یہ کہہ دیا گیا کہ اگر میں یحییٰ کے ساتھ اچھی طرح پیش نہیں آتی تو اس کو وہاں لے جایئے جہاں لوگ اس سے اچھی طرح پیش آئیں۔
ان دنوں شیراز کے علی محمد باب نے دعوائے مہدیت کر رکھا تھا اور اس کے داعی پورے ایران میں خفیہ طور پر سرگرم عمل تھے۔ یہ لوگ حکومت میں بڑے بڑے لوگوں کے گھروں میں خاص طور پر کام کر رہے تھے۔ ایک داعی میرزا بزرگ نوری کی حویلی کے آس پاس موجود تھا۔ اس حویلی میں جو کچھ ہو رہا تھا، وہ اس سے فائدہ اٹھانا چاہ رہا تھا۔ اس نے میرزا حسین علی کو علی محمد باب کی کتابیں پہنچانا شروع کر دی تھیں اور میرزا حسین علی نے ان کتابوں کی باتیں اپنے چھوٹے بھائی یحییٰ کو بتانا شروع کر دی تھیں۔ دونوں بھائیوں میں بڑا اتفاق تھا۔
علی محمد باب کے داعی کو جب یہ معلوم ہوا کہ اس حویلی کی سوتیلی ماں یحییٰ کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کرتی تو اس نے اس عورت پر کمند ڈالنے کی کوششیں شروع کر دیں۔ وہ ان دونوں لڑکوں کو ذہنی و فکری یرغمالی بنانا چاہتا تھا۔ داعی، یحییٰ کو چپ چاپ کہیں لے جاتا اور اس کو تسلی دیتا کہ مت گھبرا، بہت جلد تیرے اچھے دن آنے والے ہیں کیونکہ ان دنوں ایران میں ایک ایسی ذات کا ظہور ہو چکا ہے جو اب سب کے لیے ایک اہم اعلان کرنے والا ہے۔
کچھ دن تو یہ باتیں اسی طرح اشاروں کنایوں میں ہوتی رہیں اور یحییٰ کے دل و دماغ میں علی محمد باب کا تصور قائم کیا جاتا

رہا۔ آخر کار ایک دن اس کی آٹھ سالہ زندگی میں اسے بتایا گیا کہ علی محمد باب پیدا ہو چکا ہے۔ یہ شخص غمزدوں، مجبوروں اور مظلوموں کا ہمدرد اور بہی خواہ ہے۔ وہ انہیں دکھ درد سے نجات دلائے گا۔

یحییٰ نے اپنی ماں کی شکایت کی۔ ''میری ماں مجھ پر بڑے ظلم کرتی ہے۔ مجھ کو صحیح طور پر کھانا پینا بھی نہیں دیتی۔ اگر یہی حال رہا تو میں ایک نہ ایک دن اس حویلی کو چھوڑ دوں گا۔''

دائی نے اس کو سمجھایا۔ ''دیکھو بیٹے! ایسی غلطی نہ کرنا کیونکہ اس سے اس حویلی کی بڑی بدنامی ہوگی اور تیرا باپ تقریباً وزیرِ سلطنتِ ایران ہے۔ میں عنقریب ایسا بندوبست کردوں گا کہ تیری شکایات دور ہو جائیں گی۔''

اس دائی کو معلوم نہیں یحییٰ میں کون سی خوبی نظر آ رہی تھی کہ وہ بڑے بھائی سے زیادہ چھوٹے بھائی پر توجہ دے رہا تھا۔

ایک دن علی الصباح دائی حویلی کے در پر آیا اور دربانوں سے معلوم کیا۔ ''کیا میرزا بزرگ نوری حویلی میں تشریف رکھتے ہیں؟''

دربان نے جواب دیا۔ ''تشریف رکھتے ہیں مگر بہت جلد دربار جانے والے ہیں۔''

دائی نے کہا۔ ''ان سے کہہ دو کہ ایک درویش ان سے ملنے آیا ہے، کوئی خاص بات کرنا چاہتا ہے۔''

دربانوں نے یہ اطلاع اندر پہنچا دی۔

میرزا بزرگ نوری نے اس شخص کو اندر بلوا لیا۔ یہ شخص اپنی صورت شکل اور وضع قطع سے نہایت دیندار معلوم ہوتا تھا۔ پہلی نظر میں میرزا بزرگ نوری اس سے متاثر ہو گیا اور پوچھا۔ ''فرمائیے، آپ کہاں سے تشریف لا رہے ہیں اور مجھ سے کیا کام ہے؟''

اس نے جواب دیا۔ ''میں آپ سے اور آپ کی بیوی سے چند باتیں کرنا چاہتا ہوں کیونکہ آج کئی دن سے جناب امیر خواب میں تشریف لاتے ہیں اور حکم دیتے ہیں کہ میں آپ دونوں سے ملوں، ان کا پیغام پہنچا دوں۔''

میرزا بزرگ نوری نے کہا۔ ''پہلے وہ پیغام مجھ تک پہنچا دیا جائے، بعد میں میری بیوی تک۔''

دائی نے جواب دیا۔ ''مجھے حکم دیا گیا ہے کہ آپ کے دونوں بیٹوں کی دیکھ بھال میں کروں اور ان پر کسی قسم کی زیادتی نہ ہونے دوں۔''

میرزا بزرگ نوری نے جواب دیا۔ ''میرے دونوں بیٹوں کے ساتھ حویلی میں اچھا سلوک کیا جاتا ہے اور وہ وزیر زادے ہیں، ان پر کون ظلم کرے گا؟''

دائی نے جواب دیا۔ ''لیکن مجھ کو تو یہ بتایا گیا ہے کہ تیرے چھوٹے بیٹے یحییٰ کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا جاتا۔ جبکہ رویائے صادقہ کے ذریعے مجھ کو مطلع کر دیا گیا ہے کہ یحییٰ ایک بلند مقام حاصل کرنے والا ہے۔''

میرزا بزرگ نوری کے دل میں وہم بیٹھ گیا۔ یہ شخص جس بات کی نشاندہی کر رہا ہے، وہ درست ہے۔ یہ ثابت ہو چکا ہے کہ گھر میں یحییٰ کے ساتھ اس کی بیوی اچھا سلوک نہیں کرتی اور اس شخص کو رویائے صادقہ میں جو کچھ بتایا گیا ہے، وہ درست ہے۔

دائی نے ذرا بے مروتی اختیار کرتے اور اٹھتے ہوئے کہا۔ ''ٹھیک ہے، میرا کام پیغام پہنچانا تھا، پہنچا دیا۔ اب میں جناب امیر کو بتا دوں گا کہ یہ لوگ مجھ کو جھٹلاتے ہیں۔''

وہ غصے میں اٹھ کر چلا گیا اور میرزا بزرگ نوری اسے دیکھتا رہ گیا۔ بیوی نے اوٹ سے پوچھا۔ ''یہ کون شخص تھا جو مجھ سے بھی کوئی بات کرنا چاہتا تھا؟''

میرزا بزرگ نوری نے پورا واقعہ بتا دیا اور کہا۔ ''میں حیران ہوں کہ میرے داخلی معاملات کا اسے کس طرح علم تھا۔ گویا وہ اسی حویلی کا ایک فرد ہے۔''

عورت کو اس دائی کی جستجو لاحق ہو چکی تھی اور وہ ایک قسم کے وہم میں مبتلا ہو گئی تھی۔ اسے یہ احساس تھا کہ اس نے یحییٰ کے ساتھ کبھی اچھا سلوک نہیں کیا اور اب اگر جناب امیر نے اس کے اس ظلم کی خبر اللہ کے ایک نیک بندے پر کر دی ہے اور اللہ کا ایک بندہ اس عورت کو ظلم سے باز رکھنے آیا تھا تو یہ کارِ خیر تھا۔ اس شخص کو میرزا بزرگ نوری اپنی بیوی سے ملوائے بغیر واپس نہ جانے دیتا تو بہتر تھا۔

یہ شخص میرزا حسین علی اور یحییٰ سے ملاقاتیں کرتا رہا اور ان دونوں کو علی محمد باب کے بارے میں تفصیلی معلومات فراہم کرتا رہا۔ دونوں بھائی اس عجیب و غریب شخصیت سے متاثر نظر آ رہے تھے۔

علی محمد باب نے اب یہ دعویٰ کر دیا تھا کہ اس میں خدا حلول کر گیا ہے اور اس کا یہ دعویٰ ایرانی عوام میں خاصی مقبولیت اختیار کر چکا تھا۔

داعی نے اپنی پوری توجہ یحییٰ پر صرف کرنا شروع کر دی کیونکہ وہ خوب جانتا تھا کہ اگر کسی کو بچپن سے کوئی تعلیم دی جائے تو وہ جوان ہوتے ہوتے راسخ و مستحکم ہو جاتا ہے۔

یحییٰ کی غیر معمولی دلچسپی نے بڑے بھائی میرزا حسین علی کو بھی مستعد و چاق چوبند کر دیا تھا۔ بڑا بھائی، علی محمد باب اور اس کی تعلیمات کے بارے میں جو کچھ جانتا تھا، وہ نہایت خاموشی سے اپنے چھوٹے بھائی تک پہنچا دیتا تھا۔

اسی دوران حویلی کے کسی خدمت گار نے میرزا حسین علی کی ماں کو بتایا کہ وہ شخص جو ایک بار اس کے شوہر میرزا بزرگ نوری سے ملنے اور کچھ بتانے حویلی میں آیا تھا اور وہ اس خاتون سے بھی ملاقات کرنا چاہتا تھا مگر افسوس کہ وہ ملے بغیر ہی چلا گیا، اس شخص کو حویلی کے خدمت گار نے دونوں بھائیوں سے ملتے اور باتیں کرتے دیکھ لیا تھا۔ اس نے یہ خبر حویلی میں اپنی آقا خاتون کو پہنچا دی۔

اس خدمت گار کو حکم دیا گیا کہ وہ اس شخص کو حویلی میں لائے۔

خدمت گار اسے حویلی میں لے آیا۔ عورت نے اس کو دیکھا۔ یہ شخص خاصا معتبر اور متدین نظر آیا۔ اس سے پوچھا۔ ”تو یہاں ایک بار پہلے بھی آ چکا ہے اور مجھ سے ملنا چاہتا تھا مگر ملے بغیر ہی واپس چلا گیا۔ آخر کیوں؟“

داعی نے جواب دیا۔ ”مجھے آپ سے ملنے ہی نہیں دیا گیا۔ بخدا میں اپنی مرضی کے خلاف آپ سے ملے بغیر واپس چلا گیا تھا اور آپ سے جو کہنا چاہتا تھا وہ ابھی تک میرے سینے میں محفوظ ہے اور میں ہر وقت اس کا دباؤ اور اس کی گھٹن محسوس کرتا رہتا ہوں۔“

عورت نے پوچھا۔ ”بتا وہ کیا بات ہے۔ آج تو اپنی اس گھٹن سے نجات حاصل کر سکتا ہے۔ میں ایک عرصے سے تیری منتظر ہوں۔“

اس شخص نے جواب دیا۔ ”آپ اپنے بیٹے یعنی سوتیلے بیٹے یحییٰ کو اذیتیں پہنچاتی ہیں، اسے دکھ دیتی ہیں، اس کے حقوق کو پامال کرتی ہیں جبکہ آپ کا بیٹا جس کا نام یحییٰ ہے، اللہ نے اسے ایک خاص مقصد سے اس دنیا میں بھیجا ہے۔ یہی وہ شخص ہے جس کے بارے میں یہ پیش گوئیاں چلی آ رہی ہیں کہ وہ جو اللہ کی طرف سے ظاہر ہو کر رہے گا۔ یہی لڑکا یحییٰ ہے۔ آپ اگر اس کو کسی قسم کا دکھ دیتی ہیں تو گویا خدا کو ناراض کرتی ہیں۔ میں آپ کو یہی بتانا چاہتا ہوں۔ اب آپ جو چاہیں کریں، میں آپ کو دوبارہ سمجھانے نہیں آؤں گا۔“

عورت اس تہدید سے خوفزدہ ہو گئی۔ اس نے کہا۔ ”اول تو میں نے اس کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کی لیکن اگر کبھی نادانستگی میں کوئی زیادتی ہو بھی گئی تو میں اس پر شرمندہ ہوں اور اپنے خدا سے معافی مانگتی ہوں اور وعدہ کرتی ہوں کہ آئندہ میں یحییٰ کے آرام و آسائش کا خاص خیال رکھوں گی۔“

اسی وقت یحییٰ اندر داخل ہوا۔

داعی نے احتراماً کھڑے ہو کر یحییٰ کی پیشانی کو چوما اور اقرار کیا۔ ”بے شک تو وہی ہے جس کی ہمارے قدماء نے پہلے سے خبر دے رکھی ہے کہ وہ جسے اللہ ظاہر کرے گا۔“

عورت نے یحییٰ کی اتنی عزت دیکھی تو خود بھی اس کی عزت کرنے پر مجبور ہو گئی۔ یحییٰ کو اپنے پاس بلایا اور اس کی پیشانی کو بوسہ دیا، کہا۔ ”بچے! اگر میں نے لاعلمی میں کوئی زیادتی کی ہے تو میں اس کی معافی چاہتی ہوں اور آئندہ خیال رکھوں گی۔“

یحییٰ نے ماں کو منع کیا اور کہا۔ ”آپ میری ماں ہیں اور ایک ماں اپنے بیٹے پر کیا زیادتی کرے گی۔ آج میں شرمندہ ہو رہا ہوں کہ آپ نے مجھ سے معافی مانگ کر مجھے شرمندہ کر دیا ہے۔“

داعی نے عورت سے کہا۔ ”میں تجھے خدا کی طرف سے یہ حکم دیتا ہوں، آئندہ تو اس کی تعلیم و تربیت پر خصوصی توجہ دے گی۔ حالانکہ اسے علم لدنی حاصل ہے۔“

داعی تو واپس چلا گیا کیونکہ اس کا کام ختم ہو چکا تھا اور ماں کا کام شروع ہو چکا تھا۔

اب یحییٰ کی تعلیم و تربیت کے لیے بہترین اساتذہ کا تقرر عمل میں آیا۔ یہ اساتذہ بھی بہت خاص تھے اور داعی کے مقرر کردہ نصاب کے مطابق یحییٰ کو درس دیا جانے لگا۔ اس لیے اساتذہ بھی کان میں یہی پھونکتے رہتے تھے کہ خدا کا ایک نبی علی

محمد باب ظاہر ہو چکا ہے اور اب ہم سب کو اس کی پیروی اختیار کرنا چاہیے۔ خوش قسمت ہیں وہ جو اس کی آواز سنتے ہیں، خوش قسمت ہیں وہ جن سے وہ باتیں کرتا ہے، خوش قسمت ہیں وہ جو اس کے احکامات کی تعمیل کرتے اور اس کے پیغامات کو دور دور تک پہنچاتے ہیں اور خوش قسمت ہوں گے وہ جنہیں مستقبل میں تقرب خاص حاصل ہوگا۔ اے یحییٰ! ہم تجھ میں وہ آثار دیکھ رہے ہیں جو مقربین میں پائے جاتے ہیں۔''

نو دن یحییٰ یہ باتیں سنتا رہا اور اپنی اہمیت اور اپنے مقام سے آگاہ ہوتا رہا۔ اب وہ علی محمد باب سے ملنے کے لیے بے چین نظر آ رہا تھا۔

استاد دن رات یہی تعلیم دیتے رہے اور یحییٰ خود کو اپنے سابقہ دنوں سے زیادہ اونچا محسوس کرنے لگا۔ اس نے ایک دن اپنے باپ کو کھانے کے دوران مطلع کیا۔ ''کیا آپ اپنے عہد کے کسی ایسے شخص سے واقف ہیں جو خود کو اللہ کا نبی کہتا ہے؟''

باپ نے جواب دیا۔ ''ہاں، میں اس شخص کو جانتا ہوں۔ شیراز کا ایک شخص علی محمد باب، مگر تو اسے کس طرح جانتا ہے؟''

یحییٰ نے جواب دیا۔ ''مجھے ان کی طرف سے یہ بتایا گیا کہ میں بھی اللہ کا ایک ایسا مثالی مظہر ہوں جو اپنے وقت پر ظاہر ہوگا اور دنیا کو راہ حق دکھائے گا۔''

باپ کو بیٹے کی باتیں کچھ عجیب سی لگیں مگر عصبیت غالب آئی اور اس نے اپنے بیٹے کو سمجھایا۔ ''اگر ایسی کوئی بات ہے تو تجھے مخفی رکھنا چاہیے ورنہ یہ دنیا جینا حرام کر دے گی۔ اگر میری اولاد کو خدا کوئی عظیم اور لافانی مرتبہ دینے والا ہے یا دے چکا ہے تو یہ میرے لیے باعث فخر ہوگا۔''

یحییٰ پر اور زیادہ توجہ دی جانے لگی۔ بڑا بھائی میرزا حسین علی اپنے چھوٹے بھائی کو بھی اس طرح بلند ہوتے دیکھ رہا تھا اور تشویش میں مبتلا ہو گیا تھا۔ بڑے ہونے کی حیثیت سے وہ خود کو اس عزت و احترام کا مستحق سمجھتا تھا لیکن یحییٰ اس کا رازدار بھی تھا اور وہ باتیں جو میرزا حسین علی کسی اور سے نہیں کر سکتا تھا، یحییٰ سے کرتا تھا۔

دس گیارہ سال کی عمر تک پہنچتے پہنچتے یحییٰ، علی محمد باب کا نادیدہ عاشق ہو چکا تھا۔ وہ علی محمد باب سے ملنا چاہتا تھا مگر وہاں تک رسائی اس وقت ناممکن تھی۔ بڑا بھائی اب تقریباً پچیس سال کا ہو چکا تھا اور وہ بھی علی محمد باب سے ملاقات کرنا چاہتا تھا مگر صرف ایک خوف کی وجہ سے وہ نہیں مل سکتا تھا۔ علی محمد باب کی پورے ایران میں مخالفت کی جا رہی تھی۔ علمائے کرام اور حکومت وقت دونوں ہی اس کی تکذیب میں مبتلا تھے۔ اب اگر میرزا حسین علی، علی محمد باب سے ملاقات کرتا تو اس کے باپ کی وزارت خطرے میں پڑ جاتی۔

دونوں بھائی اسی حویلی میں لوگوں کو علی محمد باب کی صداقت کا یقین دلاتے رہتے لیکن دوسروں کے لیے یہ کچھ عجیب سی بات تھی کہ کوئی نبی ان کے دور میں پیدا ہو جائے اور اس میں خدا بھی حلول کر جائے۔

اپنے بیٹوں کی یہ بات کہ وہ حویلی میں خدمت گاروں کو علی محمد باب کی حمایت پر آمادہ کر رہے تھے، جب میرزا بزرگ نوری کو معلوم ہوئی تو دونوں بیٹوں کو اپنے سامنے بٹھا کر پوچھا۔ ''آخر تم دونوں ایسا کیوں کر رہے ہو؟''

یحییٰ نے جواب دیا۔ ''بابا جان! مجھے معلوم ہے کہ علی محمد باب نے میرے بارے میں یہ پیش گوئی کی ہے کہ میں ہی وہ شخص ہوں جو خدا کی طرف سے ظاہر ہونے والا ہے۔ حالانکہ میں نے نہ تو علی محمد باب کی شکل دیکھی ہے اور نہ وہ مجھ سے واقف ہے۔''

میرزا بزرگ نوری نے پوچھا۔ ''جب تم دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا ہی نہیں تو پھر اس نے تمہارے بارے میں یہ پیش گوئی کس طرح کر دی؟''

یحییٰ نے جواب دیا۔ ''علی محمد باب نے میری تلاش میں اپنے آدمی اِدھر اُدھر دوڑا دیے تھے۔ جب ان میں کا ایک آدمی مجھ سے ملا تو اس نے پہلی ہی نظر میں مظہری علامات و آثار مجھ میں پائے اور علی محمد باب کو اس سے آگاہ کر دیا۔ وہاں سے میرے پاس بلاوا آ چکا ہے مگر میں اس خوف سے وہاں نہیں جا رہا ہوں کہ اس کا اثر آپ پر برا پڑے گا ورنہ میں وہاں کسی وقت بھی جا سکتا ہوں۔''

باپ بچے کی ان عجیب و غریب باتوں سے تشویش میں مبتلا ہو گیا۔ اس نے کہا۔ ''سمجھ میں نہیں آتا تو کس قسم کی باتیں کر رہا ہے۔ اگر یہ باتیں حویلی سے باہر نکل گئیں تو میرے لیے دشواری پیدا ہو جائے گی اور ممکن ہے مجھے ملازمت سے نکال دیا جائے۔''

یحییٰ نے راسخ لہجے میں جواب دیا۔ ''بابا جان! جو سچ ہے، وہ سچ ہے۔ اسے ایک دن ظاہر ہونا ہے، وہ ظاہر کرے گا۔

اس سے ظاہر ہو گیا کہ آپ لوگ [illegible] اور حکومت دونوں کے باغی ہیں۔"

باپ بولا [illegible] فسادیوں کی اور ملک کی بھی [illegible] نتائج بھی تو بھگتنا ہے۔" "بیٹے! تو اپنے بھائی کو سمجھا، وہ اس امر کی پالیسی نہ اپنائے ورنہ ہم سب دربدر ہو جائیں گے اور حویلی بھی ہم سے چھن جائے گی۔"

لیکن باپ کو یہ نہیں معلوم تھا کہ چھوٹا بھائی جو کچھ کہہ رہا ہے، بڑا بھائی اس کی تصدیق کر چکا ہے اور وہ ہر حال میں اپنے بھائی کا مددگار و معاون رہے گا۔

☆☆☆☆

دربار میں علی محمد باب کا بڑے زوروشور سے ذکر ہو رہا تھا اور اس نے دین کی وجہ سے علمائے کرام اور حکومت دونوں ہی پریشان تھے۔ شاہ نے میرزا بزرگ نوری کو حکم دیا کہ اس فتنے کو ہر ممکن طریقے سے کچل دیا جائے۔

شاہ نے میرزا بزرگ نوری سے پوچھا۔ "کیا کبھی کسی بابی سے تیری بھی ملاقات ہوئی؟"

اب میرزا بزرگ نوری کس طرح شاہ کو بتاتا کہ یہ وبا ان کی حویلی میں بھی داخل ہو چکی ہے لیکن وزیر نے لاعلمی ظاہر کی۔ "ابھی تک میری کسی بابی سے ملاقات نہیں ہوئی۔"

شاہ نے حکم دیا۔ "ان کے بارے میں معلومات حاصل کی جائیں۔ کیا کہتے ہیں، ان کا کیا دعویٰ ہے اور پھر یہ لوگ ملک وملت کے لیے سودمند ہیں یا نقصان دہ۔"

میرزا بزرگ نوری فکرمند حویلی میں داخل ہوئے تو وہاں اتفاق سے داعی بھی آیا ہوا تھا۔ اس نے وزیر کو دیکھا تو مارے ڈر کے چھپنے لگا مگر وزیر نے اسے دیکھ لیا اور اسے بلا کر پوچھا۔ "تو چھپ کیوں رہا تھا؟"

اس نے جواب دیا۔ "اس لیے کہ مجھے احساس ہوا کہ مجھے یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔"

لیکن یحییٰ نے اس کا تعارف کرایا۔ "بابا جان! یہ وہ شخص ہے جسے سچے خواب دکھائی دیتے ہیں۔ اس نے خواب میں جو کچھ دیکھا اور ہمیں بتایا، وہ تحقیق کے بعد درست نکلا۔"

باپ کو اس پر بابی ہونے کا شبہ ہوا، پوچھا۔ "کیا تو بابی ہے، علی محمد باب کا ماننے والا؟"

اس نے جواب دیا۔ "میں بابی ہوں اور ایک دن ایسا آئے گا کہ آپ سب بابی ہو جائیں گے۔"

وزیر نے کہا۔ "تم لوگوں نے ایران میں بڑا شور شر کر رکھا ہے۔ حکومت کو تشویش ہے۔ تو اپنے روحانی پیشوا علی محمد باب سے کہہ کہ وہ شاہ سے ملاقات کرے۔ وہاں مناظرے کے لیے علماء بلوائے جائیں گے۔ وہ علماء علی محمد باب سے سوالات کریں گے اور علی محمد باب ان کے جوابات دے گا۔ اس طرح یا تو وہ ہم سب کو قائل کر لے گا یا ہم اسے قائل کر لیں گے اور بات ختم ہو جائے گی لیکن یہ چوری چھپے کام کرنا مناسب نہیں۔"

داعی نے جواب دیا۔ "ایسا وقت بھی آنے والا ہے جب آوازِ حق شاہی محلات میں گونجے گی لیکن ابھی وہ وقت نہیں آیا۔"

وزیر نے اس سے پوچھا۔ "لیکن علی محمد باب آخری نبی محمد ﷺ اور آسمانی کتاب قرآن کے بارے میں کیا کہتا ہے؟"

داعی نے جواب دیا۔ "میں اس کا جو جواب دوں گا، وہ آپ برداشت نہیں کر سکیں گے۔ اس لیے میرا خاموش رہنا ہی بہتر ہے۔"

وزیر نے کہا۔ "پھر بھی، کچھ تو معلوم ہو۔ تو جو کچھ بتائے گا، میں اس پر اعتراض نہیں کروں گا۔ اس لیے کہ جو کچھ علی محمد باب کے بارے میں بتائے گا وہ تیرا اپنا قول نہیں ہوگا بلکہ وہ علی محمد باب کے ملفوظات سے متعلق ہوگا۔ چند ملفوظات بیان کر۔ چند اور اہم جو علی محمد باب کی تعلیم کی اساس سے ہوں۔"

داعی نے کہا۔ "تو سنیے۔ علی محمد باب پر فارسی میں ایک کتاب نازل ہوئی ہے۔ اس کا نام ہے 'بیان'۔ علی محمد باب کا عقیدہ ہے کہ نبوت کا سلسلہ محمدؐ پر ختم نہیں ہو جاتا، وہ اس دور میں خود کو نبی کہتا ہے اور نبی ہے کیونکہ ظہوراتِ مشیت اولیاء کا خاتم حلقہ سلسلۂ نبوت کا آخری شخص نہیں ہے اور اس کی کتاب بھی کتبِ سماوی کی خاتم نہیں۔"

(جاری ہے)

مضمون کے ماخذ

فرقے اور مسالک۔ بلال زبیری۔ ائمہ تلبیس۔ ابو القاسم رفیق دلاوری۔
بہا اللہ اور عصر جدید ترجمہ۔ عباس بٹ۔ قیامت۔ علی محمد باب

جارج براؤن، کرائم بیورو میں کام کرتا تھا۔ [illegible]
جرائم پر قابو پانے اور دیگر [illegible] کے لیے محکمے کو مکمل طور پر کمپیوٹرائز کر دیا گیا تھا۔ اس کے نتیجے میں ملازمین کمپیوٹر آپریٹر بن کر رہ گئے تھے، جو صرف معلومات کو کمپیوٹر میں فیڈ کرنے کا کام کرتے تھے۔
جوں جوں وقت گزرتا رہا، کرائم بیورو میں انسانوں کی ضرورت کم ہوتی چلی گئی۔ وہ محض لولواک (مرکزی کمپیوٹر) کے حواری بن کر رہ گئے، جو تقریباً سارا کام خود ہی انجام دیتا تھا۔ جارج کو یہ بات سخت ناگوار گزرتی تھی۔

کمپیوٹرز پورے محکمے کا کنٹرول سنبھالے ہوئے تھے۔
انسانوں کا کام بس انہیں معلومات بہم پہنچانا تھا جس کے بعد وہ پلک جھپکتے ہی تجزیہ کر کے [illegible] ایک [illegible] ذہن ہیں کہ ان کی صلاحیتیں [illegible] انسان اس نظام کے پابند [illegible] مگر وہ پھر بھی عادی تھے۔ [illegible] کر سکتے تھے جب ان کے خیالات میں کوئی الجھاؤ [illegible] الجھاؤ کا مطلب [illegible] منطقی ہوتا تھا [illegible] بات نہیں کرتے تھے۔ جارج ان لوگوں میں سے تھا [illegible] صلاحیتوں کی اس ناقدری کو شدت سے محسوس کرتے تھے۔ [illegible] برس کی عمر میں اسے محسوس ہوتا تھا کہ وہ زندگی کے ایک [illegible] کھڑا ہے۔ تقریباً پانچ برس کرائم بیورو میں کام کرنے کے بعد [illegible]

آزادی بہت بڑی نعمت ہے... مگر بعض دفعہ اس کی بہت بڑی قیمت چکانا پڑتی ہے... اس نے بھی قانون کا شکنجہ توڑ کر آزادی پالی تھی... مگر قید سے فرار ہونا اتنا جاں گسل ہوگا، اسے اندازہ نہ تھا... اسے مختلف سیاروں پر تلاش کیا گیا اور مُردہ گردان لیا گیا مگر تیس سال بعد جب وہ زندہ ملا تو انہونی ہوگئی۔

آزادی کی چاہ میں ویران سیارے پر
بسنے والے مجرم کا احوال

قیدِ تنہائی

جاوید بسام

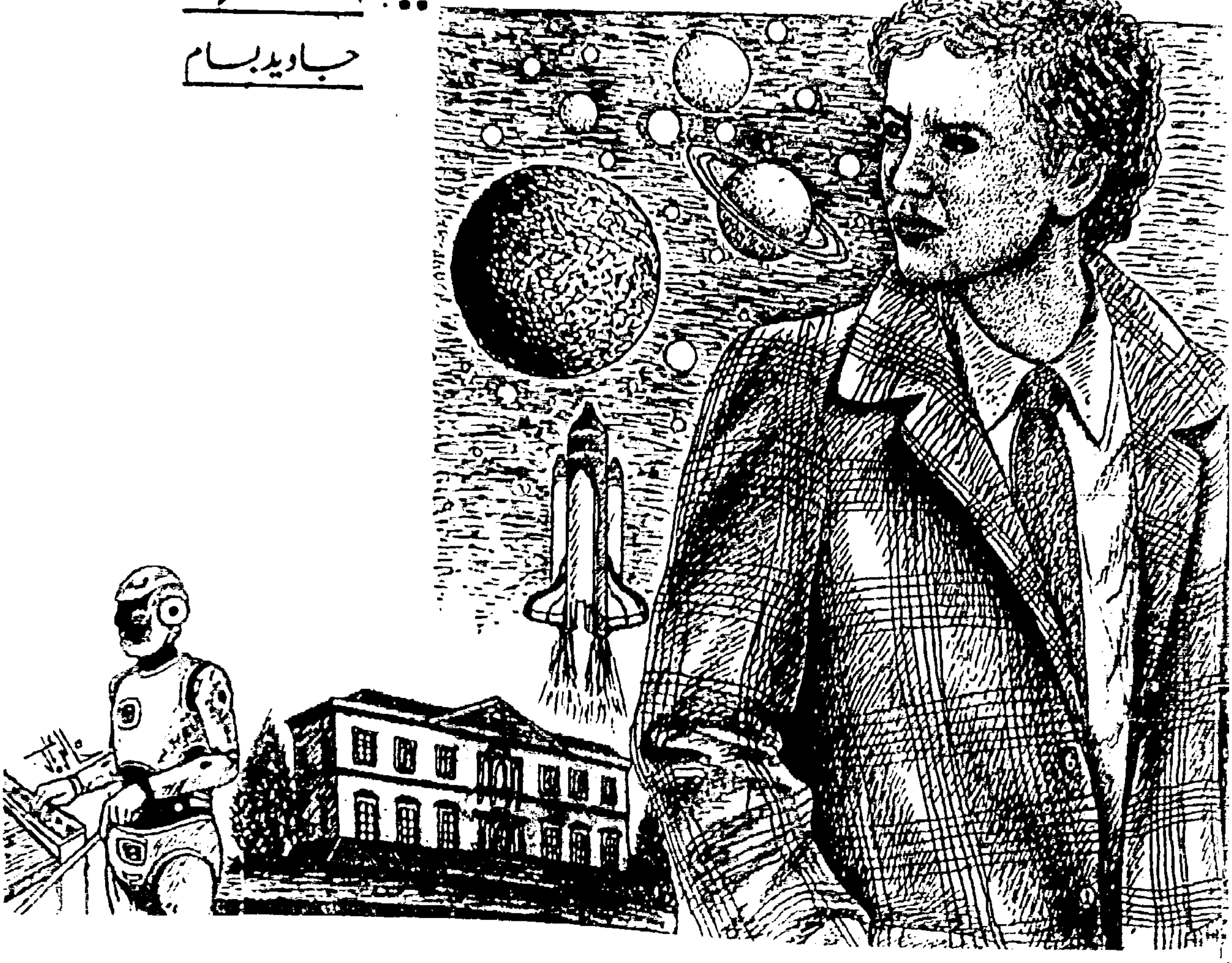

ایک بہترین پروگرامر تو بن گیا تھا مگر اس سے زیادہ ہونا نہیں۔ حالانکہ اس کے خواب بالکل مختلف تھے۔ وہ ایک نہایت ذہین آدمی تھا۔ جرم اور سزا، گناہ کی فلسفیانہ تعریف، اخلاقیات اور کردار، اداری اور مجبوری جیسے تصورات اسے بے حد توجہ کرتے تھے۔ کالج کے زمانے میں وہ انہی موضوعات پر بات کرتا رہتا تھا۔

ایک دن اس کے ساتھی طالب علم نے کہا۔ ''تمہیں تو کرمنل بیورو میں کام کرنا چاہیے۔ تم ہر وقت جرائم کی باتیں کرتے رہتے ہو جیسے خود کوئی منصوبہ بنا رہے ہو۔''

''میری دلچسپی خالصتاً سائنسی ہے۔'' جارج نے وضاحت کی تھی، مگر تعلیم مکمل کرنے کے بعد اس نے واقعی کرمنل بیورو میں ملازمت اختیار کر لی اور اب اکتیس برس کی عمر میں وہ خود کو ایک دوراہے پر کھڑا پاتا تھا۔

ایک دن وہ کرائم بیورو کی شاندار عمارت میں چمکتی ہوئی میز پر افسردہ بیٹھا جنسی انحرافات کے اعداد و شمار کمپیوٹر میں فیڈ کر رہا تھا۔ ایسے رجحانات جو شہوانی مناظر پر غور و فکر سے متعلق تھے، جنہیں زمین اور اسی نوعیت کے سترہ دوسرے سیاروں پر ریکارڈ کیا گیا تھا۔ جارج کا کام یہ تھا کہ وہ اس معلومات کو مرتب کرے، انہیں ٹوٹواک میں داخل کرے اور پھر کمپیوٹر کے فیصلے کا انتظار کرے۔ جس کے نتائج بعد میں لورنا نہم پر وہاں کے پریشان پولیس چیف کے لیے بھیجے جانے تھے۔ وہ ایک ایسا زمین نما سیارہ تھا جو اگرچہ ایک نہایت سخت گیر اور پاکیزگی پسند اشرافیہ کے زیرِ اقتدار تھا پھر بھی آج کل ان انحرافات کی لپیٹ میں آیا ہوا تھا۔

پروگرام لکھتے ہوئے جارج کو احساس ہوا کہ وہ لورنا کے اس پولیس افسر سے حسد کر رہا ہے۔ ممکن ہے وہ ایک پسماندہ جگہ پر تعینات ہو، مگر وہ حقیقی جرائم اور حقیقی مجرموں سے نمٹ رہا تھا، نہ کہ ہر وقت سر پر منڈلاتے ہوئے سب کچھ جاننے والے ٹوٹواک سے۔

جارج نے ایک بار پھر اعداد کی لمبی قطار پر نظر ڈالی اور ان پٹ کا بٹن دبا دیا۔ ٹوٹواک نے فوراً موصولہ معلومات کا تجزیہ شروع کر دیا تاکہ ایک تفصیلی جواب تیار کیا جا سکے۔ جارج اکتاہٹ کے عالم میں کہنیاں میز پر لگا کر ٹھوڑی ہاتھوں پر رکھے بیٹھا رہا۔

کمپیوٹر میں غلطی کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ نہیں...... یہ کہنا درست نہ ہوگا۔ ٹوٹواک ہر کمپیوٹر کی طرح آزمائش اور خطا کے طریقے پر کام کرتا تھا، مگر دو آزمائشوں کے درمیان وقفہ ایک مائیکرو، مائیکرو سیکنڈ کے ایک حصے سے بھی کم ہوتا تھا اور اس رفتار پر کام کرتے ہوئے مشین زیادہ سے زیادہ دو منٹ میں تمام ممکنہ اندازے ختم کر سکتی تھی۔ دو منٹ بعد کمپیوٹر کا آؤٹ پٹ جارج کی اسکرین پر نمودار ہوا۔ اس نے دیکھے بغیر ہی اس لمبی تفصیل کو چیف

الیکٹرانک [illegible]
وہ ٹھیک تھا [illegible]
لورنا نے ملازمت کی [illegible]
کام کرنا چاہتا [illegible]
کے عمل کی [illegible]

اچانک کسی جذبے کے تحت [illegible] چاہئیں۔ وہ ایک [illegible] درخواست [illegible]

''ایسے اقدامات [illegible]''

پھر تحریر پر نظر ڈالی تو [illegible]

''مدت: گزشتہ تیس سال۔

مدعا: پوری کہکشاں۔''

کچھ سوچ کر اس نے ایک اور سطر شامل کی۔

''جلدی کرو ورنہ میں تمہاری برقی تاروں پر کیچپ ڈال دوں گا۔''

ایک لمحے بعد اس کی میز کے اوپر لال بتی جل اٹھی جو اس بات کا اشارہ تھی کہ مشین اسے کچھ بتانا چاہتی ہے۔ جارج نے جواب پڑھا۔ لکھا تھا۔

''درخواست میں دھمکی کا تاثر پایا گیا ہے۔ براہِ کرم اسے ہٹا دیں ورنہ آپ کو سزا دی جائے گی۔''

جارج تصور کر سکتا تھا کہ اس کی مضحکہ خیز دھمکی نے کمپیوٹر کے الیکٹرانک دماغ میں کیسا ہنگامہ برپا کر دیا ہوگا۔ شاید کوئنگ سسٹم، پاور پلانٹ اور ہر اس چیز کو جو ''برقی موصلات'' کے زمرے میں آتی تھی، کیچپ کے سیلاب سے بچانے کے لیے ہنگامی اقدامات کیے جا رہے ہوں گے۔

''یہ دھمکی نہیں، میں مذاق کر رہا تھا۔'' اس نے جواب دیا۔

لال بتی بجھ گئی۔ کمپیوٹر پرسکون ہو گیا۔

چند لمحوں بعد اچانک پرنٹر سے کارڈز کا ایک سیلاب جارج کی میز پر امڈنے لگا۔ اس نے حل نہ ہونے والے مقدمات مانگے تھے اور وہ مل گئے تھے۔ ٹوٹواک کی صاف ستھری ٹائپ شدہ تحریر سے بھرے کارڈز ایک کے بعد ایک باہر آتے جا رہے تھے۔ جارج حیرت سے پلکیں جھپکنے لگا، جب اس کی میز پر کاغذ کا پہاڑ بنتا چلا گیا۔ کہکشاں میں بے شمار لوگ آباد تھے اس لیے جرائم بھی بے شمار تھے...... اور اگر ان میں سے صرف ایک چھوٹا سا حصہ بھی حل نہ ہوا ہو تو......

جارج نے آہ بھری۔ وہ مشین کو روک نہیں سکتا تھا۔ کمپیوٹر اپنی یادداشت میں مسلسل کھوج لگاتا رہے گا۔ تیس برسوں میں جمع ہونے والے تمام مقدمات نکالتا جائے گا۔ کم از کم پانچ ہزار کارڈز اس وقت اس کی میز پر پڑے تھے اور بہاؤ کم ہونے کا کوئی نشان نہ تھا۔

سلیکٹر کی مدھم جھنکار سنائی دی۔ جارج نے بٹن دبایا اور چیف کی گرج دار آواز آئی۔ ''جارج! تم یہ کیا کر رہے ہو؟''

''میں تفتیش کر رہا ہوں۔'' اس نے سکون سے جواب دیا۔ ''مشین ذرا حد سے بڑھ گئی ہے، بس یہی بات ہے۔''

''کون سی تفتیش؟''

''میں چاہوں گا کہ کام مکمل ہونے تک اس پر بات نہ کروں۔ چیف! شاید مجھے ایک مختصر چھٹی بھی درکار ہو۔''

''میرا خیال ہے، یہ ممکن ہو سکتا ہے۔'' چیف نے بھاری آواز میں کہا اور رابطہ منقطع ہو گیا۔

جارج نے غصے سے اپنی میز پر ڈھیر کارڈز کی طرف دیکھا۔ اس نے اعلان تو کر دیا تھا کہ وہ کسی کام میں مصروف ہے۔ اب اسے طے کرنا تھا کہ وہ کام آخر ہے کیا۔

کمپیوٹر سے دوسرا پانچ ہزار کا ذخیرہ نکل آیا تھا اور اب کارڈز میز سے نیچے گر کر کمرے میں پھیلنے لگے تھے۔ وہ گھبرا گیا۔ اسے توقع تھی کہ تیسرا ابھی کسی لمحے نکل آئے گا، مگر اس کے بجائے لال بتی جلی اور صرف ایک کارڈ باہر آیا، جس پر لکھا تھا۔ ''ابتدائی جانچ مکمل۔ مزید معلومات 180 سیکنڈ میں مائیکرو فلم پر دستیاب ہوں گی۔''

''اوہ نہیں......!'' جارج نے غصے سے چیخ کر فوراً ٹائپ کیا۔ ''حاصل شدہ معلومات منصوبہ مکمل کرنے کے لیے کافی ہیں۔ مزید تلاش بند کی جائے۔''

تھوڑی دیر بعد جواب آیا۔ ''موصولی کی تصدیق، تلاش بند کر دی گئی ہے۔''

''خدا کا شکر ہے۔'' جارج نے گہری سانس لے کر کہا۔ کارڈز کو دیکھ کر اس کی آنکھیں پھیل گئی تھیں اور وہ خود کو کسی جادوگر کا ناتجربہ کار شاگرد محسوس کر رہا تھا، مگر کم از کم وہ کاغذ کے اس سیلاب کو روکنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

اس نے سب سے اوپر والا کارڈ اٹھایا۔ ایک لمبا، دبلا پتلا سیریئن باشندہ، جس پر تقریباً تیس سال پہلے ویگا چہارم کے تیسرے شہر میں دکان سے چوری کا شبہ تھا، مگر گرفتاری عمل میں نہ آئی تھی۔ تفصیلات پچھلی جانب درج تھیں۔

دوسرا کارڈ بھی امید افزا نہ تھا۔ ایک چوڑے کندھوں اور لمبے بالوں والا شخص ایک بچے کا پالتو جانور چرا کر لے گیا تھا۔ یہ واقعہ سات جولائی 2561ء کو زمین پر پیش آیا تھا۔ جانور کبھی نہیں ملا تھا، تفصیلات پشت پر تھیں۔

یہ معلومات تیس برس سے ٹوٹو اک میں محفوظ تھیں۔ جارج نے سوچا کہ کوئی شخص اگر ایسے فضول ریکارڈز کو میموری بینک سے صاف کر دے تو معاشرے کی بڑی خدمت کرے گا۔ وہ جانور یقیناً گلا یا گوس کا بچھوانہ ہوگا، اب تک مر چکا ہوگا اور بچہ بھی بالغ ہو گیا ہوگا۔ اس کے باوجود یہ ''جرم'' اب تک حل طلب تھا۔

جارج نے تیسرا کارڈ اٹھایا۔ پچھلے کارڈز کی طرح یہ معلومات بھی تیس برس پہلے کمپیوٹر میں داخل کی گئی تھیں، مگر یہ کہیں زیادہ دلچسپ تھیں۔ جارج نے سامنے والا حصہ غور سے پڑھا، پھر کارڈ پلٹ کر تفصیلات کا جائزہ لیا۔

''ایڈورڈ ہیمنڈ چارکٹ۔

پیدائش: 21 دسمبر 2530ء، نیویارک سٹی۔

جرائم: معمولی چوری، گرفتار 8 نومبر 2547ء۔

ایک ماہ کی قید بامشقت کی سزا۔ حسنِ سلوک پر رہائی۔

بچے کا اغوا: گرفتار 12 جنوری 2558ء۔

فرار: 17 جنوری 2558ء۔

دوبارہ گرفتار: 11 جون 2558ء۔

عمر قید کی سزا: 4 اکتوبر 2559ء۔

پروسیون چہارم پر روانگی: 7 نومبر 2559ء۔

سزا کا آغاز: 11 جنوری 2560ء۔

تعزیری کالونی سے فرار: 12 مئی 2560ء۔

تاحال مفرور۔''

(مزید تفصیلات کے لیے مطلوب مجرموں کی فائل میں اضافی معلومات شیٹ 101 دیکھیں)

جارج کارڈ کو دو انگلیوں میں دبائے سوچ میں گم ہو گیا۔

ایڈورڈ...... ہاں، اسے یہ نام یاد آ گیا۔ اگرچہ ایڈورڈ کا مقدمہ جارج کی پیدائش کے ایک دو ماہ بعد ہی منظرِ عام پر آیا تھا، مگر اس نے زمانۂ طالب علمی میں اس کے بارے میں پڑھا تھا۔ جارج کی یادداشت دھوکا نہیں دے رہی تھی۔ وہ پروسیون چہارم کی تعزیری کالونی سے فرار ہونے والا واحد قیدی تھا۔

جارج نے تیزی سے کارڈز کے ڈھیر کو سمیٹ کر کمپیوٹر کے وصولی خانے میں ڈال دیا اور ایک نئی درخواست ٹائپ کی۔

''ایڈورڈ ہیمنڈ سے متعلق اضافی معلومات شیٹ 101 بھیجی جائیں۔''

چند ہی لمحوں بعد وہ کاغذ اس کی میز پر پڑا تھا۔ جارج کا اندازہ درست تھا۔ پروسیون کی پوری تاریخ میں صرف ایڈورڈ ہی ایسا شخص تھا جو وہاں سے فرار ہونے میں کامیاب ہوا تھا۔ وہ کسی طرح ایک نشست والا خلائی جہاز چرا کر کسی کو خبر ہونے سے پہلے سب اسپیس میں فرار ہو گیا تھا۔ یہ اب تک واضح نہ ہو سکا تھا کہ ایڈورڈ اس خلائی جہاز تک کیسے پہنچا، مگر اس سے پہلے یا بعد میں بھی کوئی اور قیدی پروسیون چہارم سے فرار نہ ہو سکا۔ اس لیے سب کا اتفاق تھا کہ دوبارہ ایسا ہونا ناممکن ہے۔ ایڈورڈ کے موجودہ مقام کا راز بھی حل نہ ہو سکا تھا۔ اضافی شیٹ میں کم و بیش ان تمام قابلِ اعتماد

لوگوں کے بیانات درج تھے جن کا ایڈورڈ سے فرار کے بعد کبھی نہ کبھی سامنا ہوا تھا، اسے دیکھا گیا تھا یا دیکھنے کا دعویٰ کیا گیا تھا۔ تقریباً ایک درجن ستاروں کے سیاروی نظاموں میں کم وبیش ایک سیدھی لکیر میں پروسیون سے بیلاٹرکس تک، جہاں آکر ایڈورڈ کا سراغ مٹ جاتا تھا۔ بیلاٹرکس کے گرد گردش کرنے والے چھ سیاروں کی محدود تلاشی کے باوجود کچھ ہاتھ نہ آیا تھا۔

جارج کے ذہن میں خیالات کا طوفان برپا تھا۔ یہ بات اہم نہیں تھی کہ ایڈورڈ کون تھا یا یہ کہ اس نے ایک ایسی کالونی سے فرار ہوکر ماہرینِ تعزیرات کو شرمندہ کردیا تھا جہاں سے فرار کو ناممکن سمجھا جاتا تھا یا یہ کہ اس کا جرم کتنا سنگین تھا۔ نہیں...... جارج کی دلچسپی کسی اور ہی بات میں تھی۔

ایڈورڈ غائب ہوگیا تھا اور اس نے اس ترتیب کو توڑ دیا تھا جس کا جارج عادی ہوچکا تھا۔ کمپیوٹروں کے زیرِ انتظام کہکشاں میں لوگ یوں بے نشان غائب نہیں ہوا کرتے تھے۔ کم از کم اتنی آسانی سے تو نہیں۔ مانا کہ ایڈورڈ ذہین تھا، مگر وہ گیا کہاں؟ سراغ بیلاٹرکس کے سیاروی نظام تک جاکر ختم ہوجاتا تھا۔ جارج نے ہونٹوں پر زبان پھیری۔ یہی وہ جگہ تھی جہاں ایڈورڈ کو سب سے زیادہ تلاش کیا گیا تھا، مگر بے سود۔

کیوں؟ یقیناً تلاش کے طریقے میں کوئی خامی تھی۔ ایڈورڈ کی نبض تیز ہوگئی۔ یہ موقع تھا اپنی خودمختاری آزمانے کا، گوشت پوست کے ایک عام انسان کے لیے، جس کے اندر جرأت مندانہ اندازے لگانے کی فطری صلاحیت موجود تھی، یہ ثابت کرنے کا کہ کمپیوٹر اپنے منطقی نظام کے ساتھ ہر کام کے لیے موزوں نہیں۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ ایڈورڈ کو تلاش کرے گا۔ جارج نے سب سے پہلے سلیکٹر کا بٹن دبایا۔

”چیف! میں جارج بول رہا ہوں۔ میں تین ماہ کی چھٹی کی درخواست کرنا چاہتا ہوں۔“

”تنخواہ کے ساتھ یا بغیر؟“

جارج نے ایک لحہ توقف کیا پھر فیصلہ کن انداز میں بولا۔ ”تنخواہ کے ساتھ۔ میں ایک خصوصی تفتیش پر کام کررہا ہوں، جس کا ذکر میں نے پہلے کیا تھا۔“

ایک لمحے کی خاموشی چھاگئی۔

”تین ماہ کی تنخواہ کے ساتھ چھٹی...... جارج! بجٹ بہت تنگ ہے۔ یہ کس نوعیت کی تفتیش ہے؟“

”میں ایڈورڈ جارکٹ کو تلاش کرنا چاہتا ہوں۔“ جارج نے جواب دیا۔ چیف کا ردِعمل متوقع تھا۔

”کسے؟“

”ایڈورڈ...... وہ بچہ اغوا کرنے والا جو 2560ء میں پروسیون کی تعزیری کالونی سے فرار ہوا تھا۔ یاد ہے؟“

”اوہ...... اچھا، اب سمجھا۔ ہم...... ٹھیک ہے۔ درخواست فارم بھردو اور ایک پروگرام بناکر کمپیوٹر میں ڈال دو۔ میں اس بات کو یقینی بناؤں گا کہ تمہیں چھٹی مل جائے۔“

جارج نے تیزی سے چھٹی کی درخواست والا کارڈ بھرا اور اسے ٹوٹواک میں ڈال دیا۔ پھر اس نے کمپیوٹر کو ایک اور حکم دیا۔

”ایڈورڈ سے متعلق تمام دستیاب وسائل مجھے بھیجے جائیں۔“

اسے فوراً وہ سب کچھ مل گیا جس کی اس نے درخواست کی تھی، جن میں ایڈورڈ کا کارڈ اور شیٹ 101 کی نقول بھی شامل تھیں۔ جارج نے میز صاف کی اور موصول ہونے والی دستاویزات کا مطالعہ شروع کیا۔ ان میں سے زیادہ تر وہی باتیں دہرائی گئی تھیں جو وہ پہلے ہی جانتا تھا۔ اس نے ان کاغذات پر بھی سرسری نظر ڈالی، جیسے ایڈورڈ کی وہ سوانح جو اسے پروسیون بھیجے جانے سے پہلے لکھی گئی تھی۔ ان میں سے کچھ بھی اس کے لیے اہم نہ تھا۔ اس کی اصل دلچسپی ایڈورڈ کی فرار کے بعد کی زندگی کی تفصیلات میں تھی۔ اس نے بڑی توجہ سے ان تمام بیانات کو پڑھا جن میں دعویٰ کیا گیا تھا کہ ایڈورڈ کو اس فرار کے بعد کسی اور روپ میں دیکھا گیا تھا یا کسی نے دیکھنے کا گمان کیا تھا۔ جارج کو امید تھی کہ وہ کوئی انسان ہوگا، نہ کہ ہر وقت چوکنا رہنے والا ٹوٹواک۔ ہر مشاہدے کے ساتھ امکان کا ایک نا کہ بھی تیار کیا تھا اور سیاہی کے مختلف رنگوں سے ان پر نشان لگائے تھے۔ شوخ چیری رنگ ”قابلِ اعتماد“ اور گہرے جامنی رنگ ”ناقابلِ اعتبار“ کے لیے تھے۔ رنگوں کا یہ نقشہ بلاشبہ بیلاٹرکس کی طرف اشارہ کرتا تھا۔ اس کے ساتھ ایک رپورٹ بھی تھی جو ایڈورڈ کو پکڑنے کے لیے بھیجی گئی مہم سے متعلق تھی۔

ٹوٹواک نے بیلاٹرکس کے چھ سیاروں کا تجزیہ بھی کیا تھا اور اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ ایڈورڈ بیلاٹرکس دوم، سوم یا چہارم پر ہوسکتا ہے۔ وہ سیارے جن کے باشعور باشندے اپنی نسبتاً پرامن فطرت کے لیے جانے جاتے تھے۔

گشتی جہاز سی ڈی 102 ایکس 3 نے ان سیاروں کی باریک بینی سے چھان بین کی، مگر ایڈورڈ کا کوئی سراغ نہ ملا۔ آخر اس کا کیس ”غیر حل شدہ“ معاملات میں ڈال دیا گیا۔ وہ شاید ہمیشہ وہیں پڑا رہتا اگر جارج اسے دوبارہ نہ نکالتا۔

جارج نے خوشگوار سی دھن گنگناتے ہوئے باقی کاغذات پلٹنا شروع کیے۔ ان میں ایک زرد رنگ کا اشتہاری پوسٹر بھی تھا، جسے 12 مئی 2560ء کو پروسیون پر چھاپا گیا تھا۔ اس پر ایڈورڈ کی تصویر تھی۔ گہری رنگت، سیاہ بال، وجیہہ نوجوان، پتلی مونچھیں، بڑی قلمیں اور ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ یا شاید ایک طنزیہ مسکراہٹ۔ جارج نے سوچا، بڑا مکار لگتا ہے۔ اگرچہ علمِ جرم کا بنیادی اصول یہی

تھا کہ شکل وصورت سے کردار کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا، مگر ایڈورڈ کے معاملے میں مجرم کے اعمال اس کی شکل سے میل کھاتے تھے۔ پروسیون سے فرار ہونے کے لیے غیر معمولی چالاکی درکار تھی۔

نوٹس میں اس مجرم کی گرفتاری تک پہنچنے والی اطلاع پر پچاس ہزار ڈالرز انعام کا ذکر بھی تھا۔ اس کی شناخت اور مختصر سوانح بھی درج تھی۔ جارج نے سوچا کہ شاید آج بھی ایسے نوٹس کہکشاں کے کناروں پر واقع ڈاک خانوں کی دیواروں پر آویزاں ہوں گے۔ جارج نے پوسٹر ایک طرف رکھا اور باقی کاغذات کے ساتھ اسے بھی ٹوٹواک کے ان پٹ خانے میں ڈال دیا۔

"بیلاٹرکس کے سیاروی نظام سے متعلق معلومات بھیجی جائیں۔" اس نے کمپیوٹر کو حکم دیا۔

☆☆☆

بیلاٹرکس...... جس کی کمیت سورج سے ایک اعشاریہ سات گنا زیادہ تھی، زمین سے 215 نوری سال کے فاصلے پر واقع تھا۔ کمپیوٹر کے اعداد وشمار کے مطابق بیلاٹرکس کے گرد چھ سیارے گردش کررہے تھے۔ جارج نے تیزی سے اس خلائی جہاز کی رپورٹ کا مطالعہ کیا جس نے بیلاٹرکس کے نظام کا جائزہ لیا تھا۔

بیلاٹرکس اوّل، جس کی زمین شدید گرم اور جھلستی ہوئی تھی۔ اس کا درجۂ حرارت ڈیڑھ سو ڈگری سینٹی گریڈ تک پہنچتا تھا۔ وہ زندگی کے لیے موزوں نہ تھا اور ظاہر ہے وہاں کوئی موجود نہ تھا۔

بیلاٹرکس دوم، قابلِ رہائش تھا۔ ایک آبی دنیا، جہاں پانی دراصل مائع ہیلوجنز کا مرکب تھا۔ وہاں کے باشندے انسان دوست تھے اور کلورین میں سانس لیتے تھے۔

بیلاٹرکس سوم، بھی آباد تھا۔ وہاں جگالی کرنے اور چار ٹانگوں والے ذہین جاندار بستے تھے۔ اس سیارے پر انسانوں کی ایک چھوٹی سی کالونی بھی موجود تھی۔ جارج نے پڑھنا جاری رکھا۔

بیلاٹرکس چہارم، ایک ویران اور آتشیں چٹانوں کا سیارہ تھا، جہاں کہیں کہیں کائی نما نباتات پائی جاتی تھیں۔ وہاں ارتقا کا عمل ابھی شروع نہیں ہوا تھا۔

بیلاٹرکس پنجم، ایک عظیم گیس دیو (ہائیڈروجن اور ہیلیم پر مشتمل سیارہ) تھا، جس کی کششِ ثقل بے حد طاقتور تھی۔ وہ بھی غیر آباد تھا اور وہاں اترنے کو غیر ضروری سمجھا گیا تھا۔

بیلاٹرکس ششم، زمین سے مشابہ ایک سیارہ تھا۔ اگرچہ اس کا اوسط درجۂ حرارت کم تھا۔ وہاں انسان نما مخلوق آباد تھی، جن کی تہذیب زرعی زندگی کے مرحلے میں داخل ہوچکی تھی۔ مہم کے ماہرین نے سفارش کی تھی کہ اس سیارے کے باشندوں سے رابطے سے گریز کیا جائے تاکہ ان کے قدرتی ارتقائی عمل میں خلل نہ پڑے۔

جارج نے دیکھا کہ تین سیارے ایسے ہیں جہاں زندگی موجود ہے...... دوم، سوم اور ششم...... اور تین ایسے ہیں جہاں رہنا ممکن نہیں۔ اوّل، چہارم اور پنجم۔ سرچ ٹیم نے پہلے تین کا بہت اچھی طرح معائنہ کیا تھا مگر کوئی سراغ نہیں ملا تھا۔ باقی تین میں سے اوّل اور پنجم پر اترنا ناممکن تھا۔ بس ویران چٹانی بیلاٹرکس۔ چہارم ایک ایسا سیارہ تھا، جہاں اترا تو جاسکتا تھا مگر اس کی زمین انتہائی سخت چٹانوں والی تھی۔ وہاں ایک تنکا بھی نہیں اگتا تھا۔ اگر وہاں کوئی اتر بھی جاتا تو زیادہ دن زندہ نہ رہتا۔ اس پر صرف ایک بار اڑان بھری گئی۔ کمپیوٹر کے نزدیک یہ خیال ہی غیر منطقی تھا کہ کوئی مفرور اس مکمل ویرانے میں چند دن بھی گزارنے کا فیصلہ کرے گا۔

جارج، ٹوٹواک کے اس نتیجے کو پڑھ کر ہنس پڑا۔ غیر منطقی؟ اچھا، بہت خوب! یقیناً یہ غیر منطقی تھا، مگر یہی غیر منطقی پن اس بات کی علامت تھا کہ کوئی باوقار کمپیوٹر کبھی ایسے گڑھے میں چھپنے کا سوچ ہی نہیں سکتا۔

جارج نے خوش دلی کے ساتھ میز سے تمام کاغذات ہٹا دیے اور اس بات کی تصدیق کی کہ اسے چھٹی مل چکی ہے، پھر سفر کے انتظامات کرنے لگا۔ اس نے ایک نشست والا خلائی جہاز اور نقشوں کا ایک بڑا ذخیرہ طلب کیا۔ اس نے بیلاٹرکس جانے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ سب اسپیس (وہ جہت جس کے ذریعے روشنی کی رفتار سے زیادہ تیز سفر ممکن ہو) میں بھی دو سو پندرہ نوری سال کا سفر کچھ وقت لیتا تھا۔ جارج نے یہ وقت بیسویں اور اکیسویں صدی کے علم جرم کے کلاسیکی متون دوبارہ پڑھتے ہوئے گزارا۔ وہ دور اس کے خیال میں ایسا تھا جب انسان اپنے دماغ سے کام لیتا تھا۔ یہ نہیں کہ ڈیٹا ڈال کر بے جان مشین سے تیار شدہ جواب حاصل کرلیتا۔ مثال کے طور پر بیلاٹرکس کی مہم کو لیں۔ ایک بے معنی تلاش، جو صرف ان علاقوں تک محدود رہی جو پہلے ہی ٹوٹواک نے مقرر کردیے تھے۔ کیا تلاش کرنے والوں میں سے کسی نے طے شدہ ہدایات سے ہٹنے کی کوشش کی؟ غالباً نہیں...... اور اگر کسی نے کی بھی ہو تو یہی ماننا پڑے گا کہ اس نے کمپیوٹر کو اطلاع دینا مناسب نہیں سمجھا۔

جارج کا خلائی جہاز سب اسپیس سے نکل کر بیلاٹرکس کے قریب نمودار ہوا۔ جارج کو ایک تجربہ کار خلانورد نہیں کہا جاسکتا تھا، مگر خلائی جہاز کو قابو میں رکھنا کوئی مشکل کام نہ تھا۔ ایک خصوصی حفاظتی نظام اس بات کو یقینی بناتا تھا کہ پائلٹ کوئی جان لیوا غلطی نہ کرے۔ اگر کوئی غلطی ہوتی تو حفاظتی نظام بغیر انسانی مداخلت کے جہاز کو دوبارہ سب اسپیس میں بھیج دیتا تھا اور ہنگامی لینڈنگ کی صورت میں ایک خاص آلہ وسیع فریکوئنسی پر مدد کا سگنل نشر کرتا تھا جو حادثے کی جگہ سے بیس نوری سال کے دائرے میں سنا جاسکتا تھا۔ معمول کی فضا میں واپس آکر جارج کا خلائی جہاز بیلاٹرکس اوّل کے

[illegible]

اس نے خلائی جہاز کا رخ بیلاٹرکس دوم کی طرف [illegible] اس کے گرد [illegible] کوئی انسان [illegible] ملبہ مل جانے کی توقع بھی دور تھی۔ وہاں پہلے ایک سرچ ٹیم آ چکی تھی۔ اسے یقین تھا کہ انہوں نے پوری کوشش کی ہوگی۔ بیلاٹرکس دوم اور ششم کے معاملے میں بھی یہی بات درست تھی۔ لولواک نے انہی تین سیاروں پر تلاش مرکوز کرنے کی سفارش کی تھی اور جارج کو پورا یقین تھا کہ ٹیم نے ہدایات پر حرف بہ حرف عمل کیا ہوگا۔

مگر باقی سیاروں کا معاملہ مختلف تھا۔

اور جارج نے باری باری ان کا جائزہ لینا جاری رکھا۔ قابلِ سکونت بیلاٹرکس دوم، چٹانی چہارم، رابطوں کے لیے ممنوع ششم...... اور آخر میں پنجم۔ جیسا کہ اسے خبردار کیا گیا تھا اور وہ خود بھی توقع رکھتا تھا، عظیم گیس دیو کے قریب جانا نہایت ہی خطرناک تھا۔ وہاں اترنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

تمام سیاروں کے گرد چکر مکمل کرنے کے بعد جارج خلائی جہاز کو بیلاٹرکس کے مدار میں لے گیا اور صورتِ حال کا تجزیہ کرنے لگا۔

'ایک کمپیوٹر!' اس نے خود کو حوصلہ دینے کے لیے بلند آواز میں سوچا۔ 'بنیادی طور پر ایک عقلیت پسند ہوتا ہے۔' اس نے منطقی طور پر یہ نتیجہ نکالا کہ ایڈورڈ، بیلاٹرکس کے نظام میں ہی تھا اور پھر امکانات پر غور کرنے لگا۔

تین سیارے اتنے ناقابلِ رہائش تھے کہ کوئی ہوش مند انسان وہاں اترنے کا تصور بھی نہ کرتا۔ بیلاٹرکس دوم قابلِ سکونت تو تھا مگر کسی انسان کے لیے وہاں رہنا نہایت دشوار تھا۔ یوں صرف دو سیارے ہی باقی رہ جاتے تھے جہاں مجرم چھپ سکتا تھا۔

چنانچہ ایڈورڈ نے ایک خلائی جہاز چرایا، فرار ہوا اور کہیں کامیاب لینڈنگ کی۔ کیونکہ اگر حادثہ پیش آتا تو ایک خاص آلہ فوراً مدد کا سگنل نشر کر دیتا۔ چونکہ کوئی سگنل موصول نہیں ہوا، اس لیے یہ سمجھا گیا کہ وہ خیریت سے کہیں اتر گیا ہے۔ لہٰذا ایڈورڈ کسی آباد سیارے پر ہی ہے۔ یہی وہ منطق تھی جس کے تحت کمپیوٹر نے بیلاٹرکس ششم، سوم اور

[illegible]

[illegible] ایک سیارے پر ہنگامی لینڈنگ کی تھی۔ جارج کے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی [illegible] کی بجائے [illegible] میں لولواک کو ہر قسم کی معلومات [illegible] تھے۔ وہ یقیناً اس سے [illegible] کریں گے۔ [illegible] تلاش شروع کر چکا تھا۔

مزید غور و فکر کے بعد اس نے تلاش کا دائرہ اور بھی محدود کر لیا۔ اسے بیلاٹرکس چہارم کا جائزہ لینا تھا۔ ایک غیر آباد سخت چٹانی سیارہ، جہاں کوئی جاندار نہیں رہتا، سوائے کائی کے کوئی نباتات بھی ممکن نہیں۔ کامیابی کے امکانات کو ایک بار پھر تول کر جارج نے فیصلہ کیا کہ ایڈورڈ کی تلاش وہ بیلاٹرکس چہارم سے ہی شروع کرے گا۔

☆☆☆

جارج جانتا تھا کہ اس کے سامنے ایک طویل اور صبر آزما کام ہے۔ سادہ حساب بتاتا تھا کہ پورے سیارے کی سطح کا ماہر سے باریک معائنہ کرنے میں کم از کم ایک مہینا لگے گا۔ جارج نے صبر سے کام لینے کا فیصلہ کیا، مگر اسے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ قسمت اس کا ساتھ دے رہی تھی۔ وہی قسمت جس کا اکثر مذاق اڑایا جاتا ہے، حالانکہ تفتیش میں وہ کئی بار فیصلہ کن کردار ادا کرتی ہے۔ خلائی جہاز کو بیلاٹرکس چہارم کے گرد محض سترہ گھنٹے ہی گزرے تھے کہ جارج کے اندازوں اور نتائج کو مکمل تصدیق مل گئی۔ سینسرز نے چٹانوں پر ایک تباہ شدہ خلائی جہاز کی موجودگی ظاہر کی تھی۔

جارج کے کانوں میں دل کی دھڑکن گونجنے لگی جب اس نے جہاز کو لینڈنگ کے لیے نیچے اتارا۔ فضا کا فوری تجزیہ ہوا۔ وہ قابل

تنفس تھی۔ جارج ایک بنجر میدان میں باہر نکلا۔ تقریباً سو گز کے فاصلے پر ایک بالکل ویسا ہی ایک نشست والا خلائی جہاز پڑا تھا۔ لینڈنگ کے دوران اس کے پچھلے حصے کو نقصان پہنچا تھا۔ وہ الٹ گیا تھا اور اس کا اگلا حصہ سیاہ آتشی چٹان میں دھنس گیا تھا۔ خوش قسمتی سے یہ دروازے والی سمت اوپر کی طرف گرا تھا اور پائلٹ باہر نکلنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ دروازہ ایک طرف پڑا ہوا تھا۔

جارج آگے بڑھا۔ اس کی نظریں ڈھانچے کی تلاش میں تھیں مگر کچھ نہ ملا۔ ایڈورڈ غالباً جب اس کا کھانا ختم ہوا ہوگا تو وہاں سے کہیں چلا گیا تھا۔ اس نے تباہ شدہ جہاز کی تصویر لی اور کیبن کے اندر داخل ہوا اور حیرت سے پلکیں جھپکنے لگا۔ اندرونی کیبن تیس برس سے ویران پڑا ہوا محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ اس کے برعکس یوں لگتا تھا جیسے کوئی وہاں آج بھی رہ رہا ہے۔ مگر کیسے؟ اسی لمحے اسے جواب مل گیا۔ ہوشیار ایڈورڈ روانگی سے پہلے کارسٹر کا فوڈ سنتھیسائزر (وہ آلہ جو نان فوڈ کو فوڈ میں تبدیل کر سکتا ہے) گھسیٹ کر جہاز میں لے آیا تھا۔ ایک سنتھیسائزر کے ساتھ زندگی ممکن تھی۔ اس کے ساتھ کائی کا ایک ڈھیر رکھا تھا۔ ایڈورڈ خوراک تیار کرنے کے لیے انہیں سنتھیسائزر کے سالماتی کنورٹر میں ڈالتا تھا۔

اندر سنتھیسائزر اور بستر کے سوا کچھ نہ تھا۔ اسی دوران جارج کو ایک اور اندازے کی تصدیق بھی مل گئی۔ مدد کے سگنل والے آلے کی تاریں ساکٹ سے نوچی ہوئی فرش پر پڑی تھیں۔ جارج نے ہر چیز کی تصویریں لیں، کیبن سے باہر نکلا اور دم بخود رہ گیا۔ ایک دبلا پتلا، کمزوری سے جھکا ہوا بوڑھا، الجھی ہوئی سفید ڈاڑھی کے ساتھ بنجر میدان کو عبور کرتا ہوا خلائی جہاز کی طرف آ رہا تھا۔ وہ بلاشبہ چہل قدمی سے واپس لوٹ رہا تھا۔

ایڈورڈ...... اور کوئی نہیں۔ وہ ایڈورڈ ہی تھا۔ تیس برس کی تنہائی نے اسے کھوکھلا کر دیا تھا، مگر گہری جھریوں اور الجھی ڈاڑھی کے پیچھے وہی تیز نگاہوں والا مکار نوجوان چہرہ اب بھی پہچانا جا سکتا تھا۔ وہی جو پولیس کے پوسٹر پر چھپا تھا۔ اپنی آنکھوں پر یقین نہ کرتے ہوئے جارج زمین پر جھک گیا اور احتیاط سے بوڑھے کی طرف بڑھنے لگا۔

جب دونوں کے درمیان بمشکل بیس فٹ کا فاصلہ رہ گیا تو بوڑھے کی نظر جارج پر پڑی۔ وہ ایک دم رک گیا اور لڑکھڑایا، پھر اس نے ہاتھ اٹھایا اور ٹیڑھی استخوانی انگلیوں سے پہلے جارج کے خلائی جہاز کی طرف اشارہ کیا، پھر اس کی طرف۔ بے رنگ ہونٹ ہلے، گلے سے ایک بھدی سی آواز نکلی۔ بڑی کوشش کے بعد وہ صرف اتنا کہہ سکا۔ ”تم...... تم......!“

آخر وہ لڑکھڑایا اور منہ کے بل زمین پر گر پڑا۔ وہ صدمے کا شکار ہو گیا تھا۔ جارج پر چھایا ہوا جمود یکدم ٹوٹ گیا۔ وہ دوڑ کر اس کے پاس پہنچا اور گھٹنوں کے بل بیٹھ کر اس کی بوسیدہ قمیص کے نیچے ہاتھ ڈال کر ہڈیوں جیسے سینے کو چھوا، جہاں اس نے موت کی خاموشی کو محسوس کیا۔ وہ رنجیدہ ہو گیا۔ پھر جارج کی انگلیاں اس کی قمیص کے نیچے ایک تہ شدہ کاغذ سے ٹکرائیں۔ کانپتے ہاتھوں سے اس نے کاغذ نکالا۔ وہ ایک بوسیدہ، ماند پڑ چکا مگر قابلِ مطالعہ اشتہاری نوٹس تھا۔ ایک مفرور قیدی کی تلاش کا اعلان۔ جارج کی نظر مسکراتے نوجوان چہرے سے اٹھ کر بوڑھے کے مردہ چہرے پر جا ٹھہری۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ وہ ایڈورڈ ہی تھا۔

وہ بے جان بیلاٹرکس چہارم پر صرف ایک فوڈ سنتھیسائزر کے سہارے زندہ رہا تھا۔ تیس برس تک تنہا، بغیر کسی کتاب، بغیر کسی جاندار ساتھی کے۔ جارج کی ریڑھ کی ہڈی میں سرد لہر دوڑ گئی۔ جب ایڈورڈ کالونی سے فرار ہوا تو اس نے خود کو آزاد سمجھا ہوگا، مگر وہاں وہ کم از کم انسانوں کے درمیان تھا۔ ایسے لوگوں میں جو اس سے بات کرتے، اس کا خیال رکھتے تھے۔ تنہائی کی قید اتنی ظالمانہ تھی کہ وہ کب کی فوجداری قوانین سے نکال دی گئی تھی۔ ایڈورڈ نے خود کو ایک ایسی جیل میں قید کر لیا تھا جس کی کوئی دیوار نہ تھی۔ وہ تیس برس تک اکیلا، صرف اپنی ذات کے ساتھ وہاں قید رہا۔

اس کی نام نہاد آزادی درحقیقت ایسی سزا بن گئی تھی جو کسی عدالت کے بس کی بات نہ تھی...... اور کسی دوسرے انسان کو دیکھنے کا شاک ہی اس کی موت کا سبب بن گیا تھا۔

جارج نے کچھ سوچتے ہوئے وہ پھٹا ہوا اشتہار جیب میں رکھا اور قریب پڑا ہوا ایک پتھر ٹھوکر سے ہٹا دیا۔ بیلاٹرکس چہارم پر مٹی کی تہ نہیں تھی، چنانچہ اس نے بوڑھے کی لاش پر پتھروں کا ایک چھوٹا سا مینار بنانے کے لیے پتھر جمع کرنا شروع کر دیے۔ پھر اس نے تصویریں لیں۔

بعد میں جارج نے کرائم بیورو میں اپنے ساتھیوں کے لیے ایک مختصر پیغام بھیجا تاکہ وہ اسے نوٹ بک میں درج کر دیں۔

”ایڈورڈ...... مطلوب مجرم...... بیلاٹرکس چہارم پر مردہ پایا گیا ہے۔ وہ ایک نشست والے تباہ شدہ خلائی جہاز میں تقریباً تیس برس تک زندہ رہا۔ بقا کا انحصار ایک فوڈ سنتھیسائزر پر تھا۔ مدد کے سگنل کا آلہ دانستہ طور پر ناکارہ بنایا گیا تھا۔

موت کی وجہ...... شدید ذہنی شاک۔

کسی دوسرے انسان کو اچانک دیکھنے کا اثر۔

لاش کو وہیں دفن کر دیا گیا ہے۔

کوئی قانونی کارروائی مزید درکار نہیں۔

فائل بند کی جائے۔

فقط: جارج براؤر۔

⌘⌘⌘

دیس پردیس

ناہید سلطانہ اختر

آخری حصہ

دنیا ایک ایسی قیام گاہ جس میں بسے انسان اپنی اپنی خواہشوں کے اسیر ہیں... کوئی حالات کی سختی کا شکار... تو کوئی سب کچھ مل جانے پر شاداں و فرحاں... کچھ ایسے جنہیں زمانے سے جھڑکیاں اور لعن طعن ہی ملتی ہے... سونے پہ سہاگا غربت بھی ان کے ہم رکاب رہتی ہے... ایسے میں جب منزل کا تعین نہ ہو تو وہ آسمان میں بھٹکتے پنچھیوں کی طرح عازمِ سفر ہوجاتا ہے... بہتر مستقبل، آسودہ زندگی اور دولت کمانے کی چاہ اسے وطن سے دور نگر نگر گھومنے پر مجبور کردیتی ہے اور وہ پردیس میں قسمت آزمانے چل پڑتا ہے... وہ سمجھتا ہے کہ وہاں کی سڑکیں شیشے کی ہوتی ہیں اور نوٹ اس پر بکھرے پڑے رہتے ہیں جنہیں جتنا مرضی اٹھالو... مگر یہ اس کی خام خیالی ہوتی ہے... کیونکہ اپنا دیس اپنا ہی ہوتا ہے... وہاں صعوبتیں اٹھاتے اٹھاتے شدت سے وطن سے دوری اور اپنوں کے نہ ہونے کا احساس ہوتا ہے... اور یہی کلفتیں سہتے بالآخر زندگی کی شام ہوجاتی ہے... مگر مسافر اپنی منزل سے کوسوں دور ہی ہوتا ہے۔

دلوں میں امنگ، آنکھوں میں سہانے خواب
سجائے پردیس میں قسمت آزمانے والوں کی داستان

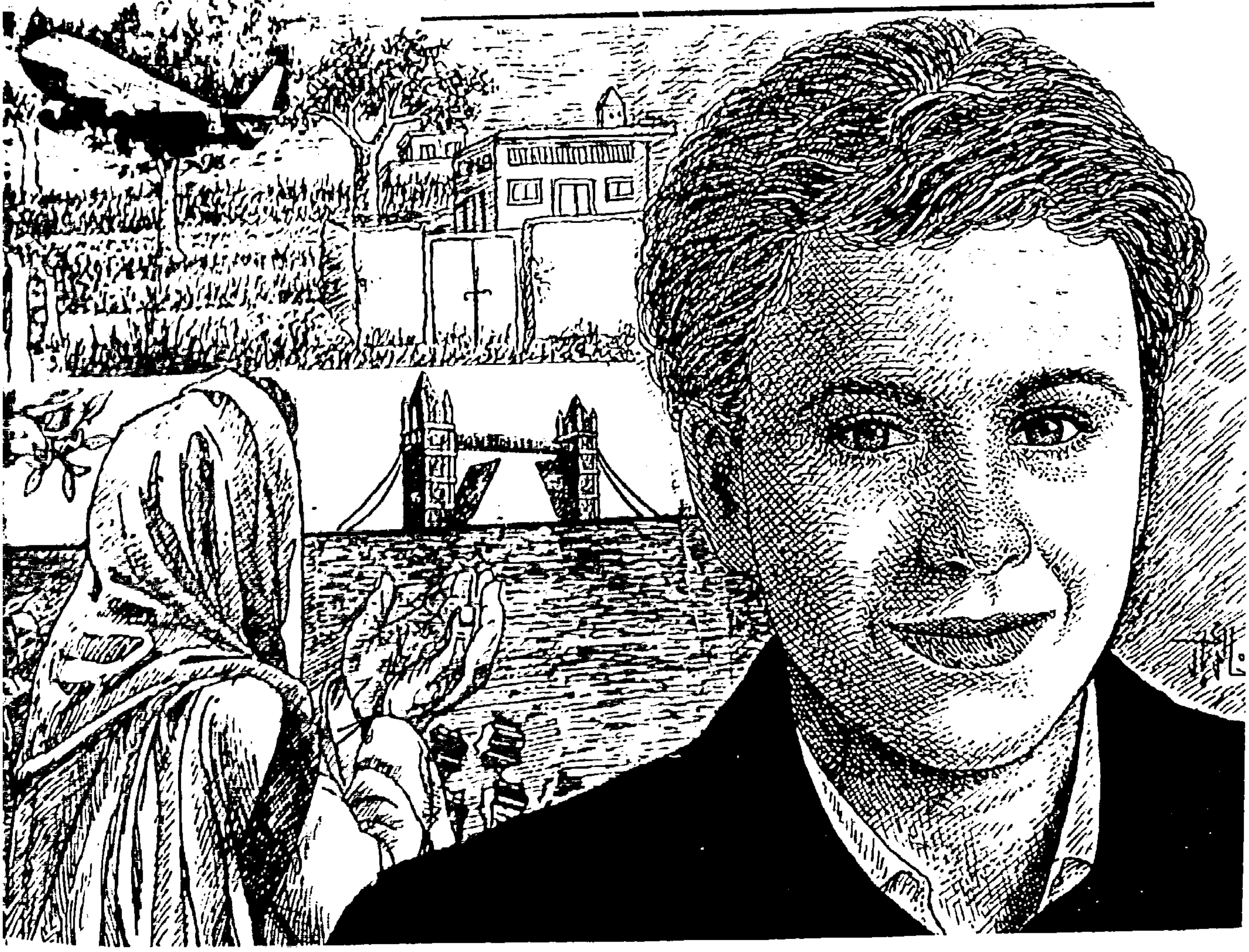

رابیل کا جانا رجب علی کے لیے [illegible]
اور [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
ان کو [illegible] ہو گئی۔

”مجھ [illegible] پر بھروسا کریں...... ان لوگوں کے جانے کا صدمہ میں نے آپ کے سہارے ہی برداشت کیا ہے۔“

رجب علی پر ہیجان طاری ہو گیا۔ ”میں نے تم سے جھوٹ کہا تھا ثمینہ کہ کسی کے جانے سے کوئی نہیں مرتا...... میں واقعی مر گیا ہوں، کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہا ہوں میں۔“

”ہم کہیں اور چلے جائیں گے۔“ ثمینہ بولی۔

”کہاں...... کتنے شہر اور بدلیں گے ہم؟“ رجب علی کے لہجے میں ٹوٹے ہوئے شیشے کی چبھن تھی۔

بار بار جگہ بدلنا آسان تھوڑی ہوتا ہے۔ رجب علی جگہیں بدلتے بدلتے بڑھاپے کی دہلیز پار کر چکا تھا۔ رابیل کے جانے کے بعد اس نے پورے خشوع و خضوع سے صرف ایک دہلیز پر سر جھکا دیا۔

ماں کو حج کی آرزو تھی مگر وہ ماں کو حج نہیں کرا سکا تھا۔ ثمینہ کے ساتھ اس نے حج پر جانے کی نیت کر لی۔

رابیل نے ان دونوں کے حج پر جانے سے پہلے فون پر رابطہ کیا مگر ثمینہ نے اس کی آواز سن کر ”سوری رانگ نمبر“ کہہ کر رابطہ منقطع کر دیا۔ وہ بار بار فون کرتی رہی اور ثمینہ کا اسے ہر بار ایک ہی جواب رہا۔ رجب علی جانتا تھا وہ ماں ہونے کے ناتے رابیل سے بات کر کے اپنا دل ٹھنڈا کرنا چاہتی تھی مگر محض اس کی خوشنودی کی خاطر وہ بیٹی کو بار بار دھتکار رہی تھی۔

☆☆☆

رجب علی اور ثمینہ کی حج پر روانگی سے چند دن قبل کرسمس آ گئی۔ کرسمس کی شام ایک بوڑھی عورت کلفٹن ول جانے کے لیے رجب علی کی ٹیکسی میں بیٹھی۔

”آج تو آپ کا بڑا دن ہے، خوش ہوں گی آپ۔“ رجب علی نے حسبِ عادت سواری سے گفتگو کا آغاز کر دیا۔

”جونی کے جانے کے بعد میرے لیے سارے دن ایک جیسے ہیں۔“ وہ تھکی تھکی سی آواز میں بولی۔

”جونی؟“ رجب علی کا لہجہ استفہامیہ تھا۔

”میرا بیٹا...... عراق، امریکا جنگ میں گیا تھا، جب واپس آیا تو سو رہا تھا...... تابوت میں...... کبھی نہ جاگنے کے لیے۔“

رجب علی [illegible] والی بوڑھی عورت سے [illegible]
”[illegible] انہوں نے جانے [illegible]
[illegible] ہو گئے تھے۔

”کتنے بچے ہیں تمہارے؟“

”وہ ایک ہی تھا...... ڈیوڈ سے میری شادی کے بعد اسے اور مجھے بچے کے لیے دس سال انتظار کرنا پڑا تھا۔ جونی پیدا ہوا تو ہماری دنیا ہی بدل گئی۔ تم سوچ سکتے ہو وہ مجھے اور ڈیوڈ کو کتنا پیارا ہوگا...... ڈیوڈ بھی فوج میں تھا۔ روس، افغان جنگ میں بھیجا گیا تھا...... وہ وہاں کام آ گیا...... باپ کے نقشِ قدم پر جونی بھی میری مخالفت کے باوجود فوج میں چلا گیا۔“ اس نے ایک سرد آہ کھینچی پھر پژمردہ لہجے میں بولی۔ ”جنگیں انسانوں سے کیا کچھ چھین لیتی ہیں...... کمزور عورت...... جس کا شوہر ایک جنگ میں مارا جائے...... بیٹا دوسری جنگ میں کام آ جائے...... اس عورت کی زندگی گہرا زخم بن جاتی ہے جو ہر لحظہ ٹیسیں دیتی ہے۔ ڈیوڈ سے جدائی کا صدمہ میں نے جونی کے سہارے جھیل لیا تھا۔ جونی کے بعد تو میرے پاس کچھ بھی نہیں رہا...... گھر کے سناٹے میں میرے کان فون کی گھنٹی پر لگے رہتے ہیں۔ میں سوچتی ہوں، گھنٹی بجے گی، میں فون اٹھاؤں گی اور جونی کی آواز سنائی دے گی...... ہیلو! خوبرو جوان بیٹے کی بوڑھی ماں...... وہ اکثر مجھ سے مذاق کیا کرتا تھا۔ کہتا، اتنی دیر کیوں کی تم نے اور ڈیڈ نے میری پیدائش میں...... پیار سے مجھے بوڑھی ماں کہا کرتا تھا۔ فون کی گھنٹی اب بھی بجتی ہے کبھی کبھی...... مگر جونی کی آواز نہیں سنائی دیتی۔ میں اکثر گھنٹی بجے بغیر ہی ریسیور کان سے لگا کر بیٹھ جاتی ہوں اور کہتی ہوں...... جونی! بوڑھی ماں کے خوبرو جوان بیٹے...... بولو نا...... تمہاری آواز مجھے کیوں نہیں سنائی دیتی۔ میں اپنے گھر کی کھڑکی سے خلا میں تکتی رہتی ہوں، اس امید پر کہ شاید...... شاید کبھی بوڑھی ماں کو اس کے خوبرو جوان بیٹے کی ایک جھلک دیکھنے کو مل جائے...... مگر نہیں ملتی۔“ بوڑھی عورت کی متورم پپوٹوں والی آنکھوں سے آنسو اس کے ڈھلکے ہوئے رخساروں پر برس رہے تھے۔

کرسمس کی شام رجب علی کا دل ایک انجانی بوڑھی عورت کو اس کے جواں مرگ بیٹے کی یاد میں آنسو بہاتے دیکھ کر دکھ رہا تھا۔

”دنیا میں جنگیں نہیں ہونی چاہئیں...... جنگیں نہیں ہونی چاہئیں۔“ بوڑھی عورت کی آواز اتھاہ غم میں ڈوبی ہوئی تھی۔

”آپ کلفٹن ول میں رہتی ہیں؟“

"ہاں ...... مگر میں وہاں کیوں جارہی ہوں؟" وہ بڑبڑائی۔

"سردی بہت ہے، آپ کو گھر میں ہی ہونا چاہیے۔"

"لیکن کیوں؟"

"کیونکہ گھر انسان کی سب سے بڑی پناہ گاہ ہوتا ہے۔"

"لیکن گھر میں کون بیٹھا ہے میرے لیے...... ایسا کرو، مجھے کہیں اور چھوڑ دو۔"

"کہاں؟" رجب علی چونکا۔

"جہاں مجھے جونی یاد نہ آئے۔"

"کوئی جگہ ایسی نہیں مادام! جانے والے ہر وقت یاد آتے ہیں۔" رجب علی نے سرد آہ کھینچی۔ وہ خود بھی تو اسی کرب، اسی درد سے دوچار تھا۔ زندگی میں اپنے بچوں کی کمی اسے ہر ہر قدم پر محسوس ہوتی تھی۔

"اچھا تو پھر مجھے میرے گھر ہی پہنچا دو...... میری بلی تو میرا انتظار کررہی ہوگی۔"

شام گہری ہورہی تھی، سردی بہت تھی، مغرب کے باسیوں کی اکثریت کا سب سے بڑا مذہبی تہوار اور ایک بوڑھی عورت اندر، باہر سے یکسر تنہا، مغموم، اپنے جواں مرگ بیٹے کی یاد میں ڈوبی، گھر واپس جانے سے گریزاں ہوتے ہوئے بھی اپنی بلی کی خاطر گھر جانے پر آمادہ ہوگئی تھی۔

گوروں کی زندگی کا یہ پہلو بھی خوب تھا۔ کتے، بلیوں کو اپنے قریبی انسانی رشتوں کی طرح عزیز رکھتے۔

کرسمس کی شام تھی اور رجب علی کے دلِ پژمردہ میں جانے والوں کی یاد کروٹ لے رہی تھی۔

☆☆☆

رجب علی نے پہلی مرتبہ حج ماں کے انتقال کے بعد اگلے برس کیا تھا، دوبارہ نشاط کے ساتھ جانے کی نیت تھی مگر جب تک اس کا اور نشاط کا ساتھ رہا، ہر دوسرے برس اس کی گود میں چھوٹا بچہ ہوتا۔

"یار! میں نے دوسری بار حج پر تمہیں ساتھ لے جانے کی نیت کی تھی۔" رجب علی کہتا۔

"میں تو اب بچوں کے بڑے ہونے کے بعد ہی جاسکوں گی۔"

"بہرحال، جب بھی سہی...... دوسرا حج مجھے ان شاء اللہ تمہارے ساتھ ہی کرنا ہے۔"

نشاط کے ساتھ حج کرنے کی خواہش پوری نہ ہوسکی تھی۔ ثمینہ کے ساتھ حج پر جاتے ہوئے رجب علی کا دل خدا کی حاکمیت اور بندے کی بے بسی کے احساس سے مغلوب رہا۔ دوسرا حج وہ نشاط کے ساتھ کرنا چاہتا تھا مگر خدا نے اپنے گھر میں اس کی دوسری حاضری ثمینہ کے ساتھ مقدر کررکھی تھی۔

ائیرپورٹ سے جدہ تک سفر کے دوران ثمینہ نے اس سے سرگوشی میں کہا۔ "میں نے سنا ہے حرم شریف پر پہلی نظر پڑنے پر مانگی جانے والی دعا ضرور قبول ہوتی ہے۔"

رجب علی نے اس کی بات کی تائید کی۔

حرم شریف میں حاضری کے وقت ثمینہ کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں تھا۔ کعبۃ اللہ پر پہلی نظر پڑتے ہی ثمینہ مبہوت ہوکر ٹھٹک گئی۔ اس کے لبوں پر دھیمی دھیمی لرزش تھی۔ رجب علی دونوں ہاتھ اٹھائے اپنے مرحومین کے درجات کی بلندی کی دعا کررہا تھا اور ثمینہ اپنے دل کی لگی کو چپکے چپکے خدائے بزرگ و برتر کی بارگاہ میں پیش کررہی تھی۔

☆☆☆

حج کی ادائیگی کے بعد انگلستان واپس لوٹے دوسرا ہفتہ تھا۔ رجب علی سعودی عرب سے واپسی کے بعد دوسرے دن ہی کام پر آگیا تھا۔ مصروفیت بھی اللہ کی عطا کردہ بڑی نعمت ہے۔

شام کا وقت تھا۔ رجب علی اپنی گاڑی میں بیٹھا ہوا درود شریف کا ورد کررہا تھا، نظریں سڑک کے پار بلند و بالا عمارت کی سیڑھیوں پر چہلیں کرتے نوجوانوں پر تھیں جنہیں نہ سرد موسم کی پروا تھی، نہ دیکھنے والوں کی فکر۔ نہایت بے نیازی سے وہ اپنے آپ میں مگن تھے۔ ان میں تین گورے تھے، دو کالے...... پانچوں نوجوان آپس میں کبھی آہستہ اور کبھی بلند آہنگی سے باتیں کرنے لگتے۔ کبھی ان میں سے کوئی اونچی آواز میں گانا گانے لگتا، کوئی ناچنے لگتا، کبھی قہقہے لگاتے لگاتے سیڑھیوں پر لوٹ پوٹ ہوجاتے، کبھی ایک دوسرے سے مکا بازی کرنے لگتے۔ انہیں چنداں ہوش نہ تھا کہ کون انہیں دیکھ رہا تھا اور کس قدر انہماک سے دیکھ رہا تھا۔

ان نوجوانوں کو دیکھتے ہوئے رجب علی کو اپنی نوجوانی کا دور یاد آنے لگا۔ ہزاروں میل کا فاصلہ، قطعاً مختلف معاشرت، نسل، رنگت، زبان سب مختلف مگر ان نوجوانوں کی چوکڑی، ہنسی مذاق اور لاابالی پن کا وہی انداز تھا جو اس کے اپنے عہد نوجوانی میں اس کا اور محلے کے دوسرے نوجوانوں کا بگن کی دکان کے سامنے سرکاری گٹر کے ڈھکنے پر اور اس کے اردگرد جمی چوکڑی میں ہوا کرتا تھا۔

کیا زمانہ تھا وہ۔ پیٹ خالی مگر زندگی نہایت بے پروا سی کھلکھلاتی ہوئی...... اب سب کچھ تھا مگر زندگی وابستہ رشتوں کی جدائی سے مغموم۔

رجب علی کچھ دیر پہلے ہی ایک سواری کو شیئرٹن ہوٹل چھوڑ کر آیا تھا اور اس نے گاڑی رینک پر قطار میں لگا دی تھی۔

اچانک اسے اپنی بصارت پر وہم کا گمان ہوا مگر نہیں وہ حقیقت تھی نجف سڑک پار کرکے چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ٹیکسی رینک کی طرف ہی آرہا تھا۔ رجب علی نے گاڑی کا شیشہ تیزی سے نیچے کیا اور بے اختیار اسے پکارا۔ ''نجف!''

وہ چونکا، ٹھٹکا اور پکارنے والی آواز کے تعاقب میں اس کی نظریں رجب علی کی ٹیکسی پر آرکیں۔ رجب علی گاڑی کا دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔

''کیسے ہو؟'' نجف کی درماندگی دیکھ کر رجب علی کے دل کی عجیب حالت تھی۔

''ٹھیک ہوں ڈیڈ!'' وہ نظریں چراتے ہوئے بولا۔

''ٹھیک تو نہیں لگتے۔'' رجب علی کا دل دُکھ رہا تھا۔

''بیمار تھا۔''

''بیمار تھے یا طیب نے اپنی طرح تمہیں بھی نشے کی لت لگا دی؟''

نجف کی جھکی نظروں نے رجب علی کو بہت کچھ بتا دیا۔

''طیبی تو شادی کے بعد بہت بدل گیا ہے۔''

''شادی تو اچھے اچھوں کا مزاج درست کر دیتی ہے۔ کہاں آئے تھے...... کہاں جا رہے ہو؟''

''یہاں کسی دوست سے ملنے آیا تھا، ولز برو جا رہا ہوں۔''

''ولز برو......! کس کام سے؟''

''وہیں رہتا ہوں۔''

''کیوں؟'' رجب علی چونکا۔ ''ایشفورڈ اپنے گھر میں کیوں نہیں؟''

''گھر بیچ دیا۔'' نجف سر جھکا کر شرمساری سے بولا۔

''کیا......!'' رجب علی پھر چونکا۔ ''گھر بیچ دیا؟''

گھر بیچ دینے کی خبر سے رجب علی کو افسوس ہوا تھا۔ بڑا گھر تھا جس میں چاروں بہن بھائی آرام سے رہ سکتے تھے۔

''طیب کو پیسوں کی ضرورت تھی۔''

''گھر کی ضرورت پیسوں کی ضرورت سے زیادہ ہوتی ہے...... ولز برو میں تم کس کے ساتھ رہ رہے ہو؟''

''اکیلا۔''

''کرائے پر؟''

نجف نے اثبات میں سر ہلایا۔

''پیروں کے نیچے کی زمین تو نہ کھوئی ہوتی بیٹا!'' رجب علی دلبرداشتہ تھا۔ ''میرے پاس دو گھر ہیں۔ ایک پہلے ثمینہ نے کام پر لگا لیا تھا، وہ اس نے [illegible] فروخت کر دیا۔ اب تم یہاں آ رہے ہو تو تمہارے لیے اگلے ہفتے میں ایک دکان بھی ہے۔ اس میں کوئی کام بھی کر سکتے ہو۔ اگر چاہو تو ابھی سے کام پر لگ جاؤ۔''

نجف چپ چاپ سنتا رہا۔ رجب علی کی گاڑی کا دروازہ کھول کر اگلی نشست پر بیٹھ گیا۔ رجب علی نے اسٹیئرنگ سنبھالی اور گاڑی آگے سے نکال کر گھر روانہ ہو گیا۔

''مجھے تو ایک روز اپنے کسی جاننے والے سے معلوم ہوا تھا کہ تم نے کسی گوری سے شادی کر لی ہے۔''

''جی۔'' اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

''تو پھر اکیلے کیوں رہتے ہو؟''

نجف چپ رہا۔

''تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔''

''وہ چلی گئی۔''

''کیوں؟''

''یہاں ایک دوسرے کو چھوڑنے کے لیے کسی خاص وجہ کی ضرورت تو نہیں ہوتی۔''

''کوئی بچہ؟''

''ایک بیٹی ہے جو ورتھمہار کے پاس رہتی ہے۔''

رجب علی کا دل نجف کے لیے اور اس بچی کے لیے بھی دکھنے لگا جس کی ماں اسے چھوڑ گئی تھی۔ تاریخ اپنے آپ کو اس طرح بھی دہراتی ہے...... نشاط کے جانے کے بعد اس کے چاروں بچے کئی سال آپا کے پاس رہے تھے اور اب نجف کی بیٹی ورتھمہار کے پاس تھی۔

نجف کی تکلیف، اس کا درد رجب علی کے سینے میں اترتا چلا گیا۔

''اسے اپنے ساتھ رکھو...... یہ جو بچپن میں ماں باپ کے پیار سے محرومی کا احساس ہوتا ہے، یہ ساری زندگی ساتھ چلتا ہے۔''

''آپ ٹھیک کہتے ہیں۔''

دردآشنائی باپ بیٹے کو ایک ہی زنجیر میں باندھ رہی تھی۔

نجف کو ہمراہ لیے رجب علی گھر پہنچا تو نجف کو دیکھتے ہی ثمینہ کا منہ بن گیا۔ وہ لاؤنج سے اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ نجف سے اس نے بات کرنا بھی گوارا نہ کیا تھا۔ نجف شرمندہ ہو گیا۔

''تم اس کی فکر نہ کرو...... بےوقوف عورت...... نہیں جانتی کہ دوسروں کے لیے کانٹے کھڑے کرنے والوں کو پھول نہیں ملتے۔ کھانا کھاتے ہیں پھر میں تمہیں ساتھ والا

گھر دکھاتا ہوں۔"

رجب علی نے نجف کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا پھر اسے ثمینہ کاٹیج سے متصل خالی گھر دکھانے لے گیا۔ نجف کو گھر کی جائے وقوع بہت اچھی لگی۔ خالی مکان کے دریچوں سے تاحدِ نظر پھیلے سمندر کو دیکھتے ہوئے اس کے چہرے کی کیفیت ہی بدل گئی۔ اس کی آنکھوں میں پہلی اداسی کی جگہ سرشاری تھی۔

"بہت خوبصورت۔" اس نے کہا۔

"بیڈ موجود ہے یہاں۔ چلو میں تمہیں گھر سے کچھ ضروری سامان دے دوں۔ اب کہیں جانے کی ضرورت نہیں۔"

"کرائے کا گھر چھوڑنے اور اپنا سامان لانے کے لیے تو مجھے جانا پڑے گا۔"

نجف کے ساتھ وہ دوبارہ گھر میں داخل ہوا تو ثمینہ کہیں جانے کو تیار کھڑی تھی۔

"کہاں بھئی؟" رجب نے اس سے پوچھا۔

"جہاں میری مرضی۔" ثمینہ نے شانے اُچکائے۔ "آپ کو مطلب۔" ثمینہ چلی گئی۔

نجف کچھ شرمندہ نظر آیا۔

رجب علی نے اسے گدا، چادر، تکیہ، کمبل اور کچھ ضروری سامان دیا پھر اس سے بولا۔ "ایک فالتو مائکرو ویو اوون تو ہے، چلو فریج اور کھانے پینے کا کچھ سامان لے آتے ہیں۔"

"جلدی نہیں ڈیڈی! فریج بعد میں لے لیں گے۔ میں تھوڑی دیر کے لیے باہر جانا چاہتا ہوں۔"

"جیسی تمہاری مرضی۔"

نجف کے ہزار تردد کے باوجود رجب علی نے زبردستی اس کی جیب میں کچھ رقم ڈال دی۔ اتنے عرصے بعد اپنے بیٹے سے مل کر اور اسے اپنے گھر لا کر رجب علی غیر معمولی مسرور تھا۔

نجف کے جانے کے کچھ دیر بعد ثمینہ واپس آگئی۔ موڈ بگڑا ہوا تھا۔ رجب علی اس سے بات کرنا چاہتا تھا مگر وہ پاؤں پٹختی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی اور دروازہ اتنی زور سے بند کیا کہ کاٹیج کے بام و در لرز اٹھے۔

کچھ لوگ حوادث سے بھی نہیں سیکھتے۔

نجف رات پڑنے پر لوٹا۔ رجب علی اس کے لیے خود کھانا پکانے کے بعد اس کا انتظار کر رہا تھا۔ نجف کے ساتھ ثمینہ کی کسی بدمزگی کے خدشے سے رجب علی، نجف کو گھر لے کر آنے کے بعد دوبارہ کام پر نہیں گیا تھا۔

نجف آیا تو رجب اپنا اور اس کا کھانا دوسرے گھر میں لے گیا۔ دونوں نے اکٹھے بیٹھ کر کھانا کھایا۔ کھانے کے دوران اور بعد میں بھی بہت دیر تک رجب علی اس سے باتیں کرتا رہا۔

نجف نے اسے بتایا کہ نگار اور طیب دونوں کی شادی ہو چکی تھی۔ نگار نے ایک غیر مذہب ہم جماعت سے شادی کی تھی مگر خوش نہ تھی۔ شوہر نکما اور آرام پسند تھا۔ نگار جاب کرتی تھی اور بیشتر اخراجات کی ذمے داری اسی پر تھی۔ ان کا ایک بیٹا تھا۔

طیب کی شادی کئی سال ایک انگریز لڑکی سے تعلق میں رہنے اور اس تعلق کے ٹوٹنے پر نشاط کی پاکستان میں ایک رشتے دار لڑکی ثروت سے ہوئی تھی۔ دونوں کے پانچ بچے تھے۔ ثروت بقول نجف، اتنی اچھی تھی کہ اس نے طیب جیسے بے پروا اور لاابالی شخص کو بھی ایک اچھا شوہر اور ذمے دار باپ بنا دیا تھا۔ طیب کو اپنے بچوں سے بے پناہ پیار تھا۔ نجف کا کہنا تھا ماں باپ کا جو پیار طیب کو نہیں مل سکا، وہ اپنے بچوں کو دینے کی کوشش کر رہا تھا۔

دُرِشہوار کی شادی نہیں ہوئی تھی۔

"اس کی شادی ہو جانی چاہیے۔" رجب علی نے کہا۔

"وہ شادی کرنا ہی نہیں چاہتی۔"

"کیوں؟"

"وہ کہتی ہے، شادی اگلی نسل کو دکھ کے سوا کچھ نہیں دیتی۔"

رجب علی نے ٹھنڈی سانس بھری پھر دھیمی آواز میں بولا۔ "تم بہن بھائی اسے سمجھاؤ کہ وہ اپنے ماں باپ کی ناکام ازدواجی زندگی کی طرف نہ دیکھے۔ شادیاں کامیاب زیادہ ہوتی ہیں، ناکام کم۔ کامیاب شادیاں اگلی نسل کو بہت کچھ دے جاتی ہیں۔"

"وہ میری طرف بھی دیکھتی ہے۔ میری شادی بھی تو ناکام ہی رہی۔" نجف کے لہجے میں دلگرفتگی تھی۔ "میری بیٹی سے اسے بہت پیار ہے...... کہتی ہے، بس اسی کے ساتھ جیوں گی۔"

"برا مت ماننا...... آدمی خواہش کے باوجود اپنی اولاد کے ساتھ نہیں جی سکتا تو تمہاری بیٹی تو اس کی بھتیجی ہے۔"

"اور وہ بھی ایک گوری کی اولاد۔" نجف کے لہجے میں تلخی تھی۔

"اسی لیے سیانے کہتے ہیں اپنے جیسوں سے رشتہ جوڑو۔ دُرِشہوار کو سمجھاؤ کہ صرف تمہاری طرف نہیں، طیب اور اس کی بیوی کی طرف بھی دیکھے۔ بقول تمہارے، دونوں کی اچھی نبھ رہی ہے کہ نہیں۔"

"[illegible] ہو چکی [illegible] [illegible]
[illegible] [illegible]"
"ماشاءاللہ"

"[illegible] [illegible]"

"[illegible] [illegible] کہانی [illegible]"

رجب علی [illegible] کہا۔ "[illegible] شادی کے لیے مجبور کرو... [illegible] زندگی نہیں گزار [illegible]... وہ تو پھر عورت کی [illegible]... ہم اس وقت [illegible] ان کے پاس [illegible] جوانی تو گزر رہی ہے، بڑھاپا ایسے نہیں گزرنا...... اور ہاں، تم بھی اپنی شادی کی ناکامی کو زندگی کی کتاب کا آخری باب مت سمجھ لینا...... زندگی میں یہی سب ہوتا ہے بیٹا...... ہمارے فیصلوں کے نتائج اکثر ہماری امیدوں کے خلاف نکلتے ہیں...... میں نے کب چاہا تھا کہ......" وہ بولتے بولتے رک گیا۔

"میں سن رہا ہوں ڈیڈی!"

رجب علی کو اپنی ادھوری بات نہ چاہتے ہوئے بھی پوری کرنا پڑی۔ "میں نے کب چاہا تھا کہ تمہاری ماں سے میری علیحدگی ہو اور تم سب بکھر جاؤ...... میں اور تمہاری ماں بھی مل جل کر تم چاروں بہن بھائیوں کے سنہری مستقبل کے خواب دیکھا کرتے تھے۔ ایک بڑے سے گھر میں بڑی سی ڈائننگ ٹیبل پر اپنے بچوں، دامادوں اور بہوؤں کے ساتھ کھانا کھانے اور ہر ایک کو اظہارِ رائے کی پوری آزادی دینے کا خواب...... سارے خواب ٹوٹ گئے...... انسان کو اس کے ہر خواب کی تعبیر کب ملتی ہے بھلا۔" رجب علی کی آواز بھرا گئی۔

"آئی فیل، سوری فار یو ڈیڈی اینڈ......" نجف ہچکچایا اور ایک لمحے کے توقف سے بولا۔ "فار مام ایز ویل...... آپ سے الگ ہو کر وہ بھی تو خوش نہیں رہ سکیں۔"

رجب علی نے چونک کر نجف کی طرف دیکھا۔ "تم سے کس نے کہا؟"

"کسی نے بھی نہیں...... میں خود سمجھ سکتا ہوں...... آپ کی اور مام کی زندگی سے اور خود اپنی اور کیتھرین کی زندگی سے بھی۔ کیتھرین اب کسی اور کے ساتھ ہے مگر بیٹی کا حال چال پوچھنے کے لیے کبھی مجھے اور کبھی کرٹ شہوار کو بھی فون کرتی ہے۔ وہ ہمیشہ یہی کہتی ہے، میں تمہارے اور کرسٹی کے بنا خوش نہیں ہوں۔"

"تمہاری بیٹی کا نام کرسٹی ہے؟"

"کرسٹینا ہے اس کا نام مگر سب پیار سے کرسٹی کہتے

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]"

"تم [illegible] [illegible]" رجب علی [illegible] کہا۔ "[illegible] ساس بیٹھا"

"انکار بھی آپ کی اور مام کی زندگی [illegible] ان کے [illegible] اور آرام پسند شخص [illegible] گزارہ [illegible] ماشاءاللہ وہ شخص [illegible] طرح بھی انکار کے لائق نہیں۔ [illegible] اس سے کہیں اچھا ساتھی مل سکتا تھا۔ [illegible] اور [illegible] خوش ہیں، نارمل زندگی گزار رہے ہیں۔"

"تمہاری ماں نے طیب کی شادی [illegible] کر کے عقلمندی کی۔"

"جی۔" نجف نے تائید کی۔

"اپنے بارے میں آئندہ کوئی فیصلہ کرو تو بہت سوچ سمجھ کر کرنا۔"

رجب علی رات گئے نجف کو شب بخیر کہہ کر خود بھی سونے کے لیے چلا گیا۔ اگلی صبح نماز اور تلاوت کے بعد وہ دن چڑھے اپنا اور نجف کا ناشتا بنا کر ناشتے کی ٹرے لیے ساتھ والے گھر گیا تو گھر کا داخلی دروازہ اندر سے بند نہ تھا۔ وہ اس کمرے میں جہاں نجف کے لیے سونے کا بندوبست کیا گیا تھا، گیا تو بیڈ سائڈ ٹیبل پر ایش ٹرے میں سگریٹ کے ٹوٹے بجھے پڑے تھے اور ایش ٹرے کے نیچے ایک کاغذ دبا ہوا تھا۔ رجب علی نے کاغذ اٹھا کر دیکھا، اس پر مختصر سی عبارت تھی۔

"ڈیڈی! میں آپ کی زندگی کو درہم برہم نہیں کرنا چاہتا۔ ولز برو جا رہا ہوں، آپ کی محبت کا شکریہ ادا کرنا میرے لیے ممکن نہیں۔ خود باپ بننے کے بعد مجھے پتا چلا کہ آپ نے ہمارے لیے کیا، کیا ہے۔ طیب کو بھی اس کا اعتراف ہے...... اور ہاں، آخری بات...... مام ہم چاروں سے کہتی ہیں...... تمہارے ڈیڈی بہترین شوہر اور بہترین باپ تھے۔"

کاغذ پر درج عبارت رجب علی کی آنکھوں میں امڈ آنے والے سیلِ رواں سے دھندلا گئی۔

☆☆☆

نجف کے یوں چلے جانے سے رجب علی کو بہت دکھ

ہوا۔ وہ تا دیر رنجیدہ رہا، اپنا دل مسوس کر رہ گیا۔ ابھی تو اسے نجف سے بہت سی باتیں کرنا تھیں...... نگار کی، طیب کی، ان کے بچوں اور خود نجف کی بیٹی کی، دُرِشہوار کی اور شاید...... شاید ذرا ذرا نشاط کی بھی۔ اس کی زندگی سے باری باری نکل کر بھی وہ سب گزرے برسوں میں ہمیشہ اس کے دل کے مکیں رہے تھے۔ اس نے انہیں ہر غمی، خوشی، بیماری، آزاری، دھوپ، چھاؤں میں یاد کیا تھا...... تہواروں پر ان کی کمی محسوس کی تھی...... اب وہ اور بات تھی کہ ان کی یاد کی کسی اور کو بھنک نہ ملنے دینے کے لیے اس نے فصیلِ دل پر ضبط کے پہرے لگا رکھے تھے اور زبان پر قفل ڈال رکھا تھا۔

نجف چلا گیا تھا۔

رجب علی پیاسا ہی رہ گیا تھا۔

اگر ثمینہ نے نجف سے اتنی بے رخی نہ برتی ہوتی تو شاید وہ رک گیا ہوتا۔

☆☆☆

موسم خوشگوار ہو چلا تھا۔ رجب علی اس روز ایک معمر انگریز جوڑے کو جو امریکا میں مقیم اپنی بیٹی، داماد اور ان کے بچوں سے ملنے جا رہے تھے، ہیتھرو ہوائی مستقر پہنچانے کے بعد ائرپورٹ ہی سے ملنے والی ایک سواری کو واپس گیٹ پہنچانے کے بعد ٹیکسی رینک پر ساتھی ڈرائیوروں سے گپ شپ کرنے کھڑا ہو گیا تھا۔ لمبے فاصلے کی دو سواریوں نے کرایہ اور بخشش سے اس کی جیب بھاری اور موڈ خوشگوار کر دیا تھا۔ رجب علی کی پیٹھ سڑک کے رخ پر تھی اور روئے سخن اپنے سامنے کھڑے ساتھی ڈرائیوروں کی طرف۔ موضوعِ سخن برطانیہ کے آنے والے انتخابات تھے۔

"رجب انکل! راجا کو ٹکٹ مل گیا ہے۔" نوجوان پاکستانی ڈرائیور شاہد نے بتایا۔

"اچھا!"

"اپنے پاکستانی بھائی یہاں کی سیاست میں یونہی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے رہے تو ان شاء اللہ ایک دن برطانیہ کا وزیراعظم ایک پاکستانی ہوگا۔" معراج الدین نے پُرجوش لہجے میں کہا۔

"ان شاء اللہ!" رجب علی سمیت مسلمان ڈرائیوروں نے تائید کی۔

"اپن لوگ بھی ہے ادھر...... پارلیمنٹ میں ہے نا ہمارا لوگ...... پرائم منسٹر ہمارا بھی ہونے سکتا۔" مہاراشٹری انیل دلپت کو بھی جوش چڑھا۔

"جس میں صلاحیت ہوگی، وہی آگے آجائے گا۔" رجب علی نے حسبِ عادت مفاہمانہ طرزِ عمل اختیار کیا۔

"لانگ لِو ایشین کمیونٹی۔" بنگلا دیشی انوار الرحمٰن نے ہاتھ اونچا کر کے نعرہ لگایا۔

"آہستہ۔" رجب علی نے اسے ٹوکا۔

"کیوں؟"

"گوروں کے دل ہم تارکینِ وطن کے لیے اب پہلے جیسے کشادہ نہیں رہے۔ وہ ہمیں ایسے دیکھتے ہیں جیسے غاصبوں کو دیکھا جاتا ہے۔ ان کا خیال ہے ہم نے ان کی تجارت، معیشت بلکہ کسی حد تک ثقافت پر بھی قبضہ کر لیا ہے۔ ان کے لوگ ہمارے کھانے شوق سے کھانے لگے ہیں، ان کی عورتیں ہماری خواتین کے فیشن اپنانے لگی ہیں حالانکہ ہم تو اپنی محنت اور صلاحیت سے اس ملک کی معیشت میں اپنی پہچان بنے ہیں اور اسے استحکام دے رہے ہیں۔ سچی بات یہ ہے کہ میں اس ملک کے لیے بھی ویسی ہی پُرخلوص سوچ رکھتا ہوں جیسی اپنے وطن کے لیے کیونکہ اس دیس نے مجھے بہت کچھ دیا ہے...... خوشحالی، امن اور اطمینان...... جہاں بھی گیا ہوں، برٹش سٹیزن ہونے کے ناتے عزت ملی ہے۔ میں یہاں کا نمک خوار ہوں اس لیے اس دیس کا وفادار بھی ہوں۔"

"رجب علی انکل زندہ باد!" معراج الدین چہکا۔

"انکل جی! ٹکٹ تو آپ کو ملنا چاہیے...... پورے لیڈر ہیں لیڈر...... ایمان سے دل کو لگنے والی باتیں کرتے ہیں آپ۔" شاہد بولا۔

"دل ہے تیرے پاس؟" رجب علی نے مسکراتے ہوئے شاہد سے کہا۔

"دل کدھر میں ہوئیں گا اس کے پاس میں انکل...... دل تو اس کا وہ پھنڈی ناک والا کورین لے لیا ہے جو اس سے وویم رامش گیٹ تک فری رائیڈ لیتی ہے۔" انیل دلپت نے شاہد کو چھیڑا۔

"اور تیرے پاس تو وہ چتکبری ازابیل دعا کرانے آتی ہے؟" شاہد نے انیل پر وار کیا۔

"بری بات۔ پرسنل لائف کو پرسنل ہی رہنے دو۔" رجب علی نے دونوں کو ٹوکا۔

"ایکسکیوزمی! رجب علی کے بارے میں کوئی بتا سکتا ہے، کہاں ملیں گے؟" رجب علی کے پیچھے سے آواز آئی۔

سب چونک کر آواز کی سمت دیکھنے لگے۔ رجب علی کا مڑ کر دیکھنا یقینی تھا کیونکہ وہ آواز، وہ لہجہ تو اس کے دل میں بسا تھا۔ بینا نہ ہوتے ہوئے بھی وہ اس آواز سے آواز والے کو پہچان سکتا تھا...... دل کا معاملہ تھا۔

خواب تھا کہ حقیقت...... چند لمحوں کو تو رجب علی ساکت و صامت رہ گیا۔ سلور گرے کار کا دروازہ کھول کر کار نشین باہر نکلا اور سڑک کنارے رکی کار سے رجب علی کی طرف بڑھا۔

''السلام علیکم ڈیڈ!'' اس نے رجب علی کو اپنے بازوؤں کے حصار میں لیتے ہوئے آس پاس کھڑے رجب علی کے ساتھیوں کو وش کیا جن پر اس نو وارد کی نسبت کھل چکی تھی۔

''وعلیکم السلام!'' رجب علی کی نظریں ٹیکسی رینک کے پہلو میں کھڑی کار میں بیٹھی جوان عورت اور کار کی کھڑکیوں سے نہایت اشتیاق اور تجسس سے باہر جھانکتے بچوں پر تھیں۔

''سوری ڈیڈ! مجھے نجف نے آپ کے گھر کی لوکیشن تو سمجھا دی تھی مگر میں وہاں نہیں گیا۔ اس نے بتایا تھا آپ سے میں یہاں بھی مل سکتا ہوں۔''

''یہ سارے کون ہیں؟'' رجب علی نے گاڑی میں بیٹھی عورت اور بچوں کی طرف انگلی اٹھائی۔ اپنے تجاہلِ عارفانہ سے رجب علی آپ ہی محظوظ ہو رہا تھا۔

''آپ کی بہو، پوتے اور پوتی۔''

''آں ہاں!'' رجب علی نہایت اشتیاق اور سرخوشی سے گاڑی کی طرف بڑھتے ہوئے اچانک ٹھٹکا اور اس نے پلٹ کر اپنے ساتھیوں کو بتایا۔ ''میرا بڑا بیٹا طیب اور اس کی فیملی۔''

''گریٹ!'' معراج الدین نے اپنے ہاتھ کا انگوٹھا عموداً کھڑا کرتے ہوئے کہا۔

رجب علی کو گاڑی کی طرف آتے دیکھ کر طیب کی بیوی اور بچے کار سے باہر نکل آئے۔

''السلام علیکم بابا!'' ثروت نے رجب علی کے سامنے اپنا سر جھکاتے ہوئے سلام کیا۔ رجب علی نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ پھر طیب کے بچوں کی طرف متوجہ ہوا۔ طیب نے نام بنام ان کا تعارف کرایا۔ ''نجیب، نقیب، ذہیب، اریب اور عطرت۔''

''غریب اور نحیف کہاں ہیں؟'' رجب علی کی حسِ مزاح پھڑکی۔

طیب اور ثروت حیرانی سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

رجب علی ہنسا۔ ''مذاق کر رہا ہوں...... بچوں کے نام رکھتے ہوئے معنی ضرور دیکھنے چاہئیں۔''

''جی ڈیڈ!'' طیب نے سعادت مندانہ انداز میں سر ہلایا۔

''بابا! آپ سے ملنے کی بہت آرزو تھی۔'' طیب کی بیوی بولی۔

''کیوں...... یہاں کی آرزو؟''

''اتنا ذکر جو سنا تھا۔''

''ذکر تو شیطان کا بھی بہت ہوتا ہے۔''

''استغفراللہ!'' ثروت محجوب ہوئی۔

''کیا یہیں کھڑے رہو گے...... چلو، گھر چلو۔ میں گاڑی نکالتا ہوں، تم میرے پیچھے گاڑی لاؤ۔'' رجب علی نے طیب سے کہا۔

''بس ڈیڈ!'' طیب ہچکچایا۔ ''آپ سے ملنا تھا۔ آپ کی بہو اور بچوں کو آپ سے ملنے کا بہت شوق تھا...... مل لیے۔''

''کیا مطلب؟''

''آپ ہمیں گھر لے جائیں گے تو ہو سکتا ہے وہ برا منائیں۔'' طیب بولا۔

''گھر میرا ہے۔''

''مگر وہ مائنڈ کر سکتی ہیں۔''

''مجھے پروا نہیں...... چلو بچو! بیٹھو گاڑی میں، جو میرے ساتھ آنا چاہتا ہے، میرے ساتھ آجائے۔''

رجب علی کے ساتھ اس کی گاڑی میں جانے کو ثروت اور پانچوں بچوں نے خواہش ظاہر کی۔

طیب ہنسا۔ ''ڈیڈ! آپ کی خاطر سب نے مجھے چھوڑ دیا۔''

''یار! کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ جسے آپ نہیں چھوڑنا چاہتے، وہ آپ کو چھوڑ دیتا ہے۔''

ثروت نے طیب کو معنی خیزی سے دیکھا۔ طیب کی نظریں جھک گئیں۔

''ہم ٹیسکو ہوتے ہوئے جائیں گے۔'' رجب علی نے طیب سے کہا۔

''اوکے ڈیڈ!''

رجب علی نے اپنی گاڑی ٹیکسی رینک سے نکالی، ثروت اور بچے رجب علی کی گاڑی میں بیٹھ گئے۔

''لے بھئی، تو اکیلا رہ گیا۔'' رجب علی نے طیب کو چھیڑا۔

''ڈیڈ! ہم بھی تو آپ کو اکیلا چھوڑ گئے تھے۔'' طیب شرمندگی سے بولا۔

''جو ہو گیا، سو ہو گیا'' رجب علی نے طیب کے شانے پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''آگے دیکھو۔''

''یو آر گریٹ!''

''گریٹ اس رب کی ذات ہے، ہم بندے تو بونے ہیں۔ اپنی کمزوریوں، محرومیوں، ضرورتوں، خواہشوں اور ان خوابوں کے اسیر جو کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہوتے۔''

ٹیسکو جاتے ہوئے ثروت نے جو رجب علی کی گاڑی

میں اگلی نشست پر اس کے ساتھ بیٹھی تھی، کہا۔ ''نجف آپ سے مل کر جانے کے بعد ہمارے ہاں آیا تھا...... بہت رویا۔''

''ثمینہ کے رویّے پر؟'' رجب علی چونک کر بولا۔

''نہیں بابا!''

''تو پھر؟''

''دُرِّشہوار اور اپنی بیٹی کو بھی اپنے ساتھ لایا تھا۔ آپ کے لیے روتا تھا۔''

''میرے لیے؟''

''جی...... کہتا تھا، ڈیڈی انسان نہیں، فرشتہ ہیں۔ بزنس، گھر سب انہوں نے دیا تھا ہمیں۔ ہم نے بزنس بھی کوڑیوں کے مول فروخت کر دیا، گھر بھی بیچ دیا۔ انہوں نے کچھ نہیں کہا، کوئی احسان نہیں جتایا۔ گھر بیچنے کا بتایا تو انہوں نے صرف اتنا کہا...... پیروں کے نیچے کی زمین تو نہ کھوئی ہوتی۔ اتنا ظرف انسان کو فرشتہ بنا دیتا ہے۔ ہم نے ڈیڈی جیسے جینوئن انسان کو کھو دیا۔ وہ ہیرا تھے۔''

رجب علی خاموشی سے ثروت کی بات سنتا رہا۔ وہ خاموش ہوئی تو اس نے متانت سے کہا۔ ''ماں باپ کو اپنے بچوں کی غلطیاں درگزر کر دینے کا حوصلہ رکھنا چاہیے۔''

ٹیسکو سے رجب علی نے کھانے پینے اور بچوں کی پسند سے ان کی پسندیدہ چیزیں خریدیں۔ وہ بہت خوش تھا۔ ثروت کے تردّد کے باوجود اس نے ثروت کو بھی کافی چیزیں خرید کر دیں۔

گھر پہنچے تو ثمینہ، رجب علی کے ساتھ آنے والوں کو دیکھ کر پہلے چونکی پھر قدرے سرد مہری سے ان سے ملی اور فوراً ہی طیب پر طعنہ زن ہوئی۔ ''اتنے سال بعد آج باپ کی یاد کیسے آ گئی؟''

''ثمینہ! پلیز، پرانی کوئی بات نہیں۔'' رجب علی نے بروقت ٹوکنا ضروری سمجھا۔

ثمینہ کو برا لگا مگر رجب علی کا موڈ دیکھ کر وہ نہ چاہتے ہوئے بھی طیب اور اس کے بال بچوں کی خاطر تواضع کو اٹھ گئی۔ ثروت اس کا ہاتھ بٹانے کو اس کے ساتھ جا کھڑی ہوئی۔

شام تک طیب اور اس کے بال بچے رجب علی اور ثمینہ کے ساتھ رہے۔ بچوں کے اٹھنے بیٹھنے اور بات چیت سے عیاں تھا کہ ثروت ایک اچھی اور سمجھ دار ماں کا کردار بخوبی ادا کر رہی تھی۔ ثمینہ کے رویّے سے صاف ظاہر تھا کہ اسے ان لوگوں کا آنا اچھا نہ لگا تھا مگر نجف سے اس کی بے رخی کے بعد رجب علی نے طیب اور اس کے بال بچوں کے بارے میں ثمینہ کی طعنہ زنی پر اسے بروقت ٹوک کر محتاط کر دیا تھا۔

جاتے وقت طیب نے کہا۔ ''ڈیڈ! خود باپ بننے کے بعد مجھے احساس ہوا ہے کہ آپ نے ہم چاروں بہن بھائیوں کے لیے کتنی محنت، مشقت کی ہوگی۔ بچے پالنا اور ان کی ہر ضرورت پوری کرنا بہت بڑا اور مشکل کام ہے۔''

''اللہ تمہیں ہمت دے، آسانی عطا فرمائے۔'' رجب علی نے طیب کا شانہ تھپتھپایا۔

''بابا! مجھے بھی کوئی نصیحت کریں۔'' ثروت بولی۔

رجب علی دھیرے سے مسکرایا۔ اس کی مسکراہٹ میں دکھ تھا، درد تھا، دلسوزی تھی۔ ''اپنے گھر، شوہر اور بچوں کے لیے جو کر سکتی ہو، کر جانا مگر میری غلطی نہ دہرانا۔'' ثروت اور طیب دونوں ہی چونک کر اسے دیکھنے لگے۔ ''اپنے پیاروں کی قسمت خود لکھنے کی کوشش مت کرنا، قسمت لکھنے والا اوپر بیٹھا ہے۔ ہم صرف کوشش کر سکتے ہیں...... میری غلطی شاید یہی تھی کہ میں نے اپنے بچوں کی قسمت خود لکھنے کی کوشش کی۔''

طیب اور ثروت دونوں ہی رجب علی کی بات کی گہرائی کو نہ سمجھ سکے۔ تجربات، حالات، وقت اور پردیس میں بھانت بھانت کے لوگوں سے میل جول نے رجب علی جیسے ان پڑھ آدمی کو داناؤں اور فلسفیوں کی سی سوجھ بوجھ دے دی تھی۔

گھر کے دروازے پر رک کر طیب نے رجب علی سے کہا۔ ''دُرِّشہوار کو آپ سے اپنی بدکلامی پر شرمندگی ہے۔ اسے معاف کر دیجیے گا۔''

''باپ ہو...... اولاد کے لیے باپ کی فیلنگز کو تو سمجھتے ہو...... اولاد سے کینہ نہیں رکھا جاتا دل میں...... صرف پیار کیا جاتا ہے۔''

''اسے ذیابیطس ہو گئی ہے۔''

رجب علی کو یہ سن کر دکھ ہوا۔

''اس سے کہنا، اپنی غذا میں احتیاط رکھے۔''

''نجف کا بلڈ پریشر بہت ہائی رہتا ہے۔''

''اچھا! اس نے بتایا نہیں مجھے۔''

''نگار کو دماغی مسئلہ ہے۔''

''بتایا تھا نجف نے۔'' رجب علی کے لہجے میں دلگرفتگی آ گئی۔ ''بچے ذہنی دباؤ میں رہیں تو وقت سے پہلے ہی خرابیٔ صحت کے مسائل اٹھانے لگتے ہیں۔ ابھی تم لوگوں کی عمر تو نہیں تھی بیماریوں کی۔''

''بابا! بس طیب ہی کچھ ٹھیک ہیں۔'' ثروت بولی۔

''اللہ اسے ہمیشہ ٹھیک ہی رکھے اور ہاتھوں پر بھی اپنی رحمت فرمائے۔''

طیب اور اس کے بچوں کو رخصت کر کے رجب علی اپنے ٹوٹے خوابوں کی کرچیاں دل میں سمائے شکستہ قدموں سے گھر کے اندر پلٹا۔

☆☆☆

ٹیکسی کے دھندے میں رجب علی کا سابقہ بھانت بھانت کے لوگوں سے پڑتا تھا۔ بعض اوقات ایسی سواریاں بھی متھے لگ جاتیں جو جائے مقصود پر پہنچ کر کرائے کے سلسلے میں ہری جھنڈی دکھا دیتیں، بعض نہایت ڈھٹائی سے کہہ دیتے...... ''پیسے نہیں ہیں کہاں سے دوں؟'' بعض اپنی خالی جیب اُلٹ دیتے۔ ''یہ دیکھو، جیب خالی ہے، ایک سکہ بھی نہیں۔''

ایسی حرکتیں یا تو درماندہ حال بوڑھے کرتے یا غنڈے یا پھر جوئے خانوں میں لٹ کر نکلے ہوئے جواری۔ کبھی کبھی خالی جیبوں والے مے نوش بھی گلے پڑ جاتے۔ ایسے مواقع پر رجب علی کو سخت غصہ آتا، وہ بڑبڑاتا۔ ''بے غیرت! یہ بھی نہیں دیکھتے ایسے لوگ کہ ڈرائیور بیچارہ روزی کے لیے نکلا ہوا ہے۔'' ایسوں سے کبھی کبھی منہ ماری بھی ہو جاتی۔

بعض اتنے ڈھیٹ ہوتے کہ کرایہ نہ ادا کرنے پر نہایت بے حیائی سے کہتے۔ ''اگلی بار تمہاری ٹیکسی میں بیٹھوں گا تو آج کا کرایہ بھی دے دوں گا۔'' رجب علی دانت پیس کر رہ جاتا۔

دادا گیر قسم کی سواریاں تو چوری اور سینہ زوری کے مصداق کرایہ بھی نہ دیتے اور مارا ماری پر اتر آتے۔

رجب علی اس دھندے میں قماش قماش کے لوگوں سے واسطہ پڑنے پر اتنا سیانا ہو گیا تھا کہ سواری کو اپنی ٹیکسی میں بٹھانے سے پہلے اس کے ظاہری حلیے اور بات چیت سے اس کی جیب ہلکی یا بھاری ہونے کا اندازہ لگانے کی کوشش کرتا مگر کبھی کبھی اس کا قیاس غلط بھی ثابت ہوتا...... جیسے اس دن ہوا۔

ایک بوڑھا شخص جس کی عمر اسی پچاسی کے لگ بھگ تو ضرور ہوگی، اپنے کتے کے ساتھ نیورومنی جانے کو آیا۔ بڑے میاں اپنے ظاہری حلیے سے مفلوک الحال نظر آتے تھے مگر ان کے چہرے پر کسی بچے کی سی معصومیت تھی اور آنکھوں میں تھکن کا احساس۔ ڈھیلی پتلون، پرانا کوٹ، سر پر ہیٹ، ایک ہاتھ میں چھڑی، دوسرے میں پرانا چرمی بیگ اور بغل میں چھوٹا سا چمڑے کا بیگ دبا ہوا تھا۔

کتوں سے مغرب والوں کی محبت بھی خوب تھی اور کتے بھی کچھ اس طرح جو اپنے پالنے والوں سے اس قدر لگاوٹ رکھتے کہ دوسرا آدمی یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا کہ وفا ان کتوں کا شعار ہے یا تربیت نے انہیں مالک کے ساتھ چلنے پر مجبور کر رکھا ہے۔

رجب علی کو بڑے میاں کے حلیے سے جیب خالی ہونے کا قیاس ہوا مگر اس کے چہرے پر چھائی معصومیت نے اسے کرایہ نہ ملنے کا خطرہ مول لینے کا حوصلہ دیا۔ کوئی بات نہیں، بڑے میاں نے اگر اپنی منزل پر پہنچ کر کرایہ دینے سے عذر چاہا تو وہ بھوکا نہیں مر جائے گا۔ بجا کہ ٹیکسی اس کا روزگار تھی مگر بعض کام اللہ کی رضا کے لیے بھی تو کیے جاتے ہیں۔ رجب علی کو اپنے لیے بھی تو اگلے جہان کے لیے زادِ راہ اکٹھا کرنا تھا...... بشرطِ درازیٔ عمر، اسے بھی اس عمر کو پہنچنا تھا۔ اس نے بڑے میاں کو ان کے کتے سمیت گاڑی میں بٹھا لیا۔

تاہم ٹیکسی رینک سے نکالتے ہوئے اس نے بڑے میاں سے سرسری پوچھا۔ ''کرایہ تو ہے نا تمہارے پاس؟''

بڑے میاں نے نہایت فیاضانہ انداز میں کہا۔ ''کرائے کی تم فکر نہ کرو۔'' اور اپنا چرمی بیگ کھول کر اس میں موجود نوٹوں کی نمائش کرائی۔ رجب علی ششدر رہ گیا۔ بیگ میں بلا مبالغہ ہزاروں پونڈز رقم موجود تھی۔

''تم نے کسی کو دینے ہیں یہ پیسے؟'' رجب علی نے پوچھا۔ جواب نفی میں ملا۔ ''تو پھر اتنی رقم ساتھ لے کر کیوں نکلے ہو؟''

بڑے میاں نے بیگ جھک کر نیچے اپنے پیروں میں رکھتے ہوئے کہا۔ ''بھئی سفر پر نکلا ہوں، خدا جانے کہاں پیسوں کی ضرورت پڑ جائے۔''

بڑے میاں کی مفلوک الحالی اور اس کے بیگ میں اتنی زیادہ رقم کے درمیان تضاد نے رجب علی کو شک میں ڈال دیا۔ ایسا تو نہیں بڑے میاں نے کوئی واردات کی ہو...... مگر اس کا لاغرپن کسی واردات کا متحمل نہ ہو سکنے کا گواہ تھا...... پھر بڑے میاں کے چہرے پر بکھری معصومیت۔

دنیا عجب تماشا ہے...... دیتے ہیں دھوکا یہ بازی گر کھلا۔ انسانوں کا باطن ان کے ظاہر سے قطعاً مختلف بھی ہو سکتا ہے۔

نیورومنی پہنچنے پر جب رجب علی نے بڑے میاں سے اس کا پتا پوچھا تو وہ بولا۔ ''یہ تم مجھے کہاں لے آئے...... مجھے

تو میڈسٹون جانا ہے۔"

رجب علی نے اپنا سر پیٹ لیا۔"تم نے تو یوروونی جانے کو کہا تھا۔"

بڑے میاں نے زور سے نفی میں سر ہلایا۔"نہیں، نہیں...... مجھے میڈسٹون جانا ہے۔"

رجب علی نے اسے میڈسٹون جانے کے لیے مزید کرایہ بتایا۔ بڑے میاں نے وہی فیاضی دکھائی۔"کرائے کا کوئی مسئلہ نہیں، میں تمہیں ٹپ بھی دوں گا۔" رجب علی مطمئن ہوگیا۔

راستے میں بڑے میاں رجب علی سے ادھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ میڈسٹون پہنچتے ہی بڑے میاں پر شادی مرگ طاری ہوگئی اور وہ بے تابی سے ادھر اُدھر گردن گھما کر گاڑی سے باہر دیکھتے ہوئے خود کلامی کرنے لگے۔

"اوہ، مسٹر جیکب! میڈسٹون، تمہاری جائے پیدائش، گائیں اب بھی ہیں...... گھاس ویسی ہی ہے...... آسمان بھی اسی طرح۔"

"اب ہم کس طرف جائیں گے؟" رجب علی نے بڑے میاں سے پوچھا۔

بڑے میاں کی آنکھوں میں خواب سی کیفیت تھی۔

"میرے اسکول...... میرا باپ میرا انتظار کررہا ہوگا، وہ مجھے اسکول سے پک کرنے آیا ہوگا۔"

رجب علی کو لگا، بوڑھا مذاق کررہا ہے۔

"پلیز! مجھے بتاؤ کدھر جانا ہے۔" اس نے کہا۔

"ٹام انکل کی شاپ تک لے چلو مجھے۔"

"مجھے کیا معلوم ٹام انکل کی شاپ کہاں ہے، مجھے پتا بتاؤ۔"

"کیا؟" بوڑھا رجب علی کو ہونقوں کی طرح دیکھنے لگا۔

"کہاں جانا ہے، مجھے بتاؤ۔" رجب علی بیزاری سے بولا۔

"میرے گھر لے جاؤ۔" بڑے میاں نے نہایت معصومیت سے کہا۔

"گھر کہاں ہے؟"

"تمہیں نہیں معلوم؟"

"مجھے کیسے معلوم ہوسکتا ہے۔" رجب علی زچ ہوگیا۔

"تم تو میرے دوست ہو...... تمہیں معلوم ہونا چاہیے۔"

"میں تمہارا دوست نہیں، ٹیکسی ڈرائیور ہوں۔"

رجب علی کو بڑے میاں پر اداکاری کرنے کا گمان ہوا۔

"تم ٹلی ہو، میرے دوست!"

"مسٹر جیکب! تمہارے مذاق سے میرا وقت ضائع ہورہا ہے۔ مجھے بتاؤ کس طرف جانا ہے۔"

بڑے میاں نے اپنے سر پر سے ہیٹ اتارا اور سر کھجاتے ہوئے بولے۔"مجھے نہیں معلوم میرا گھر کدھر ہے۔ میرے باپ کو فون کرو، وہ مجھے لینے آئے گا۔"

"مسٹر جیکب!" رجب علی نے ونڈ اسکرین سے نظر ہٹا کر بڑے میاں کو گھورا۔

"میرا گھر!" بڑے میاں نے منہ بسورا پھر رجب علی کے بازو پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے گڑگڑایا۔"مجھے میرے گھر پہنچادو نا۔ مام میرا انتظار کررہی ہوگی۔"

رجب علی کے اعصاب چٹخنے لگے...... باپ کے بعد اب مام بھی!

"تم ٹلی نہیں تو بوب ہو۔"

"میں الو کا پٹھا ہوں جو میں نے تم پر رحم کھا کر اپنی ٹیکسی میں بٹھالیا۔" رجب علی انگریزی کے بجائے اردو میں بڑبڑایا۔

اپنی زبان بھی کیا نعمت تھی۔ اکثر مواقع پر رجب علی کے بہت کام آتی۔ اسے اپنے دل کی بھڑاس نکالنے میں سہولت فراہم کرتی۔

"میرا ایک بھائی بھی ہے...... چلو اس کو ڈھونڈتے ہیں۔" بڑے میاں نے رجب علی کو معصومیت سے دیکھا پھر منہ بسورا۔"میرا بھائی......!" اور پھوٹ پھوٹ کررونے لگا۔

رجب علی نے اپنا سر پیٹ لیا...... خدایا! کس مصیبت میں پھنس گیا تھا وہ۔ صبح کس کا منہ دیکھا تھا جو یہ افتاد آپڑی۔

کچھ دیر اور وہ بڑے میاں کے ساتھ مغز کھپاتا رہا اور بڑے میاں کسی چھوٹے بچے کی طرح الٹی سیدھی باتیں کرتے رہے۔

مجبور ہوکر رجب علی کو پولیس اسٹیشن جانا پڑا۔ پولیس نے خاصی دیر اسے سوال جواب میں مصروف رکھا، بڑے میاں سے بھی بات کی۔ تفتیشی افسر نے رجب علی کی طرف سے مطمئن ہوکر بڑے میاں کو اپنی تحویل میں لے لیا۔

"آج کا دن میرے لیے بہت سخت تھا۔" رجب علی نے پولیس افسر سے کہا۔

"بڑی عمر میں بھی کبھی لوگ اسی طرح اپنی یادداشت کھو بیٹھتے ہیں۔" پولیس افسر بولا۔

"اچانک!" رجب علی حیران ہوا۔

"انسانی یادداشت ایک عجوبہ ہے۔ کیا تمہیں یاد ہے کہ اس دنیا میں آنے سے پہلے تم کہاں تھے؟"

رجب علی کو نفی میں سر ہلانا پڑا۔

انسانی یادداشت واقعی ایک عجوبہ ہے۔

گھر پہنچنے پر رجب علی نے گاڑی کی چابی میز پر پھینکی، اپنی تھیلی ایک طرف رکھی اور تھکے ہارے مسافر کی طرح کرسی پر ڈھیر ہوگیا۔

''کیا ہوا بڑے میاں؟'' ثمینہ اسے کافی عرصے سے بڑی محبت سے بڑے میاں کہنے لگی تھی۔

''مت پوچھو کیا ہوا۔''

''خیریت؟'' ثمینہ تشویش میں تھی۔

رجب علی خاموشی سے اسے دیکھنے لگا۔

''ایسے کیوں دیکھ رہے ہیں؟'' ثمینہ کو تعجب ہوا۔

''ہم انڈیا جارہے ہیں۔''

''ہیں...... آپ کو اچانک انڈیا جانے کا خیال کیوں آگیا؟'' ثمینہ چونکی۔

''میں وہ گھر دیکھنا چاہتا ہوں جہاں میں پیدا ہوا تھا...... جہاں میں نے بچپن میں اپنی ماں کے ہاتھ کی روٹی پہلی بار کھائی ہوگی۔''

ثمینہ نے اسے حیرت سے دیکھا۔ ''آج آپ کیسی باتیں کررہے ہیں...... انڈیا میں اپنے گھر کے بعد ماں کے ہاتھ کی روٹی کیوں یاد آگئی؟'' ثمینہ اسے کچھ ویسی ہی نظروں سے دیکھ رہی تھی جیسے وہ اپنی گاڑی میں بیٹھے بڑے میاں کو دیکھتا رہا تھا۔

''ذرا فریش ہوآؤں پھر بتاتا ہوں۔''

ثمینہ اسے تشویش سے دیکھ رہی تھی۔

☆☆☆

رجب علی کی عادت بن گئی تھی، جب کسی بات کا ارادہ کرلیتا تو اس پر عمل پیرا ہوکر پایۂ تکمیل تک پہنچا کر ہی دم لیتا...... اور برٹش پاسپورٹ کا وصف یہ تھا کہ نکالا، جھاڑا اور جہاں مرضی آئی، چل دیے۔

انڈیا جاتے ہوئے ثمینہ نے دورانِ پرواز رجب علی سے پوچھا۔ ''آپ کو اپنا انڈیا والا گھر یاد تو ہے نا یا اس بڑے میاں کی طرح مجھ سے کہیں گے تمہیں میرے گھر کا پتا کیوں معلوم نہیں؟''

رجب علی مسکرادیا۔ ''اگر سچ پوچھتی ہو تو یاد نہیں مگر وہاں بہت سے رشتے دار اب بھی رہتے ہیں۔''

''ان کا اتا پتا معلوم ہے یا ڈھونڈتے پھریں گے؟''

''سہارن پور میں میرے والد، دادا اور ان کے بزرگوں کا بڑا نام تھا۔ علماء کا خاندان تھا، ماں نواب خاندان سے تھیں، پتا چل ہی جائے گا۔ چھ خالائیں تھیں، تین ماموں تھے جن میں سے دو پاکستان آگئے تھے۔ بڑے ماموں اتنے وجیہہ تھے کہ جب گھر سے نکلتے تو میری والدہ بتاتی تھیں کہ عورتیں اُڈلیں اپنے گھروں کے پردوں سے جھانک جھانک کر دیکھا کرتی تھیں۔ پاکستان آنے کے بعد جب پہلی بار بڑے ماموں کراچی میں ہمارے گھر آئے تو میں انہیں دیکھ کر ڈر گیا تھا۔''

''کیوں بھئی؟''

''ساڑھے چھ فٹ اونچے، سرخ و سفید رنگت، بڑی بڑی چمکدار آنکھیں، بے انتہا وجیہہ آدمی تھے۔ میں نے ان سے پہلے ایسا حسین آدمی نہیں دیکھا تھا، اس لیے ڈر گیا۔'' رجب علی نے توقف کیا پھر مسکراتے ہوئے بولا۔ ''مجھ پر گئے تھے۔''

''ہاں...... میرا شوہر ہے تو ہینڈسم...... جوانی میں تو گوریاں مرتی ہوں گی آپ پر۔''

''گوریوں کا کیا ہے، وہ تو ہم کالے پیلے ایشیائیوں پر مرتی ہیں...... ہاں، جو میرے تیسرے نمبر کے چھوٹے ماموں تھے، ان کے بارے میں اماں بتایا کرتی تھیں کہ انہیں فلموں میں کام کرنے کا شوق تھا۔ باپ، دادا مذہبی تھے اور بیٹا فلمی اداکار بننا چاہتا تھا...... نوجوانی میں ہی گھر سے چلے گئے۔ بہت بعد میں ان کے بارے میں پتا چلا کہ وہ خود تو اداکار نہ بن سکے مگر ان کا ایک بیٹا فلم انڈسٹری میں آگیا تھا۔ چھوٹے ماموں نے تین شادیاں کی تھیں۔''

ثمینہ ہنس دی۔ ''آپ کی طرح۔''

''شاید...... میری ہی طرح...... قسمت کے پھیر میں۔''

''سنا ہے پھوپی، بھتیجی اور ماموں، بھانجا ایک ذات کہلاتے ہیں۔''

''خدا مغفرت کرے آپا کی...... وہ بھی یہی کہا کرتی تھیں کہ بھانجا اپنے ماموں پر جاتا ہے۔''

''آپ بھی تو اپنے ماموں کی طرح نوجوانی میں گھر سے پردیس آگئے تھے۔''

رجب علی نے ایک سرد آہ کھینچی۔ ''کیا پوچھتی ہو ثمینہ...... کتنے دکھ جھیلے ہیں اس میلے میں...... خوشحالی تو ملی، خوشی نہیں ملی۔''

ثمینہ نے اپنا ہاتھ رجب علی کے شانے پر یوں رکھ دیا جیسے اسے تسلی دینا چاہتی ہو۔ ثمینہ کے ہاتھ کی چاروں انگلیوں میں نگینوں سے مرصع طلائی انگوٹھیاں جگمگا رہی تھیں۔

اور ہزاروں میل دور نشاط اپنے چھوٹے سے ذاتی کیفے میں انگوٹھیوں سے بے نیاز ہاتھوں سے ایک گاہک کو کافی پیش کررہی تھی۔

ممبئی پہنچ کر ایک ہوٹل میں قیام کرنے کے بعد رجب علی نے پہلے اپنے چھوٹے ماموں کے بچوں کو ڈھونڈ نکالا۔ ماموں عرصہ ہوا مر چکے تھے۔ ماموں کے بچوں سے اسے چند اور رشتے داروں کا اتا پتا ملا پھر ان سے بہت سے اور رشتے داروں کا۔ آخرکار وہ ممبئی سے دہلی، دہلی سے سہارن پور، رام پور اور مراد آباد میں اپنے متعدد رشتے داروں تک جا پہنچا۔

سہارن پور میں وہ گھر جس کے بام و در نے دنیا میں رجب علی کے آنے کے بعد اس کی پہلی صدا سنی تھی، اب بھی موجود تھا۔ اس گھر کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی رجب علی کے وجود میں سنسنی دوڑ گئی۔ اسے اس گھر تک پہنچانے والے اس کے کزن گلزار نے بتایا کہ اس مکان کی پرانی عمارت کو ڈھا کر اس پر نئی عمارت تعمیر کی گئی تھی۔ اس گھر کی وسعت، اس کے بام و در دیکھتے ہوئے رجب علی کے دل میں ہوک اٹھی۔ اتنے شاندار گھر کی وارث ہوتے ہوئے اس کی ماں نو آزاد وطن میں ایک کچے گھر کے آنگن میں کھڑے امرود کے درخت کے نیچے کئی سال گرمی کا موسم دستی پنکھا جھل کر گزارتی رہی تھی۔

ماں نے پاکستان جانے کے بعد بھارت میں چھوڑے گئے اپنے گھر اور دیگر اثاثوں کے بارے میں کوئی کلیم داخل نہیں کیا تھا جبکہ ماں کے ایک قریبی رشتے دار نے جھوٹا کلیم دائر کر کے نہ صرف اپنے لیے بلکہ اپنے آٹھ بہن بھائیوں کے لیے ناظم آباد جیسے رہائشی علاقے میں پہلو بہ پہلو نو مکانات کلیم میں حاصل کر لیے تھے۔

ماں تو ایسی صابر، شاکر اور قناعت پسند تھی کہ دونوں ہاتھ جوڑ کر کہتی۔ ''شکر ہے، میرے بچے صحیح سلامت پاکستان پہنچ گئے...... آزادی مل گئی...... سب کچھ مل گیا۔ گھر کا کیا ہے، پکی نہ سہی، کچی دیواریں ہی پک جاتی ہیں۔''

ماں کے یقین کو ٹھیس نہیں پہنچی تھی۔ وقت کے ساتھ اس کے بہن بھائیوں کے اپنے اپنے علیحدہ گھر بن گئے تھے۔ بہن بھائی نہیں رہے تھے، ماسوائے ریحانہ کے، مگر بہن بھائیوں کے بچے پختہ اور آرام دہ گھروں میں رہ رہے تھے۔ آپا کہا کرتی تھی۔ ''ایک نسل بوتی ہے، اگلی نسل اس کا پھل کھاتی ہے۔''

ریحانہ کی اولاد نہیں تھی۔ دیر سے شادی میں کچھ نہ کچھ تو مسائل ہوتے ہی ہیں مگر ریحانہ کا فلسفہ تھا، جلدی شادی کر کے نقصان میں رہنے سے بہتر ہے انتظار کر لیا جائے...... ریحانہ کا پروفیسر شوہر عمر میں اس سے دس سال بڑا تھا۔ ریحانہ سے شادی کے بعد پروفیسر اور ریحانہ کی ازدواجی زندگی سات آٹھ سال ہی رہی مگر ریحانہ کا کہنا تھا، ان چند برسوں میں اس نے شوہر کے ساتھ اتنی پُرمسرت زندگی گزاری تھی جو مسائل میں گزری طویل طویل ازدواجی زندگی پر بھاری تھی۔ ریحانہ اکیلی رہتی تھی۔ تنہائی کے احساس کو اس نے اپنے اوپر طاری نہیں کیا تھا۔ بہنوں اور بھائیوں کے بچوں سے اس کا نہایت خوشگوار تعلق تھا۔ ریحانہ ان کا خیال رکھتی اور وہ سب اسے احترام دیتے۔

گلزار نے رجب علی کو اس کے باپ، دادا کی تمام جائدادیں دکھائیں جن میں سے بعض اب غیروں کے قبضے میں تھیں اور اِکا دُکا اپنوں کے پاس بھی۔ گلاب کے پھولوں سے مہکتا ایک باغ خود گلزار کے پاس تھا۔ اس باغ کی روشوں پر رجب علی کو چہل قدمی کراتے ہوئے گلزار نے اعتراف کیا کہ یہ باغ ملا تو تھا رجب علی کے باپ کو اس کی وراثت میں مگر رجب علی کے گھر والوں کے پاکستان جانے کے بعد گلزار کے باپ نے اس کی دیکھ بھال رکھی تھی اور اب گلزار نے اسے دو لاکھ روپے سالانہ کے عوض میں ایک گلفروش کو ٹھیکے پر دے رکھا ہے جو اس باغ میں موسمی پھول کاشت کرا کے خود بھی فائدہ اٹھاتا تھا اور گلزار کو بھی فائدہ پہنچاتا تھا۔

ایک فیول اسٹیشن دکھاتے ہوئے گلزار نے رجب علی کو بتایا کہ وہ بھی اس کے بزرگوں کی زمین پر ہی بنا ہوا تھا۔

ماں کہا کرتی تھی۔ ''مال، جائداد کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ آزادی بڑی نعمت ہے...... آزادی کی قدر پنجرے میں بند پرندے سے پوچھو۔''

کاش! پاک سرزمین کو مالِ مفت سمجھ کر دونوں ہاتھوں سے لوٹنے والے جانتے کہ جس درخت کی ٹھنڈی گھنی چھاؤں کا وہ مزہ لے رہے تھے، اس کی پھلواری میں رجب علی کی ماں جیسی بے شمار ماؤں کا صبر و شکر بھی شامل تھا۔

رجب علی کو گلزار اس دینی مدرسے میں بھی لے گیا جس کے مہتمم و مدرس کبھی رجب علی کے دادا، پردادا رہے تھے۔ مہتمم وقت گلزار کی زبانی رجب علی کا سیاق و سباق سن کر سراپا نیاز بن گئے۔ اس درجہ احترام پر رجب علی کی آنکھوں کے کنارے بھیگ گئے۔

آگرہ میں مرمریں تختے پر ثمینہ کے ساتھ بیٹھ کر تاج محل کے سامنے تصویر کھنچواتے ہوئے رجب علی کو نشاط یاد آ گئی۔ جن دنوں وہ ریڈنگ میں خرید کردہ گھر کی تزئین و آرائش میں لگا ہوا تھا، نشاط اسے بار بار ٹوکتی۔ ''بس کریں...... تھکے ہوئے گھر آتے ہیں اور کام میں لگ جاتے ہیں۔''

''کیوں بس کر دوں؟ تھکنا تو میں نے سیکھا ہی

نہیں۔'' وہ کہتا۔

ایک روز نشاط نے کہا۔ ''بہت سجالیا آپ نے تاج محل، اب بس بھی کردیں۔''

''ہاں۔'' رجب علی نے اسے محبت سے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ ''میں اپنی ممتاز محل کے لیے تاج محل ہی تو سجا رہا ہوں۔''

نشاط نے قہقہہ لگایا اور ہاتھ جوڑتے ہوئے بولی۔

''جان کی امان چاہتی ہوں عالم پناہ!''

''آپ تو ہماری جان ہیں جانِ شاہ جہاں۔'' وہ فلمی انداز میں بولا پھر اس نے نشاط سے وعدہ کیا کہ ایک دن وہ اس کے ساتھ محبت کی یادگار تاج محل دیکھنے ضرور جائے گا۔

قسمت کی بات، وہ نشاط کے ساتھ تاج محل دیکھنے تو نہ آسکا...... ثمینہ تاج محل کے سامنے اس کے پہلو میں بیٹھی مسکرا رہی تھی اور رجب کا دل نشاط کی بے وفائی کے باوجود اس کے خیال میں غرق تھا۔

محبت ہوا کی سرسراہٹ کے بجائے سمندر کے شور جیسی ہوتی تو ثمینہ اس کے پہلو سے اٹھ کر پہلی پرواز سے مارگیٹ کی راہ لیتی۔

☆☆☆

بھارت سے واپسی پر ثمینہ کے ساتھ ٹیکسی میں مارگیٹ جاتے ہوئے رجب علی سوچ رہا تھا کہ اچھا ہوا جو وہ ہوش وحواس میں اپنی جائے پیدائش، اپنا آبائی گھر اور وہ جائدادیں دیکھ آیا تھا جو اس کے آباء کے خوشحال اور باعزت پس منظر کی غماز تھیں مگر اب اوروں کے قبضے میں تھیں۔ وہ اپنے رشتے داروں کے اصل چہرے بھی دیکھ آیا تھا جن میں سے بعض اس کے کزن گلزار کی طرح کھرے اور مخلص تھے۔ جنہیں یہ اعتراف کرنے میں عار نہ تھا کہ وہ اسی کے آباء کی زمین پر کھلنے والے پھولوں کی آمدن سے فیضیاب ہو رہے تھے...... اور بعض اس کے ماموں زاد بھائی ثنا اللہ اور اس کی بیوی راشدہ کی طرح چڑھتے سورج کے پجاری بھی تھے جنہوں نے پاکستان کا حوالہ دیے جانے پر اپنے ملازم سے باہر ہی باہر کہلوا دیا تھا کہ ان کا کوئی رشتے دار پاکستان میں نہیں رہتا لیکن جونہی رجب علی نے انگلستان کا حوالہ دیا، وہ لپکے ہوئے آئے تھے اور اسے اور ثمینہ کو ہوٹل سے اپنے ہاں لے آنے پر مصر تھے۔

دنیا کتنی بری جگہ ہے...... نہیں، دنیا بری جگہ نہیں...... دنیا تو امتحان گاہ ہے، اس امتحان گاہ میں آزمائش سے گزرنے والے انسانوں کے اعمال کے نتائج اس دنیا کو اچھی یا بری جگہ بنا دیتے ہیں۔ حتمی نتائج تو جب آنا ہوگا، آئیں گے...... امتحان گاہ میں بیٹھے ہر امیدوار کو اپنی کارکردگی کا بخوبی علم ہوتا ہے۔ کاش! ہر انسان دنیا کی امتحان گاہ سے صبر و سکون اور دیانت و امانت داری کے ساتھ گزرنا سیکھ لے۔

''ہوم سویٹ ہوم!'' رجب علی نے اپنے گھر کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوتے ہوئے کہا۔ ''شکر ہے ہم اپنے گھر واپس آگئے۔''

''اس بڈھے کی طرح یادداشت کھوئے اور حوالات جائے بغیر۔'' ثمینہ نے مسکراتے ہوئے رجب علی کو دیکھا۔

''پتا نہیں بیچارے کے ساتھ آگے کیا ہوا ہوگا۔'' رجب علی کے لہجے میں ملال تھا۔

''بچپن تو بچپن، اسے اپنا بڑھاپے کا گھر بھی یاد آسکا ہوگا کہ نہیں۔'' ثمینہ دھیرے سے ہنسی۔

''ننھی عمر...... زیادہ بڑھاپے کو اسی لیے تو ننھی عمر کہا گیا ہے۔'' رجب علی صوفے پر نیم دراز ہوگیا۔

''کہیں بھی گھوم پھر آؤ، جو سکون اور آرام اپنے گھر میں ملتا ہے اور کہیں نہیں۔'' ثمینہ بولی۔

''گھر کا رستہ بھی قسمت سے یاد رہتا ہے ثمینہ!'' رجب علی نے ٹانگیں پساریں اور ایک لمبا سانس لے کر بولا۔ ''کسی شاعر نے کہا ہے...... نگری نگری پھرا مسافر، گھر کا رستہ بھول گیا۔''

''اس بڈھے کی طرح!'' ثمینہ کو پھر یادداشت گم کردینے والا بوڑھا یاد آیا۔

''ارے ثمینہ! وہ بڈھا تو اپنے ہی دیس میں رستہ بھولا تھا۔ بیچارے رجب علی سے پوچھا...... اپنے دیس سے نکل کر کہاں آپہنچا۔''

''بیچارہ!'' ثمینہ نے رجب علی کو تیکھی نظروں سے دیکھا۔ ''یہ لفظ آپ پر جچتا نہیں...... بیچاری تو میں ہوں...... کوئی مجھ سے پوچھے کہ میں نے رجب علی کے ساتھ تیس سال کتنی بیچارگی سے گزارے ہیں...... آدھے نہیں، پورے پورے ڈکٹیٹر ہیں آپ۔''

''ڈکٹیٹر تو خیر میں نہیں ہوں مگر کیا کہا تم نے...... تیس سال! تیس سال تو صرف تمہارے ساتھ ہوگئے اور اس سے پہلے......'' وہ یکلخت چپ ہوگیا۔

''چپ کیوں ہوگئے بڑے میاں...... آگے بولیں۔'' ثمینہ نے اسے گہری نگاہوں سے دیکھا۔

''کچھ نہیں۔'' رجب علی نے نظریں چرائیں۔

''اس سے پہلے کچھ دن شہزادی مہر النساء بیگم کے

ساتھ...... اور اس سے بھی پہلے آٹھ نو سال مہارانی نشاط کے ساتھ۔''

''تم عورتوں کے لیے مرد کی زندگی سے نکل جانے والی عورتیں ہمیشہ بھوت بنی رہتی ہیں۔''

''آپ مرد ایک ہی پر قناعت کیوں نہیں کرتے؟''

''مرد کب چاہتا ہے کہ عورت اسے چھوڑ جائے؟''

''چھوڑا تو آپ کو پہلی نے ہی...... دوسری کو تو آپ نے خود چھوڑا...... نشاط کو نہیں بھولتے آپ...... ہے نا؟''

''میرے چار بچے ہیں اس سے۔'' رجب علی نے ثمینہ کو چھیڑنے کو کہا۔

''جو پلٹ کر باپ کو پوچھتے بھی نہیں۔'' ثمینہ طنز سے بولی۔

''آئے تو تھے۔''

''کوئی مطلب ہوگا آپ سے۔''

''تمہاری بیٹی نے کون سا پوچھ لیا؟''

''وہ تو سو بار پوچھے، اگر آپ اسے اجازت دیں۔''

''مجھے ضرورت نہیں۔ میں ایک بار جو راستہ چھوڑ دیتا ہوں، اس راستے پر دوبارہ نہیں پلٹتا۔''

''یہ تو نہ کہیں...... پہلے چھوٹے پھر بڑے بیٹے کو آپ گھر لے آئے کہ نہیں؟''

''وہ خود آئے...... میں انہیں لینے نہیں گیا تھا۔''

''وہ بھی خود آجائے گی۔ بے شک آپ اسے لینے نہ جائیں۔''

''میرا متھا گرم مت کرو۔'' رجب علی نے اپنا ایک پاؤں اٹھا کر نیچے پٹخا۔

''گھر آتے ہی آپ کا موڈ بگڑنے لگا۔ اس سے تو اچھا تھا کہ ہم تاج محل کے سامنے ہی بیٹھے رہتے۔'' ثمینہ کو کیا معلوم تھا کہ تاج محل کے سامنے اس کے ساتھ بیٹھے ہوئے بھی رجب علی کا دل کہاں بھٹک رہا تھا۔

ثمینہ اپنی جگہ سے اٹھ کر رجب علی کے پاس آبیٹھی اور بڑی لگاوٹ سے بولی۔ ''بڑے میاں! انڈیا جانے سے پہلے میں آپ کو ایک بات بتانا چاہتی تھی مگر آپ کا موڈ بگڑ جانے کے خوف سے نہ بتا سکی...... اب بتا رہی ہوں۔''

''کیا بات؟'' ثمینہ کے لہجے سے چھلکتی احتیاط نے رجب علی کو سیدھا ہو کر بیٹھنے پر مجبور کر دیا۔

''رابی کے ہاں بے بی آنے والا ہے۔''

رجب علی دم بخود رہ گیا۔

''ہم نے اس کی شادی تو نہیں کی؟'' رجب علی نے گھائل لہجے میں کہا۔

ثمینہ کا سر جھک گیا۔

''تم اس سے رابطے میں ہو؟'' رجب علی نے ثمینہ سے باز پرس کی۔

''میری اولاد ہے وہ...... آپ سے شادی کے بعد مجھے سب سے بڑی نعمت یہی تو ملی ہے۔'' ثمینہ کی آواز میں رقت تھی۔ وہ رجب علی سے نظر نہ ملا پا رہی تھی۔

رجب علی نے اپنا بازو ثمینہ کے ایک شانے سے دوسرے تک دراز کر دیا اور دلسوزی سے بولا۔ ''تم عورتیں اتنی کمزور کیوں ہوتی ہو ثمینہ!''

''اولاد کے معاملے میں تو آپ بھی کمزور ہی نکلے...... جو بیٹے آپ کو چھوڑ کر چلے گئے تھے، آئے تو آپ نے انہیں گلے لگا لیا۔''

''تم نہیں جانتیں ثمینہ! انہوں نے چھوٹی چھوٹی عمروں میں کیا کچھ سہا ہے۔ رابیل کو تو ہم نے شہزادی بنا کر رکھا ہوا تھا...... اس کی کون سی خواہش تھی جو تم نے یا میں نے پوری نہیں کی۔ اسے ہماری محبت ہی کا لحاظ ہونا چاہیے تھا۔''

''آپ ٹھیک کہتے ہیں...... مگر اس ملک میں ہمیں جو سہولتیں مل رہی ہیں، ان کی کچھ نہ کچھ قیمت تو دینا ہوتی ہے۔''

''اتنی بڑی قیمت!''

''میں صرف اپنے لیے نہیں، آپ کے لیے بھی دکھی ہوں۔ جانتی ہوں کہ رابی سے آپ کتنا پیار کرتے تھے...... وہ بدقسمت تھی جو اس نے اس محبت کی قدر نہیں کی...... اب بھگت رہی ہے...... نوکری کر رہی ہے اور گھرداری بھی۔''

رجب علی ٹھنڈی سانس بھر کے رہ گیا۔ کتنے ہی لوگ تھے جن کا اس نے پردیس میں ہاتھ تھاما تھا۔ خدا کی خوشنودی کی خاطر انہیں سہارا دے کر ان کی زندگی کو بہتر بنانے میں دامے، درمے، سخنے مدد کی تھی مگر اس کے اپنے بچے میلے میں ماں باپ کا ہاتھ چھوٹ جانے سے بچھڑ جانے والے بچوں کی طرح بھٹک گئے تھے۔

نگار، اس کی سب سے خوبصورت اور چہیتی بیٹی ایک غیر مذہب شخص سے شادی کے بعد کبھی اس سے نہیں ملی تھی۔ نجف نے بتایا تھا، اس کا ایک بیٹا تھا جس کی تربیت اس نے اسلامی طرز پر کی تھی۔

طیب اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ اس سے ملنے آیا تھا۔ پانچ بچوں کی ذمے داری نے اسے رجب علی کی اس مشقت اور مشکلات سے آگہی دی تھی جو اس نے ماں کے بغیر رہ جانے والے اپنے چار بچوں کی پرداخت میں اٹھائی تھی۔

نجف کی درماندگی اور مایوسی نے رجب کو دنوں

آزردہ رکھا تھا...... اور آنے کے بعد اس کا جانا رجب علی کو اور دکھی کر گیا تھا۔

"ذرِ شہوار گئی تو پھر پلٹ کر نہیں آئی تھی۔

اور اب...... رابیل کے بارے میں ثمینہ بتا رہی تھی کہ وہ بھی کچھ اچھے حال میں نہ تھی۔

رجب علی کا دل دکھ رہا تھا۔ اس نے یہ کب چاہا تھا کہ اس کے بچوں کو ایسی زندگی ملے۔ وہ تو ان کے لیے روشن، چمکیلے خواب دیکھا کرتا تھا۔ ایک فرد کی غلطی کا بھگتان کتنے افراد بھگت رہے تھے...... نشاط، شیطان کو اپنے اور اس کے درمیان آنے کا موقع نہ دیتی تو مہرن کیوں آئی ہوتی اور اسے طلاق دے کر رجب علی سارے خاندان کے لیے نکّو کیوں قرار پاتا...... ثمینہ اس کی زندگی میں کیوں آئی ہوتی...... کیوں وہ اور ثمینہ رابیل کے جانے کا درد سہتے...... ایک لمحے کی خطا صدیوں کی سزا بن گئی تھی۔

☆☆☆

رابیل سے ثمینہ کے رابطے کی رجب علی کو کچھ تو سُن گُن تھی، اب تصدیق بھی ہوگئی۔ ثمینہ پہلے در پردہ رابیل سے تعلق رکھتی تھی، رجب علی کے علم میں لانے کے بعد اس نے رجب علی کی اجازت سے اس سے ملنا جلنا شروع کر دیا۔ رجب علی نے بادلِ ناخواستہ اجازت دی تھی۔ نہ دیتا تو بھی ثمینہ نے اس سے تعلق تو رکھنا تھا۔

عمر بڑھنے کے ساتھ رجب علی کا مذہب کی طرف زیادہ رجحان ہوگیا تھا۔ اس نے مسجد سے اپنا تعلق نہایت مستحکم کرلیا تھا۔ نماز کے اوقات میں کبھی سواری ساتھ نہ ہوتی تو وہ نماز کا وقت ہوتے ہی نماز ادا کرتا۔

وقت کے ساتھ اپنے وطن سے اس کی محبت میں بھی اضافہ ہوتا چلا گیا تھا۔ پردیس میں ہم وطن تارکینِ وطن سے وہ خصوصی انسیت اور رغبت رکھتا، حبِ وطن سے سرشار اور اس کی فکر میں غلطاں رہتا۔ وہ اور ثمینہ ٹیلی ویژن کے سامنے بیٹھتے تو ان کی توجہ کا مرکز پاکستان کی خبریں ہوتیں۔

"پاکستان کو اچھے حکمران نہیں ملے۔" ثمینہ کہتی۔

"ثمینہ! پاکستان کو اچھی عوام نہیں ملی۔" رجب علی کہتا۔

"عوام بیچاری کس گنتی میں بڑے میاں!"

"عوام ہی تو اصل طاقت ہے ثمینہ! جس ملک کے عوام باشعور اور متحد ہوں، اس کے حکمرانوں کا قبلہ آپ ہی آپ درست ہوجاتا ہے...... عوام کو اپنے فرائض کا احساس اور حقوق سے آگہی ہونی چاہیے۔"

"اب کی بار پاکستان میں الیکشن ہوں تو آپ بھی کھڑے ہوجائیں، کیا پتا عوام آپ ہی کو وزیرِ اعظم بنا دے۔" ثمینہ کو مذاق سوجھتا۔

"پھر تو رہی سہی امید بھی جائے گی۔"

"نہیں، نہیں...... آپ جیسا محبِ وطن کہاں ملے گا عوام کو۔" ثمینہ مسکراتی۔

"تمہیں ایک بات بتاؤں ثمینہ!" رجب علی نہایت سنجیدگی سے کہتا۔ "وطن سے نکلتے ہی ہر فرد محبِ وطن بن جاتا ہے۔"

"عجیب بات ہے۔"

"عجیب کہو یا غریب...... بات سچی ہے۔"

"لیکن کیوں...... ایسا کیوں؟" مذاق کے موڈ میں آئی ثمینہ سنجیدہ ہوجاتی۔

"انسان، چیزیں، حالات جب ہماری دسترس میں نہیں ہوتے، تب ہمیں ان کی قدر آتی ہے۔"

"جیسے رابی کو ہماری اور اس گھر کی قدر یہاں سے جانے کے بعد آئی ہوگی...... اس حال میں جب اسے آرام کی ضرورت ہے، وہ کام کی زیادتی سے پس رہی ہے۔"

"مرد کی برابری کا دعویٰ کرنے والی عورت کو یہ درد تو سہنا پڑتا ہے ثمینہ! مغرب کی دیکھا دیکھی ہمارے دیس کی عورت بھی اس چکی میں پسنے کو تیار گھر سے نکل آئی ہے۔ مجھے یاد ہے، جب میں چھوٹا تھا، ہمارے گھروں میں مرد صبح کو کام پر جانے سے پہلے بازار سے روزمرّہ سودا سلف خرید کر گھر کی عورتوں کو دے جایا کرتے تھے، اب وہاں عورت گھر کے بجائے گھر سے باہر بس اسٹاپوں پر، بازاروں میں، زندگی کے ہر شعبے میں رلتی کھلتی نظر آتی ہے...... حد یہ ہے کہ مغرب کی دیکھا دیکھی اسے دکانداری پر بھی کھڑا کر دیا گیا ہے۔"

"کیا کرے بیچاری...... گھر میں بیٹھ کر سودا سلف کے لیے مرد کی محتاجی سے بہتر کہ خود ہاتھ پاؤں ہلالے۔"

"بہت خوب! اگر یہ سوچ ہے تو بھگتے...... ورنہ دینِ اسلام تو کہتا ہے مرد، عورتوں کے نگہبان ہیں...... کفالت مرد کی ذمے داری ہے، عورت کا کام ہے عزت و آبرو کے ساتھ گھر میں بیٹھنا۔"

"دوسروں کی فکر چھوڑیں...... آپ کما رہے ہیں، میں عزت سے گھر بیٹھی ہوں۔"

"دوسروں کی فکر کیے بغیر دل مانتا نہیں یار!"

☆☆☆

رابیل کے ہاں بیٹی کی پیدائش سے نانی بن کر ثمینہ حد درجہ خوش تھی۔ رجب علی کو اس خبر سے آگاہ کرنے کے بعد اس نے قدرے فاتحانہ انداز میں رجب علی سے کہا۔ "میں

نے پہنچ کے اس کے کان میں اذان بھی دلوادی۔"

"کیا فرق پڑتا ہے۔" رجب علی نے سرد مہری دکھائی۔

"کیوں فرق نہیں پڑتا؟" ثمینہ نے ابرو چڑھا کر رجب علی کو دیکھا۔

"اذان صدا ہے اسلام کے راستے پر بلانے کی..... اور بچے کے کان میں اذان دینا اسے آگاہ کرنا ہے کہ اللہ پاک نے اسے اسلامی گھرانے میں بھیجا ہے۔"

"میں نے رابی سے کہہ دیا ہے، اسے اپنے مذہب پر رکھنا۔"

"تم کون ہوتی ہو اسے ڈکٹیشن دینے والی؟"

"میری نواسی ہے اس کی بیٹی۔"

"تمہیں یاد ہے، تم نے نگار کے بیٹے کی پیدائش پر کیا کہا تھا؟"

"کیا کہا تھا؟"

"جس باپ کی اولاد ہے، اسی کے مذہب پہ جائے گا۔"

"اچھا چھوڑیں..... آپ کو تو نواسی کی پیدائش پر خوش ہونا چاہیے۔"

"تم کافی ہو اس کام کے لیے۔"

ثمینہ اس کے پاس آبیٹھی۔ "دیکھیں جی..... نگار ہو یا رابیل..... ان کے بچوں کا کیا قصور..... بچہ چاہے مسلمان کا ہو، ہندو کا یا سکھ کا، معصوم ہوتا ہے۔ اللہ پاک اسے دینِ فطرت پر پیدا کرتے ہیں۔"

"مگر مسلمان اپنے بچے کو مسلمان، ہندو اسے ہندو اور سکھ اسے سکھ مذہب پر ہی دیکھنا چاہتا ہے۔" رجب علی نے کہا۔

"رابی اب ماں بن گئی ہے، اسے معاف کردیں۔"

"نگار بڑی ہے..... پہلے اس نے غلطی کی..... پہلے اسی کو کیوں نہ معاف کروں۔"

"میں کیا کہہ سکتی ہوں۔" ثمینہ نے منہ بنایا۔

"نہیں..... کہہ تو تم بہت کچھ سکتی ہو..... لیکن اونٹ پہاڑ کے نیچے آگیا ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"کاش! تم نے میرے چار بچوں کو بھی اپنا سمجھا ہوتا..... حالات آج بہت مختلف ہوتے۔"

"لگتا ہے آج آپ مجھ سے لڑنے کے موڈ میں ہیں۔"

"ہتھیار پھینکے مدتیں گزر گئیں۔"

"اچھا سنیں..... رابی اکیلی ہے..... وہ منحوس تو کام پر جاتا ہے یا آوارگی میں رہتا ہے۔ رابی کی دیکھ بھال کو کوئی بھی نہیں..... آپ کی اجازت ہو تو میں دو چار دن اس کے پاس رہ آؤں؟"

"ضمیر گوارا کرتا ہے؟"

"میں ماں ہوں اس کی..... آپ کی طرح پتھر کا دل نہیں رکھتی۔" ثمینہ رونے لگی۔

"ہر شخص اپنے کیے کا جوابدہ ہے۔ جو تمہارا دل چاہتا ہے، کرو..... ویسے بھی یہ ملکہ کی راجدھانی ہے..... عورت آزاد ہے، خود مختار ہے۔"

"میں اپنی ممتا کے ہاتھوں مجبور ہوں۔"

"ہم سب کسی نہ کسی کے ہاتھوں بلیک میل ہو رہے ہیں۔"

☆☆☆

ثمینہ چار پانچ دن رابیل کے ساتھ رہنے کے بعد رجب علی کی اجازت سے ایک دو دن کو اپنے میکے میں رک گئی تھی۔ رجب علی گھر میں اکیلا تھا۔ اس کی ریٹائرمنٹ کا وقت اب نزدیک ہی تھا۔ ثمینہ کے گھر پر نہ ہونے کے باعث اسے کام سے وقت پر گھر پہنچنے کی فکر نہ ہوتی۔

اس روز وہ رات بھر کام کرنے کے بعد فجر کی نماز ادا کر کے سویا تو دن چڑھے آنکھ کھلی۔ بستر سے اٹھنا چاہا تو لگا جسم پتھر کا ہو چکا تھا۔ باوجود کوشش کے وہ بستر سے نہ اٹھ پایا۔ جسم شل تھا، آنکھیں چھت سے لگی تھیں، زبان ساکت اور دماغ سُن۔ اس نے چلانا چاہا مگر آلۂ صوت نے ساتھ نہ دیا۔ اس نے چھت سے نظر ہٹا کر آنکھوں کے ڈھیلوں کو ترچھا کرتے ہوئے بیڈ سائڈ بورڈ پر رکھے موبائل فون کو دیکھا مگر اسے اٹھانے کے لیے اپنے ہاتھ کو حرکت میں لانے سے قاصر رہا۔

"اس بے بسی سے نہیں رب!" یکایک اس کے ساکت جسم میں حرکت ہوئی اور اس نے کروٹ لے کر خود کو بستر سے نیچے گرا دیا۔ فرش پر زندہ لاش کے مانند پڑے وجود کو اپنا ہاتھ بیڈ سائڈ بورڈ پر رکھے موبائل تک پہنچانے میں گویا صدیاں لگیں۔ فرش پر دیوار تا دیوار بچھے قالین پر پڑے پڑے اس نے بمشکل ایمرجنسی نمبر ملایا اور زبان کو بدقت حرکت دے کر ٹوٹے پھوٹے لہجے میں اپنی جائے قیام بتائی اور کہا۔ "میں مر رہا ہوں۔"

ایمرجنسی نمبر پر اس کی کال جانے کے بعد کون، کس طرح اس کی مدد کو گھر میں آیا، اسے پتا نہ چل سکا۔ جب آنکھ کھلی تو اس نے کمزور سی آواز میں پوچھا۔ "کون ہے..... میں کہاں ہوں؟"

"میں نرس ہوں..... تم اسپتال میں ہو۔" جواب ملا۔

"کیوں؟"

''تم مفلوج ہو گئے ہوتے اگر خدا کی مہربانی نہ ہوتی تم پر۔''

اسے یاد آیا، اس نے اپنی بے بسی پر خدا ہی کو تو پکارا تھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

''ثمینہ! میری بیوی؟'' اس نے آہستہ سے کہا۔

''میں بلاتی ہوں اسے۔'' مہربان آواز والی نرس نے کہا۔

اس نے آنکھیں موند لیں۔ کچھ دیر بعد اسے اپنے سر پر کسی کے ہاتھ کا لمس محسوس ہوا اور دھیمی سی آواز اس کے کان میں پڑی۔ ''میں ہوں، ڈیڈی!''

اس نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔ سماعت کو دھوکا ہوا تھا یا بصارت جو دیکھ رہی تھی، وہ خواب تھا۔

''مام دو دن سے اسپتال میں تھیں، میں نے ابھی تھوڑی دیر پہلے انہیں زبردستی گھر بھیجا ہے فریش ہونے کو۔''

دو دن گزر گئے تھے اسے ہوش و خرد سے عاری ہوئے۔

کوئی اور وقت ہوتا تو وہ اپنے سرہانے کھڑی رابیل کو پرے دھکیل دیتا اور بھڑک کر کہتا۔ ''دفع ہو جا۔'' مگر یہ وقت اور تھا۔ وہ موت کی وادی سے پلٹا تھا اور کسی اپنے کی آواز سن رہا تھا۔

اس نے دوبارہ آنکھیں موند لیں۔

''میں نے آپ کے لیے بہت دعائیں مانگیں اللہ سے۔'' وہ کہہ رہی تھی۔

رجب علی چپ پڑا تھا۔

دفعتاً اسے اپنے چہرے پر ایک موتی آبی بوند ٹپکنے کا احساس ہوا۔ اس نے آنکھیں کھول دیں۔

''سوری ڈیڈ...... آئی ریئلی فیل سوری!'' وہ آنسوؤں سے بھیگی آواز میں کہہ رہی تھی۔ ''میں جانتی ہوں...... مجھے احساس ہے کہ آپ میری وجہ سے بہت دکھی رہے ہیں۔''

اس نے رجب علی کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر ہونٹوں سے لگا لیا جیسے کسی مقدس و محترم چیز کو چوم رہی ہو۔

''میں نے تجھے بھلا دیا تھا...... کیوں آئی تو؟'' رجب علی کی آنکھیں پھر بند تھیں اور آواز میں شدید نقاہت۔

''مگر میں آپ کو ہر وقت یاد کرتی تھی۔'' اس کے لہجے میں بے تابی تھی۔ ''مجھے معاف کر دیں۔'' اس کی آواز میں ندامت تھی۔

کیا معاف کرنا آسان تھا...... کیا معاف کر دینا ممکن تھا؟

چند ماہ پہلے ہی تو اس کا دیرینہ دوست بھگوان سنگھ اپنی بیوی کے ساتھ اس سے ملنے آیا تھا۔ اسے خون کا سرطان تشخیص ہوا تھا۔ اپنی اکلوتی بیٹی نیتو کی ایک گورے سے شادی سے وہ انتہائی ناخوش اور بیٹی سے ناراض تھا۔ آخری دنوں میں نیتو ہی بھگوان سنگھ کی دیکھ بھال کے لیے اس کے پاس تھی۔ رجب علی اور ثمینہ عیادت کے لیے گئے تو بھگوان سنگھ بولا۔ ''میں نے نیتو کو معاف کر دیا ہے...... اپنا وہی جو ہمارے دکھ میں ہمارے کام آئے۔'' بھگوان سنگھ نے نیتو کے ہاتھوں میں ہی دم توڑا تھا۔

ریکوری سے کمرے میں منتقل کیے جانے اور پھر اسپتال سے ڈسچارج کیے جانے کے بعد بھی رجب علی دنوں یہی سوچتا رہا کہ رابیل نے جو غلطی کی تھی، اسے درگزر کر دینے کا حوصلہ کہاں سے لائے۔ اس کے نزدیک تو رابیل کی خطا قابلِ معافی نہ تھی۔

ثمینہ نے ایک روز اچانک ہی ایک ننھے سے وجود کو اس کی گود میں لا ڈالا۔ ''یہ آپ کی نواسی ہے۔''

''اٹھاؤ اسے۔'' اس نے ناگواری سے کہا۔

''آپ کی طبیعت پوچھنے آئی ہے۔''

رجب علی نے اسے خود ہی اپنی گود سے اٹھا کر نہایت بے اعتنائی سے ایک طرف ڈال دیا۔ رابیل جو قدرے فاصلے پر کھڑی بغور دیکھ رہی تھی، لپک کر بچی کے نزدیک پہنچی اور اسے اٹھا کر سینے سے لگا لیا۔ رجب علی نے کن انکھیوں سے دیکھا، بچی کو اپنے سینے سے لگائے رابیل ایک ہاتھ سے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے مسکرا بھی رہی تھی۔ عجیب تضاد...... عجیب منظر تھا۔

رجب علی کو خوف سا آنے لگا۔ ''استقامت رب!'' اس نے اللہ سے رابیل اور اس کی بچی کے خلاف اپنی استقامت کی دعا مانگی۔

رابیل دوبارہ آئی۔ پھر آئی۔ ہر بار بچی کے ساتھ۔

رجب علی رب سے اپنی استقامت کی دعا مانگتا رہا...... دو ننھی ننھی آنکھیں آتے جاتے اسے دیکھنے لگی تھیں...... رجب علی کمزور پڑ رہا تھا۔ اس نے گڑگڑا کر رب سے کہا۔ ''میں کمزور پڑ رہا ہوں میرے پروردگار!''

ثمینہ اس کی کمزوری کو مسلسل ہوا دے گئی۔

''رب! میں نے بہت کوشش کی مگر ہوں نا بندۂ خاکی، بندۂ ناتواں، اپنی کمزوری کا اسیر...... مجھے معاف کر دینا میرے رب...... مجھے معاف کر دینا۔''

رجب علی ہار گیا۔

☆☆☆

زندگی سود و زیاں کا معاملہ ہے۔ آخر عمر انسان کسی مہاجن کی طرح کھاتا کھولے کیا کھویا، کیا پایا کے پھیر میں

اُلجھا رہتا ہے۔ رجب علی بھی اس حساب کتاب سے ماورا نہیں تھا۔ آگے کی خبر تو وہی جانے جو کائنات کی وسعتوں میں پل پل ذی ارواح کے ہر ہر عمل کی نگرانی کررہا ہے۔ اپنے تئیں رجب علی حساب کتاب کرتا تو نتیجہ یہ نکلتا کہ زندگی میں کچھ غلطیاں ہوئی تھیں تو کچھ اچھے کام بھی ہوگئے تھے...... اپنی کسی غرض کے بغیر دوسروں کے کام آکر ملنے والی مسرت کا تو کوئی مول ہی نہ تھا۔ بالخصوص پردیس میں کسی ہم وطن کا اس کی ضرورت میں ہاتھ تھام لینے سے ملنے والی خوشی تو انمول ہوتی۔ رجب علی نے ایک دو نہیں، کئی کا ہاتھ تھاما تھا۔ ان میں سے بعض تو اس کے مرید ہی ہوگئے تھے۔

تبسم پاکستان سے آئی تھی۔ دو بچوں کی ماں جسے اس کے شوہر نے محض اپنی ماں بہنوں کے دباؤ میں آکر بلاوجہ ہی طلاق دے دی تھی۔ تبسم کی ایک رشتے دار جو برطانیہ میں اپنی فیملی کے ساتھ مقیم تھی، اس پر رحم کھا کر اسے کسی طرح برطانیہ لے آئی تھی۔ کئی سال بیچاری اپنی اس رشتے دار کی ''میڈ'' بنی فیملی کی خدمت گزار رہی۔ ایک روز وہاں سے نکلی تو برطانوی شہریت کے حامل ایک پاکستانی ڈرائیور ارشد کے ہتھے چڑھ گئی جو ہر عیب میں پورا تھا۔ تین عورتوں کو چھوڑ چکا تھا، چوتھی کی تلاش میں تھا۔ تبسم ملی تو اس نے تبسم سے شادی رچالی۔ جو کماتا، وہ اس کے عیبوں ہی کو پورا نہ پڑتا تھا، تبسم کو کیا دیتا۔ بیچاری اولڈ ہوم میں کام کر کے اپنا گزارہ کرتی اور کچھ ارشد کی نذر بھی کر دیتی۔ ثمینہ سے اس کی ملاقات مارگیٹ کی مسجد میں ہوئی تھی جہاں وہ دیگر خواتین کے ساتھ نمازِ جمعہ ادا کرنے آئی تھی۔

ثمینہ کو اس نے اپنی داستان سنائی تو ثمینہ اسے اپنے گھر کا پتا اور آنے کی دعوت دے آئی تھی۔ وہ آئی تو پھر آتی ہی رہی۔ ثمینہ اور رجب علی سے اس کا نیازمندانہ تعلق ہوگیا۔ ارشد سے رجب علی بخوبی واقف تھا اور اس کے عیوب سے بھی آگاہ تھا۔ دونوں کی وابستگی ایک ہی پیشے سے جو تھی۔

ارشد کی غلط حرکتوں کے باعث تبسم اس سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتی تھی مگر رجب علی نے اسے نیشنلٹی ملنے تک جیسے تیسے گزارہ کرنے کا مشورہ دیا جو اس نے مان لیا اور کئی سال رو دھو کر ارشد کے ساتھ گزارہ کرتی رہی لیکن جب اسے نیشنلٹی کے حصول کے لیے درکار مدت میں صرف دو ماہ باقی تھے، ارشد نے اسے خود ہی طلاق دینے کا فیصلہ کرلیا۔ اس موقعے پر رجب علی نے اپنے چند سرکردہ ساتھیوں کو اپنے ساتھ ملا کر ارشد کو اس کے اس فیصلے پر عملدرآمد سے باز رکھا اور اس کی بعض کمزوریوں کو ڈھال بنا کر اسے پابند کیا کہ وہ تبسم کو برطانوی قومیت ملنے تک طلاق نہ دے۔

ثمینہ کو برطانوی قومیت اور برطانوی شہری ہونے کے تمام حقوق ملنے کے بعد ارشد نے اسے طلاق دے دی۔ وہ خود بھی یہی چاہتی تھی۔ ارشد کے چنگل سے نکلنے اور خودمختار ہونے کے بعد اس نے ملازمت کر کے پاکستان میں اپنا گھر بنایا اور دونوں بچوں کی جنہیں وہ اپنے والدین کے پاس چھوڑ کر آئی تھی، شادی کی۔ وہ ثمینہ اور رجب علی کی ممنون رہتی تھی کہ ان کے مشورے اور مدد نے اسے پردیس میں اپنی اور پاکستان میں اپنے بچوں کی زندگی بنانے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ دونوں بچے جو اس کی سپورٹ سے پڑھ لکھ گئے تھے، انہیں وہ برطانیہ میں مقیم گھرانوں میں شادی کر کے اپنے پاس بلانے کی کوشش میں تھی۔ رجب علی کو وہ اپنا محسن قرار دیتی تھی۔

ایک اور پاکستانی نوجوان جنوری کی ایک یخ بستہ رات رجب علی کو ٹھٹھرتا، کپکپاتا ہوا ملا تھا۔ رجب ٹیکسی رینک پر سواری کے انتظار میں تھا کہ گاڑی کے اگلے شیشے پر کھٹکھٹاہٹ ہوئی۔ رجب علی سمجھا کوئی سواری ہے مگر اس نے کپکپاتے ہوئے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں رجب علی سے اس کی گاڑی میں بیٹھنے کی اجازت چاہی۔ اس کے دانت بری طرح بج رہے تھے۔ اس کی شکل و صورت، حلیہ اور انگریزی سے رجب علی کو یہ اندازہ کرنے میں دشواری نہ ہوئی کہ وہ وہاں نووارد تھا۔

''کار میں صرف بیٹھنا ہی ہے یا کہیں جانا بھی ہے؟'' رجب علی نے پوچھا۔

''کہیں نہیں سر! جب کوئی سواری آئی، میں اتر جاؤں گا۔ باہر سردی بہت ہے۔'' اس نے اردو میں جواب دیا۔

''بیٹھ جاؤ۔''

وہ گاڑی کے عقب سے گھوم کر رجب علی کے ساتھ بیٹھ گیا۔

''یہاں تو مار دینے والی سردی ہے سر!''

''اتنی رات اور سردی میں نکلنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟''

''ضرورت ہی تو تھی سر!''

''کیا مطلب؟'' رجب علی کو اس کے جواب سے تجسس ہوا۔

اس نے بتایا، وہ کراچی میں ایک سیاسی جماعت کا کارکن تھا۔ جماعت کے دو دھڑوں میں ٹارگٹ کلنگ شروع ہوئی تو وہ بھی مخالف پارٹی کی ہٹ لسٹ پر آگیا۔ جس دھڑے کا وہ کارکن تھا، اس کے کرتا دھرتاؤں نے اپنا

اثر رسوخ کام میں لا کر متعدد دیگر کارکنوں کی طرح اسے بھی ویزا دلوا دیا۔ انگلستان پہنچے اسے تیسرا دن تھا اور کوئی ٹھکانا نہ ہونے کے باعث وہ اپنا مختصر اسباب سفر کبھی اِدھر، کبھی اُدھر رکھ کر مارا مارا پھر رہا تھا۔ اس وقت بھی اس کا سفری بیگ قریبی پبلک فون بوتھ کی آڑ میں رکھا ہوا تھا جس میں انگلستان کی یخ بستہ سردی سے محفوظ رہنے کا کوئی سامان نہ تھا۔

''یار! کیسے لوگ ہو تم۔ ان لیڈروں کے پیچھے جنہیں نہ تمہاری جان کی پروا ہے، نہ تمہاری مجبوریوں کا احساس، تم لوگ آنکھ بند کر کے چل پڑتے ہو۔''

''غلطی ہو گئی سر! میرے باپ کی بھی توبہ جو میں اب کبھی سیاست میں حصہ لینے کا نام بھی لوں۔'' وہ دونوں کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولا۔

''سیاست میں حصہ لینا بری بات نہیں ہے یار! مگر سیاست میں اچھے اور برے کی تمیز کھو بیٹھنا بری بات ہے..... کھانا وانا کھایا تم نے؟''

''سر! جو پیسے جیب میں تھے، کل پرسوں میں خرچ ہو گئے۔'' وہ جھینپ کر بولا۔

''اتنا خرچیلا ہے تو۔''

''سر! باس نے جو پیسے دیے تھے، وہ انہوں نے کسی کو دینے کے لیے بھجوائے تھے۔ ائرپورٹ سے باہر نکلتے ہی اس نے تھوڑے سے پیسوں کے سوا باقی سب مجھ سے لے لیے۔ بس انہی پیسوں سے دو دن گزارہ کرتا رہا۔ اب جیب خالی ہے۔''

''اب؟''

''اب کچھ بھی نہیں سر..... ! پہلے سردی سے تو جان چھوٹے۔''

''سردی سے تو ابھی کئی مہینے جان نہیں چھوٹے گی۔''

''اتنی لمبی سردی؟''

''بیٹا جی! نام پوچھ لیتی ہے یہاں کی سردی۔''

''اللہ معافی! آپ گاڑی میں نہ بٹھاتے تو میری قلفی جم جاتی۔''

''جو کسی کام کی نہ ہوتی۔''

نوجوان جھینپ گیا۔

''نام کیا ہے تمہارا؟''

''ذیشان۔''

''چلو، پہلے کھانا کھلاؤں تمہیں۔''

''نہیں سر..... ! ٹھیک ہے، گزارہ ہو جائے گا۔''

''بیگ کدھر پڑا ہے تمہارا؟''

''وہ اُدھر..... کیبن کی آڑ میں۔''

رجب علی نے کار ریک سے نکالی۔ فون بوتھ کے نزدیک رک کر اس کا بیگ گاڑی میں رکھوایا اور گاڑی گھر کے راستے پر موڑ لی۔

ثمینہ حسب معمول اپنے کمرے میں سو رہی تھی۔ رجب علی نے اپنے چابیوں کے گچھے میں پڑی گھر کے دروازے کی چابی سے دروازہ کھولا، ساتھ آنے والے کو بٹھایا، کچن میں جا کر کھانا گرم کیا اور خود بھی اس کے ساتھ کھانا کھانے بیٹھ گیا۔ کھانے کے بعد چائے بنائی اس کے لیے اور اپنے لیے بھی، پھر ساتھ والے کمرے میں سونے کے لیے اسے بستر دیا۔

صبح کو نماز کے بعد اس کی خیر خبر لینے گیا تو وہ جاگا ہوا تھا۔ ''سر! بہت بہت شکریہ۔''

''کس بات کا شکریہ؟''

''مجھے پناہ دینے کا۔''

''چلو، ناشتا کرتے ہیں۔''

رجب علی اسے کاٹیج میں لے آیا۔ اس کے اور اپنے لیے ناشتا بنایا۔ دونوں بیٹھے ناشتا کر رہے تھے کہ ثمینہ بھی کاٹیج کی اوپری منزل سے نیچے آ گئی۔ رجب علی کو ایک اجنبی کے ساتھ ناشتا کرتے دیکھ کر چونکی اور اشارے سے اس کا سیاق وسباق پوچھا۔ رجب علی نے اشارے میں ہی جواب دیا کہ بتاتا ہوں۔ ذیشان نے ثمینہ کو سلام کیا۔ وہ سلام کا جواب دے کر اپنا ناشتا بنانے کچن میں چلی گئی۔ رجب علی کچن میں آیا تو اس نے ثمینہ کو دھیمی آواز میں اس اجنبی کا سیاق وسباق بتایا۔

''بڑے میاں! ہوش کے ناخن لیں۔ آپ تو بالکل ہی سٹھیا گئے۔ یہ شخص اگر رات کو ہمارے ساتھ کوئی واردات کر کے چلتا بنتا تو۔''

''ثمینہ! ہماری نیت نیک ہو تو کوئی ہمارا بال بھی بیکا نہیں کر سکتا۔ بیچارہ غریب الوطن ہے..... پاکستانی ہے..... رات جب میرے پاس آیا تو سردی سے اس کی حالت خراب تھی، بھوکا بھی تھا۔''

''آپ نے اسے رات کو بھی کھانا کھلایا ہوگا؟''

''یار! ایک بندے کو کھانا کھلا دینے سے کچھ کال نہیں پڑ گیا ہوگا تمہارے کچن میں۔ جب میں اس ملک میں آیا تو میرا بھی کسی نے ہاتھ تھاما تھا۔''

''بنے رہیں ایدھی۔''

''جئے ایدھی!''

ناشتے کے بعد رجب علی کام پر جاتے ہوئے اسے بھی

ہمراہ لے گیا اور راستے میں اسے سیاسی پناہ حاصل کرنے کے طریق کار سے آگاہ کیا۔

’’لیکن انکل میرے پاس تو وکیل کے پاس جانے اور اس کی فیس ادا کرنے کو پھوٹی کوڑی بھی نہیں جیب میں۔‘‘

’’فکر مت کرو، میں پیسے دے دوں گا۔‘‘

’’تھینک یو انکل! ایک ایک پائی لوٹا دوں گا آپ کی۔‘‘

رجب علی اسے ایک قانون داں کے دفتر لے گیا۔ ایک اجنبی ہم وطن کی اعانت کرتے ہوئے رجب علی نہایت طمانیت محسوس کررہا تھا۔

ذیشان کی سیاسی پناہ کی درخواست متعلقہ حکام تک پہنچادی گئی۔ حسبِ قاعدہ اسے قیام وطعام کی سہولت مل گئی۔ ذیشان، رجب علی کو اکثر فون کرتا اور اس سے ملنے والی اعانت پر ہمیشہ شکرگزار رہتا۔ رجب علی کے دیے گئے پیسے واپس کرنے کی اس نے بہت کوشش کی مگر رجب علی نے پیسے واپس لینے سے انکار کردیا۔

تبسم اور ذیشان تو محض دو مثالیں تھیں۔ رجب علی نے گزرے برسوں میں پردیس میں نہ جانے کتنے ہم وطنوں ہی نہیں، غیروں کی بھی مدد کی تھی۔ وہ اپنا مشکل وقت اور اس مشکل وقت میں غیروں کی مدد آج بھی یاد رکھے ہوئے تھا۔ ریڈنگ کا گھر خریدنے میں پریتم سنگھ کی مدد اسے اکثر یاد آتی تھی۔

رجب علی کو ایک بیگانے معاشرے میں اپنے حلقۂ احباب میں وہ محبت اور یگانگت حاصل تھی جو کسی کو قسمت ہی سے ملتی ہے مگر اس کے باوجود وہ اکثر خود کو تنہا اور تہی دامن محسوس کرنے لگتا۔ کبھی اسے اپنے بچے یاد آنے لگتے، کبھی ماں اور کبھی بہن بھائی۔ چھ بہن بھائیوں میں وہ واحد تھا جو زندہ تھا۔

رجب علی خلوت میں اپنی کتاب زندگی کے اوراق پلٹتا تو اسے گزرا وقت صدیوں پرے محسوس ہوتا، گزری حیات اسے خواب لگتی۔ اس خواب میں اس نے اپنے جسم و جاں پر کتنے عذاب سہے تھے...... اوائل عمر میں مہاجرت کی صعوبت، عسرت، ماں، بہنوں کی بے بسی اور بیچارگی، روٹی کی طلب، روٹی کی چاہ میں اپنوں سے دوری کا درد، اپنی زمین سے پاؤں ہٹ جانے کا دکھ، محبوب بیوی کی بے وفائی کا عذاب، گھر ٹوٹنے کا سانحہ۔ بچوں سے دوری کی کلفت، غم جاناں کے ساتھ غم دوراں بھی۔ اس کی حیات سرتاپیر کلفتوں میں ڈوبی ہوئی تھی۔ ماں اور آپا جن سے وہ اپنے دل کی ہر بات کہہ دیا کرتا تھا، اپنی اپنی قبر میں جا سوئی تھیں...... ان سے دوبارہ ملنے کی چاہ رجب علی کے دل کو ناقابل بیان درد سے دوچار کردیتی۔ نہ جانے دوبارہ کب ملنا تھا...... برسوں بعد...... قرنوں بعد...... روزِ محشر...... جہاں ہر ایک کو اپنی پڑی ہوگی۔ ماں اور آپا سے پہچان بھی پائیں گی کہ نہیں۔

رجب علی کا دل اس خیال سے دکھ میں ڈوب ڈوب جاتا کہ اربوں، کھربوں یا شاید اس سے بھی زیادہ مدت سے چلتی کائنات میں انسان کی مختصر سی حیات اور اس چھوٹی سی زندگی میں بھی اتنی آزمائشیں، اتنے دکھ، اتنے آلام، اتنے عذاب...... اور انسان ایسا ناقص العقل کہ اس قلیل مدتِ حیات کو عذابوں میں گزار دیتا ہے...... بڑے خسارے میں ہے آدم خاکی۔

رجب علی کو اپنی اس غلطی پر بھی پشیمانی ہوتی کہ پردیس آنے کے بعد وہ اپنی ہی زندگی میں الجھا رہا تھا۔ اس نے اپنے بہن بھائیوں اور ان کے بچوں کا ہاتھ تھامنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ پردیس میں وہ بے شک بہت سوں کے کام آتا رہا تھا مگر اس کے اپنے کہاں تھے؟ اول خویش بعد درویش!

برطانیہ میں ایک دو نہیں، سیکڑوں، ہزاروں خاندان ایسے تھے جو اپنی خوشحالی اور فارغ البالی کے لیے اس فردِ واحد کے مرہونِ منت تھے جو روشن مستقبل کی چاہ میں اکیلا گھر کے آنگن سے نکلا تھا اور اس نے اپنی ہی نہیں، اپنے قریبی رشتوں کی زندگی کو بھی گل وگلزار کردیا تھا۔

ثمینہ کا اپنا خاندان بھی ایسا ہی خاندان تھا۔ گزشتہ صدی کے چھٹے عشرے کی ابتدا میں ثمینہ کے دادا پاکستان میں ایک ٹرک ڈرائیور تھے، اپنے بچوں کا مستقبل بہتر بنانے کی خاطر وطن سے نکل کر پردیسی ہوئے تھے۔ پردیس میں فونڈریوں اور فیکٹریوں میں اپنی جوانی کے دن بتا کر پہلے بیوی اور آٹھ بچوں کو بتدریج اپنے پاس بلایا پھر دوسرے قریبی رشتے داروں کا ہاتھ تھاما۔ کڑی سے کڑی مل کر زنجیر بنتی چلی گئی۔ آج سب خوشحال تھے۔ پردیس ہی نہیں، وطن میں بھی ان لوگوں نے اپنی جڑیں انتہائی گہری کرلی تھیں۔ ثمینہ اور اس کے خاندان والوں کے ٹھاٹ باٹ دیکھ کر کون یقین کرسکتا تھا کہ یہ چمک دمک ایک اَن پڑھ پاکستانی ٹرک ڈرائیور کی مرہونِ منت تھی۔

رجب علی اپنا احتساب کرتے ہوئے اکثر سوچتا کہ اگر وہ صرف اپنی ذاتی زندگی کے حصار میں نہ رہتا تو شاید اس کے خاندان کی تاریخ بھی مختلف ہوتی...... اس کا گھر بندھا رہتا...... بچے اس کے ساتھ ہوتے...... اور شاید

شیطان کو بھی اس کے اور نشاط کے درمیان آنے کا راستہ نہ ملا ہوتا...... ایک بڑی کھانے کی میز کے گرد وہ، اس کے بال بچے اور شاید کوئی قریبی رشتے دار بھی ساتھ بیٹھے ایک منہ بولے خاندان کی تصویر و تفسیر بنے ہوتے۔
مگر اب کیا ہوسکتا تھا۔

☆☆☆

طویل مشقت اور زندگی کی بہت سی آزمائشوں سے گزرنے کے بعد بالآخر رجب علی ریٹائر ہوگیا۔ سلطنتِ برطانیہ کا نمک خوار اور ٹیکس گزار، تارکِ وطن جس نے حکومتِ برطانیہ سے گزارہ الاؤنس لے کر زندگی گزارنے کے بجائے اس کی معیشت میں اپنا حصہ ڈالا تھا...... ایک ان پڑھ آدمی جو بہتر مستقبل کی تلاش میں اپنی نوجوانی میں صحنِ وطن سے نکلا اور پردیس میں صعوبتیں کاٹ کر پڑھے لکھوں کی سی سمجھ بوجھ کا حامل ہوگیا تھا۔ اس نے ٹھوکروں سے منزل کا پتا پایا تھا۔ برطانیہ جیسے دیس میں بھی جہاں بلا تخصیص مرد و زن اور ذات پات، تمام شہریوں کو مساوی حقوق حاصل ہیں، ان گنت ٹیکسی ڈرائیورز ریٹائرمنٹ کے بعد فقط پنشن پر گزارہ کرتے ہیں، رجب علی پے در پے آزمائشوں کے بعد بھی اپنی ریٹائرمنٹ کے وقت خالی ہاتھ نہیں تھا۔ برطانیہ میں اس کے تین مکانات اور اچھا خاصا بینک بیلنس تھا۔ پاکستان میں بھی اس نے جائداد بنالی تھی۔ ثوابِ دارین کے لیے ایک مسجد تعمیر کرائی تھی...... حاجت مندوں کی مدد کرتا...... اس کا دل غنی تھا۔

ریٹائرمنٹ کے بعد ثمینہ کے ہمراہ اس کا پہلا سفر سوئے حرم تھا اور وہاں سے روضۂ رسول ﷺ پر حاضری۔

پھر پاکستان...... تنگدستی کے باوجود اس کی نوعمری کے یادگار دنوں کی سرزمین...... اس کے بڑوں کے خواب آزادی کی تعبیر...... اس کی ماں اور بہن بھائیوں کی آخری آرام گاہ...... رجب علی خود بھی اسی مٹی میں دفن ہونے کی خواہش رکھتا تھا۔

ریٹائرمنٹ کے بعد وہ اور ثمینہ نگر نگر گھومتے پھرے۔ حج، عمرہ اور زیارات۔ ثمینہ کا جب جی چاہتا، اسے رجب علی سے بس اتنا کہنے کی دیر ہوتی کہ وہ عمرے کے لیے جانا چاہتی ہے۔ دونوں کتنی مرتبہ اس مقدس سرزمین پر گئے، ان کے پاسپورٹس پر ہی شمار کیا جاسکتا تھا۔

سعودی عرب ہی نہیں، ثمینہ کی فرمائش پر رجب علی اسے کئی دیگر ممالک بھی سیر و سیاحت کے لیے لے کر گیا۔

قسمت کی بات تھی، ثمینہ اپنے گھر میں ان آسائشوں میں زندگی گزار رہی تھی جن کا وہ اپنے سابق شوہر کے گھر میں رہتے ہوئے تصور بھی نہ کرسکتی تھی...... اور نشاط شبانہ روز محنت سے ایک چھوٹا سا ریسٹوران چلا رہی تھی۔ بعض انسانوں کی قسمت شاید اس لیے بگڑتی ہوتی ہے کہ اس بگاڑ سے کسی اور کی قسمت سنورنی ہوتی ہے۔
رب کی حکمت، رب ہی جانے!

☆☆☆

رجب علی پاکستان جارہا تھا...... صرف ملنے ملانے نہیں...... وطن کی معیشت میں حتی المقدور اپنا بھی حصہ ڈالنے...... بہت رہ لیے پردیس...... اور اپنی توقع سے زیادہ پردیس کی مہربانیاں بھی سمیٹ لیں۔ ریٹائرمنٹ ہوگئی تو کیا، ابھی دم خم تھا۔ اپنوں کا ہاتھ نہ تھامنے کا پچھتاوا اپنی جگہ...... جو موجود تھے، ان کے ہاتھ تو مضبوط کیے جاسکتے تھے۔ رجب علی کو ریڈیو ٹیکسی بزنس کا تجربہ تھا۔ وطنِ عزیز میں ترقی یافتہ ملکوں کے سے متعدد کاروبار رواج پاچکے تھے۔ سرمائے کی ضرورت تھی اور وہ تھا رجب علی کے پاس۔

ثمینہ اس کے ہمراہ نہ جارہی تھی بلکہ اس نے تو رجب علی کو بھی جس ارادے سے وہ پاکستان جارہا تھا، روکنے کی کوشش کی تھی۔ ”بڑے میاں! اب کسی چکر میں نہ پڑیں...... بہت کرلیا کام...... اب آرام سے بیٹھیں۔ آپ کو معلوم ہے ناوہاں کتنی مشکلات ہیں۔“

”ارے ثمینہ! قبر میں جاکر لیٹ ہی جانا ہے...... جب تک دنیا میں ہیں، کام کرنا ہی اچھا ہے۔“

”آپ نے ساری زندگی یہاں گزاری ہے جہاں زیادہ جھمیلے نہیں، قانون کی عملداری ہے۔ وہاں کے حالات روزانہ دیکھتے تو ہیں یہاں ٹیلی ویژن پر۔“

”اللہ مدد کرے گا۔ نیت صاف، منزل آسان۔“

”کتنے دن کو جارہے ہیں؟“

”کچھ کہہ نہیں سکتا...... کام میں وقت تو لگتا ہے۔“

رجب علی کی روانگی سے دو دن پہلے طیب کا فون آگیا۔ جب سے اپنے بال بچوں کے ساتھ الگ ہوگیا تھا، کبھی کبھار فون کرنے لگا تھا۔ رجب علی نے اس سے پاکستان جانے کا ذکر کیا تو وہ بولا۔ ”کیوں جارہے ہیں ڈیڈ؟“

”اپنا وطن ہے یار!“

”حالات اچھے نہیں ہیں وہاں۔“

”حالات انسان بناتے ہیں۔“

”اسی لیے تو کہہ رہا ہوں، نہ جائیں۔ غربت، ہڑتالیں، ٹارگٹ کلنگ اور بھی لائٹ تو کبھی پانی نہیں۔ کیوں

پریشانی میں ڈالتے ہیں خود کو اس عمر میں۔''

''وطن کا قرض ہے مجھ پر..... تھوڑا تو اتار دوں۔''

''کیا قرض؟''

رجب علی نے اسے اپنے ارادے سے آگاہ کیا تو وہ بدک کر بولا۔''سوری ڈیڈ! آپ غلطی کر رہے ہیں۔''

''غلطی کر کے ہی آدمی سیکھتا ہے۔''

''آپ دونوں جا رہے ہیں؟''

''نہیں، صرف میں۔ ثمینہ اور اس کے گھر والے تو اس ملک کو ہی اپنا وطن سمجھ بیٹھے ہیں۔''

''ٹھیک ہے نا...... اس ملک نے باہر سے آنے والوں کو کیا نہیں دیا۔'' طیب بولا۔

''مہربانی ہے ان لوگوں کی مگر عالمی سیاست ایک بساط ہے۔ کون، کس وقت، کون سی چال چل دے، کچھ پتا نہیں۔''

''کیوں جا رہے ہیں آپ؟''

''اپنا دل مطمئن کرنے تاکہ یہ پچھتاوا نہ ہو کہ جو میں کر سکتا تھا، وہ بھی نہیں کیا میں نے۔''

''اپنا خیال رکھیے گا۔''

''میری فکر نہ کرو۔ اپنی فیملی کے لیے جو کر سکتے ہو، کر جاؤ۔''

''اوکے ڈیڈ! وش یو آل دی بیسٹ!''

''تھینک یو...... اینڈ سیم ٹو یو مائی سن!''

☆☆☆

رجب علی کو خدا حافظ کہنے کے لیے ثمینہ بھی ہیتھرو آنا چاہتی تھی مگر رجب علی نے اسے منع کر دیا۔''میں تو اڑ جاؤں گا، تمہیں اکیلے واپس آنا پڑے گا...... یہیں سے خدا حافظ!''

''آپ کو بہت مس کروں گی۔ کون میرے لیے پانی، دودھ اور تیل کی بوتلوں کے ڈھکن ڈھیلے کر کے رکھے گا۔ میرا انگوٹھا تو کام ہی نہیں کرتا۔ کون یہ خیال رکھے گا کہ گروسری میں کیا، کیا لانا ہے۔'' ثمینہ جذباتی ہو گئی۔

''صرف اس لیے مس کرو گی مجھے...... بہت خود غرض ہو۔'' رجب علی نے مذاقاً کہا۔

''عادی ہو گئی ہوں آپ کی۔ اتنی لمبی مدت ساتھ رہ کر تو میاں بیوی کی صورتیں بھی ایک جیسی ہو جاتی ہیں۔''

''کوئی بات نہیں...... نئی صورت والی لے آؤں گا۔ ایک کی گنجائش ہے ابھی۔''

''قتل کر دوں گی اسے اور آپ کو بھی۔'' ثمینہ نے اسے گھورا۔

''چلتا ہوں بڑی بی!''

''خبردار! جو مجھے بڑی بی کہا [illegible] کی نشانی!''

آپ کی نشانی!

ثمینہ نے کس درد نہاں پر انگلی رکھ دی تھی۔ [illegible] برسوں پہلے اس کی نہیں رہی تھی۔

☆☆☆

ہیتھرو ائرپورٹ پر رجب علی لفٹ سے نکل کر سامان لیے چیک اِن کو جا رہا تھا کہ اسے ایک جانب سے آواز سنائی دی۔''ڈیڈی!'' وہ تھم گیا۔

دبلی پتلی، نازک سی نہیں، فربہ اندام عورت نگار کے چہرے کے نقوش لیے اس کی طرف بڑھ رہی تھی۔

رجب علی دم بخود رہ گیا۔ کتنے برسوں بعد وہ نگار کو اس کے بدلے ہوئے روپ میں دیکھ رہا تھا۔

وہ اس کے نزدیک آ کر''سوری ڈیڈی'' کہتے ہوئے اس کے سینے سے لگ گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

''مجھ سے غلطی ہوئی...... مجھے معاف کر دیجیے۔'' اس نے روتے ہوئے کہا۔

''کچھ غلطی میری بھی رہی ہوگی۔'' رجب علی نے بوجھل آواز میں کہا۔

نگار اس کے سینے سے اپنا سر ہٹا کر اپنی بھیگی آنکھوں سے اسے حیرانی سے دیکھنے لگی۔

''جب کوئی گھر ٹوٹتا ہے تو اس میں تھوڑی بہت دونوں فریقین کی غلطی ہوتی ہے اور جب اولاد راستے سے بھٹکتی ہے تو کچھ غلطی والدین کی بھی ہوتی ہے۔ شاید میں باپ ہونے کا حق ادا نہیں کر سکا۔'' رجب علی نے کہا۔

''نہیں ڈیڈی......! ایسی بات نہیں۔ ہمیں آپ کی قربانیوں کا احساس ہے۔ مجھے یاد ہے جب ہم پاکستان میں تھے، ہم چاروں کے برتھ ڈے پر آپ چاہے ایک ہفتہ ہی کو، پاکستان ضرور آتے تھے۔ وہاں ہماری کوئی عید آپ کے بغیر نہیں گزری۔''

''مجھے اپنی کوتاہی کا اعتراف ہے۔ میں نے تم لوگوں کو وہ سب کچھ دینے کی کوشش کی جو خود مجھے نہیں مل سکا تھا...... میں بھول گیا تھا کہ مادی ضرورتوں کے علاوہ بھی اولاد کے کچھ حقوق ہوتے ہیں والدین پر...... جذباتی تقاضوں اور روحانی ضرورتوں کا پورا کرنا بھی لازمی فریضہ ہوتا ہے والدین کا...... وہ گھر بہت اچھا ہوتا ہے جو بے شک بڑا نہ ہو، مادی آسائشیں بھی نہ ہوں مگر اس گھر میں کنبے کے افراد کا آپس میں مضبوط رابطہ ہو...... جڑے رہتے تو ہماری

فیملی آئیڈیل ہوتی۔'' رجب علی کے لہجے میں ملال تھا۔

''شاید نظر لگ گئی کسی کی۔'' نگار کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

''شاید......! تمہیں طیب نے بتایا ہوگا کہ میں جا رہا ہوں؟''

''جی...... واپسی کب ہے؟''

''کچھ پتا نہیں۔''

''کیوں؟'' وہ چونکی۔

''بہت رہ لیے بے وطن...... اب کچھ وقت اپنے وطن میں بھی تو گزارنا چاہیے۔''

''آئی ول مس یو...... آئی لو یو ڈیڈ...... وی آل لو یو...... بس حالات ہی کچھ ایسے ہو گئے کہ......'' نگار نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

''تمہارا بیٹا؟'' رجب علی نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔

نگار نے چونک کر رجب علی کو یوں دیکھا جیسے اسے اپنی سماعت پر اعتبار نہ ہو پھر سر جھکا کر بولی۔ ''ٹھیک ہے...... میں اکثر اسے آپ کے بارے میں بتاتی ہوں۔ بہت اشتیاق ہے اسے آپ سے ملنے کا۔''

''تمہارے بھائی بتا رہے تھے کہ تم نے اسے قرآن مجید خود پڑھایا ہے۔''

''الحمدللہ...... نماز بھی پڑھتا ہے۔''

''گڈ!''

''اپنی غلطی کے ازالے کے لیے مجھے اتنا تو کرنا ہی چاہیے تھا۔''

''خدا استقامت دے اسے۔''

''آمین...... آپ واپس آئیں گے تو آپ کی اجازت سے کہیں نہ کہیں ملواؤں گی اسے آپ سے۔'' اس نے توقف کیا پھر ہچکچاتے ہوئے بولی۔ ''ڈیڈی......! مام بہت بیمار ہیں۔''

رجب علی خاموش رہا۔

پاکستان جانے والی پرواز کے مسافروں کو چیک ان کے لیے کہا جا رہا تھا۔

''اپنا بہت سا خیال رکھیے گا۔'' نگار ایک بار پھر رجب علی کے سینے سے لگ کر رونے لگی۔

رجب علی کی اپنی آنکھوں کے کنارے بھی بھیگ گئے۔

''تم سب مل کر دُرِ شہوار کو بھی کسی اچھے آدمی کے ساتھ شادی کے بندھن میں باندھنے کی کوشش کرو۔''

''وہ نہیں کرے گی ڈیڈی!''

رجب علی ایک ٹھنڈی سانس بھرنے پر مجبور ہوا۔

کاش! کوئی گھر کبھی نہ ٹوٹے...... خواب کبھی نہ بکھریں۔

☆☆☆

رجب علی کو پاکستان گئے چار ہفتے گزر گئے تھے۔ واپسی کی سیٹ اوپن تھی۔ پہلی بار تھا جب ثمینہ اس کے ساتھ نہ تھی ورنہ رجب علی سے اس کی شادی کے بعد طویل رفاقت میں رجب علی کا جب بھی برطانیہ سے باہر سفر پر جانا ہوا، وہ اس کے ساتھ ہوتی تھی۔ اس مرتبہ نہ جانے کا سبب رجب علی کا پاکستان میں ممکنہ طویل قیام تھا، ثمینہ اس ملک میں حاصل سہولیات اور طریقِ حیات کی اتنی عادی ہو چکی تھی کہ دو چار ہفتوں تک کہیں اور عارضی قیام کی حد تک تو گوارا تھا، اس سے زیادہ اور وہ بھی رجب علی کے رواں ارادے کے پیش نظر وہ پاکستان میں طویل قیام کے حق میں نہ تھی۔ ایک وجہ اور بھی تھی...... رابیل اور اس کے بچے...... وہ اب دو بچوں کی ماں تھی۔ گو اس کی خانگی زندگی خوشگوار نہ تھی مگر بچوں کی خاطر وہ اس ناگواری کو سہنے پر مجبور تھی۔

ثمینہ تمام سہولیات کی دستیابی کے باوجود رجب علی کی دوری شدت سے محسوس کر رہی تھی۔ گو رجب علی کی اور اس کی روزانہ ہی دو تین مرتبہ فون پر بات ہو جاتی مگر اس کے باوجود ثمینہ کو اس کی کمی محسوس ہوتی۔ وہ تھا ہی ایسا...... ایک پرانی چوٹ کے سبب دائیں ہاتھ کے انگوٹھے میں کمزوری کے باعث وہ کسی بوتل کا ڈھکن کھولنے میں دقت محسوس کرتی تو اسے رجب علی یاد آتا...... سودا سلف لے کر آتی تو چیزوں کو ان کی مخصوص جگہوں پر رکھتے ہوئے رجب علی کی کمی محسوس ہوتی...... سودا سلف لانے میں کوئی شے لانا بھول جاتی تو رجب علی یاد آتا...... دردِ شقیقہ میں مبتلا ہوتی تو رجب علی کی دوری اس کی آنکھوں کو آنسوؤں میں ڈبو دیتی۔ جب بھی اسے آدھے سر کا درد ہوتا، رجب علی دبے پاؤں اس کی تیمارداری میں مصروف رہتا...... اسے اپنے بہن بھائیوں، سہیلیوں سے ملنے جانا ہوتا تو وہ کام چھوڑ کر اسے مقام مطلوب تک پہنچانے اور پھر واپس لینے بھی آ جاتا...... سفر پر جانا ہوتا تو وہ قدم قدم پر اس کی ناز برداری کر کے ہر سفر کو اس کے لیے یادگار بنا دیتا۔ ثمینہ تو اس مرتبہ بھی ساتھ گئی ہوتی اگر رجب علی کا وہاں طویل قیام کا ارادہ نہ ہوتا۔

ثمینہ اکثر سوچتی، نشاط اور مہر النساء کیسی عورتیں تھیں جنھوں نے رجب علی جیسے آدمی کی قدر نہ کی تھی۔ وہ تو اپنے بہن بھائیوں سے اور اپنے حلقۂ احباب میں نہایت فخر سے کہتی تھی کہ رجب علی سے اس کی شادی ہونے سے پہلے اس

کے سابقہ دورِ حیات میں کوئی ایسی نیکی ہوئی تھی جس کی جزا میں اللہ نے اس کا مقدر رجب علی جیسے اچھے شوہر سے جوڑ دیا تھا۔

ثمینہ اسے کاروبار کے ارادے سے پاکستان نہیں جانے دینا چاہتی تھی۔ ایک روز اس نے قدرے خفگی سے کہا۔ ''آپ کو یہاں کیا کمی ہے۔ بہت کام کرلیا، ریٹائر ہوگئے، پنشن آتی ہے، اچھا گزارہ ہے۔ ہمیں کسی چیز کی کمی نہیں۔ جب جی چاہتا ہے، اللہ کے گھر چلے جاتے ہیں، ہالیڈیز کے لیے جہاں جانا چاہتے ہیں، اپنے ٹریول ایجنٹ کو فون کیا، ٹکٹ لیا اور چل پڑے۔ پاکستان بھی سال میں ایک دو مرتبہ چلے ہی جاتے ہیں مگر وہاں جاکر بزنس کرنا میری سمجھ سے باہر ہے۔''

''کیوں سمجھ سے باہر ہے؟'' رجب علی اس کے پاس آبیٹھا اور نہایت پیار سے بولا۔ ''ثمینہ! ہم پردیسی پرندے ہیں...... پرندے دانے دنکے کی تلاش میں کتنی ہی اونچی اُڑان بھر جائیں، شام کو اپنے آشیانوں کی طرف ہی لوٹتے ہیں۔ وطن ہمارا آشیانہ ہے...... سمجھ رہی ہو نا میری بات؟''

''جہاں آپ اپنے قریبی لوگوں کے ساتھ مل کر بیٹھ جائیں، وہی آپ کا وطن بن جاتا ہے۔ میرا وطن تو اب یہی ہے۔'' ثمینہ بولی۔

''نہیں یار! ایسا نہیں ہے...... وطن وہ ہوتا ہے جہاں آپ اپنے عقیدے اور نظریے کے مطابق آزاد زندگی بسر کرسکیں۔''

''یہاں کون سی پابندی ہے؟''

''بھول گئیں انڈر گراؤنڈ اسٹیشن والا واقعہ...... شرپسندوں کے ڈر سے تم نے ان دنوں حجاب لینا ہی ترک کردیا تھا۔ ایسڈا میں ایک گورا...... یو بلڈی پاکی کہتے ہوئے بلاوجہ ہی مجھ پر چڑھ دوڑا تھا اور تم خوف سے چیخنے لگی تھیں۔''

''کچھ دنوں میں سب ٹھیک بھی تو ہوگیا تھا۔''

''ہمیشہ ٹھیک نہیں رہے گا۔''

''خیر، میں تو کہتی ہوں نہ جائیں۔''

''میری جڑیں وہاں گڑی ہیں ثمینہ...... مجھے جانا ہے۔''

''شوق پورا کرلیں...... ہمارا مرنا جینا تو بس اب یہیں ہے۔''

☆☆☆

رجب علی پڑھا لکھا آدمی نہیں تھا۔ اس نے زندگی میں جو کچھ سیکھا، تجربے اور محنت کی بنیاد پر۔ پاکستان میں ابتدائی چند دن تو اسی سوچ بچار میں گزرے کہ کیا

جائے۔ بہن بھائیوں کی اولاد سے مشاورت بھی کچھ نتیجہ خیز نہ رہی بلکہ وہ اکثر یہ سوچنے پر مجبور ہوجاتا کہ اس تعلیم یافتہ نسل نے اگر تعلیم کو زیورِ ہستی بنانے کے بجائے محض روٹی کمانے کا ذریعہ ہی بنانا تھا تو تعلیم سے بے بہرہ ہونے کے باوجود روٹی تو اس نے بھی کما کھا ہی لی تھی بلکہ آج کے بعض تعلیم یافتہ لوگوں سے اچھی ہی۔

بہت سوچ بچار کے بعد بالآخر اس نے اس کام میں ہاتھ ڈالنے کا فیصلہ کیا جس کا اسے بھرپور تجربہ تھا۔ ریڈیو ٹیکسی اس کا آزمودہ میدان تھا۔

ابتدائی طور پر چند کاروں، ڈرائیورز اور دو ریڈیو آپریٹرز سے کمپنی کا آغاز کیا گیا۔ اسٹاف سے بارہ بارہ گھنٹے ڈیوٹی کا معاہدہ کیا تھا جو کام بڑھ جانے کی صورت میں آٹھ آٹھ گھنٹے ڈیوٹی کی صورت میں قابلِ تجدید تھا۔

گاڑیاں روڈ پر لانے سے قبل قرآن خوانی ہوئی، کاروبار میں برکت کے لیے دعا مانگی گئی۔ رجب علی نے افتتاحی خطاب میں کہا۔ ''کمپنی کا مشن عوام کو بہتر سفری سہولت فراہم کرنا ہے۔ آرام دہ سفر پر ایک عام آدمی کا بھی اتنا ہی حق ہے جتنا خاص لوگوں کا۔ امیر لوگ اگر بہترین اور آرام دہ ذاتی گاڑیوں میں سفر کرسکتے ہیں تو ایک عام آدمی کو ذاتی نہ سہی، کرائے کی آرام دہ ٹیکسی میں سفر کا حق تو ہے...... کمپنی کا لوگو ہی ''آرام دہ سفر سب کے لیے'' ہے۔ کمپنی نہ سواریوں سے زائد کرایہ لے کر ان کا استحصال کرے گی، نہ ہی اپنے اسٹاف کا حق مارے گی...... میں خود ایک ٹیکسی ڈرائیور رہا ہوں، بلکہ ہوں...... مجھے معلوم ہے ایک ٹیکسی ڈرائیور کی زندگی کیا ہوتی ہے...... رات کے وقت جب لوگ جرائم پیشہ افراد کی وارداتوں کے خوف سے اپنی گاڑیوں کے شیشے چڑھا کر اور دروازے لاک کرکے سفر کرتے ہیں، ایک ٹیکسی ڈرائیور اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر ہر قسم کی سواری اٹھانے کا خطرہ مول لیتا ہے...... کون جانے کہ سواری کے روپ میں کوئی لٹیرا ہے، دہشت گرد یا خونی...... میرا ایمان ہے کہ اگر آپ خود نیک نیت ہیں تو اللہ آپ کی حفاظت کرتا ہے۔ کمپنی کا مقصد معاشرے کے گنے چنے افراد ہی کو سہی، روزگار فراہم کرنا بھی ہے...... ہم سب کو مل کر پاکستان کی ترقی میں اپنا حصہ ڈالنا ہے۔''

ملازمت پر رکھے گئے ڈرائیوروں میں سے ایک پڑھے لکھے نوجوان ڈرائیور نے رجب علی کے افتتاحی خطاب کے بعد قدرے شوخی سے کہا۔ ''سر! ان شاءاللہ ہم نیا پاکستان بنائیں گے۔''

رجب علی نے اس کی شوخی کا برا نہیں منایا۔ جس معاشرے میں وہ اپنی زندگی کی تقریباً نصف صدی گزار کر آیا تھا، اس نے اسے برداشت اور دوسرے کا مؤقف احترام سے سننے کا عادی بنا دیا تھا۔ اس نے دھیمی سی مسکراہٹ کے ساتھ نوجوان ڈرائیور کو دیکھا اور نہایت نرمی سے دوستانہ لہجے میں بولا۔ ''بیٹا! نئے، پرانے کے چکر میں پڑنا بیکار ہے...... مجھے تو اپنا موجودہ پاکستان بھی پیارا ہے اور پرانا پاکستان بھی عزیز ہے...... جب سب کی نیتیں صاف تھیں...... بڑی بڑی سڑکیں، فلائی اوورز، انڈر پاسز، موٹروے اور میٹرو نہیں تھے مگر سڑکوں پر امن تھا، لوگوں کی جان و مال کو تحفظ تھا، زندگی بے خطر تھی، بے وجہ لاشیں نہیں گرائی جاتی تھیں۔ دہشت گردی کس چڑیا کا نام ہے، کوئی جانتا بھی نہ تھا۔ معاشرے میں بوڑھوں کا احترام تھا، عورت کی عزت کی جاتی، ہر بچے کو اپنا بچہ سمجھا جاتا تھا۔ آسائشیں بہت نہیں تھیں، بازاروں میں اتنی قسم قسم کی قیمتی چیزیں بھی نہیں سجی ہوتی تھیں۔ گھر چھوٹے مگر دل کشادہ تھے...... تب اتنی گاڑیاں بھی نہیں ہوتی تھیں سڑکوں پر مگر وطن کو اوج تک پہنچانے کا عزم مصمم تھا۔ وسائل کم تھے مگر حوصلے جواں...... روٹی کم تھی مگر نیتیں رجی ہوئی...... اپنے محلے کی دکان کے سامنے سرکاری گٹر کے ڈھکنے پر چوکڑی جما کر ہم لڑکے آپس میں ہنسی مذاق کرتے، گانے گاتے، لطیفے سناتے، ایک دوسرے سے روٹھتے مگر مان بھی جاتے تھے۔'' رجب علی اپنے ماضی کی یادوں میں کھو کر جذباتی ہو گیا تھا۔ اس نے نوجوان ڈرائیور کو متانت سے دیکھا اور نرم لہجے میں بولا۔ ''بیٹا جی! مجھے تو اپنا وہ مفلوک الحال پرانا پاکستان بھی بہت اچھا لگتا تھا...... سچ پوچھو تو اس کی اور زیادہ قدر مجھے یہاں سے پردیس جا کر آئی...... یہاں میں اپنی ماں کی چارپائی سے اپنی چارپائی کی پٹی جوڑ کر بھوکے پیٹ مگر میٹھی نیند سویا کرتا تھا۔ ان دنوں شہر اتنا گنجان آباد، اتنا پھیلا ہوا بھی نہیں تھا۔ سمندر سے آنے والی ٹھنڈی ہوائیں سونے والوں کو لوری دیتی تھیں...... پردیس میں لمبی مشکل کاٹی ہے بچہ، تب کہیں جا کر چھاؤں ملی ہے...... کہاں تک سنو گے، کہاں تک سناؤں۔''

تالیاں بجیں اور رجب علی کی زندگی کے تمام دکھ ایک قطرۂ آب کی صورت اس کی پلک پر ٹھہر گئے۔

یہ ایک آنسو جو میری پلک پہ آ کے ٹھہر گیا ہے
اس ایک آنسو میں میری زندگی کی داستاں رقم ہے

☆☆☆

کام چل پڑا اور مسائل بھی۔ رجب علی کا عزم مصمم تھا مگر جسمانی قوت روبہ زوال تھی۔ قانون فطرت یہی ہے...... ہر عروج کو زوال...... آدمی کی عمر بڑھتی ہے تو قویٰ مضمحل ہونے لگتے ہیں۔ انگلستان میں اپنی ٹیکسی کمپنی کے زمانے میں رجب علی اکثر بیس بائیس گھنٹے کام کر کے بھی تھکن کا نام نہ لیتا تھا مگر اب تھوڑی دیر کی مصروفیت بھی اسے تھکا دیتی۔ آپا کا ایک بیٹا کاروبار میں اس کی نہایت خلوص اور ایمانداری سے معاونت کر رہا تھا۔ اس کے ہونے سے رجب علی کو نفسیاتی طور پر تقویت تھی۔

رجب علی بیمار ہو گیا اور ایسا کہ نہایت کمزور حالت میں اسے بغرضِ علاج انگلستان واپس جانا پڑا۔ جانے سے پہلے اس نے کاروبار اپنے بھانجے کو سونپا اور صحت بہتر ہوتے ہی دوبارہ پاکستان آنے کا وعدہ کیا۔

انگلستان واپس پہنچا تو ثمینہ نے جتایا۔ ''میں آپ کو منع کر رہی تھی نا کہ مت جائیں۔''

''تم کیا سمجھتی ہو پھر نہیں جاؤں گا؟ بیمار نہ پڑ جاتا تو ہرگز واپس نہ آتا۔ علاج وہاں بھی کروا سکتا تھا مگر واپس اس لیے آ گیا ہوں کہ میری ساری میڈیکل ہسٹری تو یہاں میرے ڈاکٹرز ہی جانتے ہیں۔''

''آئینے میں دیکھیں، چہرہ کیسے مرجھا گیا ہے۔'' ثمینہ نے تشویش ظاہر کی۔

''فکر مت کرو، پھر کھل اٹھے گا...... خزاں کے بعد بہار ہی آتی ہے...... میں کبھی کبھی سوچتا ہوں ثمینہ، منکرینِ آخرت کتنے اندھے اور عقل سے بے بہرہ ہیں...... خزاں کے موسم میں بے برگ و بار ہوئی شاخوں پر موسم بہار میں دوبارہ پھول، پتے نکل آنے پر بھی یہ نہیں سوچتے کہ ہم انسانوں کے مٹی میں مل جانے کے بعد ہمارا رب ہمیں بھی اسی طرح زندہ کرے گا...... نیکوکاروں کو جنت اور بدکاروں کو دوزخ کا وعدہ برحق ہے۔''

''جنت میں تین میں سے کس کو ساتھ رکھیں گے بڑے میاں؟'' ثمینہ نے مذاقاً کہا۔

رجب علی نے ایک گہرا سانس کھینچا پھر بولا۔ ''جو گزر گیا، سو گزر گیا...... ساتھ وہی رہتا ہے ثمینہ جو آخر تک ساتھ دیتا ہے۔'' سینے پر ہاتھ رکھ کر دھیرے سے کھنکھارنے کے بعد رجب علی نے کہا۔ ''لگتا ہے دل آہستہ آہستہ ساتھ چھوڑ رہا ہے۔''

''بس آ گئے بیکار باتوں پر۔'' ثمینہ نے آنکھیں دکھائیں۔

''ڈر گئیں!'' رجب علی دھیرے سے مسکرایا اور ثمینہ کے شانوں پر اپنا بازو دراز کرتے ہوئے بولا۔ ''ایک نہ

ایک دن کسی بہانے جانا تو ہے ثمینہ...... آپا کے بیٹے کو بتا دیا ہے میں نے کہ اگر میری مٹی پاکستان میں لکھی ہو تو مجھے فلاں مقام پر دفن کرنا۔"

"بس کریں۔" ثمینہ نے اسے شاکی نظروں سے دیکھا۔

"میرے بغیر رہ لوگی؟"

ثمینہ کی آنکھیں چھلک اٹھیں۔

"کیوں کرتے ہیں ایسی باتیں...... آپ کی صحیح قدر مجھے اس مرتبہ آپ کے پاکستان جانے کے بعد آئی۔"

رجب علی نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "ہم انسانوں کی بدقسمتی یہی ہے کہ ہمیں ایک دوسرے کی صحیح قدر بچھڑ جانے کے بعد ہی آتی ہے۔"

"جتنی محبت مجھے آپ سے ہے، اتنی تو میں نے اپنے ماں باپ سے بھی نہیں کی۔" ثمینہ نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

رجب علی نے اسے گلے لگا لیا۔

"اب میں آپ کو اکیلے کہیں نہیں جانے دوں گی...... ٹھیک ٹھاک گئے تھے، بیمار ہو کر لوٹے ہیں۔ میں آپ کے ڈاکٹر سے آج ہی ٹائم لیتی ہوں۔"

"عمر کا تقاضا ہے ثمینہ......! ورنہ پاکستان جا کر تو میں خود کو جوان محسوس کرنے لگتا ہوں۔"

"ارے چھوڑیں...... کیا رکھا ہے وہاں...... آپ سنتے نہیں لوگ وطن کے متعلق کیا کیا کہتے ہیں۔"

رجب علی یکلخت بلبلا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ "لوگ بکواس کرتے ہیں...... حاسد ہیں، افواہیں پھیلاتے ہیں۔" اس نے ایک پل کو توقف کیا اور اپنی انگشتِ شہادت کھڑی کر کے کامل یقین سے بولا۔ "پاکستان امید ہے...... ہمارے لیے...... مسلم امّہ کے لیے...... ایک اللہ اور رسول ﷺ پر یقین رکھنے والوں کی دنیا کے لیے۔ میری بات یاد رکھنا ثمینہ! پاکستان دنیا کا مستقبل ہے۔"

"بہت معصوم ہیں آپ۔" ثمینہ دھیرے سے ہنسی۔

"پاکستان زندہ باد!" رجب علی نے ہاتھ اونچا کر کے کہا اور دوسرا ہاتھ اپنے سینے پر رکھ لیا...... دل کی لے مدھم تھی۔

☆☆☆

ایک کچے گھر کے آنگن سے شروع ہونے والا رجب علی کا سفر بہت طویل تھا...... ایک دور تھا جو بیت گیا...... ایک عہد تھا جو گزر گیا۔ اس سفر میں رجب علی کو کہیں دھوپ ملی تھی، کہیں چھاؤں۔ اس کی زندگی تجربات و حوادث اور آلام و مصائب سے عبارت تھی۔ ترکِ وطن نے اسے غم سہنا اور زندگی سے نباہ کرنا سکھایا تھا، اس کی سوچ کو گہرائی اور دل کو کشادگی دی تھی...... بے علم ہونے کے باوجود بہت سے پڑھے لکھوں سے زیادہ علم دیا تھا۔ وہ روٹی کی تلاش میں گھر سے نکلا تھا، زندگی نے خوان ہائے نعم اس کے سامنے سجا دیے تھے۔ وطن سے دوری نے اس کے دل کو وطن کی محبت سے لبریز کر دیا تھا۔ شاید وہ اپنے وطن سے نہ نکلا ہوتا، نگر نگر نہ گھوما ہوتا تو اس کی سوچ محدود ہوتی اور دل وطن پرستی کے جذبے سے عاری۔

پردیس نے اس پر اپنے دیس کی اہمیت اور محبت اس حد تک واضح کی تھی کہ اس محبت میں اس کی ذاتی زندگی کے دکھ سکھ بھی مدغم ہو گئے تھے۔ وہ رجب علی نہیں، پاکستانی اور اس سے بڑھ کر ایک مسلمان کی حیثیت سے سوچتا تھا۔ کبھی وہ صرف اپنے بچوں کے تابناک مستقبل کے خواب دیکھا کرتا تھا، اب اس محدود دائرے سے نکل کر وطن کے بہتر مستقبل کے خواب دیکھتا تھا۔ مسلم امّہ کا عروج دیکھنا اس سے بھی آگے کی تمنا تھی مگر آرزو باندھنے میں کیا حرج تھا۔ سو، رجب علی مسلم امّہ کے عروج کا متمنی بھی تھا۔

حیات کا سفر یوں ہی چلتا ہے...... جزو سے کل کی طرف...... وقت کے ساتھ فرد کی سوچ میں یوں ہی پختگی آتی ہے...... ذات کے محدود دائرے سے نکل کر قوم کی جانب۔

رجب علی کو نہ پہلے زندگی سے گلہ رہا تھا، نہ اب...... زندگی انسان کو اس کے نصیب کے مطابق ملتی ہے...... اپنی کوشش بسیار کے باوجود وہ اپنے بچوں کا نصیب خود نہیں لکھ پایا تھا...... اسے خود بھی وہی ملا جو اس کے نصیب میں تھا۔ وہ مطمئن تھا کہ اس نے تدبیر تو بہرحال کی تھی اور جم کر چو مکھی لڑی تھی۔

نشاط کا خیال اب بھی اکثر اس کے دل میں لو دینے لگتا تھا...... ثمینہ کو اگر بھولے سے بھی اس لو کی خبر ہو جاتی تو وہ اسے آتشِ نمرود بنا دینے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھتی...... صد شکر کہ قفسِ سینہ راز ہائے دل کا امین تھا۔

☆☆☆

رجب علی کے قلب کی صحت ان دنوں خاصی دگرگوں چل رہی تھی۔ معالجین کے مطابق اس کے قلب کی تین شریانیں بند ہونے کے باعث قلب کی کارکردگی ناقص تھی۔ تسلی بخش ہوتی بھی کیسے...... مٹھی برابر عضلاتی عضو ہی تو تھا...... دردِ زندگی کس حد تک سہتا...... گھاؤ ہی گھاؤ لگے تھے دل پر...... دل کو سینے سے نکال کر اس پر لگے گھاؤ شمار کرنا ممکن ہوتا تو رجب کے دلِ داغ داغ کا حوصلہ گھاؤ

شاری کو شرما دیتا۔ بچپن سے بڑھاپے تک آلام ہی آلام دیکھے تھے اس دل نے۔ کہاں تک اور کب تک سہتا اور وہ بھی اکیلا۔

متحدہ سلطنت برطانیہ ان دنوں شدید سردی اور دھند کی زد میں تھی۔ آپا کہا کرتی تھی، سردی کے موسم اور بارش میں اکیلا بندہ اور بھی اکیلا ہو جاتا ہے، گئے ہوؤں کی یاد ستانے لگتی ہے، پرانے دکھ تازہ ہو جاتے ہیں۔ آپا کی اپنی بپتا تھی، بیچاری ساری زندگی تنہا زندگی سے جوجھتی لڑتی رہی تھی۔ رجب علی کا حال بھی چنداں مختلف نہ تھا۔ تمام عمر زندگی سے اکیلا ہی لڑتا رہا تھا۔ ٹھنڈ بڑھتی، بارش برستی تو اس کا احساس تنہائی سوا ہو جاتا۔ گزرا وقت، پرانے دکھ اور گئے ہوؤں کی یاد دل میں اتر آتی۔ کتنے لوگ تھے جو اس کے دل کے قریب ہوتے ہوئے بھی دور ہو گئے تھے۔ کچھ عدم کی راہ، کچھ اپنی اپنی زندگی کے دائرے میں محصور۔ ماں، بہنیں، بھائی سب خواب بن گئے تھے بلکہ اب تو خواب میں بھی شاذ و نادر ہی آتے۔ اولاد حیات ہوتے ہوئے بھی خیال کی حد تک...... بس ایک ثمینہ ہی تھی اس کے ساتھ جو برسہا برس سے اسے رفاقت فراہم کر رہی تھی۔ تاہم وہ اور بات کہ اب بھی اسے شک سے دیکھتی تھی۔ نشاط اس کے لیے ہمیشہ ایک ڈراؤنا خواب بنی رہی تھی۔

رجب علی اس سے اکثر کہتا۔ ''اس عمر میں، میں نے تیرے سوا اور کہاں جانا ہے ثمینہ!''

وہ تنک کر کہتی۔ ''مرد کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا۔''

رجب علی پیار سے کہتا۔ ''کر لے میرا اعتبار۔''

رجب علی کی عادت تھی، فجر سے بہت پہلے بیدار ہو جاتا۔ تہجد کے نوافل ادا کرتا، فجر کے وقت نماز پڑھنے کے بعد قرآن مجید کی تلاوت کرتا، ترجمہ اور تفسیر پڑھتا، تسبیحات سے فارغ ہو کر اپنے لیے چائے بناتا، ناشتا دن چڑھے ثمینہ کے ساتھ کرتا۔ ثمینہ فجر کی نماز پڑھ کر سو جاتی تھی۔ اس کے جاگنے تک رجب علی ٹیلی ویژن پر اسلامی پروگرام دیکھتا رہتا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد سے اس کا یہی معمول تھا۔

اس روز بھی اس نے چائے بنانے کے بعد ٹیلی ویژن آن کیا اور اپنا پسندیدہ چینل کھولا۔ حرم پاک کا لائیو منظر دیکھتے ہوئے وہ چائے کے گھونٹ بھرنے لگا۔ کیسا روح پرور منظر تھا...... کعبۃ اللہ اور اس کے گرد طواف کرتے بندگانِ خدا! اچانک اسے یوں لگا جیسے وہ بھی بیت اللہ کے گرد رقصاں ہجوم میں شامل ہو گیا تھا...... لبیک اللھم لبیک...... لبیک اللھم لبیک...... مترنم گھنٹیاں بج رہی تھیں ...... ساعت اس ترنم سے معمور تھی...... بصارت دھندلا رہی تھی، دل ڈوب رہا تھا...... نبض ساتھ چھوڑ رہی تھی۔ زندگی کہاں سے شروع ہوئی تھی اور کہاں ختم ہو رہی تھی...... روٹی کی تلاش میں گھر سے نکلنے والا رجب علی خوانِ نعمت چھوڑ کر جا رہا تھا مگر اکیلا تھا...... پانچ بچوں میں سے ایک بھی اس کے پاس نہ تھا۔ ثمینہ بھی اس وقت سو رہی تھی...... کوئی اس کا ہاتھ تھام کر الوداع کہنے کو موجود نہ تھا۔

دن چڑھے بیداری کے بعد ثمینہ ہاتھ منہ دھو کر ناشتا کرنے کے لیے گھر کی بالائی منزل سے نیچے آئی تو رجب علی دونوں بازو اپنے سینے پر باندھے صوفے کی پشت سے لگا بیٹھا تھا۔ ٹیلی ویژن آن تھا، بیت اللہ کے گرد طواف جاری تھا۔ رجب علی آنکھیں کھولے ٹکٹکی باندھے اسی منظر کو دیکھ رہا تھا۔

''السلام علیکم، بڑے میاں!'' ثمینہ نے حسبِ معمول سلام کیا۔ جواب نہیں ملا۔

ثمینہ نے رجب علی کی طرف پیش قدمی کی اور اس کے نزدیک پہنچ کر اپنے دائیں ہاتھ کی انگلیاں اس کی آنکھوں کے سامنے نچاتے ہوئے بولی۔ ''کیا بات ہے، جواب نہیں دیا؟''

رجب علی جوں کا توں ساکت و صامت بیٹھا رہا۔

ثمینہ کو کچھ خوف سا محسوس ہوا۔ اس نے رجب علی کا شانہ ہلایا۔ وہ یکلخت صوفے پر ڈھیر ہو گیا۔

ثمینہ کے منہ سے دل فگار چیخ نکلی۔

نگری نگری پھرا مسافر گھر کا رستہ بھول گیا
کیا ہے تیرا کیا ہے میرا اپنا پرایا بھول گیا
ایک نظر کی، ایک ہی پل کی بات ہے ڈوری سانسوں کی
ایک نظر کا نور مٹا جب اک پل بیتا بھول گیا

روٹی کی تلاش اور نئی رتوں کی چاہ میں اپنی زمین، اپنے پیاروں کو چھوڑ کر پردیس جانے والے رجب علی کی داستانِ حیات ایک اسی کی نہیں، ترکِ وطن کر کے نئے دیس جا بسنے والے ہزاروں، لاکھوں تارکینِ وطن کی نوع بہ نوع ان گنت داستانوں میں سے ایک ہے۔

شاید...... آج بھی رجب علی کی طرح بہتر مستقبل کی تلاش میں اپنا دیس اور اپنے پیاروں کو چھوڑ کر پردیس جانے کی چاہت رکھنے والے بہت سے سادہ لوح یہ سمجھتے ہوں کہ وہاں سڑکیں شیشے کی ہیں اور ان سڑکوں پر پیسا بکھرا پڑا ہے، جتنا مرضی آئے، اٹھا لو...... مگر ترکِ وطن کا دکھ تارکینِ وطن ہی جانیں...... ہزار کلفتیں اور ہر کلفت کی داستان جدا۔

(ختم شد)